ـــــ تالیف ـــــ

شمس شریعت محمدیہ، آفتاب طریقت سہروردیہ
شیخ الاسلام حضرت سید ابو الفیض قلندر علی سہروردی

۱۳۱۴ھ ـــــــ ۱۳۷۷ھ

ابوالفیض قلندر علی سہروردی

سُخنانِ چند

خدمتِ دین و مِلت اہل اللہ کا شیوہ رہا ہے۔ جہاں بھی لادینی نے چیلنج کیا اِنھوں نے ہی اپنی ضربِ کلیمی سے اس چیلنج کا مقابلہ کیا مگر کچھ نام نہاد دانشوروں اور مذہبی سکالرز کی طرف سے ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اُن کی خدمات اور صُوفیانہ طرزِ زندگی کو متنازعہ، دنیوی ترقی میں حائل اور اسلام سے خارج کسی رہبانہ اسلوب کا نمائندہ ثابت کریں۔

الحمدللہ حضرت شیخ الاسلام سیّد ابوالفیض قلندر علی سہروردی قدس سرہٗ (م ۱۳۷۷ھ) نے کسی بحث میں اُلجھے بغیر اپنی حیاتِ طیبہ میں خالص دینِ عوام کے سامنے پیش کیا اور حتی المقدور عمل کرنے کی بھی سعی فرمائی۔ آپ کا طرزِ بود و باش نہایت سادہ ہونے کے ساتھ فقیرانہ سطوت لیے ہوئے تھا۔ اہلِ علم آپ کے پاس علمی تشنگی بجھانے کے لیے آتے اور عارفین اپنے نکات سلجھانے۔ حکیمِ اہلِ سُنت حضرت محمد موسیٰ امرتسری دام برکاتہم اپنی ایک تحریر میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

> "حضرت شیخ الاسلام سیّد ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ نے اُس وقت علومِ دین اور سِلسلہ سہروردیہ کا احیاء فرمایا جب خانقاہیں اور آستانے جہاں رُشد و ہدایت کے سرچشمے پھُوٹتے تھے گدیوں اور جاگیرداریوں میں بدل گئے تھے۔"

آپ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں "مجلسِ سہروردیہ" کی بنیاد رکھی جو آپ کی زیرِ نگرانی تبلیغِ دین کے فرائض انجام دیتی رہی۔ اسی سِلسلے میں کئی کتابوں کی اشاعت بھی ظہور پذیر ہُوئی۔ جس کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ۱۹۸۷ء میں جب عزیز القدر بزرگوارم چودھری صادق علی صاحب زاد لطفہٗ کو ناظم اور فقیر راقم السطور کو ناظم نشر و اشاعت مقرر کیا گیا تو دینِ متین اور سِلسلہ سہروردیہ کی نشر و اشاعت کے لیے میں نے ایک تجویز مکرمی چودھری صادق علی صاحب کی خدمت میں پیش کی کہ اس غرض و غایت کے لیے علیحدہ فنڈ قائم کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے اس تجویز کو بہت پسند فرمایا، اور مجھے حکم دیا کہ آپ کام شروع کریں پیسوں کا بندوبست کرنا میرا کام ہے۔ آپ نے اس سلسلے

میں نگرانِ مجلس مکرمی و محترمی حضرت الصوفی میاں عبدالکریم سہروردی صاحب مدظلہٗ کے علاوہ مجلس کے بقیہ اراکین سے بھی صلاح مشورے کیلئے اور دن رات کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک معقول رقم اس فنڈ میں مجھے مہیا کی جس سے دو سال پیشتر حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی تصنیف "جمالِ الٰہی" شائع کی جو اب نایاب ہو چکی تھی اور آج ۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۱۳ھ کو ہم آپؒ ہی کی ایک اور تصنیف "جمالِ رسولؐ" شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ کتاب ء میں پہلی بار شائع ہوئی ء میں آپؒ نے اس میں ایک باب "سانحہ ارتحال" کا اضافہ فرما کر شائع فرمائی اور موجودہ اشاعت اس کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ یہ دُوسری اشاعت کا ہو بہو چربہ ہے۔ حال ہی میں ہمارے ایک معاصر ادارے نے اسمیں کئی طرح کے اضافے کر کے شائع کیا ہے جو ہماری نظر میں ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔

نشر و اشاعت کے اس سلسلے کا احیاء جو آپؒ کے وصال کے ۳۰، ۳۵ سال بعد ہو رہا ہے یہ سب مکرمی چودھری صادق علی سہروردی زاد عزہٗ کی سعی کا رہونِ منت ہے۔ کیونکہ اگر وہ اتنی محنت سے فنڈز مہیا نہ کرتے تو میرے لیے اس بارِ گراں کو اُٹھانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا۔ میں اسکے لیے جہاں آپکا بہت مشکور ہوں وہاں مجلس کے بزرگ اراکین کا شکریہ ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا جنکی خصوصی توجہ اور عنایات نے مجھ جیسے ناکارہ انسان کو اس قابل بنا دیا کہ نشر و اشاعت کے اس اہم کام سے عہدہ برآ ہو سکا۔ میں اس سلسلے میں اپنے شیخ محترم و مکرم حضرت قبلہ الصوفی محمد نذیر غوری سہروردی دام برکاتہم کے علاوہ حضرت صوفی عبدالکریم سہروردی مدظلہ، حضرت صوفی فضل الرحمان سہروردی زاد عزہٗ، حاجی مختار علی سہروردی زاد لطفہٗ، میاں محمد سلطان انور سہروردی صاحب اور سجادہ نشین مکرمی صاحبزادہ سیّد امتیاز احمد تاج سہروردی مدظلہٗ کا بہت شکر گزار ہوں۔

مَیں آخر میں دست بدعا ہوں کہ میری یہ سعی دربار شیخ الاسلامؒ میں شرفِ قبولیت حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ میری تحریر و تقریر میں برکت عطا فرمائے۔ آمین!

سیّد ادریس سہروردی

ناظم نشر و اشاعت

مختصر احوال و آثار شیخ الاسلام
حضرت سیّد ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ

ادیس سُہروردی ____________

قدوۃ السالکین شیخ الاسلام حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ کا شجرہ نسب ۲۴ واسطوں سے قطب ربانی، غوث صمدانی حضرت سید ابو محمد عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے اور سلسلہ بعیت ۱۹ واسطوں سے حجتِ الفقر و فخری شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ سے مِلتا ہے۔

ولادت

آپ کی ولادت ۱۳۱۴ھ بمطابق ۱۸۹۵ء ضلع سیالکوٹ میں ہوئی۔ آپکے والد حضرت سید رسول بخشؒ حافظِ قرآن تھے۔ آپ کا خاندان علمی لحاظ سے علاقے میں جانا پہچانا تھا۔ اس لیے علم و فضل آپ کو ورثہ میں مِلا۔

تعلیم

ابتدائی تعلیم مڈل تک حاصل کی پھر دینی تعلیم کے لیے مدرسہ نعمانیہ لاہور سے فارغ التحصیل ہونے کی سند حاصل کر کے امامِ اہل سنت حضرت احمد رضا خان بریلویؒ

کی خدمت میں زانوئے ادب طے کیا اور وہاں سے علمِ حدیث و فقہ کے علاوہ فلسفہ منطق، کلام اور تفسیر میں سندِ امتیاز لے کر واپس وطن مالوف تشریف لائے۔

شیخِ طریقت

علمِ شریعت حاصل فرمانے کے بعد آپ نے علمِ طریقت حاصل کرنے کی طرف رجوع فرمایا اور اس سلسلے میں سیف چشت سید مہر علی شاہ صاحبؒ (گولڑہ) اور قطبِ عالم حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر دونوں اصحابِ باصفا نے آپ کو سہروردی سلسلے کی طرف رجوع کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ حیات گڑھ جلالپور جٹاں روڈ گجرات میں سلطان العارفین خواجۂ خواجگانِ سہرورد قطب عالم حضرت میاں غلام محمد سہروردی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو عارفِ کامل ہونے کے علاوہ عالم بے مثل و بے بدل بھی تھے اور آپ کے سلسلۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔

دعوتِ تبلیغ

شیخ کامل کے حکم سے لاہور تشریف، ایبٹ روڈ پر واقع حستو تیلی سہروردی کے مزارِ اقدس پر معتکف ہو کر مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے واعظ و پند کا سلسلہ شروع کیا اور قطب اقطاب حضرت شاہ ابوالمعالی قادریؒ کے مزار سے متصل جامع مسجد میں خطبہ دینے لگے۔ جلد ہی لوگوں کا رجوع آپ کی طرف ہو گیا اور ایک جمع کثیر آپ کے خطبات میں شریک ہونے لگا۔ تبلیغی مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آپ نے پاکستان اور ہندوستان کے کئی علاقوں کا دورہ کیا اور بہت سے گم کردہ راہ کو منزل شناس بنایا۔

سیرت و معمولات

مختصراً اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ آپ سنتِ نبوی علیہ السلام کے حامی اور بدعت کا قلع قمع کرنے والے تھے۔ اس کی شاہد آپ کی تصنیفات ہیں۔ آپ کا شمار ان شیوخ میں ہوتا ہے جو اکنافِ عالم کے لیے حجت اللہ بن کر اُبھرتے ہیں اور تعلیم و عمل کے ساتھ ساتھ اپنے نورِ نظر سے بیمار اور کوڑھی روحوں پر مرہم عیسٰی رکھ کر شفایاب فرماتے ہیں۔ آپ علوم و قواعد میں مہارتِ تامہ رکھنے اور اصولی و فروعی مسائل کے متعلق نظرِ عمیق رکھنے والے تھے۔ تفسیرِ قرآن میں ایسے ایسے مطالب عام فہم انداز میں بیان فرماتے کہ سننے والے حیران و ششدر رہ جاتے۔ متواضع، رحم دل، حد درجہ شفیق اور مہمان نواز تھے ہمیشہ مریدین کو اپنے برابر بٹھاتے اور دوست کہہ کر تعارف کراتے۔ بڑے صابر، حلیم اور غصہ پر قابو پانے والے تھے مگر دین کے معاملے میں سخت اور صاف گو تھے۔ ذکر و اذکار اور عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے مگر دن بھر احباب سے ملنے کے لیے کچھ وقت گھر کے ایک کمرہ میں تشریف فرما ہوتے۔ دن میں کئی بار عقائد، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور تصوف کے بارے میں اپنے ارشادات سے مسلمانوں کے دلوں کو گرماتے۔ غرضیکہ آپ کی حیاتِ طیبہ صلاح، نیک سیرت اور طہارت باطنہ کی ایسی مکمل تفسیر تھی کہ آپ کی مجالس میں داخل ہونے والا یہ محسوس کرتا کہ کسی دورِ اوّل کے بزرگ کی مجلس میں بیٹھا ہوا ہے۔

تصنیفات و تالیفات

جمالِ الٰہی۔ جمالِ رسولؐ۔ سیاحِ لامکاں۔ الفقر و فخری۔ صحیفۂ غوثیہ۔

موعظة للمتقین ۔ حُلیہ النبیؐ ۔ دعوت الحنفیہ ۔ پردہ نسواں ۔ لباس التقویٰ ۔ رسالہ علم غیب ۔ تعارف سہروردیہ ۔ تذکرہ سُہروردیہ ۔ انوار سہروردیہ ۔ میلاد الرسولؐ شعبان المعظم ۔ کتاب الصوم ۔ صوتِ ہادیؒ ۔ رمضان المبارک ۔ دخترِ ملت اور زکوٰۃ کا اسلامی نظام ۔

رحلت

آنجنابؒ کی وفات حسرت آیات کے دن قریب تھے کہ آپ کو بخار ہوا اور اسی حالت میں آپ ۶۳ برس کی عُمر میں ۲۷۔صفر المظفر ۱۳۷۷ھ بمطابق ۱۹۵۸ء کو واصلِ حق ہوئے ۔

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

✧ ✧ ✧ ✧ ✧

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمالِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

از

ابوالفیض قلندر علی سہروردی

ناشر

مرکزی مجلسِ سہروردیہ۔ لاہور

نام کتاب ——— جمالِ رسولؐ

ناشر ——— مرکزی مجلس سہروردیہ

ہنجروال، ملتان روڈ، لاہور

طابع ——— چودھری صادق علی سہروردی

مطبوعہ ——— النور پرنٹرز اینڈ پبلشرز، لاہور

تعداد ——— ایک ہزار

اشاعت اوّل ——— ۱۹۵۰

اشاعت دوم ——— ۱۹۵۳

اشاعت سوم ——— ۱۲۔ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ

ملنے کا پتہ

حاجی چودھری صادق علی سہروردی

ناظم مرکزی مجلس سہروردیہ (رجسٹرڈ)

آستانہ عالیہ شیخ الاسلام حضرت ابوالفیض سید قلندر علی سہروردی قدس سرہٗ

ہنجروال، ملتان روڈ۔ لاہور

۳۲۷۔ جہاں زیب بلاک۔ علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور

فون: ۴۴۰۱۲۷

اِنتساب

فقیر اپنی اِس ناچیز تالیف موسومہ "بہ جمال رسُول" کو بصورتِ نذرِ عقیدت براہِ راست بغیر درمیانی واسطوں کے حضور سید المرسلین افضل النبیین رحمۃ للعلمین محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند و بالا اور لاثانی دربار میں پیش کرتا ہے۔

ع گر قبول اُفتد زہے بخت و نصیب

صفحۂ تعارف

اِلتجا

اے بادشاہوں کو بادشاہت عطا فرمانے والے، غریبوں کی غریبی پر ترس کھانے والے، امیروں کو ثروت و امارت بخشنے والے اور بے آسرے دُکھیاروں کی پکار کو سننے والے واحد و قدوس خدا! ایک خاطی و عاصی بندہ پکارنے کی تمنا رکھتا ہے۔ اسے توفیقِ رفیق فرما کہ وہ تجھے دل کی اس گہرائی سے جو اخلاص و للہیت کا مسکن اور روح کے اس عمق سے جو تیرے خوف و خشیت کا مخزن ہو، پکارے۔ تو وہ داتا ہے جو ہر پکارنے والے کی پکار کو سن کر ہمیشہ اس کے استحقاق سے زیادہ اس کے دامنِ مراد کو بھرتا ہے۔

اس سائل کی روح کانپ رہی ہے اور جسم کا رواں رواں ایک ایک ریشہ لرز رہا ہے کہ زندگی کا کوئی نیک عمل اور عمر بھر کا کوئی مستحسن کارنامہ نہیں جس کی امید پر اپنے عظیم و جلیل ذات کی شمع لے کر تیری بارگاہِ فضل و عطا میں اپنے لب کشائی کر سکے۔ مگر اس کی قبولیت کی افسردگیوں میں صرف ارشادِ لا تقنطوا کی ڈھارس ہی جرأت دلاتی ہے کہ اسی کا دامن پھیلا اور غنی و کریم آقا سے مانگ وہ وہ ذات ہے جو نعمتوں کے خزانے بے منت بے استحقاق جس پر چاہتا ہے کھول دیتا ہے۔

پس اس رحمتِ لامتناہی کے صدقے اس ذرۂ ناچیز کو اپنے حبیبِ پاک صاحبِ لولاک و شرفِ افلاک کے بیانِ رفعتِ ذکر کی وہ وسعت و پذیرائی عطا فرما جس کو سندِ دوام کے ساتھ قبولیتِ عام بھی حاصل ہو اور اس تذکرۂ حبیب میں وہ تاثیر و اثر دے کہ اس کے ہر قاری و ناظر کا قلب تیرے اور تیرے محبوب کے عشق و محبت سے معمور ہو جائے۔

یا صاحب الجمال و یا سیّد البشر

من وجہک المنیر لقد نوّر القمر

لا یمکن الثّناءُ کما کان حقّہٗ

بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

حمد

تمام حمد ہر حامد سے ہر زمانہ میں اُسی ذاتِ معبود و محمود جلّ وعلا شانہٗ کے لئے ہے جو چشمِ جہاں میں شاہد و مشہود اور قبلۂ جاں میں موجود و مسجود بے گوش و زبان اور بے ظن و نشان معہود و مقصود ہے۔ اُسی کی بارگاہِ کریمی میں التفاتِ دلِ عشّاق اور اسی کی نظرِ رحیمی کی اسیر جانِ مشتاق ہے۔ وَهُوَ اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاشَرِيْكَ لَهٗ شَهَادَةً اَشْهَدُ بِهَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ؕ

بلغ العلےٰ بکمالہٖ
کشف الدجےٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ
صلوا علیہ واٰلہٖ

نعت

اے حبیبِ کبریا اے منبعِ جود وصفات
باعثِ تکوینِ عالم مرکزِ کل کائنات
ہوگیا پیدا تیری خاطر نظامِ ہست وبود
بارگاہِ حق میں ہے مقبول کتنی تیری ذات
تو نہیں کچھ بھی نہیں تو ہے تو سب موجود ہے
تیرے ہی دم سے ہوا قائم وجودِ شش جہات
کیوں نہ ہم سمجھیں محبت کو تیری ایمان اصل
جب اسی اک بات پر موقوف ہے اپنی نجات
جس کے منہ میں پڑگیا اک مرتبہ تیرا لعاب
اس نے ٹکڑے کردیا پیمانۂ آبِ حیات
تونے فرمایا ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ دُنیا میں جب
سربسجدہ تیرے قدموں میں گرے لات ومنات
ریزہ چیں تیری بساطِ حسن کے شمس وقمر
اے مجسّم نورِ حق اے مشعلِ کل کائنات
عاصیوں کو ناز ہو کیوں نکر نہ تیری ذات پر
مانی جائے گی تیری محشر کے دن ہر ایک بات
تیرے نورِ پاک سے ضو ریز مہر ومہ ہوئے
تیرے حسنِ لم یزل کی اس طرح نکلی زکات
مرجعِ خلقِ خدا ہے تیری ذاتِ باصفا
ہو ریاضؔ دلِ حزیں پر بھی نگاہِ التفات

مقصدِ کتاب

معترض کے لئے یہ کہنا کافی ہے۔ کہ وہ بلاتحقیق اپنی نکتہ چینی کو حرکت نہ دے۔ فقیر نے یہ کتاب ایسے شخص کے لئے نہیں لکھی جو سرور کائنات مختار شش جہات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر۔ معجزات میں طعنہ زن معیّن آثار و نشانات سے منحرف۔ و فیع خصائل و جمیع کمالات سے روگردان اور خصائص کبرے و فضائل عظمےٰ میں شک و شبہ کرنے والا ہو اگر معترضین کے لئے ہوتی تو اس میں دفع اعتراضات پر وہ دلائل قائم کئے جاتے جن سے ایسے لوگوں کے اقوال باطلہ و اعتراضات واہیہ کا خاتمہ ہو جاتا۔ لہٰذا اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اہل محبت کے لئے ہے جو حضور کی ہر دعوت پر لبیک کہنے والے اور نبوت مختتمہ و رسالت تامہ کی تصدیق کرنے والے ہیں تاکہ ان کی محبت میں تاکید۔ ایمان میں مضبوطی اور اعمال میں زیادتی ہو۔

خداوند عالم جل مجدہٗ اس امر پر قادر ہے۔ کہ وہ نبوت محمدیہ علیہا الصلوات والتسلیمات کے اس روشن پہلو ہی سے لوگوں کے دلوں میں وہ نور معرفت نبوت پیدا فرمادے جو بغیر کسی واسطہ کے ان کو اس کا اہل بنادے اور وہ بے ساختہ بول اُٹھیں ؎

خدا کو مانا ہے دیکھ کر تجھ کو اُس کی شان جمیل تُو ہے
خدا کی ہستی پہ میرے نزدیک سب سے روشن دلیل تُو ہے

ولادتِ آنجناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

حضور پرنور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ ربیع الاوّل مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو کتم غیب سے منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور پوری کی پوری کائنات نے اس ظہور قدسی پر بصد ادب و احترام سر جھکا لیا۔ فضائے بسیط میں ایک شورِ مسرت و شادمانی بلند ہوا کہ وہ مختار نبی آگیا جو کفر و شرک کی ظلمتوں کے طلسم کو توڑ کر رکھ دے گا۔ وہ باعث تخلیق کائنات تشریف لے آیا۔ جو ایک دنیا کو خارزار غم والم سے نکال کر آرام و راحت کے فردوس میں پہنچا دے گا۔ وہ پھول کھلا جس کی نکہت بیز یاں اور تر دستیاں مشامِ عالم کو معطر اور معنبر کر دیں گی۔ وہ ہادی نمودار ہوا جس کی تعلیم و تلقین تا قیام قیامت مخلوق خدا کو ہدایت و نجات کی سند دیتی رہے گی۔ وہ آفتاب قطب نکلا جس سے اس جہان آب و گل کا ذرہ ذرہ قدوسیوں کے ساتھ مل کر اس نورِ ایزدی کی درخشانیوں سے ابدی طور پر کسب ضیا کرتا رہیگا۔ اور دنیا کی ماسوا پرستی خدا پرستی سے بدل جائیگی۔ غلام و آقا برابر اور شاہ و گدا ہمسر ہو جائیں گے۔ ویرانے گلستان اور دیوانے علم و حکمت کے پاسبان نظر آئیں گے۔ ہر متکبر کی کبریائی کو اس کے فقیر اور ہر فرعون بے سامان کی باطل خدائی کو اس کے نجیب ٹھکرا دیں گے۔ صلو علیہ و آلہٖ۔

(مقتبس) (از معارف)

میلاد نامہ منظوم

وہ عالم تجھ پہ صدقے اے زمینِ گنبدِ خضرا
تری آغوش میں آسودہ ہے وہ برزخِ کبریٰ

وہ جس کی ذات والا۔ اک نویدِ رحمتِ عالم
وہ جس کا روئے زیبا شمعِ ظلمت خانۂ دُنیا

وہ جس کا نطقِ شیریں نغمۂ الہامِ ربّانی
وہ جس کا خلقِ نوشیں شہد سے بڑھ کر حلاوت زا

وہ جس کی ہستیٔ اقدس سراپا معنیٔ قرآں
وہ جس کا ہر نفس وقفِ پیامِ ملتِ بیضا

وہ جس کے درگہِ سامی کا جبریلِ امیں چاکر
وہ جس کے عتبۂ عالی پہ قدسی ناصیہ فرسا

وہ جس کے آستاں پہ رفعتِ عرشِ بریں صدقے
وہ جس کے بوستاں میں نغمہ پیرا بلبلِ طوبےٰ

وہ جس کے عالمِ جاں میں نوائے قدس برق افشاں
وہ جس کے ذوقِ ایماں میں پیامِ شوق شور افزا

وہ جس کے قدسیانِ پاک گوہر دید کے طالب
وہ جس کے نوریانِ عرشِ اعظم والا و شیدا

وہ جس کی مدحتِ خوبی میں ہے رطب اللساں قرآں
وہ جس کی شانِ محبوبی ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی

وہ جس کے خم کدہ کے حضرتِ فاروق صہبائی
وہ جس کے گُل کدہ کے حضرتِ صدیق اک طوبیٰ

وہ سرشار مئے باقی تصدق جس پہ مے خانہ
وہ ساقی جس کے دم سے ضو فشاں خمخانہ بطحا!

وہ جس کے بادہ نوشوں میں بلال و بوذر و سلماں
وہ جس کے سرتر و شوں میں ابن زید و سید الشہدا!

وہ جس کی موجِ مے میں جلوہ پیرا برقِ سینائی
وہ جس کا تا ابد باقی خمارِ نشۂ صہبا!

وہ جس کا نقشِ پا سجدہ گہِ مہر و مہ کامل
وہ جس کا داغِ سیما مطلعِ نورِ سحر گویا

وہ جس کی برقِ ایماں بیقرارِ جلوۂ ایمن
وہ جس کا ذوقِ عرفاں زندہ دار خلوتِ شبہا

وہ جس کے بوریا پر سطوتِ تختِ شہی قرباں
وہ جس کے فقر سے لرزاں شکوہِ قیصر و کسریٰ

محمدؐ وہ کمالِ آخرینِ محفلِ عالم
محمدؐ وہ جمالِ اوّلیں شاہدِ معنیٰ!

محمدؐ وہ نسیم نو بہارِ گلشنِ ہستی
محمدؐ وہ شمیمِ مشک بارِ جنّت الماویٰ!

محمدؐ وہ شبستانِ ازل کی شمع نورانی
محمدؐ وہ ز سر تا پا جمال جلوۂ سینا

محمدؐ وہ درِ تاجِ رسل وہ خاتم المرسل
محمدؐ وہ ظہورِ نورِ کُل وہ جلوۂ یکتا

محمدؐ وہ گروہِ اولیا کے سیدِ والا
محمدؐ وہ کلاہِ انبیاء کے طرۂ زیبا

محمدؐ وہ نبوت کے شرف کے مبدؤ خاتم
محمدؐ وہ رسالت کی صدف کے لولوئے لالا

محمدؐ وہ شہنشاہِ دو عالم سرورِ افخم
محمدؐ وہ مہِ دو ہفتۂ یثرب شہِ بطحا!

محمدؐ وہ نویدِ لطفِ عام و رحمتِ عالم
محمدؐ وہ پیامِ نوبہارِ گلشنِ دنیا

محمدؐ وہ سحابِ رشحۂ بار مزرعِ گیتی
محمدؐ وہ شبابِ روزگارِ ملتِ بیضا

محمدؐ وہ بہارِ تازۂ باغِ براہیمی
محمدؐ وہ چمن پیرائے باغِ ملتِ آباء

وہ خورشیدِ ضیا بارِ عرب جس کی تجلی سے
عرب کا ذرہ ذرہ آسمانِ قدس کا تارا

وہ رشکِ مہرِ عالمتاب جس کی جلوہ ریزی سے
شبستانِ جہاں میں پھر ہوا نورِ سحر پیدا

ہوا پھر مطلعِ انوار ظلمت خانۂ عالم
سرِ فاران جو مہِ ضوفشانِ مصطفےٰ احمد کا

سیاہی ہو گئی کافور یکسر شامِ ظلمت کی
صبا لائی پیامِ نو پھر صبحِ سعادت کا

نئے انداز بیداری سے کروٹ لی زمانے نے
خمارِ خوابِ نوشیں سے یکایک جاگ اٹھی دنیا

جہاں کے گلشنِ پژمردہ میں تازہ بہار آئی
رگِ افسردۂ ہستی میں خونِ زندگی دوڑا!

دلِ بے نور میں رخشاں ہوئی پھر شمع ایمانی
یہ خاکستر ہوئی پھر سوزِ ایماں سے شرر افزا

نگاہِ معرفت پیدا ہوئی پھر دیدۂ دل میں
عطا ہر کورِ باطن کو ہوئے پھر دیدۂ بینا

عرب کی وادیاں تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھیں
ہوا عالم میں آوازہ بلند اللہ اکبر کا!

زبانِ کفر وقفِ کلمۂ حق ہو گئی یکسر
زمیں سے آسماں تک غلغلہ توحید کا اٹھا

فضائے کفر و باطل ہو گئی پر شور و شیون سے
نوائے اہلِ دل سے ہو گئی معمور پھر دنیا

جھکا دیں گردنیں اربابِ طغیان و تمرد نے
ہوئے نام آورانِ کفر اک اک بندۂ مولا

ہر اک کافر بڑھا لبیک کہکر دعوتِ حق پر
ہر اک منکر نے مضبوطی سے پیمانِ وفا باندھا

فدایانِ محمدؐ بن گئے جو دشمنِ جاں تھے
تہِ تیغِ محبت ہو گئی یکسر صفِ اعدا

کہیں لطف و محبت تھی کہیں تہدید و شدت تھی
کہیں شانِ جمالی تھی کہیں فرِ جلالی تھا

جہاں کے گوشہ گوشہ میں صدائے دینِ حق پہنچی
نوائے حق پرستی مشرق و مغرب میں لہرایا

دیا علم و عمل سے درسِ آئینِ جہانبانی
پڑھایا پھر سبق دنیا کو تدبیر و سیاست کا

شتربانی بھی کرتے تھے جہانبانی بھی ہوتی تھی
ابھی وہ بینوا تھے اور ابھی تھے وہ جہاں آرا

ہوا سکہ رواں عدل و مساوات و اخوت کا
ہوئی پھر از سرِ نو مجلسِ صدق و صفا برپا

فضائل سے ہوئی آراستہ پھر بزمِ انسانی
محاسن کا بنی گہوارہ پھر یہ فسق کی دنیا

دلوں کی خشک کھیتی لہلہائی جوشِ باراں سے
سرِ الستانِ جہاں میں چشمہ پھوٹا نورِ عرفاں کا

شرف بخشا گیا انسانیت کو پھر سعادت کا
بلند اس درجہ پایہ ہوا پھر آدمیت کا

مٹی ظلمت سرائے دہر سے لعنت غلامی کی
زمانہ سے اُٹھی رسمِ تمیزِ بندہ و آقا

جسے دیکھو وہ اب سرشارِ صہبائے اخوت ہے
جسے دیکھو وہ اب ہے بادۂ وحدت کا متوالا

ہوا ختم آہ وہ دورِ شرابِ مجلسِ دوشیں
نہ وہ ساقی ہے اب باقی نہ وہ خمخانہ بطحا!

کہاں وہ عہد سرشاری کہاں یہ دورِ محرومی
کہاں کیفِ مئے عرفاں کہاں رنجِ خمار افزا!

وہی مینا ہے اب بھی پر نہیں وہ بادۂ رنگیں
وہی صہبا ہے اب بھی پر نہیں وہ شورشِ صہبا

کرے گو دورِ گردوں لاکھ اپنی سعیِ امکانی
پلٹ کر پھر کبھی وہ عہدِ قدس آ نہیں سکتا

نہ دیکھی ہوگی چشمِ آسماں نے بزمِ قدس ایسی
سُنے ہوں گے نہ عالم نے یہ نغماتِ طرب افزا

نہ پائے گا زمانہ پھر کبھی مجد و شرف ایسا
نہ ایسی پھر سعادت دیکھے گی یہ دیدۂ دنیا

مظاہر تھے یہ سارے رحمت اللعالمینی کے
کرشمے تھے یہ سب بس آپ کی لطف آفرینی کے

اجمالِ صفات

اس کائنات آب و گِل میں ہر پیدا ہونے والے انسان کا کوئی نہ کوئی ایک نام پیدائشی اور زیادہ بھی بطور کنیت و خطاب کے مشہور ہوتے ہیں۔ جن میں بعض سے محض ایک وقتی فوقیت و فضیلت کی تشہیر مراد ہوتی ہے۔ اور بعض سے صرف لکارنے کا کام لیا جاتا ہے۔ مگران افراد میں ناموں کے لحاظ سے معنوی وابستگی و حقیقت بہت کم پائی جاتی ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ہوتی ہی نہیں۔ آج ناموں کے لحاظ سے تو لاکھوں علی۔ حسین۔ حسن۔ احمد۔ خالد۔ طارق وغیرہ وغیرہ نظر آئیں گے۔ مگران کے یہ اسماء محض شناخت تک محدود ہوں گے۔ اور اپنی صفات عملیہ سے جو اس نام سے متعلق ہیں کوسوں دُور۔

چونکہ یہ بات زبان زد خلائق ہے۔ کہ اچھے ناموں میں بلحاظ اپنی تاثیرات کے ہزاروں برکات سے انسان بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس لئے نام اچھے رکھنے چاہئیں مگران کی حقیقت معنوی کا ورود اور تاثیرات کا ظہور بہت کم پایا جاتا ہے۔ سعادت ازلی اور چیز ہے اور نام نہاد تفوق اور۔

کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ آنحضور سرور کائنات۔ مفخر موجودات۔ مختار شش جہات صلعم کی پیدائش سے قبل جب یہ بات مشہور ہوگئی کہ ایک نبی رحمت نبی آخرالزمان عنقریب دنیا میں تشریف لانے والے ہیں۔ جن کا اسم پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا۔ تو عرب میں بعض لوگوں نے اپنے بچوں کا نام محمدؐ رکھنا شروع کر دیا۔ کہ شاید وہ وجود باجود ہمیں میں سے پیدا فرما دیا جائے۔ مثلاً چھ بچوں کے نام حضور کی ولادت باسعادت سے قبل رکھے جا چکے تھے۔ جو یہ ہیں۔ محمد بن احیحہ بن الجلاح الاوسی۔ محمدؒ بن سلمہ انصاری۔ محمدؒ بن براءلبکری محمدؒ بن سفیان بن مجاشع۔ محمدؒ بن حمران جعفی۔ محمد بن خزاعی سلمی۔ مگر اللہ تعالےٰ

خوب جانتا ہے۔ جہاں اس نے اپنے انعام رسالت کو رکھنا ہوتا ہے۔ اور یہ ناز معرفت شرف محمد بن عبداللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں رکھا۔ جو ازلی و ابدی طور پر اس کے لئے حقیقتاً منتخب تھے۔

اس باب میں صرف سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ایک جامع صفات ہستی ہے۔ جس کے اسماء گرامی جہاں بھر کے موسوم افراد سے زیادہ اور جس کی ذات بابرکات ہر اپنے اسم کی کُلّی مصداق اور اس کی حقیقت صوری و معنوی کی صحیح حامل و عامل ہے۔ اللہ کریم نے جو اسم مبارک اپنے محبوب کے لئے خاص کرنا چاہا۔ اس کے ارشاد فرمانے سے قبل اپنے محبوب بے عیوب کو اس کی خصوصیتوں کا حامل اور حقیقتوں کا اہل کر کے بھیج فرمایا۔ وہ محبوب خدا صرف اسماء عالیہ سے موسوم ہی نہیں بلکہ تمام اسماء طیبہ کے حقائق حضور کی ذات گرامی میں مجتمع ہیں۔ وہ عوام کی طرح محض اسماء مبارکہ کی فہرست ہی نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ حضور کی ذات پر ہر لحاظ سے منطبق اور صادق آتے ہیں۔ اور یہ ایک وہ خوبی ہے۔ جو جہاں بھر کے اولین و آخرین افراد میں اسماء کی اس بہتات کا ساتھ قطعاً نہیں پائی جاتی اور نہ پائی جائے گی۔ بلکہ اکثر انبیاء علیہم السلام کو بھی جو اسماء کی ایک ایک عزرگی کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ مثلاً۔ ابراہیم علیہ السلام کا اسم شریف حلیم۔ نوح علیہ السلام کا شکور۔ عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام کا برّ و سید موسیٰ علیہ السلام کا کریم و قوی۔ یوسف علیہ السلام کا حفیظ و علیم۔ ایوب علیہ السلام کا صابر اور اسماعیل علیہ السلام کا صادق الوعد۔ ان سب پر بھی آنحضرتؐ کو زیادتی اسماء میں فضیلت تامہ حاصل ہے۔

لہذا۔ فقیر چاہتا ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوات والتسلیمات کے تمام اسماء مبارکہ کو یکجا جمع کر کے حضورؐ ہی کے علم و عمل کی روشنی میں اُمت خلق خدا تک ذرا تفصیل کے ساتھ پہنچا دے۔ جو ابھی تک ظلمت کدۂ جہان میں آفتاب و مہتاب کی پرستار۔ دیوتاؤں اور طاغوتی طاقتوں کی شکار۔ تثلیث کے عقیدہ کی دلبند

شجر و حجر کی عبادت میں پابند۔ رینگنے والے جانوروں سے مرغوب۔ جنگالی کرنے والے معبودوں کی مرغوب۔ اگنی دیوی سے پُرخوف۔ اور نسل و رنگ کے امتیاز میں مالوف۔ دُنیا کے مبلغ اعظم کی تعلیم سے ناآشنا رہ کر معبود حقیقی کی معرفت سے محروم ہے۔ و باللہ التوفیق

اسماء شافیہ مبارکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم معہ تشریح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُحَمَّدٌ	اَحْمَدُ	حَامِدٌ	مَحْمُودٌ
تعریف والا	بہت حمد والا	سراہنے والا	سراہا گیا
قَاسِمٌ	عَاقِبٌ	فَاتِحٌ	خَاتِمٌ
بانٹنے والا	پیچھے آنے والا	کھولنے والا	ختم کرنے والا
حَاشِرٌ	مَاحٍ	دَاعٍ	سِرَاجٌ
اُٹھنے والا	محو کرنے والا	بلانے والا	چراغ
رَشِيْدٌ	مُنِيْرٌ	بَشِيْرٌ	نَذِيْرٌ
بزرگ	نورانی	خوشخبری دینے والا	ڈرانے والا
هَادٍ	مَهْدٍ	رَسُوْلٌ	نَبِيٌّ
ہادی	ہدایت والا	بھیجا گیا	مخبر صادق

طٰهٰ	یٰسٓ	مُزَمِّلُ	مُدَثِّرُ
طٰهٰ	یٰس	گلیم پوش	چادر اوڑھنے والا
شَفِیْعٌ	خَلِیْلٌ	کَلِیْمٌ	حَبِیْبٌ
شفاعت والا	دوست	کلام کرنے والا	محبت والا
مُصْطَفٰی	مُرْتَضٰی	مُجْتَبٰی	مُخْتَارٌ
چُنا ہوا	برگزیدہ	قبول کیا گیا	اختیار دیا گیا
نَاصِرٌ	مَنْصُوْرٌ	قَائِمٌ	حَافِظٌ
مدد دینے والا	مدد دیا گیا	قیام والا	حفاظت والا
شَهِیْدٌ	عَادِلٌ	حَکِیْمٌ	نُوْرٌ
گواہ	عدل والا	حکمت والا	نور
حُجَّةٌ	بُرْهَانٌ	اَبْطَحِیٌّ	مُؤْمِنٌ
دلیل	دلیل دیا گیا	بطحا والا	امن والا
مُطِیْعٌ	مُذَکِّرٌ	وَاعِظٌ	اَمِیْنٌ
تابعدار	نصیحت کرنیوالا	نصیحت والا	امانت دار
صَادِقٌ	مُصَدِّقٌ	نَاطِقٌ	صَاحِبٌ
سچا	سچ کر دکھانیوالا	بولنے والا	عزت دار

مَکّیٌّ	مَدَنیٌّ	عَرَبیٌّ	هَاشِمیٌّ
مکے والا	مدینے والا	عرب والا	اولادِ ہاشم
تِہَامیٌّ	حِجَازیٌّ	نَزَاریٌّ	قُرَیْشیٌّ
تہامی	حجاز والا	نزار کی نسل سے	قریشی نسب
مُضَرِیٌّ	اُمِّیٌّ	عَزِیْزٌ	حَرِیْصٌ
مضر والا	ان پڑھ	غالب	حرص والا
رَءُوْفٌ	رَحِیْمٌ	یَتِیْمٌ	غَنِیٌّ
شفیق	رحمت والا	یتیم	بے پرواہ
جَوَّادٌ	فَتَّاحٌ	عَالِمٌ	طَیِّبٌ
سخاوت والا	فتح والا	جاننے والا	پاک
طَاهِرٌ	مُطَهَّرٌ	خَطِیْبٌ	فَصِیْحٌ
پاک کرنے والا	پاک کیا گیا	خطبہ دینے والا	عمدہ بیان والا
سَیِّدٌ	مُنَقًّی	اِمَامٌ	بَارٌّ
سردار	صاف کیا ہوا	پیشوا	نیکوکار
شَافٍ	مُتَوَسِّطٌ	سَابِقٌ	مُقْتَصِدٌ
شفا دینے والا	درمیانہ	سبقت لے جانے والا	میانہ رو

مَہدِیٌّ	حَقٌّ	مُبِینٌ	اَوَّلٌ
ہدایت والا	سچائی بخشنے والا	ظاہر	پہلا
اٰخِرٌ	ظَاہِرٌ	بَاطِنٌ	رَحمَۃٌ
پچھلا	ظہور والا	پوشیدہ	رحمت
مُحَلِّلٌ	مُحَرِّمٌ	اٰمِرٌ	نَاہٍ
حلال کرنیوالا	حرام کرنیوالا	حکم دینے والا	منع کرنیوالا
شَکُورٌ	قَرِیبٌ	مُنِیبٌ	مُبَلِّغٌ
شکر گذار	آگے	رجوع کرنیوالا	پہنچانے والا
طٰسٓ	حٰمٓ	حَسِیبٌ	اَولٰی
طٰسٓ	حٰمٓ	حساب لینے والا	بہتر
	رَحمَۃٌ لِّلعٰلَمِینَ		
	اول و آخر حاضر و غائب جہانیوں کیلئے رحمت		

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی حَبِیبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَزوَاجِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَاَتبَاعِہٖ اَجمَعِینَ

تشریح مولا کریم جل وعلا شانہٗ نے حضور علیہ السلام کے یہ اسماء شریفہ ہر رتبے کے مطابق جُداگانہ اس لئے بیان فرمائے کہ تصدیق کرنے والوں اور ایمان کے متلاشیوں کو تردد نہ پیدا ہو۔ اور محبوب و محبوبیت و شان رسالت و نبوّت

کا ہر پہلو ایسا واضح نظر آئے کہ ایک حاسد اکمہ کے سوا جو اعجاز کو بھی ہذا سحر مبین کہکر انکار کر دے، ہر شخص اس پر گواہی دے سکے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس کی ہزارہا مثالیں احادیث سے ملتی ہیں۔ مگر فی زمانہ عقائد کفار کا تو جھگڑا ہی نہیں مخالفانہ نظریئے کے ماتحت اہل اسلام کہلاتے ہوئے وہ لوگ میدان میں آسے ہیں جن کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بلندئ شان کا تذکرہ ایک نیک عقیدہ مسلمان کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ جہاں کہیں یہ آواز کانوں میں آئی۔ ان کے کفر و بدعت کے فتوے فوراً حرکت میں آگئے۔ گویا وہ نہیں چاہتے کہ محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے تمام فضائل و محاسن کے ساتھ ذکر کیا جائے۔ کیونکہ ہر وہ حمد و نعت ان کے عقائد کے خلاف ہوگی۔ جس میں آنحضور علیہ السلام کی ذات باری تعالےٰ سے لفظی مطابقت و مشابہت پائی جائے۔ حالانکہ ان کا یہ عقیدہ خود رب العزت کے ارشاد و سنت کے خلاف ہے۔ جب خالق الکل خود ہی وہ اوصاف بیان فرمائے جو اس کی اپنی ذات کے لئے خاص اور حضور علیہ السلام کے لئے عام اس کے عطا فرمودہ ہوں۔ تو پھر ان کی یہ بیجا منطق اور لغو تاویل سازی کیا معنی رکھتی ہے۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اسماء مبارکہ حضور کی شان بلند پر من کل الوجوہ دال نہیں۔ اگر نہیں تو نعوذ باللہ ان اسماء کو محض پکار کے لئے حضور کی جانب منسوب فرمایا گیا ہے۔ اور اگر یہی عقیدت ہے۔ کہ حضور علیہ السلام میں یہ اوصاف جمع نہ تھے۔ تو معاف فرمایئے گمراہی اور بیدینی دوسری کس شے کا نام ہوگا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ ابھی تشبیہ الوہیت و نبوت یا مولا کریم جل شانہٗ و نبی کریم عز اسمہ کے مشتبہ مماثلت کو سمجھنے سے عاری ہیں، جو بات بات میں اڑ کر یہ کہہ بیٹھے ہیں کہ ان عاشقوں نے نبی علیہ السلام کو رب العزت سے ملا دیا ہے۔ حالانکہ جمیع علماء کرام اہلسنت والجماعت یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ مولا کریم خالق نبی علیہ السلام مخلوق۔ اللہ کریم کا علم اور جمیع صفات ذاتی اور حضور علیہ السلام کی عطائی۔

خداوند عالم جل شانہٗ کا علم ناممکن التغیّر اور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ممکن التبدّل ۔ اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ کا علم غیر ممکن الفناء حضور کا ممکن الفنا۔ مماثلت و برابری کو شرک وکفر فرماتے ہیں۔ جو معترضین کے ذہن میں ہے۔ قاضی ابوالفضل رحمتہ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کو ایسا واضح بیان فرمایا ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد کوئی شخص تشبیہ کے چکر اور ملمع سازمخرب ایمان باتوں میں نہیں پڑ سکتا۔ فرماتے ہیں کہ اللہ کریم جل مجدہٗ اپنی عظمت۔ بڑائی، حکومت۔ عمدہ ناموں اور بڑی صفات میں اس حد تک ہے کہ مخلوقات میں سے قطعاً مشابہ نہیں اور نہ کسی مخلوق کو اس سے تشبیہ ممکن ہے۔ اور بلا شبہ جو شرع میں خالق ومخلوق پر بولا گیا ہے۔ ان دونوں میں حقیقی معنوں کے لحاظ سے کوئی مشابہت نہیں۔ کیونکہ قدیم کی صفات حادث کے خلاف ہوتی ہیں۔ پس جس طرح خداوند عالم کی ذات اور ذاتوں کے مشابہ نہیں ایسا ہی اس کی صفات بھی مخلوق کی صفات کے مشابہ نہیں کیونکہ مخلوق کی صفات اعراض واغراض سے جدا نہیں ہوتیں۔ اور باری تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ اپنی صفات واسماء کے ساتھ ہے۔ اور اس بارے میں خداوند عالم کا یہ قول کافی ہے۔ لیس کمثلہٖ شیئ۔ یعنے اس کی مثل کوئی نہیں۔ اور یہ حقیقت تمام تر مسائل توحید کو شامل ہے۔ علماء عارفین ومحققین نے فرمایا ہے کہ توحید اسی ذات کے ثابت کرنے کا نام ہے جو کہ اور ذاتوں سے مشابہ نہیں اور نہ صفات سے معطل ہے۔ غرضیکہ نہ اسکی ذات کیطرح کوئی ذات ہے اور نہ اسکی صفات کیطرح کوئی صفت اور نہ اسکے نام کیطرح کوئی نام اور نہ اسکے کام کیطرح کوئی کام ہے مگر صرف لفظی لفظ کیساتھ مطابقت ومشابہت کی وجہ سے ہے۔ اور ذات قدیمہ اس سے بری ہے کہ اس کی صفت حادث ہو۔ جیساکہ یہ محال ہے کہ ذات محدثہ کی صفت قدیم ہو۔ اور یہی مذہب جمہور حضرات اہل الحق کا ہے۔ پھر اس تشبیہ کا الزام یا جامی کا طعن محض افترا نہیں تو اور کیا ہے۔

فقیر کہتا ہے کہ قرآن کریم سے استفادہ کرنے کی اگر قوت ایمانی نہ ہو تو مسلمان

ہوتے ہوئے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمار مبارکہ ہی کے مطالب و
معانی پر غور کر لیجیئے۔ سرکار رسالت مآب علیہ السلام کی شان ارفع و اعلیٰ اور تعلق
الٰہی کی قربت کا ہر پہلو روشن ہو جائے گا۔ اس پر بھی کوئی مماثلت و بشریت کی تنگ
گلیوں میں بھٹکنا اپنا جزو ایمان بنالے تو اللہ کریم اس کو ہدایت فرمائے۔ شعر

ادب گا ہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ مے آید جنید و بایزید اینجا!

حضور محمدؐ ہیں:۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خصوصیت دی ہے۔ کہ آپ کے اسمار کے
ضمن میں آپ کی تعریف فرمائی ہے۔ آپ کے ذکر کے اثنا میں آپکے
بڑے شکر کا ذکر مخفی رکھا ہے۔ اس اسم شریف میں جو بر وزن مفعل ہے
کثرت حمد میں مبالغہ ہے۔ یعنے حضور حمد کرنے والوں میں سب سے
بڑھکر ہیں۔ اور اُن سب سے افضل ہیں جن کی تعریف کی جاتی ہے۔
اسی لئے کائنات کا ذرہ ذرہ آج تک حضور کا ثناگستر و مدح خواں
ہے۔ اور ان کے پیارے نام کی نوبت شاہانہ رات دن کے چوبیس
گھنٹوں میں پانچ مرتبہ مساجد کے بلند ترین میناروں سے سامعہ نواز
ہے۔ اور قیامت کے دن بھی حمد کا جھنڈا حضور کے ہاتھ میں ہوگا۔
تاکہ کمال حمد آپ کے لئے پورا ہو۔ اور اس میدان میں آپ حمد کی
صفت سے مشہور ہو جائیں۔ آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر اُٹھائیگا
اس مقام میں آپ سب کی شفاعت فرمائیں گے۔ اور آپ پر تعریفوں
کے وہ دروازے کھلیں گے جو کسی پر نہ کھلے ہیں اور نہ کھولے جائینگے۔

حضور احمد ہیں:۔ اور یہ آپ کا وہ اسم مبارک ہے۔ جو پہلی کتابوں میں آچکا ہے۔ اور
انبیاء علیہم السّلام سوابق نے اسی اسم مبارک کی خوشخبریاں دی ہیں
آپ سے پہلے کوئی اس نام سے نہیں پکارا گیا۔ تاکہ کسی ضعیف قلب
پر اس سے اشتباہ یا شک نہ پڑے۔ مسیح علیہ السلام کا ارشاد

قرآن پاک میں بھی اسی اسم شریف کے ماتحت ذکر ہوا ہے مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ۔ اور اسی اسم مبارک سے آپ تمام حمد کرنے والوں میں ممتاز ہیں ۔

حضور حامد ہیں :- جنہوں نے چار دانگ عالم میں اپنے مالک و خالق رب کی وہ حمد و ثنا پھیلائی جس کی ماقبل میں مثال نہیں ۔ اور مابعد میں قیامت تک نہ ہو سکے گی ۔ ساری کائنات ارضی و سماوی میں اپنے معبود برحق کے ذکر کو بلند کرنا صرف حضور ہی کا حصّہ ہے ۔ غلام تو غلام ہے اغیار بھی معترف ہیں ۔ کہ مسلمانوں کے نبی کو خدا سے عشق ہے ۔ کوئی بلندی ایسی نہیں جہاں وہ چڑھتا ہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ کے نعرے نہیں مارتا اور کوئی پستی ایسی نہیں جہاں وہ اترتا ہو اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ نہیں پکارتا ۔

حضور محمود ہیں ا- جن کی حمد و ثنا پر تمام انبیاء علیہم السّلام نے آدم علیہ السّلام سے لیکر مسیح علیہ السّلام تک یکتائی و الوالعزمی کی مُہر لگا دی ہے حضور ہی وہ بلند مرتبہ رسول ہیں ۔ جن کی نسبت یوم میثاق میں تمام رسولوں سے اتباع کا عہد لیا گیا ۔ اور قیامت کے دن حضور ہی عرش معلےٰ کی دائیں جانب قیام فرما کر (جہاں کوئی اور نہیں کھڑا ہو سکے گا) اپنی امت کی اور سب لوگوں کی شفاعت فرمائینگے یہ مقام مقام محمود ہو گا ۔ جس پر اوّلین و آخرین رشک کھائیں گے ۔

حضور قاسم ہیں :- جن کے دست تصرف میں رَبّ العزت کے خزانوں کی چابیاں ہیں ۔ گو ہر شخص کو ہر وقت ہر شے دینے والا اللہ کریم ہی ہے ۔ مگر تقسیم حضور فرماتے ہیں ۔ حضور کے درِ دولت سے کبھی کوئی سائل خالی نہیں گیا ۔ خدا کے خزانوں پر قبضہ ہے ۔ قدموں میں اشرفیوں کے ڈھیر ہیں ۔ جسے چاہتے ہیں مالا مال فرما دیتے ہیں ۔ مگر ایسا

قاسم کون ہو گا جو دوسروں کو تقسیم کر کے خود خالی ہاتھ رہنا پسند فرمائے۔ جو کی روٹی پر قانع ہو۔ گھر والے پانی اور کھجوروں پر گذارا کریں۔ پورا پورا مہینہ چولہا گرم نہ ہو۔ پھر بھی شان وَاللّٰهُ یُعْطِیْ اِنَّمَا اَنَا الْقَاسِمُ میں فرق نہ آنے دے۔ اور کنیت ابو القاسم ہی سے مشہور ہو۔

حضور عاقب ہیں:۔ یعنے سب سے پیچھے آئے ہیں۔ اور یہ بھی ایک ایسی فضیلت ہے جو کسی نبی کو حاصل نہیں۔ کیونکہ حضور تمام انبیاء علیہم السّلام سے بعد آئے ہیں۔ حدیث شریف میں خود حضور نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں وہ عاقب یعنے تمام انبیاء علیہم السّلام سے پیچھے آنے والا ہوں۔ کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے۔ کہ نبوت کے محل کی وہ آخری اینٹ جس سے اس کی تکمیل ہوئی میں ہوں۔

حضور فاتح ہیں:۔ اُن انعامات کے جو حضور کے تشریف لانے تک بند تھے حضور ہی نے اِن کو کھولا اور خلق خدا کو سرفراز فرمایا۔ تاکہ اپنے اس اسم شریف کی حقیقت کو ظاہر فرما دیں۔ کیونکہ آپ رحمت کے دروازوں کو اپنی امت پر اُن کی عقلوں کو معرفت الٰہی اور اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ کھولنے والے ہیں۔

حضور خاتم ہیں:۔ جنہوں نے انبیاء سابقین کے تبلیغی کارناموں پر ختم نبوت و رسالت کی مُہر ثبت فرما دی۔ اور دُنیا والوں کو اپنی تخلیق کے لاکھوں برس بعد دین فطرت کی تکمیل کا وہ مژدۂ جانفزا سُنایا جس کے بعد کسی نبی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ گویا آپ کا ظہور ہی ختم نبوت کی بیّن دلیل ہے۔

حضور حاشر ہیں:۔ یعنے آپ بروز قیامت سب سے پہلے اُٹھیں گے۔ اور تمام لوگ

آپکے قدم پر حشر کریں گے۔ یعنے حضور کے سامنے قبروں سے اُٹھائے جائیں گے۔ قدم کے یہ بھی معنے کتابوں میں لکھے گئے ہیں۔ کہ لوگ شفاعت کے لیے حضور کے گرد یا حضور کی جانب جمع ہوں گے ؛

حضور ماحیؐ ہیں: کہ آپ کے ذریعے اور واسطے سے آپ کے غلاموں کے گناہ یا جہان والوں سے کفر مٹایا گیا ہے۔ اور اس کے معنے بعض اہل اللہ نے غلبۂ دین مراد لیا ہے۔ یعنے حضور کی برکت سے کفر کمزور اور اسلام غالب ہوگا۔ جس سے وعدہ خلافی جھوٹ بولنا۔ بدی کی حمایت۔ ظالموں کا ظلم۔ ضعیفوں کا ستایا جانا۔ مظلوموں کی دل آزاری۔ بیواؤں پر بیدردی سب مٹ جائیں گے۔ اور تمام ادیان پر حضور کے دین اسلام کو غلبہ ہوگا ؛

حضور داعیؐ ہیں: یعنے وہ اللہ کی جانب بلانے والا اور روح الحق جس کا عام منصب ہی تمام سچائیوں کی طرف دعوت دینا تھا۔ جس کے حیات افزا اور زندگی بخش پیغام سے بے شمار مردہ دل اور مردہ روح زندہ ہوئے اور ہمیشہ رہتی دنیا تک ہوتے رہیں گے۔ اس کے بیان کی فصاحت خوش بیانوں پر بھی وجد طاری کرتی تھی اور زبان کی طلاقت آنکھوں سے نیر جاری۔ اس کی نظر کی احساس آفرینی دلوں کو درد آشنا اور کلام کی بلاغت کفار کو باخدا کرتی ؛

حضور سراجؐ ہیں: جن کا وجود مقدس کمالات انسانی کا وہ روشن چراغ تھا جس نے ظلمتکدۂ دنیا میں اپنی ضیا پاشی سے تمام اجسام کی جسمانی و روحانی تاریکیوں کو دُور کر کے اس قابل بنا دیا کہ وہ رب العزت کی تجلیات سے کسب ضیاء کر سکیں اور اس سے لو لگا سکیں ؛

حضور رشیدؐ ہیں: جن کی ذات ستودہ صفات سے تمام جہان والوں پر وہ رشد و ہدایت کے دروازے کھلے جو ساڑھے تیرہ سو سال سے لیکر آج تک بند نہیں

ہوئے۔ جب تک یہ دنیائے کون و فساد قائم ہے بند نہیں ہونگے کیونکہ حضور کی طرف سے لوگوں کو جو محبت و اخلاص۔ امن و سلامتی نیکی و پاکیزگی۔ توحید پرستی و علم پروری۔ راست بازی و اخوت نوازی۔ رواداری و عدل گستری اور پارسائی و تقویٰ کی دعوت دی جا چکی ہے۔ دنیا والے بالواسطہ یا بلاواسطہ قیامت تک اسی سے مستفیض اور مستفید ہوتے رہیں گے۔ اور یہی اس کے رشید ہونے کا ابدی اقتضا ہے۔

حضور منیرؐ ہیں:۔ جنہوں نے تمام کائنات رنگ و بو کو ایسا روشن فرمایا کہ فضائے ہستی اس شعلۂ طور سے وادیٔ ایمن بن گئی۔ اور اپنی ضیا باری کا وہ جلوہ دکھایا کہ نور ازل جھلکی ہوئی مخلوق کے قلوب قاسیہ میں بھی لہریں لینے لگا۔ اور صرف اپنی قلوب کو نہیں بلکہ ان کے تمام ماحول کو بھی منور فرمایا۔

حضور بشیرؐ ہیں:۔ یعنے فرمانبرداروں کو اُن کے حق وصلہ کی اور نافرمانوں کو اُن کے ابدی و سخت عذاب کی خوشخبری دینے والے ہیں۔ جو ایک ہادی کے اوصاف میں لابدی وصف ہے کہ جس جماعت یا قوم کی جانب آئے اپنی ہدایت کے قبول کرنے یا ٹھکرانے والوں کو اُن کی آخری منزل کا پتہ دے۔ اسی لئے آپ نے اہل ایمان کو خوشخبری اور بشارت دی۔ اور بے ایمانوں و نافرمانوں کو ابدی عذاب جہنم کا مژدہ سنایا۔

حضور نذیرؐ ہیں۔:۔ کہ حق بات کہکر کو ڈرائیں تاکہ وہ گمراہی اور بداعمالی کی جزا سے بچ جائیں۔ چنانچہ حضور نے عرب کے نفس پسندوں۔ بت پرستوں اور خونخوار وحشیوں کو یہ کہکر ڈرایا کہ تمہارے بت تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ یہ جہنم کا ایندھن ہیں ان کو چھوڑ دو اور ایک خدا کی

پرستش کرو۔

حضور ہادی ہیں:۔ جن کی ہدایت کا مخاطب ہر ذرہ کائنات ہے۔ اس لئے کہ آپ کی ہدایت تامہ ہر اسود واحمر سرزرد وسفید کے لئے قیامت تک کو حاوی ہے۔ اس جہان میں جس قدر ہادی آئے اِن کا دائرہ ہدایت اُن کی تعلیم کے ماتحت ایک ایک قوم۔ ایک ایک گروہ یا جماعت کے لئے محدود تھا۔ مگر حضور کافۃً للناس کے لئے یوم محشر تک غیر محدود دائرہ رکھتے ہیں۔ نہ تعیین تعلیم۔ نہ تعیین وقت۔ نہ تعیین قوم۔ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا اسی ہادی کی شان ہے۔

حضور مُہدی ہیں:۔ یعنے وہ ہدایت والا جس کو ہدایت کی توفیق بھی حاصل ہو۔ اور اس کی ہدایت کے غلغلے عرش وفرش کی پنہائیوں اور سمندر کی گہرائیوں میں ہیجان برپا کر دیں۔ جس پر نظر ڈال دے قطرے کو دریا اور کافر کو باخدا بنادے۔

حضور رسول ہیں:۔ جو مولا کریم کی طرف سے منشاء ایزدی کا مخلوق پر اظہار فرمانے کے لئے بھیجے گئے اور وہ حکم پہنچانے کے لئے تشریف لائے۔ جو آپ کو راہنمائی کی صورت میں پہنچا۔ بحیثیت مستقل کتاب وقانون کے حامل۔ مستقل شریعت میں کامل اور نبوت تامہ کے مالک ہونے کے آپ وہ رسول ہیں جن پر رسالت ونبوت ختم کی گئی ہے۔ اور آپ کے بعد کوئی نبی ورسول نہیں آسکتا۔ آپ کے نقش کی لرزش کو ہمیشگی کی سند حاصل ہے۔ آپ کے ارشاد فرمائے ہوئے جملے آج تک محفوظ ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔

حضور نبیؐ ہیں:۔ جن کا مرتبہ اللہ کریم کے نزدیک نہایت بلند ہے۔ آپ کو علوم غیبیہ پر ایسا مطلع کیا گیا ہے۔ کہ آپ کے اقوال وافعال اور ارشادات واخبار نے لامکان سے تحت الثریٰ اور ان کے علاوہ اسرار الٰہی

و کائنات از ماہ تا ماہی کو طشت از بام کر دیا ہے۔ آفتاب و مہتاب
کو تہ و بالا فرمانا حضور کی نبوت تامہ اور مدارج عامہ کی ایک ادنیٰ
سی دلیل ہے۔ اور حضور ہی وہ نبی غیب داں ہیں جن کی تعلیم کامل
نے امت کے غلاموں کو بھی مغیبات پر مطلع ہونے کا اہل بنا دیا ہے
اور یہی اس نبوت کی خصوصیات میں سے ایک وہ دلیل ہے، جو
ختم نبوت کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے ۔

حضور طٰہٰ اور یٰسٓ ہیں :۔ یعنے یہ وہ راز دارانہ اسمار شافیہ ہیں جن میں محبوب و محب کی
ایسی رموز پوشیدہ ہیں جن کو صرف آپس کی پکار کے لئے خاص کر لیا
گیا ہے۔ غیر کو اس راز داری میں دخل نہیں اور یہ وہ بلندئ تعلق
ہے جو ماقبل میں کسی رسول و نبی۔ جن و ملائکہ کسی کو حاصل نہیں اور مابعد
میں تو یہ اہلیت ہی محال و ناممکن ہے۔ ان تمام اسمار و دیگر حروف
مقطعات کی تاویلات کتب میں مذکور ہیں۔ مگر صحیح حقیقت و علم کو
فرمانے والا ہی جانتا ہے۔ نا اہل اس کو کیا بیان کرے ۔

حضور مُزّمّل ہیں :۔ وہ شہنشاہِ کونین جن کے اختیار میں سب کچھ تھا جو چاہتے کر سکتے
مگر وہ سادہ زندگی بسر کی۔ کہ رب العزت نے ان کی سادگی ہی کی
تعریف فرمانے میں محبوبیت و محبت کا راز منکشف فرمایا۔ اسلام
چونکہ محبوب کی اداؤں ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ اس لئے محبوب
کی کملی پوشی ایسی پسند آئی۔ کہ کملی والے۔ کہکر پکارا۔ اور اس کملی میں
وہ کمال بھرے کہ تمام خدائی کے کمال اسی سے بنائے۔ اور ساری
خدائی اسی کملی پر سے قربان و نثار کر دی۔ اسی کملی کی طفیل تمام
خاصان خدا کو گلیم پوشی۔ مقبولان بارگاہ کو صوف پوشی اور سلاطین
کار فرما کو حق نیوشی نصیب ہوئی ۔

حضور مُدّثّر ہیں :۔ جو خاندان نبوت و رسالت کا آخری تاجدار ہوتے ہوئے اپنی پاک

وسادہ زندگی کا ایک ایک لمحہ آفتاب عالمتاب کی طرح ایسا روشن رکھتے ہیں، جس کی ہر شام صبح کی طرح مسکراتی اور ہر رات دوپہر کی طرح چاک دامن ہے۔ اس نور بار و نور پاش زندگی کی کوئی کرن اور کوئی ادا ایسی نہیں جو اس چادر کی لپیٹ سے نکل کر اہل دُنیا کی آنکھوں کو خیرہ نہ کرے۔ اس لئے محبوب کی ردا پوشی بھی عشاق کی نگاہوں میں مستور فرمادی، تاکہ تخت و تاج کی تمنا نہ رہے ؛

حضور شفیعؐ ہیں :- اور شفاعت کبریٰ کی خصوصیت سے ممتاز ہیں۔ میدان قیامت روز محشر، اعمال کے حساب کا دن۔ جہاں بڑے بڑے اولوالعزم لرزتے ہوں گے۔ وہاں حضور عرش کا پایہ پکڑ کر اور بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہو کر گنہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے ؛ اور اپنی اُمت عاصی کو بخشوائیں گے ؛

حضور خلیلؐ ہیں :- جن کے لئے محبت کے تمام مراتب وقف کر دیئے گئے ہیں۔ وہ ہر میدان ابتلاء میں پورے اترنے والے۔ مغفرت کی حدِ طمع سے باہر، سچی زبان اور سچے کردار کے حامل۔ خداوند جل وعلا شانہٗ کے سوا تمام دنیا و ما فیہا سے علیحدہ، غیر کی پرستش سے دُور رہ کر اپنی خلّت کی حقیقت ان اشارات میں پیش فرماتے ہیں۔ اگر خداوند عالم تو مجھ سے راضی ہے تو مجھے تکلیفوں کی پرواہ نہیں۔ میرے لئے تیرے چہرے کے نور کی پناہ کافی ہے۔ میں اسی پناہ میں آتا ہوں جس کے سامنے ساری تاریکیاں نابود ہو جاتی ہیں۔ اور جس کی بدولت دُنیا اور آخرت کے تمام امور اصلاح پذیر ہوتے ہیں ؛

حضور کلیمؐ ہیں :- حق تعالےٰ نے ان کو اپنی قدرت کا سماں دکھا کر معراج اور ایقان کے بلند درجہ تک پہنچایا۔ یعنے ایک رات کے بعض حصہ میں مسجد حرام سے لیکر بیت المقدس اور پھر وہاں سے اجرام سماوی اور

بہشت و دوزخ کی سیر کرائی اور اسے اپنے قرب میں اس مقام پر بلا کر جہاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی نہیں پہنچ سکا اور نہ کوئی پہنچے گا۔ راز و نیاز کی گفتگو فرمائی اور عالم غیب کے اسرار اُن پر آئینہ کئے ۔

حضور حبیب ہیں ، اور آپ کو رب العزت جل و علا شانہ' نے اپنی محبت کے ساتھ خاص کیا ہے ۔ یعنے حبیب کسی اور کو نہ فرمایا نہ پیدا کیا ۔ حبیب کی شان بلند ۔ وہ ہے جس کی مغفرت میں کوئی کلام نہ ہو ۔ بلکہ حدِ یقین سے بڑھ کر ہو ۔ کیونکہ حبیب اس کی جانب بذاتہ پہنچتا ہے ۔ اور باقی بالواسطہ ۔ اور وہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے ۔ رب العزت کو اس کی مرضی مطلوب ہوتی اور اس کو بغیر سوال کے وہ کچھ ملتا ہے جو باقیوں کو سوال پر بھی ملے یا نہ ملے ۔

حضور مصطفٰے ہیں ، جن کو مولا کریم نے اپنے دیدارِ بے حجابانہ اور مکالمہ بالمشافہ کے لئے ازل سے ہی خاص کر لیا تھا ۔ اُم الکتاب کے پانے اور عرش معلےٰ پر جانے ۔ اللہ کا آخری کلام پہنچانے ۔ حسن بے پناہ کا قدیمی روپ دکھانے ، خلق خدا کو گناہ سے بچانے میں آپ کو ابتدا ہی سے معصوم و مصطفٰے فرمایا گیا گویا حضور جمال ازل کا ایک جلوہ تھے ، جس کی تابش سے پتھروں میں گداز پیدا ہوا اور مشتاقین جمال کے قلوب کو ابد کے نور سے معمور ہونا نصیب ہوا ۔

حضور مرتضٰے ہیں ، اس لئے کہ آپ عالم مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ و جمیع اسرار و علوم ہیں ۔ آپ کا سینہ انوارِ الٰہی کا گنجینہ و معارفِ ربانی کا خزینہ ہے ۔ آپ کے رُخِ انور ۔ پاکیزہ زندگی و مسکن پاک کی اللہ کریم نے قسمیں کھائی ہیں ۔ آپ کا پیشاب پاک ۔ پاخانہ خوشبودار ، پسینہ معطر تھا ۔ آپ کی زبان خدا کی زبان ، آپ کی گفتگو خدا کی گفتگو آپ کا ہاتھ اللہ کا

ہاتھ۔ آپ کا لعاب دہن ہر مرض کی دوا۔ آپ کا بال بال برکت ورحمت اور آپ کا وجود مقدس سراپا برہان تھا۔ ایک ایک عضو میں ایسے الگ الگ اعجاز پوشیدہ تھے کہ منکرین صرف چہرہ انور پر ایک نگاہ ڈالتے ہی کہہ اٹھتے کہ یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ؛

حضور مجتبٰے ہیں:۔ جن کو سَل، تعطٰی، یعنی مانگ جو مانگے گا دیا جائے گا کے مشرف اجابت سے نوازش فرمائی گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ اللہ تعالےٰ کے نزدیک تمام انسانوں میں مکرم اور تمام انبیاء علیہم السلام میں معظم ہیں ؛

حضور مختار ہیں:۔ ہر اس معاملہ میں جو رب العزت کی طرف سے آپ کو بحیثیت محبوب ودلیعت ہوا۔ جس کو چاہا جنتی فرمایا اور جسے چاہا جہنمی کر دیا۔ اور اس کی بے شمار مثالیں تو آیات و احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ استن حنانہ کا جنت میں گاڑ دینا۔ اکیلے حضرت خزیمہ کا دو گواہوں کے برابر گواہی میں فرمانا۔ (ایک صحابی کو جو مانگتا ہے مانگ لے) کے اختیارات سے اجازت فرمانا۔ چاند کے دو ٹکڑے کر دینا۔ غروب سورج کو لوٹانا۔ آپ کے اختیارات کے معمولی دلائل میں سے ہے۔ کیونکہ حضور صاحب امر ونہی ہیں۔ اور حضور کے سوا بفضلہ تعالیٰ جہان میں اور کوئی مختار و حاکم نہیں ہے ؛

حضور ناصر ہیں :۔ جو خدمت میں آیا۔ جو کچھ کسی نے مانگا۔ جس قسم کی مدد چاہی سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم نے دل کھول کر فرمائی یہاں تک کہ مدد مانگنے والا مدد کے بار سے عاجز آگیا۔ ظاہری و باطنی حاضر و غیر حاضر، قرب و بعد، زمانہ حیات ظاہری اور وقت

نقل مکانی میں حضورؐ یکساں امداد فرماتے ہیں، جیسے کوئی مانگے
ویسے ہی عطا ہوتا ہے۔ اور ان کیفیات میں سرِ مو مبالغہ کو دخل
نہیں، اور اس کی اس قدر مثالیں احادیث میں موجود ہیں، جنکو
شمار کرنا محالات سے ہے۔

حضور منصورؐ ہیں: یعنی حضور ایسے منصور (مدد دیئے گئے ہیں) کہ گویا کوئی ایک
کام بھی دینی و دنیوی ایسا نہیں، جس میں رَبُّ العزت کی نصرت
حضور کے شاملِ حال نہ ہو، بلکہ یوں کہیئے کہ حضور کی زندگی کا ایک
ایک لمحہ اسی نصرت کے سائے میں بسر ہوتا ہے، بلکہ سرکار کی
ذات بابرکات ہی اول سے آخر تک مجسّم نصرتِ الٰہی تھی جس کا
ایک پہلو وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ تھا، یہی وجہ تھی، کہ
اعدا کی تمام تر قوتیں مٹ گئیں، مگر حضور کا ایک بال بیکا نہ ہوا۔

حضور قائمؐ ہیں: آپ کے نزدیک ہر ایک حال کی تیاری اور قائمی تھی، حق
سے قصور نہ کرنا اور غیر حق کی طرف تجاوز نہ فرمانا۔ حضور کا شیوہ
تھا۔ آپ کی نشست و برخاست، رفت وگذشت، گفت و شنید
غرضیکہ ہر حال و قال خداوند عالم جل مجدہٗ کے ذکر پر ہوتا تھا
آپ کسی جگہ کو وطن معتین نہ فرماتے بلکہ وطن بنانے سے منع
کیا جاتا۔ ہر ہمنشین کو اس کا نصیب عطا فرماتے۔ یہاں تک کہ
ہر ایک کو یہی خیال ہوتا۔ کہ حضور کے نزدیک مجھ سے بڑھکر دوسرا
کوئی مکرّم نہیں۔ جو کوئی کسی کلام یا کام کے لیے حضور کے ساتھ
یا سامنے کھڑا ہوتا حضور اس وقت تک صبر فرماتے جب تک کہ
وہ خود اجازت طلب کرے۔ آپ کا ہاتھ اور خلق تمام لوگوں پر
وسیع تھا۔ آپ کی مجلس حلم وحیا اور صبر و امانت کی مجلس ہوتی
جس میں بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر رحم کیا جاتا۔ اہلِ حاجت

ہمیشہ بامراد جاتے کسی کو نا اُمیدی نہ ہوتی۔ آپ کسی کی مذمت نہ فرماتے، عیب نہ ڈھونڈھتے اور شرم و عار نہ دلاتے تھے۔ آپ کو کسی شئے نے کبھی غضبناک نہیں کیا جو آپ کو ہلکا کر دے اور گھبرا ڈالے۔ اُمت کے لئے ہر اس بات پر قائم ہوتے جس سے ان کی دنیا و آخرت درست ہو۔

حضور حافظ ہیں:۔ جو اپنے اخلاق حمیدہ و فضائل مجیدہ میں وہ وسعت رکھتے ہیں، جن کے بیان کے اختتام سے پہلے دلائل منقطع ہو جاتے ہیں۔ آپ کا خوف الٰہی، آپ کی عبادت۔ آپ کی شفقت آپ کی ہر امر میں حفاظت اس قدر تھی جس قدر کہ آنکھ رُبّ ہونے کا قرب اور علم تھا۔ آپ اس قدر نماز پڑھتے کہ آپ کے قدم مبارک متورم ہو جاتے اور آپ کا ہر عمل بطور دوام کے ہوتا تھا۔

حضور شہید ہیں:۔ جن پر حقائق مخفیہ کو آشکار فرمایا گیا۔ اور سب پر گواہ رکھا گیا حضور نے اپنی وفات سے بیشتر لکھو کھہا بندگان خدا کو نہ صرف اس شہادت پر قائم کیا بلکہ آئندہ نسلوں پر گواہ بنا دیا۔ بلا شبہ حضور رب العزت کی طرف سے شاہد ہیں۔ تاکہ قیامت کو سب پر گواہ ہو سکیں۔ قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں جب انبیاء اور امتوں میں جھگڑا ہوگا۔ اُمتیں اپنی معصیت کاری پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس کوئی داعی الی اللہ نہیں آیا تو اور انبیاء علیہم السلام فرمائیں گے کہ ہم گئے۔ اس وقت اُن پر حجت قائم کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ گذارا جائے گا۔

حضور عادل ہیں:۔ جو وعدے کے پکے۔ قول کے سچے۔ نیکوں کے طرفدار۔ بے کسوں کے دستگیر، ضعیفوں کے سہارے۔ مظلوموں کے چارے۔ یتیموں

اور بیواؤں کے ہمدرد تھے۔ وہ عزت وخودداری، عزم و استقلال، اور عظمت و وقار کے پیکر، عدل وانصاف کے معاملے میں اپنے بیگانے کی تمیز نہ کرتے تھے۔ جہانِ ظلم میں وہ عدالت قائم فرمائی، جس کی کوئی ایک مثال دُنیا بھر میں ملنی مشکل ہے۔ جس نے اس کی عدل گستری کو دیکھا مسحور ہوگیا، اور جس نے اس کے سمجھنے کی کوشش کی وہ فدائی بن گیا :

حضور حکیم ہیں :- جبکہ تہذیب و تمدن، علم و حکمت، موت کی نیند سلائے جا چکے تھے حضور نے خود ہر قسم کی تربیت و تعلیم ظاہری سے محروم رہنے کے باوجود اہل جہان کو علم و معرفت اور عقل و حکمت کے وہ رموز بتائے جو محفل علم و حکمت کے صدر بنگئے اور تمام دنیا کے عقلاء و حکماء ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے پر مجبور ہو گئے :

حضور نُور ہیں :- اور وہ نورِ خدا ہیں جو سب سے پہلے پیدا ہوا اور باقی کائنات حضور کے نور سے پیدا فرمائی گئی۔ گو حضور کی ذات گرامی بادی النظر میں پوست و گوشت اور استخوان و عصاب سے مملو نظر آتی تھی۔ انسان تھے اور انسانوں کی طرح رہتے سہتے چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے تھے مگر تھے پیکر نور، سراپائے ضیاء، مجسمۂ جمال۔ ایک خاکی غلاف تھا جو لبشریت کے نام سے اس نور یزدانی پر پڑا ہوا تھا۔ اہل نظر اس کالبد خاکی میں ضیاء و نور کی تجلیاں مشاہدہ کرتے تھے اور عوام بھی یہ معلوم کرتے اور دیکھتے تھے کہ عام انسانوں کی طرح حضور کا سایہ نہ تھا۔ آفتاب و ماہتاب کی روشنی میں آپ کا کوئی عکس زمیں

پر نمایاں نظر نہ آتا تھا۔ اور نہ ہی آسکتا تھا۔ کیونکہ نور کا سایہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کا ظاہر نور۔ باطن نور۔ سینہ نور۔ دل نور دماغ نور۔ جسم اطہر نور۔ غرضیکہ سرتا پا مجسم نور تھے۔ اور یہی وہ نور تھا جو تخلیق عالم سے پیشتر ایک نامتناہی زمانہ تک عرش ربانی پر جلوہ گستر رہا اور ملاء الاعلیٰ کی پہنائیاں اور فضائیں اس سے بقعۂ نور بنی رہیں۔ ملائکہ اس کا طواف کرتے اور پروانہ وار نثار ہوتے رہے۔ پھر اسی نور کی بدولت نیابت الٰہی، وراثت ربانی اور خلافت ایزدی کی تمام نعائم معرض وجود میں آئیں اور یہی نور ولقد کرمنا بنی آدم کے خطاب کی تخلیق کا باعث بنا۔ اور اسی نور کے ماتحت حضرت آمنہ کی گود کو چار چاند لگے۔ جس نے اسی کی بے پناہ روشنی میں شام وروم کے مکانات کا نظارہ کیا۔ اور مشرق و مغرب کی فضائیں منور دیکھیں ؛

حضور حجتہ ہیں:۔ اور خداوند جل مجدہٗ کی ہستی پر سب سے بڑی حجت ہیں جنکے مقابلے میں باقی تمام دلائل ہیچ ہیں، حضرت سراج الاُمت سند الفقرا، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے (جب ہستی باری تعالیٰ کی پرستش پر آپ پر اعتراض کیا گیا) تو کیا خوب جواب فرمایا کہ من بایں طور خدارا مے شناسم کہ خدائے محمد است۔ یعنے خداوند جل وعلا شانہٗ کو میں اس طریق پر پہچانتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا ہے ؛

حضور سُبرہان ہیں:۔ کوئی بصارت وبصیرت رکھنے والا انسان اگر حضور کے تمام مراتب مخصوصہ وجملہ اوصاف مدحیہ کا مطالعہ کرے تو اس پر خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ کہ حضور سرتا پا بُرہان ہیں۔ اور آپ کا بال بال برکت ورحمت ہے۔ آپ کو اہل معصیت کے لئے

چراغ ہدایت اور اہل تقوے کے لئے مشعل راہ بنا کر مبعوث فرمایا گیا ہے۔ مخالفین و معاندین اور معترضین و منکرین نے آزمائش و ابتلاء کے جس پہلو سے حضور کو پرکھا ہر لحاظ سے اپنے دعوائے نبوت و رسالت کی ایک بولتی چالتی دلیل پایا۔ جس کا نہ کوئی جواب ہوا نہ ہو سکتا ہے ؛

حضور ابطحی ہیں :۔ یعنے بطحا کے ساکن۔ گویا حضور ایسے شہر ایسے مقام میں رہنے والے ہیں جس کی تقدیس و بزرگی پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں اور نہ اس میں کوئی امر مشکل و مخفی ہے۔ آپ سابق سکونت و رہائش کے لحاظ سے مکی اور مابعد کی ابدی زندگی کے لحاظ سے ابطحی ہیں۔ جن کی فضیلت خدا کی تمام نیک مخلوق کے نزدیک زیادہ مکرم و مسلم ہے۔ حضور فرماتے ہیں، خدا نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مجھ کو ان کے بہتروں میں رکھا۔ پھر بہتر افراد میں سے قبائل کو پسند فرمایا۔ تو مجھے بہتر قبیلہ میں پیدا کیا۔ پھر گھروں کو پسند فرمایا تو مجھ کو بہتر گھر میں رکھا ؛

حضور مومنؐ ہیں :۔ یعنے امن و امان والے۔ تاریخ شاہد ہے کہ غلاموں پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ انسانیت تذلیل کے انتہائی درجہ پر پہنچ چکی تھی اور اس سے وہ وحشیانہ سلوک ہو رہا تھا کہ رُوح لرز اٹھتی ہے۔ مگر اس امن و امان کی سرکار نے اور مساوات کے پیغمبر نے ہر ذلیل و غلام مخلوق کو وہ آزادی کا منشور اعظم عطا فرمایا کہ ان کو تاج و تخت کا مالک بنا کر شرف و مجد کی مسندوں پر بٹھا دیا ؛

حضور مطیعؐ ہیں :۔ جن کے نقشِ قدم کو وہ ثبات نصیب ہوا۔ کہ جن کے فرمودہ رستے پر چلنے والا کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ اور خدا کے ایسے فرمانبردار کو ان کی اطاعت میں اللہ تعالےٰ کی فرمان پذیری پنہاں ہے ؛

حضور **مُذکّر** ہیں ۔ جنہوں نے اپنے خالق و مالک خدا وحدہٗ لاشریک کا پیغام پہنچانے اور بھٹکی ہوئی مخلوق کو اس کا دروازہ دکھانے کے لئے نہایت بے بسی کی حالت میں تن تنہا وہ پند ونصائح کے دریا بہائے کہ قوم کو باوجود اختلاف کے اس کے حضور میں جھکنا اور صداقت کو تسلیم کرنا پڑا ۔ اور حضور نے اس بے ریائی سے اپنے فریضۂ منصبی کو ادا فرمایا ۔ کہ اپنی بیٹی تک کو عملی زندگی بہتر بنانے کی ٹھوس تلقین کر دی ؛

حضور **واعظ** ہیں ۔ جن کی زندگی کا علم وعمل دونوں برابر تھے ۔ جو فرماتے اس کا عمل پہلے آپ میں موجود ہوتا ۔ یعنے آپ کا قال حال کے مطابق تھا ۔ آپ دنیا میں تھوڑے پر قناعت کرتے ۔ ہر حال میں عقبےٰ کو ترجیح فرماتے ۔ دُنیا کی بناوٹ اور خوبصورتی سے اعراض فرماتے ۔ کبھی پیٹ بھر کھانا نہ کھاتے ۔ روزہ کو محبوب رکھتے ۔ ساری رات یا اس کا اکثر حصّہ بیدار رہتے ۔ اور اللہ تعالیٰ کی بندگی و شکر گذاری کو آرام اور تن آسانی پر پسند فرماتے ؛

حضور **امینؐ** ہیں ۔ جن کا بچپن معصوم ، جوانی بے داغ ۔ اور تمام زندگی ایسی صاف اور پاکیزہ تھی ۔ کہ دوست تو کیا کوئی دشمن بھی اس پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کر سکتا ۔ ابوسفیان جیسا دشمن اسلام عرب سے باہر ایک غیر سلطنت کے دربار میں کھڑا ہو کر آپ کے حالات بیان کرتا ہے تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکلتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر پہلو میں امین ہے ۔ اس میں کوئی اخلاقی کمزوری نہیں حضور کی دیانت وامانت پر قوم کا یہ اعتماد ہے ۔ کہ اپنی قیمتی اشیائ اس کے پاس امانت رکھتی ہے ۔ اور محفوظ واپس لیتی ہے ۔ آپ نے جس دیانت داری کے ساتھ وحی آسمانی کی دولت سرمدی

دوسروں تک پہنچائی اس پر قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے۔ کہ وہ نبوت سے پہلے بھی تو تم ہی میں رہتا تھا کیا اسنے کبھی جھوٹ بولا یا کسی کا نام لیا۔ جو بندوں سے جھوٹ نہ بولے وہ خدا پر کیونکر افترا باندھیگا۔

حضور صادق ہیں، آپ کی زندگی بعثت کے بعد جن زہرہ گداز مظالم میں گھری رہی۔ اور اِن کا مقابلہ جس فوق العادۃ استقلال وثبات کے ساتھ حضورؐ نے کیا۔ حقیقتاً وہ ایک صادق ہی کا کام تھا۔ ورنہ تمام شیطانی قوتیں جب اپنے ابلیسی جنود اور تمام ہولناکیوں کے ساتھ سچائی کو مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں تو وہاں جھوٹے اور ریاکار و مکّار کا کیا قیام کہ مقابلہ کرسکے۔ پتھر برسائے گئے۔ آب و دانہ بند کیا گیا۔ گرم ریت پر لٹایا گیا۔ قتل کے منصوبے کئے گئے۔ اور لالچ دیئے گئے پھسلایا گیا۔ ستایا گیا۔ بہکایا گیا۔ بڑے بڑے توبہ شکن حُسن اور بڑے بڑے استقلال سوز جواہرات دکھائے گئے۔ مگر وہ نبوت صادقہ کی چٹان صد ہزار تموّج میں بھی نہ ہلی۔ اور اپنی صداقت پہ قائم رہی۔ اور اس کے اس قیام نے نہ صرف چراغِ توحید کو بجھنے سے بچا لیا۔ بلکہ ساری دنیا کو ایک اَن دیکھے خدا کی پرستش پہ مائل کر دیا۔

حضور مُصدّق ہیں، آپ نے اپنی سچائی کے ماتحت انسانوں کو اس دُنیا میں رہنے سہنے کے قابل بنا دیا۔ اُن کے قلوب قاسیہ کو روشن کر کے بالکل خدا کے سامنے کر دیا۔ سیاست کی بساط اُلٹ گئی۔ امن عامہ کا اعلان ہو گیا۔ غیر الٰہی غلامی سے نجات مل گئی۔ اور کسی کے دل میں خدائے وحدہٗ لاشریک کے خوف کے سوا کسی کا ڈر نہ رہا۔

حضور ناطق ہیں :- جن کے متعلق قرآن کریم گواہ ہے کہ کبھی خدا کی مرضی کے
بغیر اور اپنی خواہش کے ماتحت کلام ہی نہیں کرتے ۔ جب
اس نے بولنے کا ارشاد فرمایا بولے جب سکوت کا حکم ہوا
چپ ہوگئے۔ بے زبان جانوروں نے اس سے اپنے دکھ کی
کہانیاں سُناکر نفع پایا۔ اور بے جان اشیاء نے اُس کے
پاکیزہ نطق کی بدولت خدا سے شرف ہمکلامی حاصل کیا۔ یہاں
تک کہ دُنیا کی کوئی شئے اس کی رحمت سے محروم نہ رہی ؛

حضور صاحب ہیں :- اور ہر ایک کے صاحب ۔ اور ہر بات میں ممتاز و اشرف
ہیں ۔ عربی ہوں یا عجمی حضور اصل و شرافت و نسب میں سب
سے زیادہ پاکیزہ و افضل ۔ عقل و حکمت میں غالب
یقین و ارادہ میں قوی ۔ مہربانی اور رحم میں سب سے بڑھ کر
روح و جسم میں نفیس تر اور بے عیب ۔ عیب و نقص و
خامی و کمزوری اور عصیان و طغیان و عار و خار سے صاف
ہیں ۔ انبیاء کے صاحب ۔ صدیقین کے صاحب ۔ شہدا کے
صاحب اور صالحین و مومنین کے صاحب ۔ ملائکہ کے صاحب
جنات کے اور جنات کے صاحب ۔ شجر و حجر ۔ چرند و پرند ۔
ارض و فلک ۔ غرضیکہ بعد از خدا حضور ساری کائنات کے
صاحب ہیں ؛

حضور مکّی ہیں :- یعنے مکّہ مکرمہ آپ کی جائے ولادت ہے ۔ جو رب العزت
کے نزدیک مقدّس ہونے کے علاوہ ساری کائنات کا روحانی
اور جغرافیائی مرکز ہے ۔ یہ وہ شہر ہے جسے دنیا بھر کے
شہروں کے مقابلے میں امنیت کی ڈگری دی گئی ہے ۔ اور
جہاں پر خدا کے سچے احکام کی ماتحت انسان تو انسان سبھی

کسی حیوان پر بھی ظلم و ستم اور قتل و نہب روا نہیں رکھا گیا۔
اور یہی وجہ اس کے بلدالامین ہونے کی ہے۔ جس کی خداوند
عالم نے بطریق احترام قسم کھائی ہے۔ اور تعریف فرمائی ہے:

حضور مدنی ہیں:۔ مدینہ طیبہ میں سکونت فرمانے والے۔ ہجرت کرنے والے
اور مدنی لوگوں کو اپنی رحمت اللعالمینی سے سرفرازی بخشنے
والے ہیں۔ اس مقام کو بھی حرم شریف ہونے کی وہی
حیثیت حاصل ہے جو مکّہ مکرمہ کو ہے۔ مسجد حرام میں نماز
کا ثواب اگر ایک لاکھ نماز کا ہے تو مدینہ منوّرہ مسجد نبوی
علیہ السّلام میں پچاس ہزار نماز کا۔ شب معراج میں جبرائیل
علیہ السلام نے اسی شہر کی حرمت کے لئے حضور علیہ السّلام
سے دو نفل پڑھوائے۔ اور بعض علمائے کرام و عاشقان
ذی الاحترام نے تو لکھا ہے کہ یہ حرم وفضل ہے۔ اور
حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا جسم اطہر جس آخری آرام گاہ
کی مٹی سے مس فرما رہا ہے وہ عرش اعظم سے زیادہ مرتبہ
رکھتی ہے:۔ ع

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ مے آید جنید و بایزید اینجا

حضور عربیؐ ہیں:۔ اور اسی نسبت سے ہر عقیدت مند آنکھ خاک عرب کو
محبت کی نگاہ سے دیکھتی ہے بطحےٰ کا ذرہ ذرہ اسی ذات گرامی
کے سبب سے آفتاب جہانتاب نظر آتا ہے۔ فرشتے حضورؐ کے
مطلع پر انوار الٰہی کے روشن طبق لے کر اترتے ہیں تو عشاق آپکی
آرامگاہ پر اپنی جانوں کو نچھاور و قربان کرتے ہیں۔ مکّہ و مدینہ
کی گلیاں سرکار کی ضیا پاشیوں سے ایسی بقعۂ نور بن گئی ہیں

کہ رب العزت بھی پیار سے ان کی قسم کھاتا ہے۔ غرضیکہ
عرب روحانیوں کی نگاہ میں ہزار حسن اور لاکھ جلووں کی
جنت گاہ ہے ؛

حضور ہاشمی ہیں: جو عرب میں ایک مشہور ترین باوقار، سلیقہ شعار، حیادار
اولوالعزم قبیلہ تھا۔ عادات عالیہ اور تہذیب متعالیہ اس کی
ادنیٰ خصوصیات سے تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ رب العزت
جل وعلا شانہ نے نور محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اسی اعلیٰ
گھرانے میں چمکایا۔ کیونکہ یہ نور اگر کسی ادنےٰ یا متوسط خاندان
میں جلوہ گستر ہوتا تو عرب کے شرافت پرست لوگ زبان طعن
دراز کرتے۔ حضورؐ کے مورث اعلیٰ حضرت ہاشم تھے۔ جو مکہ مکرمہ
میں بالخصوص اور تمام ملک عرب میں بالعموم سب سے زیادہ
با اثر، ذی اقتدار، پرشکوہ واحتشام، ذی عزت، اور جری
النسان تھے۔ شاہ حبش سے میل ملاپ اور حجاج کی میزبانی
اُن کی ظاہری اولوالعزمی و ہوشمندی کی ایک چھوٹی سی دلیل
ہے۔ انہی حضرت ہاشم کے اسم گرامی پر حضور علیہ السلام کی
نسبت خاندانی ہاشمی ہے ؛

حضور تہامیؐ ہیں: جو بلندیٔ نسب اور علوِ خاندان کے لئے ایک نمایاں وصف
ہے۔ اور محاسن و مدارجِ رسالت کے ساتھ کسی دوسرے کو
حاصل نہیں ؛

حضور حجازیؐ ہیں: جن کی طفیل حجاز مذہبی مرکز اور مرجع خلائق بن گیا۔ اور
جس کی عظمت کا سبب صرف حضور علیہ السلام کی ذات ہے

حضور نزاری و قریشیؐ ہیں: یعنے حضور علیہ السلام کے مورث اعلیٰ حضرت سیدالانبیاء
وسیدنا ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اور آپ کا ہی سلسلہ نسب طرح

حضور تک پہنچتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السّلام کے بارہ بیٹے تھے، جن میں سے ایک کا نام قیدار تھا۔ اور ان قیدار کی اولاد میں عدنان تھے۔ جن کی اولاد تمام حجاز پر چھا گئی۔ اس اولاد میں بھی خاندان نبوی کو ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ایک امتیاز رہا۔ وہ شخص جس نے سب سے پہلے اس خاندان کو قریش کے نام سے ملقب کیا۔ نضر بن کنانہ تھا۔ نضر کے بعد فہر، قصی بن کلاب کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ اور اسی قریش کے لقب کے سبب حضور کو قریشی ذکر کیا جاتا ہے، کیونکہ انہی کی اولاد سے چند پشتوں میں آپ کے جد امجد تھے ؛

حضور مُضری ہیں :۔ جو اپنی عالی نسبی میں ممتاز ہیں ؛

حضور اُمّی ہیں :۔ جنہوں نے اپنی سعید فطرت کے ماتحت قدرت کے مکتب میں تعلیم حاصل کی اور جن کی ابتدائی و انتہائی تعلیم کا کالج خدا کا دربار تھا۔ کسی استادِ علم و فن کے سامنے تعلیم حاصل کرنے کیلئے زانوئے ادب تہ کرنے سے رب العزّت نے محفوظ رکھا کیونکہ جو خود تعریف کیا جانے والا ہو۔ اس کے مقابلے میں سے کوئی اور بلندی (جہاں وہ جھکے) اس کی توہین ہے۔ گو حضور ظاہری اُستاد نہ رکھتے تھے اور ہر قسم کی تعلیم و تربیت سے محروم رہے۔ مگر اپنے غلاموں اور پیروؤں کو وہ علوم سکھائے۔ کہ ان پر مستقل ترقی کے دروازے کھل گئے۔ کائنات بھر کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو کر مصروف عمل ہو گئیں۔ اور متلاشیانِ حق کو وہ عرفان عطا کیا کہ ماسوی اللہ کا خوف خود بخود دلوں سے دُور ہو گیا۔ کیا شان ہے اس اُمّی ہونے کی، جس کی ذات نے علم و کمال کے دریا بہا دیئے اور جہاں بھر کے اہل علوم دلوا نے بنا دیئے ؛

حضور عزیز ہیں:- جن کو ہر حال میں غلبہ ہوا۔ اور جن کی پیدائش ہی غلبہ کیلئے تھی۔ آپ کی کامل عقل و ذکاوت۔ قوت حواس۔ قبول دعا۔ فصاحت زبان۔ اعتدال حرکات۔ حسن شامل۔ خلق عظیم۔ تدبّر ات عامہ و خاصہ۔ زیادتی علم الٰہی وہ خصائص ہیں۔ جن کو شرع نے ثابت کیا ہے۔ اور جن کے غلبہ میں بمقابلہ عوام اہل جہان کے کوئی شبہ نہیں۔ ایک صحابی وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ میں نے سابق انبیاء علیہم السّلام کی منزّل من اللہ اکہتر (۷۱) کتابوں میں پڑھا ہے۔ کہ نبی آخرالزمان محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ افضل۔ عقلمند اور سب پر غلبہ ظاہری و باطنی رکھنے والے ہوں گے۔ کیونکہ حضور کو جوامع الکلم۔ لواء الحمد۔ مقام محمود۔ دشمنوں پر دو ماہ کی راہ پر غلبہ۔ اور تمام زمین مسجد برائے عبادت الٰہی۔ شفاعت کبریٰ و حوض کوثر سے سرفراز فرمایا گیا ہے۔

حضور حریص ہیں:- کیونکہ حضور کو ہر اس شخص پر ایمان لانے کی حرص ہے۔ جو خدا کی نافرمانی سے اپنے آپ کو عذاب الٰہی کا مستحق بنالے۔ اور آپ کو ہمیشہ وہ باتیں ناگوار معلوم ہوتیں جو اُمت کو دُکھ دینے والی ہوں۔ آپ تکلیف دینے والوں اور دشمنوں کے لئے بھی یہ دُعا فرمایا کرتے کہ الٰہی ان کو ہدایت کر تاکہ یہ مجھے پہچان کر اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچالیں۔ اور آپ نے کبھی کسی کے لئے بد دعا نہیں فرمائی۔

حضور رؤف ہیں:- جو اُمت کے لئے انتہائی شفقت فرماتے۔ کسی کو کوئی تکلیف ہوتی تو آپ اُس سے زیادہ اس کی تکلیف کو خود محسوس فرماتے۔ یہاں تک کہ کسی بچے کا رونا۔ کسی غریب کی غربت۔ کسی مسافر کی تنگی۔ کسی قرضدار کی قرضداری آپ کو بے چین کر دیتی۔

اگر حضور کسی بچے کے رونے کی آواز سُنتے تو نماز کو مختصر فرما دیتے رات کی نماز۔ وصال کا روزہ۔ تراویح۔ تہجد۔ ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنا۔ وغیرہ اعمال کے متواتر کرنے سے لوگوں کو بچا دیا۔ تاکہ فرض نہ ہو جائیں۔ آپ نے دُعا فرمائی۔ کہ مولا کریم میری گالی اور لعنت کو اگر میں کسی کے حق میں کروں۔ تو تُو اُنکو اُن کے لئے رحمت فرمادے۔ آپ اپنے ہر مخالف کو توبہ کیلئے ڈھیل دیا کرتے۔ ظالموں نے طرح طرح کی ایذائیں دیں۔ مجنون اور دیوانہ کہا۔ جسم اطہر پر نجاست پھینکی۔ آب ودانہ بند کر دیا۔ شعب ابو طالب میں محصور رکھا۔ راستے میں کانٹے بچھائے۔ گلے میں پھندے ڈالے۔ پتھر برسائے۔ دانت مبارک شہید کئے گھر اور وطن سے نکالا۔ مگر حضورؐ کی جبین اقدس پر شکن تک نہ آیا اور ہر وقت ایسے لوگوں کے لئے رحمت ہی طلب کی۔ اور اپنے رحمت مجسم ہونے کا ثبوت دیا۔

حضور رحیم ہیں: جنہوں نے ہر دشمن پر رحم وکرم فرمایا۔ اور کسی سے کسی کے ظلم کا کبھی بدلہ نہیں لیا۔ ہبار ابن الاسود جس نے حضور کی لختِ جگر سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو نیزہ مار کر شہید کیا۔ حضرت حمزہ کا قاتل وحشی۔ آپ پر حملہ کرنے والا دعثور جادو کرنے والا لبید بن الاعصم۔ گوشت میں زہر دینے والی یہودیہ عورت عبداللہ بن ابی منافق وغیرہ وغیرہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال قابل بخشش نہ تھے۔ مگر حضور نے باوجود مقدرت وطاقت کے سب پر رحم فرمایا اور معاف کر دیا۔ اور ساتھ ہی مخالفین کیلئے ہمیشہ دعا فرمائی۔ کہ اللہ کریم ان کو شناخت کی آنکھیں عطا فرما تاکہ یہ مجھے پہچان جائیں۔

حضور یتیم ہیں:- یتیمی کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ یتیموں کی سرپرستی فرماکر انہیں دُرِّیتیم بناتے ہیں۔ اور معاندین کے اسی اعتراض کی جڑ پر کلہاڑی چلاتے ہیں۔ کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ اگر اسلام کی اشاعت کے لئے تلوار ضروری ہوتی۔ تو وہ بجائے ایک یتیم کی تولیت و سرپرستی کے کسی سلطنت و سلطان کے ہاں ظہور فرماتا۔ اور تیغوں کے سائے میں اپنی نشوو ارتقا کی بنیاد رکھواتا۔ کاش کہ سطحی نظر رکھنے والے معترضین اس یتیم کے دنیا میں اسلام پھیلانے اور لانے کی حقیقت کو سمجھتے ۰

حضور غنیؐ ہیں:- اور ایسے غنی جو دوسروں کو غنی فرما دیتے ہیں۔ جیساکہ قرآن کریم میں ہے۔ کاش کہ وہ راضی ہوتے اسپر جو دیا ان کو اللہ تعالےٰ نے اور اللہ کے رسول علیہ السّلام نے۔ پھر دوسرے مقام پر فرمایا۔ کہ اللہ تعالےٰ نے ان کو غنی کیا اور اللہ کے رسول کریم نے غنی کیا۔ گویا حضور خود غنی اور مستغنی عن الخلق ہیں۔ اور حضور کو خزائن الٰہیہ کی کنجیاں دی گئیں ہیں۔ مولاکریم کے خزانۂ جود وکرم سے جو کچھ کسی کو ملتا ہے۔ اس کی کُنجیاں حضور ہی کے ہاتھ مبارک میں ہیں۔ حضرت انس فرماتے ہیں۔ کہ حضور سب سے بہتر سب سے بہادر اور سب سے سخی تھے۔ آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اتنا سونا دیا کہ آپ اُٹھا نہ سکے۔ نوے ہزار درہم یک وقت آپ کے پاس آئے تو حضور نے بوریئے پر رکھ کر سب تقسیم فرما دیئے۔ اور کسی سائل کو محروم نہ فرمایا۔ حضور کی نسبت عطاء وغناء کی یہ روایت مشہور ہے۔ کہ آپ نے کسی مسٔلہ کے جواب میں کبھی نہ نہیں فرمائی ۰

حضور جوّاد ہیں:- جو مولا کریم کی خاص عنایتوں اور خزانوں کے امانت دار تھے۔ اُن پر خدا کی تمام نعمتیں ختم ہوئیں اور تکمیل دین کر دی گئی۔ خداوند عالم کے اس امین نے دین کی لازوال دولت کو تمام و کمال دنیا والوں تک پہنچایا اور باقی نعائم الٰہیہ سے بھی مالا مال کر کے حق سخاوت ادا فرمایا۔

حضور فتّاح ہیں:- جنہوں نے مفتوحوں کے ساتھ رواداری برتی۔ مغلوب قوموں پر جبر و ظلم نہیں کیا۔ ان کے مذاہب کو مٹانا اور انکے معابد کو گرانا ان کے زن و فرزند کو غلام بنانا اور ان کے تاجداروں اور سرداروں کو ذلیل کرنا۔ ان کے اموال و عیال کو زندہ آگ میں جلا دینا۔ اور طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کر کے مارنا اپنا شعار اور وطیرۂ عمل نہیں بنایا۔ بلکہ مفتوحوں اور مغلوبوں کو انسان سمجھا اور ان کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کیا کیونکہ شاہانہ زندگی کی خصوصیتیں ایک داعی الی اللہ اور نبی برحق میں نہیں ہوتیں۔ وہ دنیا کی نفسانی حرص و آز۔ شان و شکوہ نمود و نمائش۔ شوکت و جلال۔ عزت و ناموری۔ زرق و برق گرانبہا ملبوسات۔ لذیذ اغذیہ۔ رفیع الشان محلات۔ تخت و تاج۔ زہرہ جمال اور حور پیکر نازنینوں کے جھرمٹ۔ معاندین سے انتقام۔ سلب و نہب خزانہ و زر و جواہر۔ ہوس ملک گیری اور جنگ و پیکار کے تسلسل کے لئے تہ تیغ کرنا لازم نہیں سمجھتا بلکہ اس کا نقطۂ نگاہ بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ فاتح میدان جنگ میں اگر سر پر غرور رکھتا ہے۔ تو ایک پیغمبر خدا۔ جبین نیاز۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں زبان خودستا ہوتا ہے۔ تو ایک داعی حق زبان شکر سنج۔ ایک بادشاہ

غیض و غضب کا آتشکدہ ہوتا ہے۔ تو ایک رسول رحم و کرم کا سرچشمہ۔ ایک بادشاہ جاہ و جلال کا دیوتا ہوتا ہے۔ تو ایک مفاد توحید نیاز مند بندہ۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ارض عالم پر جسقدر جلیل القدر فاتح رونما ہوئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اس رحم دل فاتح کی شان ہی الگ ہے۔ اس کا مظفر و منصور چہرہ جدہر کو پھرتا ہے۔ ظل الٰہی و تعلیم ربانی اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ وہ لڑائی میں کبھی پہل نہیں کرتا۔ اور اجسام کی بجائے قلوب و ارواح کو تسخیر فرماتا ہے :۔

حضور عالمؐ ہیں ا۔ جن کا علم علم الٰہی کا جزو ہے۔ جو فرماتے ہیں۔ علم الٰہی کے ماتحت ہی فرماتے ہیں۔ انہوں نے علوم و معارف کے پردے چاک کئے۔ اور وہ کچھ اہل جہان کو بتایا جو راہنماؤں میں حضور علیہ السلام سے پہلے کسی نے نہ بتایا اور نہ بعد میں کوئی بتا سکیگا حضور اپنی تعلیم کا آپ ہی نمونہ اور آپ ہی مثال ہیں۔ کیونکہ راہنماؤں میں ماکان دمایکون نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ ہوگا :

حضور طیبؐ ہیں :۔ پاکیزہ پیدا ہوئے اور پاکیزہ رہے۔ آپ اپنی صفائی قلب۔ پاکیزگیٔ ضمیر اور بلندیٔ روح و طہارت جسم کے لحاظ سے وہ ہیں جن پر عالم انسانیت کو ناز ہے۔ مگر حضورؐ کو اس پر فخر نہیں بلکہ ہر مداح کو اپنی مدح میں مبالغہ سے منع فرماتے ہیں۔ اور ایسے پاکباز ہیں کہ اللہ تعالٰی نے آپ کو درست فرما کر گناہ سے پہلے معافی کی خبر دی۔ تاکہ ہر حال میں اس کا طیب ہونا منکشف ہو جائے۔

حضور طاہر و مطہرؐ ہیں۔ یہ وہ طہارت ظاہری و باطنی ہے۔ جس کو کتاب اللہ نے واضح طور پر بیان فرما دیا ہے۔ آپ ایک عظیم الشان

مصلح کی حیثیت میں خود ایسے فطری پاکیزہ ہیں کہ ہر وہ عمل یا شئے جو حضور کے سامنے آئے یا ساتھ لگے اس کو بھی طہارت یافتہ بنا دیتے ہیں۔ آنجناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کی طہارت کا یہ شاندار مظاہرہ اعمال ظواہرہ سے گذر کر باطن تک پہنچ کر رہا۔ حضور نے نہ صرف قتل و غارت۔ سلب و نہب۔ ڈکیتی اور چوری۔ دختر کشی و مادر بہادی۔ قمار بازی و شراب خوری۔ زنا و غنا۔ خیانت و حماقت۔ بد دیانتی و سود خوری۔ بے حیائی و بد باطنی۔ طعن و تشنیع۔ استہزاء و مذاق۔ شرک و کفر۔ نسلی مفاخرہ وامتیازات کا کُلی خاتمہ کیا۔ بلکہ غیبت و بدگوئی۔ بہتان و اتہام۔ حسد و کینہ بغض و عداوت۔ ریا و نمود۔ رسم و رواج۔ غضب و غرور۔ اور فتنہ و فساد سے بھی بھٹکتی ہوئی مخلوق کو پاک و صاف کر دیا۔ نفاق و شقاق مٹائے۔ اور قلوب و نفوس انوار الٰہی سے مجلّا فرما دیئے۔

حضور خطیبؐ ہیں۔ اور خطیب الانبیاء ہیں۔ جملہ انواع کلام اور اسالیب بیان حضورؐ پر ختم ہوئے۔ آپ کا کلام ہر لحاظ سے تمام اہل قال کا پیشوا اور آپ کے اشارات من کل الوجوہ اہل حال و علم کے لئے حجت قاطع ہیں۔ آپ ہر آنے والے سائل سے اس کی اپنی زبان میں گفتگو فرماتے اور شافی جواب سناتے۔ اس بیان کا مجموعہ اس قدر ہے جس کا حصر نہیں ہو سکتا۔ باوجود امّی ہونے کے یہ کمال بجائے خود آپ کی نبوت تامہ پہ ایک برہانِ قوی اور دلیل محکم ہے۔ اہل دنیا کی عقلیں حیران اور زبانیں اس کے احاطہ سے عاجز ہیں:

حضور فصیحؐ ہیں:۔ اور اُن پر فسون و معجزانہ کلمات کا بے انتہا ذخیرہ رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے دانشمند انتہا معلوم کرنے میں دیوانے ہو گئے ہیں۔ بہت سے اسی فصاحت و بلاغت کے بھنور میں ایمان لائے۔ اور بہت سے حق و ناحق کی وادیوں میں بھٹک کر رہ گئے۔ کسی نے کہا کہ جادو ہے اور کوئی خدا کی زبان سمجھ کر قربان ہو گیا آخر اس فصاحت کو سجدے ہوئے، اور منکرین ذلیل ہو کر مٹ گئے۔

حضور سیدؐ ہیں:۔ جو تمام انسانوں سے مکرّم اور تمام انبیاء علیہم السّلام سے افضل ہیں۔ اور سیادت ہی کے لئے مبعوث فرمائے گئے ہیں۔

حضور منقیؐ ہیں:۔ جن کی پیدائش میں ہی کمالِ خلقت اور جمالِ صورت۔ قوت عقل، صحتِ فہم، فصاحتِ زبان۔ طاقتِ حواس۔ اعتدالِ حرکات شرفِ نسب، عزتِ قومی، بزرگیٔ وطن وغیرہ رکھے گئے۔ اور تمام اخلاقِ عالیہ، آدابِ شرعیہ دینیہ۔ علم و حلم، صبر و شکر، عدل و زہد۔ تواضع و عفو۔ سخاوت و شجاعت، حیا و مروّت۔ خاموشی و سکون۔ وقار و عظمت، عفت و رحمت۔ حسنِ ادب و معاشرت اُن کا مجموعۂ حُسنِ خلق ہیں۔ حضور وہ اعلیٰ کردار اور مزاج پاکیزہ رکھتے جن کے دوست دشمن مدّاح رہے۔ حضورؐ کے خلقِ عظیم کے پھول ایامِ بہار کے کبھی پابند نہیں ہوئے۔ وہ نا خزاں دیدہ ہونے کی حیثیت سے ہر فصل میں کھلے اور ہر موسم میں ترو تازہ رہے۔ جھوٹ، غیبت، ترش روئی، بدعہدی بد کلامی، آپ کی فطرت میں ہی نہ تھے۔ کیونکہ یہ رحمت اللعالمینی کی شان کے منافی ہیں۔ حضور کا بچپن، جوانی، بلکہ ساری مقدس زندگی معصوم اور گناہوں سے پاک ہے۔ اور اس شان کی اصلیت یہ ہے۔ کہ حضور کا نور صلب آدم و نوح و حضرت

ابراہیم علیہم السّلام کے ذریعہ آپ کے والدین میں ظہور پذیر ہوا۔ درانحالیکہ وہ پشت در پشت ارحام طاہرہ و اصلاب طیبہ میں آتا رہا۔ جن میں کوئی ایک بھی حرام کا ارتکاب کرنیوالا نہیں تھا۔

حضور امامؑ ہیں: ۔ امام الانبیاء ۔ امام الاتقیا والاصفیا ۔ امام وقت ۔ امام زمانہ جن کے تمام اوصاف میں سے ایک وصف امام ہونے کا ذکر سالقہ کتب سماوی میں بھی آیا ہے۔ چنانچہ امیتوں کے حافظہ متوکل نرم دل ۔ بازاروں میں نہ چلّانے والے ۔ بدی کا انتقام نہ لینے والے ۔ دین غیر مستقیم کو درست فرمانے والے ۔ ہر خوبی کے مالک ۔ تسکین کو لباس اور نیکی کو شعار بنانے والے ۔ تقویٰ کے حامل ۔ حکمت میں معقول ، صدق و وفا کے عامل ۔ عفو و احسان میں کامل ، ہدایت کے امام تورات شریف نے بیان فرمائے ہیں ، اور باقی کتب یا قرآن کریم میں جو بیان فرمایا گیا ہے وہ علاوہ ازیں امامت کائنات پر شاہدہ دال ہے :

حضور باتر ہیں: ، جو باوجود بلند منصب و اعلیٰ مرتبہ ہونے کے نیکی کا مجسمہ متواضع پسند اور کبر و نخوت سے پیار نہ کرنے والے تھے ۔ مسکینوں کی عیادت کرتے اور فقیروں کے ساتھ بیٹھتے ، غلام کی دعوت قبول فرماتے اور صحابہ سے ملکر رہتے ۔ گدھے پر سواری فرماتے ۔ سادہ لباس زیب تن کرتے ، اور اگر جَو کی روٹی اور باسی سالن کی طرف بھی بلائے جاتے تو انکار نہ فرماتے ۔ گھر میں گھر والوں کی خدمت کرنا ، کپڑوں میں پیوند لگانا ، اور جوئیں دیکھنا ۔ جوتا گانٹھنا ۔ بکری کا دودھ دوہنا ۔ گھر میں جھاڑو دینا ۔ اونٹ کا گھٹنا باندھنا اس کو چارہ ڈالنا ۔ بعض اوقات خادم کو آٹا گوندھ دینا ۔ آپکی پاکیزہ عادات میں داخل تھے ۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں ۔

کہ میں ایک مرتبہ حضورؐ کے ساتھ بازار گیا۔ اور آپ نے اپنا پاجامہ خریدا جب واپس ہونے لگے، تو میں نے ازراہِ خدمت وہ پاجامہ اُٹھا کر ساتھ چلنا چاہا، تو حضورؐ نے مجھ سے پاجامہ لے لیا۔ اور فرمایا کہ شئے کا مالک اپنی شئے کے اُٹھانے کا زیادہ مستحق ہے ۔

حضورؐ شافیؐ ہیں ، یعنے دافع البلاء والوباء والقحط والمرض والالم ہیں ۔ اپنی اُمّت کے لئے بالخصوص اور تمام کائنات کے لئے بالعموم تدبیر وتصرّف، امداد و اعانت، حاجت روائی و مشکل کشائی فرماتے ہیں۔ اور حضورؐ کو یہ قدرت بعطائے رحمان و بوساطت ربانی بہترین طور پر حاصل ہے ۔ حضورؐ رحمتِ عالم ہیں ، جن کی وجہ سے کفار و مشرکین پر بھی عذاب نہیں آتا ۔ قحط سالیاں پید ائش کے ساتھ ہی دُور ہو گئیں ۔ غلاموں سے جو کچھ کسی نے طلب کیا اس کو ملا۔ کسی کو دُنیا عطا فرمائی اور کسی سے جنّت کی ضمانت کی۔ حضورؐ بتملیک الہٰی جنّت کے مالک ، کارخانہ الہٰی کے مختار ہونے کی حیثیت سے ضمانتیں لیتے ۔ بیع کرتے اور ذمے واری فرماتے ہیں ۔ اور اس مضمون میں بے شمار آیات و احادیث ہیں ۔ جن کو اپنے اپنے مقام ضرورت پر کتاب ہذا میں بیان کیا جائے گا ۔ ہاں بعض لوگ فی زمانہ حضورؐ کی اس شان کے منکر ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ حضورؐ کو کسی نوع کی قدرت نہیں ۔ اور نہ اللہ کریم جل مجدہٗ کے ہاں وہ کسی کی حمایت کر سکتے ہیں ۔ اور نہ کسی کے وکیل بن سکتے ہیں ۔ اس کا جواب صرف یہ ہے ، کہ کور باطن اور بے بصر ہیں ۔ اگر چمگادڑ کی آنکھ دن کو نہ دیکھ سکے تو آفتاب کا کیا قصور ہے ، جو طلوع نہ ہو ۔

حضورؐ متوسّط ہیں ، یعنے اعتدال پسند کسی قول وفعل میں حد سے زیادتی بھی پسند

نہیں فرمائی۔ اور نہ کمی کو ترجیح دی۔ اکثر ہوتا ہے کہ انسان ایک خوبی کو انتہا تک پہنچاتا ہے۔ تو دوسری سے عاری ہو جاتا ہے۔ مثلاً مروّت میں ترقی کی تو عقل و ہوش سے رہ گیا۔ عاجزی و انکساری اسی پہ لوٹی۔ کہ شجاعت و جواں مردی سے علیحدہ ہوگیا رحم میں بڑھا تو انصاف جاتا رہا۔ لیکن حضورؐ وہ کامل الاخلاق محبوب ہیں۔ جن کی اعتدالی کیفیت کی تعریف فرمائی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی افق اعلیٰ پر بھی بیان فرمایا گیا ہے۔ گویا یہی ایک ذات قدسی ہے۔ جس میں بیک وقت جملہ اخلاق کا اجتماع پایا جاتا ہے۔ اہلِ دُنیا نے نہ یہ نمونہ دیکھا اور نہ آئندہ دیکھ سکنے کی توقع ہو سکتی ہے۔ آپ عبادت۔ ریاضت شجاعت۔ رحمت۔ سخاوت۔ اور حسن معاملہ و ایثار خلق غرضیکہ ہر صفت میں ایسے کامل و اکمل ہیں۔ کہ آپ کی مثل ربُّ العزت نے پیدا ہی نہیں فرمائی ؛

حضورؐ سابق ہیں۔ جن کی سبقت پر قرآن کریم گواہ ہے۔ تیسرے پارے میں ذکر ہوتا ہے کہ روز میثاق ایک مجلس ہوئی ہے۔ اس میں رب العزت تمام انبیاء علیہم السّلام سے عہد لیتے ہیں۔ کہ تمہاری نبوت و رسالت کے زمانہ میں اگر میرے رسول آجائیں۔ تو کیا تم ان پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد فرماؤ گے۔ جمیع انبیاء عرض کرتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ ایسا ہی کریں گے۔ چنانچہ اس عہد کی پابندی میں تمام انبیاء کرام اسی رسول علیہ السّلام کی پیشینگوئیاں فرماتے رہے۔ کیونکہ آپ سردار انبیاء اور نبی آخرالزمان صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی جتقدر صحف سماوی و کتب الہامی موجود ہیں۔ وہ اپنی تمام تر تحریفوں

اور ترمیموں کے باوجود بھی حضورؐ نبی کریم رؤف رحیم کی تشریف آوری کے تذکار میں بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دُعا۔ نوید مسیحا۔ سلیمانؑ کی بشارت۔ موسٰے کی ہدایت۔ یرمیاہ دلیسعیاہ کی اشارت۔ ملاکیؑ نبی کی وضاحت۔ یہ تمام تر حضورؐ کی اولیت وسابقیت پر روشن دلائل ہیں۔ اور خود حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ اور کائنات اور انبیاء کا تو ذکر ہی بعید ہے میں اس وقت بھی نبی ہی تھا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کا ابھی مٹی اور پانی سے آپ کا پُتلا بنانے کے لئے اکٹھا کیا جا رہا تھا

حضور مقتصدؐ ہیں :۔ یعنے میانہ رو۔ ہر کام میں افراط تفریط سے پرہیز فرماتے۔ اور درمیانی حیثیت کو اختیار فرما کر یہ ارشاد کرتے کہ یہی حالت بہتر ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ اگر آپ پر مختلف اشیاء اعلیٰ وادنیٰ پیش کی جائیں تو حضورؐ اوسط درجہ کو پسند فرماتے ؎

حضور مہدی ہیں :۔ اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت فرماتے ہیں۔ جس کے معنے اللہ کی طرف اس کے حکم کے ماتحت بلانے والے کے بھی ہیں۔ معمورۂ عالم جب عصیان وطغیان کی تاریکیوں میں گھرا ہوا تھا۔ انسان انسانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اس ظالمانہ ماحول میں ہدایت کا وہ نور چمکایا۔ کہ دلوں کو جوڑ کر سب کو بھائی بھائی بنا دیا۔ نسل ورنگ کی تمیز مٹا کر مساوات کی حقیقت کھول دی عورت نہایت ذلیل ترین حالت میں تھی۔ کوئی شخص لڑکی کا باپ بننا گوارا نہیں کرتا تھا۔ عورت کو وہ بلندیٔ مراتب عطا فرمائی۔ کہ عزت وحرمت میں مردوں کے برابر بنا دیا۔ غلاموں پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ ان سے وہ وحشیانہ سلوک

ہوتے جن کا بیان بھی روح کو لرزا دیتا ہے۔ مگر حضور نے انکو صرف مساوات کی سطح پر ہی لاکر کھڑا نہیں فرما دیا۔ بلکہ تخت و تاج بھی ساتھ ہی بخشد یئے۔ اور شرف و بزرگی کی مسندیں اُن کے لئے بھی ودیعت فرمادیں ؛

حضور حقؐ ہیں :۔ مولا کریم نے فرمایا ہے کہ جھٹلانے والوں کی طرف حق آیا۔ مگر انہوں نے اس کو جھٹلایا۔ اس سے حضور کا صدق وامر ثابت ہے۔ وہ حق ہے اور حق کے ساتھ حق لیکر آیا ہے۔ تاکہ جھوٹوں پر اُس کو ظاہر فرمائے۔ لوگوں نے مخالفت کی۔ مگر انجام کار حق کی فتح ہوئی۔ خلافت الٰہیہ کے قیام سے سارا عرب اس کا مطیع ہوگیا۔ اور قیصر وکسریٰ کے تاج اس کے قدموں میں آگرے۔ اس عظیم الشان کامیابی کے باوجود اس کی حقیقت میں فرق نہ آیا۔ اور قیام حق کے سبب فخر وعزور اس پر اپنا عکس نہ ڈال سکے ؛

حضور مُبینؐ ہیں :۔ یعنے روشن رسول۔ جن کی صداقت پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اپنی دلیل آپ ہیں ؛

حضور اوّل و آخرؐ ہیں :۔ مخلوق کے وجود سے پہلے خلقت میں سبقت فرمانے والے اور بعثت میں سب سے آخر ظاہر فرمائے گئے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ارشاد ہوتا ہے۔ کہ میں تمام انبیاء علیہم السّلام سے پہلے ہوں۔ اور بعثت میں سب سے آخر ہوں۔ اور فرمایا کہ میں سب سے پہلے ان لوگوں میں سے ہوں گا جن کے ساتھ زمین اُٹھیگی اور ان سب سے پہلے ہوں جو جنّت میں داخل ہوں گے۔ اور اوّل شفاعت کرنے والا اور اوّل شفاعت قبول فرمایا گیا میں ہوں۔ مجھ پر یعنے میرے قدم پر ہی لوگ حشر کریں گے۔ الغرض

حضورؐ تخلیق کائنات کا بیج اور تکمیل شش جہات کا باعث ہیں، یہ ظہور نور السمٰوٰت والارض کی ابتدا حضورؐ ہی سے ہوئی اور حضور ہی اس کا تتمہ ہیں، رب العزت کی مخلوق میں نہ حضورؐ سے اوّل کوئی ہے اور نہ مراتب میں بعد کو کوئی آخر ہو سکتا ہے۔ تمام مراتب و مدارج حضورؐ ہی سے شروع ہوئے اور حضورؐ ہی میں ختم و گم ہو کر رہ جائیں گے۔

حضور ظاہرؐ و باطنؐ ہیں:۔ رازِ الٰہی کے کھولنے اور پانے والے کیونکہ حضور کا وجود ہی ہستی باری تعالیٰ کی ایک روشن دلیل ہے، جس نے حضورؐ کو ایمان کی آنکھ سے مطالعہ کیا اس نے خدا کو پا لیا۔ یہی ظاہر و باطن ہیں، جن پر ہر لحاظ سے خالق الکل جلوہ گر ہے۔

حضور رحمتؐ ہیں:۔ اور تمام مخلوق کے لئے رحمت ہیں، جن و انسان کے لئے رحمت ہیں، مومن و کافر کے لئے رحمت ہیں، مومن کے لئے رحمت بسبب ہدایت کے، منافق کے لئے رحمت بسبب امان از قتل کے اور کافر کے لئے رحمت بہ سبب تاخیر عذاب کے ہیں، حضور کی وجہ سے تمام مخلوق اُن عذابوں سے محفوظ ہو گئی ہے۔ جو پہلی اُمتوں پر آتے رہے ہیں، جنہوں نے اپنے پیغمبروں (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو جھٹلایا، حضور نبی الرحمۃ، نبی توبہ، نبی ملاحم ہیں۔ آپ کا رحمت ہونا کسی خاص قوم یا خاص ملک کے لئے نہیں ہے، وہ رحمت کا بادل مشرق و مغرب اور شمال و جنوب پر یکساں برسا جس طرح بادشاہ اس کے چشمۂ کرم سے بہرہ یاب ہوئے۔ اسی طرح غریبوں نے بھی اس کی رحمت کے موتیوں سے اپنی جھولیاں بھریں۔ جس طرح نشیب و فراز نے اس سے نفع اٹھایا۔ اسی طرح حاضر و غائب مستفیض ہوئے اور شش جہت

کی کوئی چیز اس کی رحمت سے خالی نہ رہی ؛

حضور مُحلّل ہیں :- یعنے ان اشیاء و افعال کے مجاز ہیں جو کسی پر حلال نہ تھے حضور نے تمام بندشوں کے دروازے کھول دیئے ہیں ؛

حضور مُحرّم ہیں :- ہر وہ چیز جو فطرتاً اپنی تاثیر کے ماتحت انسان کے لئے مضر تھی۔ حضور علیہ السّلام نے انسانوں کے فائدے کیلئے اس کے استعمال سے صرف منع ہی نہیں فرمایا۔ بلکہ اسکے مرتکب پر وعید اور سزا بھی فرمائی ہے۔ تاکہ اگر رافت و رحمت کے ماتحت یہ لوگ دین فطرت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ تو عظمت و ہیبت سے ان کو اس مضر شئے یا فعل سے باز رکھا جائے ؛

حضور آمِرٌ و ناہٍ ہیں :- یعنے صاحب امر و نہی ہیں۔ حضور سے زیادہ ہاں اور نہ فرمانے میں کوئی سچا نہیں۔ صاحب قصیدہ بُردہ فرماتے ہیں۔ کہ صاحب امر و نہی ہونے کے یہ معنے ہیں۔ کہ حضورؐ حاکم ہیں۔ حضورؐ کے سوا عالم میں کوئی حاکم نہیں۔ اور نہ وہ کسی کے محکوم ہیں۔ بلکہ صاحب فرمان مالک افتراض و والیٔ تحریم ہیں۔ اور یہ وہ شان ہے۔ جو بعد از خداوند جل و علا شانہ حضور علیہ السّلام کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ آپ نے صحرا نشینوں، نا اُمتیوں، بے تہذیبوں اور اُجڈوں میں پیدا ہو کر اخلاق۔ معاشرت۔ معیشت۔ سیاست وغیرہ معاملات کے علاوہ امر و نہی کے وہ قوانین وضع فرمائے کہ دنیا میں حیرت انگیز ترقی کے باوجود آج تک ان میں کسی کو ترمیم کی گنجائش نظر نہیں آئی ؛

حضور شکُور ہیں :- یعنے ہر لحظہ بارگاہ رب العزت میں شکر گذار ہیں۔ ہر

نعمت ومشقت پر مولا کریم کا شکر ادا فرماتے۔ ایک مرتبہ حضرت اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا۔ کہ آپ رات کی نماز میں اسقدر قیام فرماتے ہیں۔ کہ آپ کے قدم مبارک سُوج جاتے اور متورم ہوکر اُن سے خون کی سیریں پھوٹ نکلتیں۔ تو حضرت صدیقہ نے عرض کی۔ کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کو اللہ کریم نے بے شمار فضائل ومحاسن سے نہیں نوازا؟ اور آپ پر لاتعداد انعامات نہیں فرمائے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں اللہ کریم نے مجھ پر بے انداز نوازشات فرمائی ہیں جو کسی کو بھی حاصل نہیں۔ تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا عرض کرتی ہیں کہ پھر آپ عبادت میں اس قدر تکلیف کیوں اُٹھاتے ہیں۔ اور اس قدر مشقت کیوں فرماتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ کیا تو چاہتی ہے کہ میں اس کا شکر گذار بندہ نہ بنوں۔ یعنے جس مولا کریم نے مجھ پر یہ کرم نوازی کی ہے۔ میرا بھی فرض ہے کہ میں اس کا شکریہ ادا کروں ⁂

حضور قریب ومنیب ہیں :۔ رب العزت کے حضور میں سب سے آگے جرأت میں سب سے آگے۔ پیدائش میں سب سے آگے اور شفاعت میں سب سے آگے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں بنی نوع انسان کی مکمل راہنمائی فرماتے ہیں۔ اور رجوع الی اللہ کا یہ عالم ہے۔ کہ دین کے ساتھ دُنیا کو بھی لے چلنا حضورؐ کی ایک ادنیٰ سی خصوصیت ہے۔ فطری طور پر ایک گمراہ۔ پابند ہوا د ہوس اور زمانہ ناشناس۔ تہذیب وتعلیم سے گری ہوئی قوم کے لیئے دین ودُنیا کا یکجا قوام کر کے انتہائی ترقی کے زینہ پہ لے جانا۔ لہٰذا حضورؐ ہی کا معجزہ ہے۔ جن کی تبلیغ کی گہرائی میں

ساری دُنیا سماگئی ؛

حضور مبلغ ہیں :۔ جنہوں نے شریعت مطہرہ کے احکام کھول کھول کر خلق خدا کو پہنچائے۔ جنسی اور نسلی تعصبات کروڑوں انسانوں کو پامالِ جور و ستم بنائے ہوئے تھے۔ ہر قوم جو طاقت رکھتی تھی، روئے زمین کی ہر چیز کو صرف اپنے ہی لئے سمجھتی تھی۔ باہمی تعاون اور اتحاد و یگانگت کا کوئی مستحکم رشتہ موجود نہ تھا۔ آخر اس مبلغ اعظم و تاجدار اخوت و مساوات نے انسانیت کی شیرازہ بندی کے لئے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ایک اسلامی رشتہ قائم کیا۔ اور منتشر دلوں کو باہم جوڑ کر بھائی بھائی بنا دیا۔ اس کا سب سے زندہ اعجاز اور ابدی سبق قرآن کریم ہے۔ جو انہی الفاظ میں اب تک موجود ہے۔ جو بذریعہ وحی ۲۳ برس کی مُدت میں نازل ہوا تھا ؛

حضور طٰسٓمٓ و حٰمٓ ہیں :۔ اُن رازوں کے راز دار جو رب العزت نے آپ کے لئے ودیعت فرمائے، اور اُن اسماء سے موسوم ہیں۔ جو حضورؐ کے باطنی حالات و کمالات۔ فضائل جلیلہ۔ خصائل و خصائص جمیلہ درجات رفیعہ و مراتب منیعہ کے ماتحت مولا کریم نے رکھے۔ جن میں عوام کالانعام کی تو کیا حقیقت ہے انبیاء و مرسلین و ملائکہ مقربین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کا بھی حصہ نہیں ہے۔ اِن ارشادات کا علم خطاب فرمانے والا جانتا ہے یا خطاب کیا گیا ؛

حضور حسیب ہیں :۔ جن کو کائنات کے ذرّے ذرّے کا اس لئے عالم بنا یا گیا کہ حضور سب پر محاسبت فرما سکیں گے۔ کیونکہ بغیر اس محاسبہ کے کوئی بھی علوِ مرتبت نہیں پا سکتا۔ حسیب ہونا ایک دہ بلند

صفت ہے۔ جو حضور کے لئے خاص تھی، کیونکہ حسیب وہ ہوتا ہے۔ جس میں قوت وطاقت تو بے پناہ ہو۔ مگر عقل کی تابع ہو۔ ہر مشکل کے وقت حتیٰ کہ سکرات موت میں بھی نفس مطمئن ہو اور اس کے اس بلند پایہ اور بے پرواہ فعل کی تعریف کی جائے حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں، کہ میں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو صاحب حوصلہ وسخی اور ہر معاملہ میں حسیب اور خوش رہنے والا نہیں دیکھا ٭

حضور اولیٰ ہیں: جن کے احکام اُن کے تصرف کی قوت سے ملے ہوئے ہیں جنکا غلام یا صحابی بننا موجب سعادت دنیا وعقبےٰ ہے۔ تورات میں ذکر کیا گیا ہے۔ کہ ایک اولیٰ شخص اولیٰ امت کے لئے اولیٰ ہونے کی حیثیت میں ظاہر ہو گا۔ وہ اپنی امت کی اصلاح ہدایت وتعلیم سے کرے گا۔ اور رہتی دنیا تک نوع انسان کے ساتھ رہے گا۔ وہ خوبیاں جو حضورؐ کی اوّلیت پر گواہ میں وہ ہیں جن میں کسب وعمل کو دخل نہیں، بلکہ رب العزت کی عنایت و موہبت سے ہیں۔ فضیلت۔ نبوت۔ رسالت۔ خلّت۔ محبت برگزیدگی۔ اسراء۔ دیدار قرب۔ شفاعت۔ مقام محمود۔ معراج جسمانی امامت الانبیاء۔ قیامت کو انبیاء واُمم سابقہ پر گواہ ہونا۔ اولاد آدم کی سرداری۔ صاحب عرش کے نزدیک حمد۔ لواء الحمد کا پانا رحمت اللعالمین ہونا۔ ہدایت۔ امانت۔ رضا۔ کوثر۔ گذشتہ و مابعد امور سے قبل از وقوع معانی۔ انشراح صدر۔ رفعت۔ ذکر سکینہ کا اترنا۔ فاتح ہونا۔ تائید ملائکہ۔ کتاب وحکمت۔ سبع مثانی۔ قرآن عظیم۔ پاکیزگیٔ رحمت۔ اللہ تعالےٰ اور ملائکہ کا درود شریف پڑھنا۔ آپ کے اسم پاک۔ پیشانی عمر اور مسکن

پاک کی قسمیں کھائی جلد قبولیت دُعا کا وعدہ۔ شجر و حجر کا کلام انگشتانِ مبارک سے پانی کا اجرا۔ تھوڑی چیز میں برکت۔ شق القمر۔ ردالشمس۔ اشیاء کا مدد دینا۔ علم غیب۔ سایہ کا نہ ہونا سنگریزوں کا تسبیح پڑھنا۔ دردوں بیماریوں کا اچھا کر دینا لوگوں کے شر سے بچانا۔ وغیرہ جن کا کوئی عقل احاطہ نہیں کرسکتی۔ اور ان کے علم پر سوائے اس کے عطا فرمانے والے خدائے وحدہٗ کے اور کوئی آگاہ نہیں ؎

حضور رحمۃ اللعٰلمین ہیں۔ تمام جہان اور تمام جہانیوں کے لئے خواہ وہ اوّل میں یا آخر۔ حاضر ہیں یا غائب۔ زندہ ہیں یا مُردہ۔ حضور کے اس اسم پاک کی برکت سے یہ اُمت اُمت مرحومہ کہلانے کی مستحق ہوگئی ہے۔ کیونکہ حضور کی طفیل آپس میں صبر و رحمت کی وصیّت کرتے ہیں۔ حضورؐ کو تراحم کا حکم دیا گیا ہے۔ اور حضورؐ نے اس خطاب کے ماتحت کائنات کے ایک ایک ذرّے کو ابدی طور پر اپنی وسیع رحمت کے دائرے میں گھیر لیا ہے۔ کیونکہ حضور بجائے خود ایک صفت ہیں رحیم کی اور صفت اُس وقت تک فناہ نہیں ہوتی۔ جب تک موصوف فناہ نہ ہوجائے۔ چونکہ رب العزت جل شانہٗ کے لئے فناہ ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا اس کی صفت رحمت اللعالمین یعنے حضور بھی ابدی اور ہر شئے کو گھیرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ جبریل علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپ کو بھی اس رحمت سے کچھ حصّہ ملا ہے۔ فرمانے لگے ہاں ملا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ میں اپنے انجام سے ڈرا کرتا تھا۔ مگر اب بے خوف ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسی رحمت کے پیش نظر قرآن پاک

میں میری تعریف کی ہے اور مجھے مولا کریم نے اپنے حضور میں باعزت مطبوع اور امین فرمایا ہے۔ اور جو میرے ساتھ دشمنی رکھنے والی مخلوق ہے ان کو اپنا دشمن بیان کیا ہے اور اصحاب یمین کی سلامتی اسی رحمت کے طفیل ہے۔ حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں، کہ رب العزت نے میری امت کے لئے میری وجہ سے دو امانیں اتاری ہیں، ایک یہ کہ جب تک کہ میں اُن میں ہوں اُن پر عذاب نہ آئے گا۔ دوسرے جب تک وہ استغفار کرتے رہیں گے۔ عذاب سے محفوظ ہوں گے۔ گویا حضور ابدی طور پر بحیثیت رحمت العالمین ہونے کے اُمت کے ساتھ ہیں۔ اس لئے امت عذاب سے مامون ہے

مندرجہ بالا اسماء شافیہ کے علاوہ قرآن کریم میں حضورؐ کے اور بہت سے اسماء مبارکہ ہیں۔ جن کو یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ وہ تفصیلی تذکار میں انشاء اللہ مذکور ہوں گے۔ اور یہ خصوصیات عالیہ وہ تھیں، جو غلاموں کی آگاہی کے لئے اپنے محبوب کی اظہار شان کی غرض سے رب العزت جل مجدہ نے ارشادات واحکام میں ظاہر و باہر فرما دیں۔ اس کے سوا جو کچھ اُس مالک دوجہان نے مراتب عالیہ ومدارج رفیعہ دار آخرت میں آپ کے واسطے زیادہ فرمائے ہیں۔ وہ وہ ہیں، جن کے دُرے ہی عقلیں گم ہو جاتی ہیں۔ اور ادراک ان کی خبر ہی سے حیران ہوئے ہیں، خدا کرے کہ جن حقائق کو حضور کے اسماء شافیہ کے ماتحت فقیر نے مختصراً درج کیا ہے۔ عوام الناس کے قلوب ان سے قرب نبوت کے انوار حاصل کریں اور اپنی باطنی بینائی سے معرفت رسالت کو پا سکیں۔ اور، اُس ابدی سخی کو اپنا ملجائے وماوے ٹھہرائیں، جس کے کسی سائل کو ناکامی نہیں ہوئی اور

جس کا کوئی بھکاری نامراد نہیں رہا اور جس کے دربار میں دشمن بھی رسوا و ذلیل نہیں ہوئے۔ جو مفسدین کے اعمال بھی ان کے منہ پر نہیں لاتا۔ اور جس نے دشمنوں کو بھی ہمیشہ اپنی رحمت کی کملی میں پناہ دی ہے، وہی مجرموں اور عاصیوں کا سہارا اور وہی ناداروں و خطاکاروں کا آسرا ہے۔ شعر

جو اُس کے جلووں سے ہو منور اُس آئینے میں نہ بال آئے
مٹے خیال گناہ دل سے جو دل میں اس کا خیال آئے!

اَللّٰھُمَّ بِحَقِّ جَمَالِ مُحَمَّدٍ اَرِنِیْ وَجْہَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ حَالًا وَّ دَوَامًا۔

ظاہری جمال نبویؐ

گو باطنی جمال نبوت محمدیہ علیہ الصلوات والتسلیمات کا مختصر سا نقشہ حدیث شریف کی منشا کے ماتحت جو اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وہ عاشقان حضور کے لئے تسلی و تشفی کو کم نہیں۔ مگر ظاہری صورت و سیرت کے دلدادہ حضرات کے محرومی کے خیال سے جی چاہتا ہے۔ کہ حضورؐ کی مبارک تریں ظاہری صورت و سیرت کو بھی ذکر کر ہی دیا جائے۔ تاکہ متلاشی اس کو اس میدان میں معرفت حضور کا ذریعہ بنا سکیں۔ فقیر نے اس سے قبل ایک کتاب اسی موضوع پر موسومہ بہ حلیۂ مبارک محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم منظوم پنجابی زبان میں لکھی تھی۔ پھر ایک کتاب موسومہ بہ سیاح لامکان میں اسی موضوع پر ایک باب صحیح احادیث و روایات کے ماتحت موسوم بہ نور مجسم کا بے مثل فی الصفات ہونا لکھا۔ اب فقیر اس موضوع پر تحقیق کے مختلف پہلوؤں کو کام میں لاکر جن میں اصح روایات کے علاوہ مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کے ایک فاضلانہ مضمون کا اقتباس بھی درج ہے۔ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ مولا کریم عقیدۂ حقۂ اہلسنت والجماعت

کے ماتحت لفظی لغزشوں سے بچائیے۔ اور بروز قیامت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخوں اور بے ادبوں میں نہ اُٹھائیے۔ آمین

قلّت روایت

قارئین کرام یہ پڑھ کر متعجب ہوں گے۔ کہ سیرت وحدت کے اس عظیم ترین ذخیرے میں جو اس وقت دُنیا کے سامنے ہے حلیۃ النبی علیہ السلام سے متعلق بہت کم روایات ملتی ہیں۔ جس کا سبب یہ نہیں۔ کہ صدر اوّل کے مصنفین کو حلیۂ نبوی علیہ السّلام کے مدّون کرنے کا اہتمام نہ تھا۔ بلکہ اصحاب سیر و محدّثین نے اس مسئلہ میں بڑی ہی جدّو جہد کی ہے۔ اور ایک ایک لفظ جمع کیا ہے۔ مگر وہ کیا کرتے۔ جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے ہی انہیں زیادہ روائتیں نہیں پہنچیں۔ کیونکہ جمیع صحابہ کرام میں چند گنتی کے حضرات ہی حلیہ مبارک بیان فرمانے والے نظر آتے ہیں۔ جن میں سے سیّدنا امام الاتقیا حضرت امیرالمومنین علی المرتضٰے علیہ السّلام اور ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہٗ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے اس باب میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اکثر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے بہت سے سبب ہو سکتے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا۔ کہ فرط تادّب و تعظیم سے وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف نظر بھر کے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت یہ حقیقت واضح فرمائی تھی۔ جس کو اُن کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہٗ ایک گفتگو کے بسلسلہ کا اشارہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ میرے والد حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا کہ اگر کوئی مجھ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک پوچھے تو میں بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انتہائی تعظیم کی وجہ سے میں آپ کو

نظر بھر کے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

قدِ مبارک نہ بہت لمبا تھا نہ بالکل ٹھیگنا۔ بلکہ میانہ قدوں سے کچھ نکلتا ہوا۔ لیکن لمبے قد والوں کے ہجوم میں بھی حضورؐ نمایاں نظر آتے تھے۔ سارا جسم اطہر بہت بھرا ہوا بھدّا نہ تھا۔ بلکہ گداز سڈول۔ مضبوط۔ معتدل۔ موزون۔ اور گٹھا ہوا تھا۔ جسم اطہر پر بال نہ تھے صرف ایک خوبصورت ترین خطِ سیاہ بالوں کا کوڑی سے ناف تک زیب بدن مقدس تھا۔ ہاں۔ کلائیوں۔ پنڈلیوں۔ کندھوں اور سینہ منوّر کی بلندیوں پر روئیں پھیلے ہوئے تھے۔ سینہ کشادہ اور پیٹ مبارک کی سطح میں پورا تناسب اور کندھوں کے ابھار پر گوشت اور پھیلاؤ نہایت موزونیت رکھتا تھا۔ دست و پائے مبارک خوبصورت، لمبے لمبے، چھوٹے ہوئے تھے۔ پنڈلیوں میں بہت خفیف خم تھا اور پاؤں کے تلوے گداز بھرے ہوئے تھے۔ کفِ دست مبارک فراخ، پرگوشت۔ انگلیاں دبیز اور تلوے صاف ستھرے۔ درمیان میں اتنا خلا کہ نیچے سے پانی لے روک بہ جاتا۔ پائے ہائے مبارک میں انگوٹھے کے بعد کی انگشت باقی انگلیوں سے بڑی، مگر چھنگلیا سب سے بلند اور نمایاں تھی۔ ایڑیاں پتلی پتلی۔ ملائم اور خوبصورت تھیں۔

چہرۂ انور رنگ سُرخ و سفید، روئے مبارک نہایت خوبصورت اور پُر نمک تھا، بہت پُرگوشت اور بالکل گول نہ تھا، بلکہ کسی قدر بیضاوی تھا۔ رخسار، ستواں اور بالوں سے صاف تھے۔ طبع مبارک پر کوئی بات گراں گذرتی تو سُرخ ہو جاتے تھے۔

ریشِ مقدس خوب گھنی اور بھاری تھی، کنپٹیوں سے حلق تک پھیلی ہوئی تھی، اطراف سے بڑھے ہوئے بال تراش دیا کرتے تھے۔ پوری ڈاڑھی سیاہ تھی۔ عہد پیری میں بھی صرف ٹھوڑی سے اوپر چند ہی بال سفید دکھائی دیتے تھے۔

سر بڑا تھا۔ بال بہت گھنے۔ خوب کالے۔ کانوں کی لو تک لمبے رہتے تھے۔ جب زیادہ بڑھ جاتے تھے۔ اور کندھوں تک آجاتے تھے۔ تو تراش کر کم کر دیئے جاتے تھے۔ بال نہ بہت پیچیدہ تھے۔ نہ گھونگریالے۔ نہ بالکل سیدھے اور کھڑے تھے۔ ہلکی ہلکی لہریں سی ان پر پڑی معلوم ہوتی تھیں۔ آخر عمر تک تھوڑے سے بال کنپٹیوں پر اور سر مبارک میں سفید ہوئے تھے۔ تیل لگا لیتے تو دکھائی نہ دیتے۔ ورنہ نظر آتے تھے۔

چشمہائے مبارک و پیشانی

آنکھیں بڑی بڑی سرمگیں تھیں تپلی خوب سیاہ۔ سفیدی میں لال ڈورے پڑے ہوئے۔ آنکھوں کے شگاف کشادہ۔ دونوں طرف کے گوشے سُرخ۔ پلکیں۔ کالی، لمبی لمبی۔

پیشانی چمکیلی کشادہ۔ بھویں خمیدہ۔ پتلی۔ نہایت لطافت سے ہلکی ہو کر باہم جڑ گئی تھیں۔ دونوں کے بیچ میں ایک رگ تھی۔ جو غصہ کے وقت پھول جاتی تھی۔ پسینہ بہت نکلتا تھا۔ اور ماتھے پر موتی کے دانوں کی طرح چمکتا تھا۔

ناک ستواں اور ایسی تھی کہ پہلی نظر میں بلند اور کھڑی معلوم ہوتی تھی مگر دراصل نہایت ہی خوبصورت اور چہرے کے مناسب تھی۔

دہنہ، لطافت کے ساتھ کشادہ۔ دندان مبارک خوب سفید۔ نیچے موتی کی طرح تاباں۔ اوپر نیچے چڑھے نہ تھے۔ ترتیب سے دو صفیں قائم تھیں۔ سامنے کے دانتوں میں خفیف شگاف تھے۔

وصف جمال پاک

صحابہ کرام جمال نبوی سے از حد متاثر تھے ذیل میں بعض اقوال دیئے جاتے ہیں۔

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام آدمیوں سے زیادہ حسین تھے۔ میں نے آپ کو ایک مرتبہ سُرخ جوڑا زیب تن کئے دیکھا۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ آپ سے

زیادہ کبھی کسی زلفوں والے کو خوبصورت دیکھا ہے۔ چوڑے سینہ اور شانوں تک بال لٹکے ہوئے تھے۔ (صحیحین)

براء بن عازبؓ سے پوچھا گیا کہ "کیا رسول اللہ کا چہرہ تلوار کی طرح لمبا اور چمکیلا تھا؟"

کہنے لگے "نہیں بلکہ چاند کی طرح منور اور خوبصورت"۔

کعب بن مالکؓ کہتے ہیں "جب آپ کسی بات پر خوش ہوتے تھے۔ تو چہرہ مبارک اس طرح روشن ہو جاتا تھا گویا چاند کا ٹکڑا ہے"۔ (صحیحین)

جسم اطہر کی خوشبو

حضرت انسؓ نے بیان کیا "میں نے آپ سے پہلے اور آپ کے بعد کبھی کسی کو آپ کا سا خوبصورت نہیں دیکھا۔ رنگ چمکیلا گورا تھا۔ پیشانی پر پسینہ ایسا نظر آتا تھا گویا موتی بکھرے ہیں! چلتے تھے۔ تو جھومتے تھے۔ میں نے کبھی کوئی دیباج یا ریشم آپ کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم نہیں دیکھا۔ نہ کبھی کسی مشک یا عنبر میں آپ کی خوشبو سے بہتر خوشبو پائی"۔ (صحیحین)

حضور کا پسینہ معطر

انہی حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ "ایک دن آپ ہمارے گھر تشریف لائے اور سو گئے۔ میری ماں اٹھیں۔ اور آپ کا پسینہ سونت سونت کر شیشی میں لینے لگیں۔ آپ کی آنکھ کھل گئی۔ فرمایا "ام سلیم! یہ کیا ہے؟"

عرض کیا "میں آپ کا پسینہ لے رہی ہوں۔ اپنے عطر میں ملاؤں گی۔ کیونکہ یہ عطر سے بھی زیادہ خوشبو دار ہے"۔ (صحیحین)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں "آپ کے دانت بڑے ہی چمکیلے تھے۔ منہ کھولتے تو دانتوں سے ایک نور سا نکلتا معلوم ہوتا تھا"۔ (دارمی)

جری بھی حسین بھی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ "میں نے آپ سے زیادہ کسی کو جری اور

حسین نہیں دیکھا۔" (مسند احمد)

حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے: "آپ جس راستہ سے گذرتے جاتے تھے۔ بعد میں آنے والے لوگوں کو خوشبو سے پتہ لگ جاتا تھا۔ کہ ادھر سے تشریف لے گئے ہیں۔" (صحیحین)

حضور کی ہتھیلی

نیز انہی نے بیان کیا: "ایک دن نماز کے بعد میں آپ کے ساتھ مسجد سے نکلا۔ دولڑکے اور بھی آ گئے، آپ نے اُن کے رُخسار چھوئے۔ پھر میرے رُخسار پر ہاتھ رکھا۔ آپ کے ہاتھ کی ٹھنڈک اور خوشبو میں نے ایسی محسوس کی۔ گویا ابھی ابھی عطر کے قرابے سے نکلا ہے۔" (مسلم)

نیز انہی نے کہا: "اگر تم حضور کو دیکھتے تو سمجھتے، آنکھوں میں سُرمہ لگا ہے۔ حالانکہ سُرمہ لگا نہ ہوتا تھا۔" (ترمذی)

چودھویں کا چاند!

نیز انہی کی روایت ہے: "ایک مرتبہ چودھویں رات میں آپ سُرخ جوڑا پہنے تشریف فرما تھے۔ میں کبھی چاند کو اور کبھی آپ کے چہرے کو دیکھتا تھا۔ مگر آپ مجھے چاند سے بھی زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔" (ترمذی و دارمی)

ربیع بنت معوذ سے پوچھا گیا: "آنحضرت کیسے تھے؟"
کہنے لگیں: "اگر تم حضور کو دیکھتے تو سمجھتے۔ اُٹھتا ہوا سُورج دیکھ رہے ہیں۔" (دارمی)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو خوبصورت نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا آفتاب رُخِ انور پر چل رہا ہے۔" (ترمذی)

مکمل سراپا

ام معبد نے آپ کا سراپا خوب بیان کیا ہے۔ یہ وہی خاتون ہیں، جس کے خیمے میں آپؐ نے سفر ہجرت کے

دوران میں دم لیا تھا۔ وہ آپ کے نام نامی سے واقف تھی، اس لئے اپنے شوہر سے آپ کا حلیہ اس طرح بیان کرنے لگی :۔

"میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ جو صاف ستھرا تھا۔ حسن اس پر جلوہ گر تھا۔ چہرہ روشن تھا۔ جسم خوبصورت تھا۔ نہ توندا سے بدنما بنا رہا تھا۔ نہ شانوں پر ننھا سا سر ہی اُسے حقیر ظاہر کر رہا تھا۔ وہ نہایت ہی خوبصورت اور حسین تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ۔ پلکوں میں کجی۔ آواز میں اثر۔ گردن میں درازی۔ ڈاڑھی گھنی۔ بھویں لمبی پتلی جُڑی ہوئی۔ جب چُپ ہوتا تو باوقار ظاہر ہوتا۔ جب بولتا تو شاندار بن جاتا۔ دُور سے دیکھو تو سب سے حسین اور بھاری بھر کم نزدیک سے دیکھو تو سب سے زیادہ دلفریب اور شیریں میٹھی بات چیت۔ نپے تُلے بول بولنے والا۔ نہ بالکل کم سخن نہ بہت باتونی۔ گفتگو ایسی جیسے ہار میں موتی پر وئے ہوئے۔ میانہ قد۔ نہ بہت لمبا نہ ایسا ٹھگنا کہ نگاہ میں حقیر ہو جائے۔ دو شاخوں کے بیچ میں ایک شاخ۔ مگر وہ باقی دونوں سے زیادہ تر و تازہ اور نظر فریب۔ اس کے رفیق اس کے روبرو حاضر۔ اگر بولتا تو غور سے سنتے۔ حکم دیتا تو تعمیل کے لئے دوڑ پڑتے۔ بہت سنجیدہ اور ہنس مکھ۔ ترش رو اور سخت گیر نہیں۔" (خصائص)

حضرت علیؓ کا بیان

حضرت علیؓ فرماتے ہیں :"آپ سب سے نیک دل، سب سے زیادہ راست گو سب سے زیادہ نرم مزاج، سب سے زیادہ خوش خلق تھے۔ پہلی نظر میں ہر کوئی آپ کی ہیبت سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ لیکن کچھ دیر حاضری کے بعد محبت کرنے لگتا تھا۔ میں نے آپ سے پہلے اور بعد کسی کو آپ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا۔" (ترمذی)

نیز فرمایا: "آپ کی گردن چاندی کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی پیشانی پر پسینہ موتی کی طرح چمکتا تھا۔ مشک خالص سے زیادہ خوشبودار تھا۔ میں نے کوئی آدمی آپؐ کا سا نہیں دیکھا"۔ (ابن سعد)

سیمیں گردن

ہند بن ابی ہالہ کہتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت شاندار تھے۔ چہرہ اس طرح چمکتا دمکتا تھا۔ جیسے چودھویں کا چاند۔ گردن ایسی صاف اور خوبصورت تھی۔ گویا چاندی سے گھڑ کر بنائی گئی ہے"۔ شمائل ترمذی)

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے تھے: "آپ کا چہرہ ایسا تھا گویا چاند، کا طباق ہے"۔ (خصائص)

بدرِ منیر

حضرت عائشہؓ کا قول ہے: "آپؐ سب سے زیادہ حسین چہرے والے تھے۔ سب سے زیادہ روشن رنگ والے تھے۔ جب کبھی کسی نے آپؐ کا حلیہ بیان کرنا چاہا۔ تو رُخِ انور کو بدرِ منیر سے ضرور تشبیہ دی چہرے پر پسینہ کی بوندیں سچے موتیوں کی طرح چمکتی تھیں۔ اور پسینہ مشک خالص سے زیادہ اچھی مہک رکھتا تھا"۔ (خصائص)

نیز بیان کرتی ہیں: "ایک مرتبہ کسی نے سیاہ شملہ ہدیہ دیا۔ آپؐ نے اُسے باندھا۔ اور مجھ سے فرمانے لگے۔ عائشہ! یہ مجھ پر کیسا معلوم ہوتا ہے میں نے عرض کیا۔ بہت ہی بھلا لگتا ہے۔ اس کی سیاہی آپؐ کے چہرے کی سفیدی میں اور آپؐ کی سفیدی اس کی سیاہی میں پیوست ہوئی جاتی ہے"۔ (کنز العمل)

حیا و نزاکت طبع

ابوسعید خدریؓ کہا کرتے تھے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پردے میں بیٹھنے والی کنواریوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔ جب کوئی بات طبع مبارک پر گراں گذرتی تو ہم آپ کے چہرے سے معلوم کر لیا کرتے تھے"۔ (صحیحین)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں :ـ ایک دن میں نے دیکھا کہ آپؐ چٹائی پر لیٹے ہیں، اور چٹائی کے نشان پہلو پر نمایاں ہیں۔ میں نشانوں پر ہاتھ پھیرنے لگا اور عرض کیا۔

یارسول اللہ! آپؐ پر میرے ماں باپ قربان، آپ نے ہمیں کیوں خبر نہ دی، کہ سونے کے نیچے کچھ بچھا دیتے؟"

آپؐ نے جواب دیا۔ مجھے دنیا سے کوئی سروکار نہیں۔ میری اور دُنیا کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کوئی سوار کسی درخت کے سایہ میں دم لے لیتا ہے۔ اور پھر آگے روانہ ہو جاتا ہے" (مسند طیالسی و احمد)

پیشانی پر نور کے دانے

نیز حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ ایک دن میں بیٹھی سوت کات رہی تھی، اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم اپنی نعل گانٹھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا آپؐ کی پیشانی پر پسینہ آرہا ہے۔ اور اس کی بوندیں چمک رہی ہیں۔ اس منظر نے مجھے مبہوت کر دیا۔ آپؐ کی نظر اٹھی، تو مجھے مبہوت دیکھ کر فرمانے لگے "کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا۔ آپؐ کی پیشانی پر پسینہ کی بوندیں نور کے دانے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ابوکبیر الہذلی اس حال میں آپ کو دیکھ لیتا۔ تو جان جاتا کہ اس کے اِن اشعار کا اعلیٰ مصداق آپ ہی ہیں۔

(ترجمہ اشعار):ـ

نہ اس کی ماں میں کوئی عیب تھا۔ نہ دائی میں۔ اور وہ خود ہر بیماری سے دُور ہے۔

جب اس کے چہرے کو دیکھو۔ تو اس طرح چمکتا ہے۔ جس طرح ابر میں بجلی چمکتی ہے۔

یہ سُن کر آپؐ نے نعل اور سوئی ہاتھ سے رکھ دی۔ اُٹھ کر میرے

پاس تشریف لائے۔ میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور فرمانے لگے۔ عائشہؓ خدا تجھے جزائے خیر دے۔ مجھے یاد نہیں ہے کبھی اتنا خوش ہوا ہوں جتنا اس بات سے خوش ہوا ہوں۔ (خصائص)

ماہِ تمام

حضرت عمرؓ اپنی مجلس میں زبیر بن ابی سلمٰی کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے۔ جو اس نے ہرم بن سلطان کی تعریف میں کہا تھا۔

ترجمہ شعر:۔ (اگر تو انسان کے سوا کچھ اور ہوتا۔ تو اندھیری رات کا روشن کرنے والا بدرِ منیر ہوتا)

پھر حاضرین سے کہتے۔ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایسے تھے۔ اور کوئی دوسرا آدمی ایسا نہ تھا۔ (کنز العمل)

حضور کو بھی اپنے حسن کا پورا احساس تھا۔ اور اس نعمت پر ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کیا کرتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ کہ جب آپ آئینہ دیکھتے تو فرماتے:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْسَنَ خَلْقِیْ وَخُلُقِیْ ط (خدا کا ہزار ہزار شکر جس نے میری صورت و سیرت دونوں اچھی بنا دی ہیں)

سیرت خیر الخلق صلی اللہ علیہ وسلم

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔

ترجمہ:۔ اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو مگر رحمت واسطے جہانوں کے

دُنیا کی تمام شخصیتوں میں شاید تاجدارِ کائنات مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی شخصیت کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہوا ہے کہ اس کی زندگی پر اتنی کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہوں۔ جتنی قرنِ اوّل سے لے کر آج تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر لکھی جا چکی ہیں۔ اور متفرق طور پر تقریروں، تحریروں اور مواعظ و خطب میں جس قدر اس پاک زندگی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کو اگر یکجا جمع کیا جائے تو بلاشک یہ دفتر اس سارے ذخیرہ پر سبقت لے جائے گا جو انسانی کوششوں نے دنیا کی تمام تاریخی شخصیتوں کے حالات پر فراہم کیا ہے۔ لیکن اس کثرت کے ساتھ آپ کا ذکرِ پاک زبانوں پر آنے کے باوجود یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ سیرت و سوانح کا کوئی بڑے سے بڑا دفتر بھی رسول اکرم کی زندگی اور آپ کے خصائص و شمائل کا اتنا صحیح اور جامع نقشہ نہیں کھینچ سکا۔ جتنا خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خالق جل شانہٗ نے اپنے ایک لفظ رحمۃ اللعلمین میں کھینچ دیا ہے۔ بظاہر یہ ایک بہت بڑا دعویٰ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ دفتروں اور کتابوں کے بڑے بڑے مجلدات کی پہنائیوں کے مقابلہ میں ایک لفظ کی اتنی وسعت اور جامعیت عقل میں سمانی بہت مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم لفظ رحمت کے معنوں پر غور کرتے ہیں اور اس کے بعد نبیٔ رحمت کی حیاتِ طیبہ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس تقابل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی ایک لفظ رحمت کی تفسیر تھی۔ اور رحمت کا حقیقی مفہوم اگر کہیں بتمام وکمال ادا ہوا ہے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پاک زندگی میں ادا ہوا ہے۔

رحمتِ مجسّم لغت عرب میں رحمت کے معنی ہیں وہ رقّت جو احسان کی مقتضی ہو اور یہ لفظ خالص رقّت کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ اور کبھی خالص احسان کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا رحمت کا حقیقی مفہوم رقّت ہے اور احسان سے مرکب ہے۔ اور کمال درجہ کی رحمت وہی ہے جس میں غایت درجہ کی رقّت اور غایت درجہ کا احسان دونوں شامل ہوں لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں پر رقّت اور احسان کا مطلب بھی سمجھ لیا جائے۔ لفظ رقّت لغت عرب میں جفوۃ اور قسوۃ کے مقابلہ پر بولا جاتا ہے۔ کسی کی حاجتمندی اور تکلیف پر دل کا پسیجنا رقّت اور سخت ہو جانا قسوۃ کہلائے گا۔ پس جب کسی شخص کا دل کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر دُکھے تو اس دکھن کو رقت سے تعبیر کیا جائے گا۔ عام اس سے کہ وہ مصیبت ظاہر ہو یا مخفی، محسوس ہو یا غیر محسوس اور مصیبت زدہ کو خود اپنی مصیبت زدگی کا احساس ہو یا نہ ہو وہ مصیبت بالفعل اس پہ آچکی ہو یا آئندہ آنے والی ہو۔ بہر حال اپنے ہم جنس کی جس حالت کو انسان مصیبت سمجھے اور اس پر کڑھے۔ دکھے۔ رنجیدہ ہو۔ تو اس کے اس قلبی فعل پر رقّت کا اطلاق ہوگا۔ اور غایت درجہ کی رقّت وہی ہوگی جو ہر قسم کی مصیبت کے مقابلہ میں پیدا ہو۔ دوسری جانب لفظ احسان کے معنی میں انعام علی الغیر یعنی دوسرے شخص کو اس کے استحقاق سے زیادہ عطا کرنا اور اپنے استحقاق سے کم لینا۔ مگر انتہائی درجہ کا احسان یہ ہے کہ انسان دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے لئے اپنی زندگی وقف کردے اور اس کے مقابلہ میں خود کوئی اجر نہ لے۔ پس لفظ رحمت کے معنی یہ ہوئے کہ ایک شخص کا دل دوسرے شخص کی ہر مصیبت کو دیکھ کر دکھے۔ اور اس دل کی دکھن کے باعث

نہ کسی اجر کی طمع سے وہ اس پر احسان کرے۔

مگر لفظ رحمت مصدر ہے اور اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت قرار دینا کمال درجہ کے مبالغہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر محض معمولی درجہ میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف کرنا مقصود ہو تو آپ کو رحیم کہا جا سکتا تھا۔ یا ذو رحمۃ کے لفظ سے آپ کی توصیف کی جا سکتی تھی۔ لیکن اللہ جل وعلا شانہٗ نے ان الفاظ کی بجائے آپ کو خود رحمت قرار دیا۔ اور عرب کا قاعدہ ہے کہ جب مصدر سے وہ کسی کی توصیف کرتے ہیں تو یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ شخص اس صفت کا مجسم مظہر بن گیا ہے۔ یہ ہے اس لفظ کا مفہوم جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے والی ذات نے آپ کی مدح فرمائی ہے۔ اب اس تعریف کی صداقت آزمانے کے لئے جب ہم حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس رحمت مجسم کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے، جس میں رحمت کا رنگ غالب نہ ہو۔ اور یہ سب کو معلوم ہے کہ آپ کی شخصیت ایک نہایت جامع شخصیت تھی، ایک بیکس واعظ سے لے کر ایک ملک کے فرمانروا تک۔ ایک مظلوم جماعت کے امام سے لے کر ایک فاتح سپہ سالار تک۔ ایک تنگدست مہاجر سے لے کر تمام ملک عرب کے مالک و مختار تک آپ کی زندگی نے مختلف دور دیکھے تھے۔ لیکن آپ جس حال میں اور جہاں بھی رہے رحمت کی صفت آپ کی صفت میں نمایاں رہی، سب سے زیادہ نازک وقت انسان کے لئے وہ ہوتا ہے۔ جبکہ اس کو اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہو اور ایسے موقع پر مفتوح دشمن کے ساتھ جو سلوک دنیا میں ہوا کرتا ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مگر نبیؐ رحمت کو جب کبھی غلبہ حاصل ہوا اس نے رحمت ہی سے کام لیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ انسان نے گذشتہ تیرہ سو سال سے تہذیب و تمدن کی دنیا میں جو عظیم الشان ترقی کی ہے اس کا اصلی راز کیا ہے تو میں بے تکلف

کہوں گا۔ کہ یہ سب سرودِ کائنات مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کا فیض ہے۔

محسنِ اعظم

ظہورِ اسلام سے قبل دنیا تہذیب وشائستگی سے خالی ہی نہیں تھی۔ بلکہ خود جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک ایسے موقع پر ہوئی جب انسان کا تمدنی نشو وارتقا ایک خاص مقام پر پہنچ کر رُک گیا تھا۔ افراد واقوام کی زندگی میں بارہا ایسی ساعتیں آئی ہیں جب ان کے لئے کوئی راہِ عمل باقی نہیں رہی۔ لیکن وہ وقت بڑا ہی نازک تھا۔ جب کوئی ایک قوم یا ایک نسل نہیں بلکہ ساری دنیا ایک ناقابلِ بیان ابتلا میں گرفتار تھی۔ اور جب مذہب، اخلاق، سلطنت، جماعت، معاشرت غرضیکہ زندگی کے ہر ادارے میں ایک فتنہ وفساد برپا تھا۔ عقل سر بزانو تھی کہ اس مصیبت سے کیوں کر نجات ملے۔ نہ ماضی ہی سے کوئی پیام تسکین ملتا تھا اور نہ مستقبل میں کوئی اُمید کی صورت نظر آتی تھی۔

اربابِ نظر سے یہ پوشیدہ نہیں کہ ساتویں صدی مسیحی میں انسان ایک نہایت خوفناک انحطاط کا شکار ہو چکا تھا۔ نہ کبھی دُنیا کی حالت اس قدر پست ہوئی اور نہ کبھی انسان نے ایسی عاجزانہ زندگی گذاری۔ نصف سے زیادہ دنیا جہالت میں الجھی ہوئی اور ان اقوام کا مسکن تھی۔ جو نیم وحشیانہ زندگی بسر کر رہی تھیں۔ امن عالم کا شیرازہ پراگندہ ہو چکا تھا۔ اور ہر طرف انتشار وتصادم رونما تھا خداوند عالم کی بے بس مخلوق اربابِ سلطنت کی حرص وآز پر بھینٹ چڑھ چکی تھی نہ کوئی قانون کی گرفت تھی نہ فرائض کی ذمہ داری۔ انسان کی یہ انتہائی پستی اور اس کی زندگی کے یہ وہ عاجزانہ لمحات تھے۔ جن میں خدائے قدوس جل وعلا شانہٗ کے آخری نبی علیہ السلام نے اہلِ جہان کے سامنے رشد وہدایت کی سچی راہ پیش کی۔ اور فرمایا کہ خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ رَبُّ العالمین ہے۔ کائنات کا خالق ہے۔ فاطر السمٰوٰت والارض اور انسان کا معبود حقیقی

ہے۔ جس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی متحرک نہیں ہوتا۔ وہی سمیع وعلیم اور قادر و قیوم ہے۔ جس کی جانب ہم سب کو لوٹنا ہے، گویا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو صحیح حقیقت سے آشنا کر دیا۔ اور دُنیا کے جسم مردہ میں زندگی کی از سر نو لہر دوڑ گئی۔ انسان اور انسانیت کی آزادی کا وقت قریب آگیا۔ معبودان باطل رخصت ہو گئے۔ تعصب و جہالت کی زنجیریں کٹ گئیں، ضلالت و گمراہی ختم ہو گئی۔ اور دُنیا ہدایت و صداقت کے آفتاب سے چمک اُٹھی۔

لیکن اس رسالت کا مقصود صرف دعوت و تبلیغ نہیں تھا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نسل انسانی کے مصلح، قائد، اور راہنما بھی تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس عزم اور یقین کے ساتھ حضور علیہ السلام نے دنیا کی راہنمائی فرمائی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ فریضۂ رسالت ادا فرمایا۔ اور لوگوں کی توجہ ان تاریخی شواہد کی طرف منعطف کرائی۔ جو اقوام و امم کی زندگی کا راز ہیں۔ اور فرمایا قوموں کی عاقبت پہ غور کرو۔ کس قدر وہ ہوشیار قومیں تھیں جو انجام کار عتاب الٰہی کا شکار ہوئیں۔ آپ نے سب سے پہلے ذہن انسانی کو تجربے اور مشاہدے کی دعوت دی۔ اور اللہ کریم کی زمین پر سفر کرنے اور ظالموں کا انجام دیکھنے پر متوجہ کیا۔ اپنے قلوب اور اپنی زندگیوں کا محاسبہ کرنا سکھایا۔ اور یہ بھی بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو عبث پیدا نہیں فرمایا۔ دُنیا آیات ربّانی کی مظہر اور سنن الٰہیہ کی ترجمان ہے۔ حضور علیہ السلام گویا سب سے بڑے محرک تھے۔ جنہوں نے فکر و تدبر کی دُنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اب تک لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے۔ کہ دین اور دنیا، مادیت اور روحانیت روح اور جسم متضاد چیزیں ہیں، عقل اور عقیدے میں کوئی مفاہمت پیدا نہیں ہو سکتی۔ جذبات اور تخیلات کا ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونا ناممکن ہے مگر خیر الخلق رسول علیہ السلام نے ایک ایک کر کے ان تمام بے معنی تخیلات کا

تار و پود بکھیر دیا اور لوگوں کے اندر مذہب کا وہ صحیح جذبہ پیدا فرما دیا جس میں تمام اجزائے حیات ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ اور انسانی زندگی کائنات کا ایک واحد و مفید جزو بن کر ترقی کے انتہائی مدارج طے کر لیتی ہے۔ یہی تعلیم تھی نبیٔ رحمت اور نبیٔ اُمی کی، جس کے اثر سے عرب کے بدو اور بادیہ نشین جہالت و ضلالت سے نکل کر ہدایت کے راستہ پر گامزن ہو گئے اور یہ ایک پہلی ایسی اُمت پیدا فرمائی جس نے دنیا میں ایک خدا کی عبادت پر تلقین کی۔ اور جس نے تمام ان وسائل کو جو انسان کی جہالت سے خدا اور اس کے بندوں میں حائل ہو گئے تھے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ امت محمدیہ اس راز سے بھی آگاہ ہو کر دنیا کی مقتدا بن گئی، کہ مذہب انسان کے احساسات و جذبات اور غور و فکر کی نفی نہیں فرماتا۔ بلکہ وہ اس کے ذہنی ترقی اور ذوق جمال کا سب سے بڑا دوست ہے۔ اس کے نزدیک عبادت کا مقصود محض ضبط نفس اور تزکیۂ ذات ہے۔ فنا و رہبانیت نہیں، اس لئے کہ زندگی ایک عطیۂ الٰہی ہے۔ شر نہیں۔ وہ عاقبت کے خیال سے دُنیا کی علیحدگی نہیں سکھاتا نہ لذائذ دُنیا کے ترک کی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے کہ دُنیا محض کارگاہِ عمل ہی نہیں بلکہ مزرعۂ آخرت بھی ہے۔ وہ زندگی کو ایک سلسلۂ فرائض سے تعبیر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ انسان کا کام ترک و تعطل نہیں، بلکہ غلبہ و تسخیر ہے۔ انسان کائنات کا حکمران اور نائب حق ہے۔ اور ذات خداوندی اس کا مقصد وحید اور مقصود آخری ہے۔ حکومت محض خداوند عالم کے لئے ہے۔ جو دولت کو انسان کا مشترکہ سرمایہ لیکن ملکیت کو اس کے کسب حلال کا نتیجہ سمجھتی ہے، جس نے رنگ و خون کا کوئی امتیاز گوارا نہیں کیا۔ اور عزت و شرف کی بنیاد تقویٰ پر رکھی۔ اس کی مرضی یہ ہے کہ اس کی زمین پر صرف اس کے نیک بندے حکمران رہیں۔ اور دُنیا میں حق و صداقت کی قوتیں کامیاب ہوں بنی نوع انسان اور تہذیب و تمدن کی یہ وہ خدمت ہے جو اسلام نے انجام

دی۔ اور یہی ایک خصوصیت پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی انبیاء و مصلحین اور رہنمایانِ عالم کی صف میں ممتاز کرتی ہے۔ اللہ اکبر کس قدر بلند ہے وہ شخصیت اور کس قدر مقدس ہے۔ وہ ذات جس سے زندگی کا آخری نظام تکمیل کو پہنچا اور دُنیا شاہدِ مقصود سے ہمکنار ہوئی۔

حضور صفِ انبیاء میں

حضرت کلیم اللہ مظہرِ جلال تھے اور جناب مسیح علیہ السّلام پر تو جمال اور ان ہی دو حضرات پر موقوف نہیں، تمام انبیاء و رُسل ان دو میں سے کسی ایک شان کے حامل تھے، گو دوسری شان سے بھی بالکل خالی نہ تھے۔ لیکن ہماری سرکار مکہ میں دونوں شانیں بہ تمام و کمال جلوہ گر تھیں۔ اور کمال بھی وہ کہ جو کسی کو حاصل نہ ہو اس لئے یہ مبالغہ نہیں کہ سرکار سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو مظہرِ جلال یا پرتو جمال کہنے کی بجائے جامع کمالات کہا جائے۔ عموماً ہر نبی و مرسل میں ایک نہ ایک شان ایسی پائی جاتی ہے جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اور ان کی ایک ایسی غیر منفک صفت ہے۔ جو ان کی دیگر صفات پر عرضِ لازم کی طرح ان کے نام کے ساتھ ساتھ ذہن میں متصور ہو جاتی ہے۔ مثلاً حضرت ایوبؑ کا صبر و شکر، حضرت یوسفؑ کا حسن و جمال، حضرت سلیمانؑ کی حکومت و فرمانروائی۔ اور حضرت عیسیٰؑ کی شانِ درویشی وغیرہ۔ لیکن تاجدارِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مشکل سے کوئی مابہ الامتیاز شئے بتائی جا سکے گی جو آپ کے اور دیگر صفاتِ حمیدہ پر اس درجہ غالب ہو جو انہیں روشن اور نمایاں نہ ہونے دیتی ہو۔ کیونکہ آپ ہر شان کے حامل اور ہر ایک صفت میں کامل ہیں۔ اور ہر ایک وصف آپ میں اس درجۂ کمال کے ساتھ موجود ہے کہ انتہائی باریک بین اور غواص نگاہیں بھی کسی خاص صفت کے بارے میں اپنا کوئی فیصلہ دینے میں عاجز ہیں۔ جس شعبۂ کمال کو غائر نظر سے دیکھا جائے وہی تمام صفات سے اکمل نظر آئے گا۔ لیکن جونہی دیکھنے والا

اپنی نظر ہٹا کر دوسری صفت کمالیہ پر ڈالے گا اسے کہنا پڑے گا۔ کہ میرا پہلا فیصلہ غلط تھا۔ دراصل یہ ہے وہ صفت جس کو ممیّز قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر پھر اسی مرکز پہ اپنی محققانہ نظر جمائے جہاں سے ہٹا کر دوسرے نقطے کی طرف گیا تھا۔ تو پھر دوبارہ اپنے فیصلے کی تردید کرنی پڑے گی۔ گویا متجسس اور غوّاص نگاہیں ہر وصف کی بابت ترجیحی فیصلہ دینے میں متحیر و ششدر رہ کر پکار اٹھیں گی۔ ع

ہر چند وصفت میکنم در حسن زاں بالاتری

یہی سبب ہے کہ جب ایک مؤرخ حضور علیہ السّلام کو اپنی مورخانہ نگاہ سے دیکھتا ہے تو آپ اس کو اپنے سے بالاتر بے مثل مؤرخ نظر آتے ہیں۔ ایک فلسفی اگر اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو آپ سے بڑھ کر اسے کوئی فلسفی نظر نہیں آتا۔ اگر ایک فرمانروا اور سیاستدان جب آپ کے حسن و تدبیر و تدبّر اور شانِ حکمرانی پر غور کرتا ہے تو آپ اسے عدیم المثال سیاستدان اور بے نظیر حکمران معلوم ہوتے ہیں۔ ایک درویش عارف جب آپ پر نگاہِ تحقیق ڈالتا ہے تو عرفان و درویشی میں آپ کی نظیر ناممکن سمجھتا ہے۔ ایک دلدادۂ فصاحت جب آپ کی فصاحت و بلاغت پر غور کرتا ہے تو اس فن میں بھی آپ کو اپنی مثال آپ ہی تصوّر کرتا ہے۔ غرضیکہ جس نے جس نگاہ سے آپ کو ٹٹولا، آپ اس کو اسی وصف میں کامل و اکمل نظر آئے۔ پس ماننا پڑے گا۔ کہ ایسی ہستی ہی ساری دنیا کی صحیح رہبر اور تمام عالم کے لئے اسوۂ زندگی اور نمونۂ عمل بن سکتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر حضور تاجدارِ مدینہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے سوا اور کسی میں بھی ساری کائنات کے لئے نمونۂ عمل بننے کی صلاحیت نہیں۔ اگر کوئی شخص ایک عادل مؤرخ اور ایک محقق مصنّف کی حیثیت سے تمام دیگر انبیاء و مرسلین اور مختارِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی پر

غور کرے تو اسے اقرار کرنا پڑے گا۔ کہ بجز رسول عربی علیہ السّلام اور کسی میں ایسی عملی جامعیّت موجود نہیں کہ وہ سارے عالم کے لئے اور ہر طبقہ کے انسانوں کیلئے نمونۂ عمل بن سکے۔ آپ کا شاہد، مبشر، نذیر داعی الی اللہ، سراجِ منیر، خاتم النبیّین ہونا۔ خلق عظیم پر تشریف لانا۔ اور آپ کے ہاتھوں پر اللہ کی نعمت کا اتمام، اور آپ کے ذریعہ تکمیل دین ہونا یہ سب کچھ اسی دعویٰ کی دلیل ہیں کہ آپ تمام عالم کے لئے رحمت اور ساری کائنات کے لئے آخری نبی مبعوث فرمائے گئے ہیں؛

ارتقائے انسانی میں حضور علیہ السّلام کا حصہ

اس میں ہرگز کلام نہیں کہ دُنیا کی دَورِ جدید کی متمدن اقوام نے متمدن ہو کر بھی ان کمالات کا اظہار نہیں کیا جو ان کے طبعی ارتقاء کے متوازی ہونے چاہیئے تھے۔ مثلاً رومی اور یونانی تمدّن میں انسانی عظمت و بزرگی کا معیار اس کے دل و دماغ کے کمالات نہ تھے بلکہ مصنفین کے قائم کردہ اصولوں کے مطابق ان کے نسبی اور جدّی تعلقات سے ان کی حیثیت قائم کی جاتی تھی۔ گو رومی اور ہندی تمدّن کے درمیان بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ مگر جائے حیرت ہے۔ کہ مُدّت دراز تک برہمنیت کی نام لیوا جماعتیں اپنی روایاتِ کی خوگر رہیں، اور انفرادی اخلاق کی جگہ نسبی تعلقات ہندو قوم کے افراد کا نشان امتیاز بنے اور اب تک بنے ہوئے ہیں۔ یہی کیفیت ایک عرصہ تک سامی طبقہ بنی نوع انسان پر وارد رہی۔ اور اسرائیلی دُنیا جس نے سب سے پہلے توحید الہٰی کا سبق سیکھا۔ اپنی اجتماعی زندگی کے اوّلین دَور میں اس اسوۂ دلپذیر کی جزئیات سے بے بہرہ ہوگئی، اور اس قدر بے بہرہ ہوئی کہ یہودی دُنیا کے درمیان ایک دائمی حدفاصل مقرر کردی۔ خطۂ حجاز کے شورہ پشت قبائل کی شورہ پشتی نے عدم مساوات کے باب میں جن جن ستم طرازیوں کا اظہار کیا ان کے بھیانک تذکار سے کتب تاریخ لبریز ہیں، پھر کیا یہ تعلیم اخوت و مساوات

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ معجزہ نہیں کہ حضور نے نہایت تھوڑی مدت میں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ چشم زدن میں ان پر معاندت قبائل کی ازلی رقابت کو ابدی اخوت میں تبدیل فرما کر ہمیشہ کے لئے ایسا بھائی بھائی بنا دیا۔ جس کی مثال نہیں ملتی۔

ترغیب علم

جس شد و مد سے شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّی محض ہونے کے باوجود تحریک و تبلیغ کسب علم و فن کا اظہار فرمایا، وہ بلاشبہ کسی اور ہادی کے حصّہ میں نہیں آیا۔ ہاں یہ صحیح ہے۔ کہ ہندوازم اور بدھ مت میں علم کو اپنانے پر زیادہ توجہ دی گئی۔ مگر ان ہر دو مذاہب کے مقتداؤں نے تحصیل علوم ایک مخصوص فرقے کا اجارہ قرار دے کر عامۃ الناس کے دل و دماغ کی خشکی کو دور کرنے کی کوئی راہ نہیں نکالی، حتّٰی کہ شودروں کو انسانیت سے گرا ہوا سمجھ کر ان کی سماعت میں مقدّس کتابوں کا پڑھنا پڑھانا ممنوع قرار دے دیا۔ اور ایسے لوگوں سے چھو جانے والا بھی عذاب الیم کا مستحق گردانا گیا۔ اس کو چھوڑیئے کیونکہ برہمن اور شودر نسبی اعتبار سے دو جداگانہ گروہ تھے۔ مگر حاملان انجیل کے لئے وہ کون سی مصیبت تھی۔ جو ان کے راہبوں اور قسیسوں اور عام اہل جہان کے درمیان ایک سنگین دیوار قائم کرنے کا موجب ہوئی۔ خود عیسائی مؤرخ مسٹر گبن کا بیان ہے۔ کہ دُنیا کو جہالت میں مبتلا رکھنے اور رفتار تمدّن کو غایت درجہ سست کرنے میں جو بد شوخی یورپ کے دورِ کلیسیت میں اہل کلیسا نے دکھائی وہ دُنیا کے کسی اور دور میں کسی اور جماعت سے ظاہر نہیں ہوئی۔ ان لوگوں نے نہ صرف شمع علم کو عوام کی نظروں سے اوجھل کیا۔ بلکہ علم کی ضرورت پر وعظ کہنے والوں کو دار پر کھنچوا دیا۔ آگ میں جلوایا۔ زبانیں نکلوا دیں اور ان کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیئے۔ تاکہ کسی کو بھی تحصیل و تبلیغ علم پر عامل ہونے کی جسارت نہ پیدا ہو۔

لیکن شارع اسلام ہادیٔ برحق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحصیل علم ہر ایک کے لئے نہ صرف دُنیوی فرض بلکہ مذہبی فرض قرار دیکر ہر مرد اور عورت کو اس کا حامل گردانا۔ اور کسب علم کو زندگی کے اولین لمحات سے لیکر دم واپسیں تک لازمی قرار دیا۔ ایک عالم باعمل کی دوات کی سیاہی کو ایک شہید کے خون کے برابر فرمایا۔ اور علم کے حصول کے لئے ہر ایک اجنبی سرزمین حتیٰ کہ چین تک تگ و دو کرنے کی تاکید فرمائی۔ اور سب سے پہلے خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس درس گاہ کا افتتاح فرمایا وہ مدینہ منورہ کا ایک مکتب تھا۔ جس میں سب سے اول حضرت مصعب بن عمیر معلم قرار پائے پھر ۲ھ ہجری میں اسیران بدر کا فدیہ ہی آپ نے یہ قرار دیا کہ ایک ایک خواندہ قیدی دس دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے اور آزادی کی ہوا کھائے

حقوق نسواں

آج کسی قوم کی ترقی و بلندی کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ معیار قائم ہو گیا ہے، کہ اس پر عورتوں کی حیثیت کو پرکھا جائے۔ اور اس قوم کے آئین میں عورت کی غلامی کی اور تعلیم و تجارت کی حالت کیا ہے؟

اس مسئلہ میں ہر قوم کے آئین کا جوں جوں گہری نظر سے مطالعہ کرتے جائیے توں توں وہ ناکارہ اور پسماندہ نظر آئے گی۔ اس لئے کہ اسلام نے عالم نسوانی اور اس کی حالتِ غلامی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے اس کی مثال کہیں بھی نہیں ملتی۔ ابتداء ظہور عالم میں انسان عام جانوروں کی طرح غول بن کر رہتے تھے۔ رشتہ جنسیت کے سوا کوئی رشتہ نہ تھا۔ حیوانوں کی طرح تقاضائے فطرت کو پورا کر لیتے تھے۔ اور جو اولاد ہوتی تھی سب کی مشترکہ ملکیت قرار پاتی تھی نہ کوئی شوہر تھا نہ بیوی۔ عورت اور مرد اپنی اپنی غذا و خوراک خود پیدا کرتے اور کھاتے کسی کا کسی پر بوجھ نہ تھا۔ سب سے پہلا انقلاب یہ ہوا کہ انسانوں نے زمین کو ملکیت قرار دینا شروع کیا اور یہیں سے انفرادیت کی شاخ پھوٹی اور اسی سے

علیحدگی جائداد کے ساتھ علیحدگی سکونت کا جذبہ پیدا ہوا۔ انسانی ضروریات میں عورت بھی نہایت اہم چیز تھی۔ اس لئے مردوں نے عورتیں مخصوص کرنی شروع کر دیں۔ اور عورتوں کی ملکیت تمدن عالم کے طلوع کا سبب بن گئی۔ اس لئے کہ عورتوں کی ملکیت کے ساتھ مکانوں کی ضرورت اور قبائل کی تقسیم بھی پیدا ہوگئی۔ عورتوں کی محنت اور کمائی کا سلسلہ بند ہوا۔ کیونکہ اب وہ امور خانہ داری کا رجحان رکھنے لگی تھیں عورتوں کی کفالت نے ایک مخصوص چیز یہ پیدا کر دی کہ وہ پوری طرح غلام نظر آنے لگیں۔ اور مردوں کی نگاہ میں ایک تفریح کا آلہ یا بچے پیدا کرنے کی مشین بن کر رہ گئیں۔ اور رفتہ رفتہ رفیق حیات سمجھنے کی بجائے مرد اپنی عورت پر ایک جابر حاکم بن گیا۔ دُنیا والوں نے بہت ترقی کی، مگر عورت کو جو ڈگری مل چکی تھی۔ اس میں کوئی رد و بدل نہ ہوا۔ رومیوں کی تہذیب شہرۂ آفاق مانی گئی۔ مگر عورت ایک پالتو بلی سے زیادہ اس میں بھی کوئی استحقاق نہ پا سکی۔ یونان میں انتہائی علم فلسفہ کی ترقی کے باوجود عورت جائداد منقولہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ اور علوم وفنون سے وہ محروم رکھی جاتی تھی۔ ایران میں بھی یہی حال تھا۔ ہندوستان میں ایک ہندو عورت کی حیثیت قطعاً ایک بے جان بت اور منو شاستر کی رو سے سانپ اور بچھو سے بدتر تھی۔ بیوہ ہو جانے پر نکاح ثانی کا حق سلب، جائداد و وراثت سے محروم اور صرف شوہر کی خدمت کے لئے مخصوص تھی۔ کثیر الازدواجی ان کی قسمت کا ایک اندوہناک باب بن چکی تھی۔ اور لوگ مویشیوں کی طرح عورتوں کو گھروں میں بھر رکھتے تھے۔ اور عیسائیت کی مہذب دنیا میں تو عورت اب تک ایسے جنجال میں جکڑی ہوئی ہے۔ کہ اس کو اپنا نام رکھنے کے بھی قابل نہیں سمجھا گیا۔ بچپن میں باپ کے نام سے اور شادی ہونے پر شوہر کے نام سے منسوب رہی۔ ترکہ اور وراثت تو درکنار اپنی ذاتی کمائی میں بھی اس کا کوئی حق اور حصہ نہیں۔

عرب میں عورت مرنے والے خاوند کی اولاد میں وراثت کے طور پر تقسیم

ہو جاتی تھی۔ بیویوں کی کوئی مقررہ تعداد نہ تھی۔ نہ ان کا کوئی حق تھا۔ وحشیانہ سلوک کی وہ حقدار اور بعض اوقات خاوند یا مالک کی مرضی پر واجب القتل قرار دی جاتی تھیں۔ دُنیا میں سب سے پہلے حضور علیہ السلام نے عورت کے حقوق قائم کئے۔ اور فرمایا تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ تم عورتوں کو میراث سمجھ کر ان پر جبراً قبضہ رکھو۔ ہاں اگر ان سے کسی بدکاری کا اظہار ہو تو ایسا کر سکتے ہو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اور اگر تمہیں کسی وجہ سے تمہاری بیوی ناپسند ہو تو عجب نہیں کہ جس کو تم ناپسند رکھ رہے ہو۔ اسی سے اللہ تمہیں خیر و برکت دے۔ عورتوں کو اذیت نہ دو اور نہ ستاؤ۔ گو عورتوں کو مردوں پر فوقیت حاصل ہے۔ مگر حقوق کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ وہ تمہارا لباس ہیں۔ اور تم اُن کا لباس ہو۔ مرد عورتوں کے نگران کار ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے۔ اور وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ گویا بانیٔ اسلام نے پہلی مرتبہ مرد و عورت کے حقوق برابر قرار دے کر عورت کی مالی حالت مستحکم کی اس لئے کہ عورت کی تحقیر اور پستی کی وجہ اس کی مالی بے چارگی بھی تھی۔ اسلام نے ہی یہ احسان فرمایا کہ عورت کو وراثت میں شریک کیا۔ اور وہ اپنے باپ۔ بھائی۔ خاوند۔ بیٹے کے مال و جائداد میں اپنے حصے کی وارث قرار دی گئی۔ اس کو اپنی جائداد کا مالک بنا دیا گیا۔ اس کو بیع و شریٰ۔ خرید و فروخت اور معاہدہ و انتظام کی پوری اجازت عطا فرما دی گئی۔ اپنے حق مہر پر اس کو اختیار دیا گیا۔ عبادت میں بھی عورت کو مرد کے برابر فرمایا اور عورت کی روحانی حیثیت بھی قائم کر دی۔ گویا عورت اب گھر کی ملکہ اور بنیادی حیثیت سے مرد کے برابر ہو گئی۔ وہ ذلیل لونڈی اور پالتو بلی کے درجہ سے نکل کر حقیقی معنوں میں رفیقۂ حیات بن گئی۔ جو اسلام سے پیشتر عملیات۔ مالیات، اقتصادیات اور عبادت میں قطعی کوئی حصہ نہ رکھتی تھی۔ لیکن اسلام نے عورت کے لئے ترقی و مساوات کے تمام دروازے

کھول دیئے۔ اور اس کے راحت وآرام کو معیار شرافت قرار دے کر صاف طور پر فرما دیا کہ شریف وہی ہے جس کا سلوک اپنی عورت کے ساتھ بہتر اور شریفانہ ہو۔

عورت کے مدارج

سرکار دو عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بے زبان اور غریب طبقۂ نسواں کی مظلومیت ملاحظہ فرمائی تو قوم کو پیغام دیا کہ مرد اور عورت ایک ہی اصل اور ایک ہی جوہر سے ہیں۔ اس لئے مردوں کو چاہیئے کہ عورت کو کمزور سمجھ کر اس پر حکمرانی کی نہ ٹھانے۔ اور اس پروردگار عالم سے ڈرے۔ جس نے دونوں کو ایک جان سے پیدا فرمایا ہے۔ مولا کریم نے تمام تر روحانی مدارج اور فلاح اُخروی میں عورتوں کو مردوں کے پہلو بہ پہلو رکھا ہے۔ اور کسی قسم کی تفریق نہیں فرمائی۔ قرب خداوندی کا انعام دونوں کے واسطے یکساں طور پر ہے۔ نجات اُخروی اور فلاح عقبیٰ کا مرد ہی اجارہ دار نہیں بلکہ دونوں میں سے وہ زیادہ مستحق ہے۔ جو زیادہ نیک کام کرے اور زیادہ متقی ہو۔ فطری جسمانی کمزوریاں اور تخلیقی خامیاں عورت کی ذلت کا تمغہ نہیں بلکہ اس کی نزاکت کا روشن پہلو ہیں۔ جن کا پایا جانا فاطر فطرت نے اس کے لئے ضروری سمجھا۔ اگر یہ اس میں نہ ہوتیں تو وہ چراغ خانہ نہ بن سکتی۔ قدرت نے اسلام میں جو مدارج اس کی کمزوریوں کے باوجود اس کو مرحمت فرما دیئے ہیں۔ وہ ایک اجمال ہے۔ جس کی تفصیل نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ تاکہ بخوبی واضح ہو جائے۔ کہ عورت کی مختلف سہ گانہ حیثیتوں میں علیحدہ علیحدہ بانئ اسلام نے اس کا کیا درجہ اور حق قائم فرمایا ہے۔

لڑکی کی حیثیت میں

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور علیہ السّلام نے فرمایا۔ جس کو مولا کریم نے لڑکیاں عطا فرمائی ہوں وہ ان کی باحسن وجوہ پرورش

کرے وہ لڑکیاں اس کے اور دوزخ کے درمیان آڑ بن جائیں گی، پھر ایک اور حدیث قدسی ہے کہ جس نے دو لڑکیاں پالیں وہ شخص اور میں جنت میں دو ملی ہوئی انگلیوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب ہوں گے، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ بہترین نیکی کیا ہے. کہ تیری لڑکی جو تیرے پاس آئی ہو اور تیرے سوا اس کا کوئی دستگیر نہ ہو تو تو اس کی دستگیری کر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السّلام نے فرمایا جس کو خداوند عالم نے لڑکی عطا فرمائی اور اس نے اس کو نہ زندہ دفن کیا اور نہ ہی اسکو ذلیل سمجھا اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دی وہ بہشت میں داخل ہو گا۔ اور ایک یہ بھی روایت ہے، کہ کوئی بال بچے دار شخص جب کوئی چیز بازار سے لائے تو واجب ہے کہ اس کی تقسیم کی ابتدا لڑکی سے کرے. کیونکہ جو لڑکی کو خوش رکھتا ہے۔ وہ گویا حق تعالیٰ کے ڈر کر روتا ہے۔ اور آتش دوزخ اس پر حرام ہو جاتی ہے۔

حضور کی خدمت میں حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا جب بھی حاضر ہوتیں تو حضور علیہ السّلام محبت سے کھڑے ہو جاتے اور حضرت سیدہ کا ہاتھ پکڑ کر چومتے اور اپنی جگہ بٹھاتے، کیا اس سے بڑی عزت کسی مذہب میں لڑکی کے لئے ممکن ہے، اس کے علاوہ سب سے زیادہ حق رسانی یہ ہے کہ لڑکی اسلام میں محروم الارث نہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے. کہ اللہ کریم تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت فرماتا ہے کہ ایک بیٹے کیلئے دو بیٹیوں کا حصہ ہے، اگر بیٹیاں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے واسطے دو تہائی اور ایک ہو، تو نصف کیا ادیان عالم اور اقوام دنیا میں کہیں بھی یہ تقسیم ملتی ہے؟ یہ وہ حیثیت ہے، کہ جس پر کسی بناوٹی نقد و نظر کی صورت معلوم نہیں ہوتی ؛

بحیثیت ماں کے

سوسائٹی میں عورت کی ایک اہم حیثیت ماں کی ہے جتنی اہمیت اور جتنا احترام حضور علیہ السّلام نے ماں کے متعلق فرمایا ہے وہ ایک نہایت بلند ڈگری ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ والدین کیساتھ بھلائی کا سلوک کر اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں ہی تیرے پاس بڑھاپے میں پہنچیں تو ان کے سامنے اُف بھی نہ کرنا۔ اور ان کے ساتھ سختی سے نہ بول۔ بلکہ نرمی سے ان کے ساتھ بات کر اور عاجزی کا بازو ان کیلئے جھکا دے اور ان کیلئے دعا کر۔ کہ اے رب ان پر رحم فرما جیسے رحم سے بچپن میں انہوں نے مجھے پالا۔

پھر حضور علیہ السّلام نے کن مؤثر الفاظ میں جاہل لوگوں کو سمجھایا ہے کہ دیکھو جنّت تمہاری ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے حضور علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ کہ حضور میں نے اپنی ضعیفہ ماں کو سات حج بیت اللہ شریف کے اپنے کندھوں پر سہارا کر کرائے ہیں۔ کیا میری طرف سے ماں کا حق الخدمت ادا ہو گیا ہے۔ تو حضور علیہ السّلام نے فرمایا ابھی تو تم اتنا معاوضہ بھی ادا نہیں کر سکے جتنا تمہاری ماں نے تمہیں کیلئے بستر سے اٹھا کر سوکھے کی جانب لیٹ گئی تھی۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے حاضر حضور ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے عرب کا فلاں ریگستانی علاقہ اپنی ضعیفہ ماں کو کندھوں پر اٹھا کر عبور کرایا ہے۔ اور میرے پاؤں گرم ریت سے آبلے پڑ کر زخمی ہو گئے ہیں۔ کیا میں نے اپنی ماں کا کوئی حق ادا کیا ہے فرمایا ہاں ممکن ہے کہ مولا کریم تیری اس محنت کو تیری ماں کے کسی درد کے اس چھوٹے سے جھٹکے کے عوض میں قبول فرما لے۔ جو تیری پیدائش کے وقت تیری ماں کو لگے۔ ایک صحابی ابی الطفیل بیان فرماتے ہیں۔ کہ میں حضور علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک عورت آئی۔ حضور علیہ السّلام نے اس کے لئے اپنی چادر مبارک بچھا دی اور وہ اس پر

بیٹھ گئی۔ آپ سے باتیں کرتی رہی، پھر جب وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ تو ہمارے عرض کرنے پر کہ یا رسول اللہ یہ بی بی کون تھیں۔ معلوم ہوا کہ آپ کی رضاعی والدہ تھیں اسی طرح کی ایک اور مثال حضور علیہ السّلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ حضور علیہ السّلام نے لوگوں کو نصیحت فرمائی کہ جب مصر کو فتح کرو۔ تو مصر کے رہنے والوں سے سلوک کا برتاؤ کرنا۔ اس لئے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی والدہ ہاجرہ اسی سرزمین کی تھیں۔ حضورؐ کی یہ ایک پیشینگوئی تھی جو پوری ہوئی، اور مصر والوں نے اپنے ساتھ فاتحین کا وہ سلوک دیکھا تھا جو لاجواب تھا۔ آخر ان سے نہ رہا گیا اور سوال کیا کہ اس قدر مہربانی کی کیا وجہ ہے۔ تو ان کو جواب دیا گیا جو اُوپر مذکور ہوا ہے۔ تو ایک پادری بول اُٹھا کہ پیغمبر کے سوا اور کوئی ہستی عورت کا ایسا احترام نہیں کر سکتی۔

قرآن کریم نے ماں باپ میں سے ہر ایک کو ترکہ میں سے چھٹا حصّہ اگر اس کے اولاد ہو۔ اور اگر اولاد نہ ہو اور وارث ہو ماں باپ تو ماں کو تیسرا حصّہ اور اگر اس کے بھائی ہوں تو ماں کو چھٹا حصّہ بعد وصیّت یا بعد ادائیگی قرض کے معیّن فرمایا ہے۔

بحیثیت بیوی عورت کی ایک اور اہم حیثیت بطور بیوی کے ہے اور اسی حیثیت میں عورت کی مظلومیّت بھی آشکارا ہے۔ اس لئے پہلا حکم خداوندی جو اس باب میں نازل ہوا یہ تھا کہ بیوی موجب تسکین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری جنس سے تمہارے واسطے تمہاری بیویاں بنا دیں۔ تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ۔ اور اسی نے تمہارے درمیان الفت اور محبت پیدا فرمائی۔ ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو، اور ان کو وہی کھلا۔ تم کو دو جو خود کھاؤ۔ اور ان کو وہی پہناؤ جو خود پہنو۔ اور ان سے درشتی سے پیش نہ آؤ۔ تمہارے ترکہ میں سے وہ چوتھائی حصّہ کی حقدار ہیں۔ اگر ان سے تمہارے ہاں اولاد نہ ہو۔ اور اگر ہو تو آٹھواں حصّہ کی مالک ہوں گی۔

گویا حضور ہی کی رحمت سے عورت کو یہ حق ملا ہے کہ وہ خود مختارانہ طور پر کسی جائداد کی قابض و مالک ہو سکتی ہیں۔ ورنہ حضور کی تشریف آوری تک وہ ایک ذلیل ترین چیز تھی۔

رحمت رسول علیہ السّلام میں کمزوروں کا حصّہ

جہاں آپؐ نے عورت کے ساتھ حسنِ سلوک کو سب سے بڑی نیکیوں میں ایک نیکی قرار دیا اور بار بار مَردوں کو تاکید فرمائی کہ ان کی دلجوئی تمہارا فرض ہے۔ بیوی کو اپنی آبرو کا لباس سمجھو۔ لڑکیوں کی تربیت کو موجب رحمت قرار دیا۔ اور والدہ کی حالت میں وہ قابل احترام ٹھیرایا کہ جس کے پاؤں کے نیچے جنّت ہو وہاں حضور کی رحمۃ للعالمینی نے تمام غربا کو بھی اپنی رحمت سے محروم نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ وہ غریبوں کے محب۔ مسکینوں کے ساتھی یتیموں کے والی۔ غلاموں کے مولیٰ۔ بیکسوں کے مددگار۔ کمزوروں کے سہارے بے آسروں کے آسرے۔ دردمندوں کی دوا اور ساری کائنات کے لئے مجسّم رحمتِ رحمٰن تھے۔

حضور علیہ السّلام ہمیشہ غربا؍ مساکین سے اس طرح پیش آتے تھے۔ کہ وہ لوگ اپنی غربت اور مسکنت کو موجب رحمت سمجھنے لگے تھے۔ اور امرا۔ کو حسرت ہوتی تھی کہ ہم کیوں غریب نہ ہوئے۔ اور آپ نے اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ فرما کر طبقۂ غربا۔ کو قابل فخر بنا دیا۔

حضور علیہ السّلام کی دعا ہوا کرتی تھی کہ اے میرے خدا مجھے مسکین زندہ رکھ مسکین اٹھا اور مساکین ہی کے ساتھ میرا حشر کر۔ ایک مرتبہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے یہ دعا فرماتے ہوئے سنا تو عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم اس کی کیا وجہ ہے۔ جو حضور ایسی دعا فرماتے ہیں۔ حضور نے فرمایا۔ اے عائشہؓ یہ دولتمندوں سے پہلے جنّت میں جائیں گے نیز ایک اور موقع پر حضور علیہ السّلام نے حضرت اُمّ المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا

کو یوں نصیحت فرمائی۔ اے عائشہؓ کسی مسکین کو اپنے دروازے سے نامراد نہ پھیر غریبوں سے پیار کر اور ان کو اپنے سے نزدیک کر تاکہ خدا و ند عالم تمہیں اپنے نزدیک فرمائے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا بیوہ عورت اور مسکین کے ساتھ سلوک کرنے والا ایسا ہے جیسا مجاہد فی سبیل اللہ۔ جیسا تمام رات نوافل پڑھنے والا اور دن کو روزہ رکھنے والا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ کہ ایک مرتبہ حضور علیہ السلام غربا مہاجرین کے ساتھ مل کر بیٹھے تو فرمایا کہ فقراء مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ امراء سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ اور حضور نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے جنت کے دروازے پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ اس میں زیادہ غربا و مساکین تھے۔ اور مالدار دروازہ پر روک دیئے گئے تھے۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم خدمت اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر تھے کہ آپ کی خدمت میں ایک قبیلہ کے لوگ حاضر ہوئے۔ جو سب کے سب اتنے غریب تھے کہ ان کے جسموں پر نہ کپڑا تھا نہ پاؤں میں جوتا۔ ننگے بدن ننگے سر اور ننگے پاؤں۔ حضور علیہ السلام ان کی حالت دیکھ کر سخت مضطرب ہوئے۔ عالم کرب و اضطراب میں آپ کبھی اندر تشریف لے جاتے اور کبھی باہر تشریف لاتے۔ چنانچہ اسی بیقراری میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا اور نماز کے بعد خطبہ میں ان لوگوں کی امداد و دستگیری کی طرف حاضرین کو متوجہ فرمایا۔ جب سب نے ان کی امداد کی تب حضور کا اضطراب رفع ہوا۔

حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یتیم کا مال موجب ہلاکت ہے۔ اور فرمایا سات باتیں موجب ہلاکت ہیں۔ ان سے بچو۔ حاضرین دربار نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ وہ کیا ہیں تو فرمایا ۱۔ خدا کے ساتھ

شرک کرنا۔ (۲) جادو کرنا۔ (۳) اس شخص کا قتل کرنا جو حرام کیا گیا ہو۔ (۴) سود کھانا۔ (۵) یتیم کا مال کھانا۔ (۶) جنگ سے بھاگنا۔ (۷) پاکدامن عورت پر تہمت لگانا۔ حضرت سہل روایت فرماتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ حضور علیہ السّلام نے انگشت شہادت اور وسطیٰ کو ملا کر فرمایا کہ میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنّت میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے۔

حضور علیہ السّلام یتامیٰ و مساکین کے علاوہ غلاموں پر خاص شفقت فرماتے اور ان کو آزاد کرنے میں نہایت سبقت کرتے۔ ان سے حسن سلوک کی بار بار تاکید فرمائی جاتی۔ نہایت محبت سے خود حضور علیہ السّلام نے تینتالیس ۴۳ غلاموں اور گیارہ لونڈیوں کو آزاد فرمایا۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔ کہ میں نے اپنے غلام کو ایک مرتبہ ماں کی گالی دی تو حضور علیہ السّلام نے سن کر فرمایا۔ اے ابو ذر کیا تم نے اس کو ماں سے غیرت دلائی ہے۔ تم میں ابھی جہالت کا اثر باقی ہے۔ یاد رکھو تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ ان کو خدا نے تمہارے قبضہ میں دے رکھا ہے۔ پس جس شخص کا بھائی اس کے قبضہ میں ہو۔ اس کو چاہیئے کہ جو خود کھائے اس کو بھی کھلائے۔ اور اپنے غلاموں سے وہ کام نہ لو جو ان پر شاق گزرے۔ اگر کوئی سخت کام ان سے لو تو خود بھی ان کی امداد کرو۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السّلام کا ارشاد ہے۔ کہ جو شخص اپنے غلام کو بقدر اپنے حصّے کے آزاد کرے اسے لازم ہے کہ اس کو اپنے مال سے پوری آزادی دلا دے۔ اور اگر وسعت نہ ہو تو کسی عادل سے اس کی قیمت لگوائے۔ مزدوری غلام سے کروائی جائے۔ لیکن جبر نہ کیا جائے۔ جو شخص کسی مسلمان غلام کو آزاد کرے۔ اللہ تعالیٰ اس آزاد کردہ ہر عضو کے عوض میں اس کا ایک ایک عضو دوزخ سے آزاد فرمائے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام زید بن حارثہ کو آزاد فرما دیا تھا۔ لیکن وہ حضور کی خدمت سے علیحدہ ہونا اور آغوش پدری میں جانا گوارا

نہ کرتے تھے۔ اور حضور ہی میں حاضر رہتے۔ ان کے بیٹے اسامہ سے آپ کو اس قدر محبت تھی کہ آپ فرمایا کرتے۔ اگر اسامہ لڑکی ہوتی تو میں اس کو زیور پہناتا۔ اور حضور خود اپنے دست مبارک سے اس کی ناک صاف کیا کرتے۔ ابو مسعود صحابی رضی اللہ عنہ ایک بار اپنے غلام پر برافروختہ ہو کر زدوکوب پر اتر آئے۔ تو اتفاق حسنہ سے سرکار دو عالم علیہ السلام ادھر تشریف لے آئے۔ فرمایا مسعود تم کو جس قدر اس غلام پر اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ تم پر اختیار رکھتا ہے۔ ابو مسعود نے مڑ کر دیکھا۔ تو حضور تھے۔ دست بستہ عرض کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم میں نے اس کو آزاد کیا۔ فرمایا اگر تم اس کو آزاد نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تم کو چھو لیتی۔ ایک دفعہ حضور نے دیکھا کہ ایک سوار آرہا ہے۔ اور اس کے پیچھے غلام بھاگ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو بھی سوار کر لو اور اپنے پیچھے بٹھالو۔ یہ بھی تمہارا بھائی ہے۔ اور اس کی روح بھی تمہاری روح کی طرح ہے۔ آپ نے ابوالہثیم کو ایک غلام مرحمت فرمایا اور تاکید فرمائی کہ اس سے نیک سلوک کرنا۔ ابوالہثیم غلام کو گھر لے گئے۔ اور بیوی کو صورت حالات سے آگاہ کیا۔ بیوی نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دو۔ چنانچہ غلام آزاد کر دیا گیا۔

غرضیکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غلاموں کا اس قدر خیال تھا۔ کہ آخر وقت میں بھی آپ نے غلاموں کے متعلق حسن سلوک کی وصیت فرمائی۔ اور فرمایا کہ اپنے غلاموں کے معاملہ میں خدائے قدوس سے ڈرتے رہا کرو۔ گویا اس مسئلہ میں اتنی تاکید تھی کہ حضور کے ارشاد سے آئندہ کوئی غلام بنایا جانا جائز نہ سمجھا جائے۔ آپ نے ہمیشہ مظلوموں کی دستگیری فرمائی۔ اور ظالموں کو ظلم سے باز رکھا اور مظلوموں کی آہ سے ڈرایا۔ کیونکہ ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔ ان کی آہ بلا روک ٹوک درگاہ الٰہی میں پہنچتی ہے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات

چیزوں کا حکم دیا۔ (۱) جنازہ کے ہمراہ جانا۔ (۲) مریض کی عیادت کرنا۔ (۳) دعوت قبول کرنا۔ (۴) مظلوم کی امداد کرنا۔ (۵) قسم کا پورا کرنا۔ (۶) سلام کا جواب دینا۔ (۷) چھینکنے والے کو جواب دینا۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو حضور علیہ السلام نے یمن کی طرف روانہ فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ مظلوموں کی فریاد سے ڈرنا، اور ان کی مدد کرنا۔

بوڑھوں کا اکرام

انسان کی پچھلی عمر اور ضعیفی کو ارذل عمر کہا گیا ہے۔ جس میں آدمی ہر طرح معذور ہو جاتا ہے۔ اور اسکی عمر کا یہ حصہ اتنا احتیاج آمیز ہوتا ہے کہ انسان بعض اوقات مصائب و تکالیف سے تنگ آکر خود موت کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ پیری جب مسلّط ہوتی ہے۔ اور تمام طاقتیں جواب دے چکتی ہیں تو اولاد تک کو ان کا وجود ناگوار اور ان کی زندگی بوجھل معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور ان کا گھر میں رہنا بھی دوبھر نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کا وقار قائم رکھنے اور اس کا شرف پہچاننے کے واسطے سرکار دو عالم نبی مکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام سنایا کہ مولا کریم نے بوڑھے مسلمان کے اکرام کو اپنا جلال بتایا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی خدمت، اس کی دلجوئی اولاد پر فرض کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔ کہ اگر تیرے ماں باپ سے کوئی یا دونوں تیرے پاس بڑھاپے کو پہنچیں تو وہ خواہ تیری طبیعت کے خلاف کتنا ہی عمل کریں۔ ان سے اُف بھی نہ کہنا۔ اور نہ ان کو نا اُمید کرنا۔ اور ان سے ہر بات نرمی سے کر اور ان کے لئے دعا مانگ کہ الٰہی ان پر رحم فرما۔ جیسے انہوں نے مجھے کمزوری میں پرورش کیا اور رحم فرمایا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ تم کو روزی اور مدد تمہارے بوڑھوں اور کمزوروں کی بدولت دی جاتی ہے۔ گویا بوڑھوں کی خدمت خدائے پاک کے رحم کا وسیلہ ہے۔ اور والدین کی دعا ایک وہ مؤثر شئے ہے۔ جو ہر آن رحمت الٰہی کے زیرِ سایہ رکھ دیتی ہے۔

سرکار کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں پر بھی نہایت شفقت فرماتے تھے۔ آپ کو جو بچے راستہ میں چلتے ہوئے بھی ملتے اور آپ سوار ہوتے تو ان میں سے بھی کسی کو اپنے ساتھ سوار فرما لیتے۔

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ ایک دیہاتی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کرنے لگا۔ کہ آپ تو بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور ان کو بوسہ دیتے ہیں۔ ہم تو ایسا نہیں کرتے۔ حضور علیہ السّلام نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے تیرے دل سے رحمت سلب کر لی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ جب بچوں کے پاس سے گزرتے تو ان پر سلام کہتے اور فرماتے کہ حضور علیہ السّلام ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

بعض اوقات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے مزاج کا اسقدر خیال فرماتے کہ اگر یاد الٰہی میں بچے پاس آکر شوخی کرتے یا آپ کے اوپر چڑھ جاتے تو بھی آپ ان کی دل شکنی گوارا نہ فرماتے۔ چنانچہ حضرات حسنین علیہما السلام کے ایسے کئی ایک واقعات مشہور ہیں۔ کہ سجدے میں گئے ہوئے حضرت کی پشت مبارک پر صاحبزادے بیٹھ گئے۔ اور جب تک وہ خود نہیں اترے۔ آپ نے سجدہ سے سر مبارک نہیں اٹھایا۔ اسی طرح حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے امامہ بنت زینبؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت روایت ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ اور امامہ بنت زینب یعنی اپنی نواسی کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ بچی ابوالعاص بن ربیعہ بن عبد الشمس کی بیٹی تھی۔ چنانچہ جب نماز پڑھتے ہوئے حضور سجدے میں جاتے تو اس کو اتار لیتے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر کندھوں پر اٹھا کر کھڑے ہوتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں۔ حضور علیہ السّلام نے فرمایا کہ میں نماز شروع کرتا ہوں۔ اور ارادہ کرتا ہوں کہ قرأت لمبی کروں۔ کہ دفعتہً صف میں سے کسی بچے کے رونے

کی آواز آنے لگتی ہے، تو میں قرأت کو مختصر کر دیتا ہوں، تاکہ بچے اور بچے والی کو تکلیف نہ ہو۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام جب موسم کا کوئی نیا میوہ آتا تو آپ تقسیم فرماتے۔ وقت حاضرین میں سے پہلے بچوں کو دیتے۔

بچوں کی اصلاح اور بچوں کو سدھارنے کے لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدنی سزا کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اور خاص کر منہ پر مارنے سے قطعی طور پر روکا ہے اور اولاد کی درستئ اخلاق کے لئے دعا کو بہترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ ایسے ہی اولاد کے قتل کرنے کے مذموم کام کو سختی سے روکا۔ جو اہل عرب کی اکثر عادت بھی رکہ وہ لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ اور ایسے فعل سے بچنے کو موجب تسکین فرمایا۔ چنانچہ پیدا ہونے سے قبل اولاد کے لئے کثرت سے دعا مانگنے کا حکم دیا کہ اولاد آنکھوں کا سکھ، دل کا چین اور کلیجہ کی ٹھنڈک ثابت ہو۔

بیماروں سے سلوک

بیمار خواہ کیسے ہی مرض میں مبتلا ہو نہایت بے کس، مجبور اور قابلِ رحم حالت میں ہوتا ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طبقہ کی بڑی ہمدردی کی ہے اور بیماری جیسی مایوسی کی حالت میں بھی انسان کی وہ ڈھارس بندھائی کہ وہ اس مصیبت کو بھی رحمت الٰہی سمجھ کر شکر کرنے لگا۔

سرکار جہاں پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماروں کی بیمار پرسی کی حد سے زیادہ ترغیب دلائی ہے۔ تاکہ آدمی کو آدمی سے انتہائی الفت و ہمدردی ہو۔ اور بیمار مسافرت میں بھی ہوتے ہوئے کس مپرسی کی حالت میں تکلیف نہ اٹھائے۔ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی عیادت کو بھی تشریف لے جاتے تھے۔ چنانچہ مشہور روایت ہے کہ ایک مسجد کا جاروب کش بیمار ہو گیا تو آپ بار بار اس کی بیمار پرسی کو تشریف لے گئے۔ اور جب وہ فوت ہوا تو رات زیادہ جا چکی تھی۔ لوگوں نے آپ کو تکلیف نہ دینے کی غرض سے بلا اطلاع کئے اس کو

دفن کر دیا۔ آپ کو صبح اطلاع ہوئی تو آپ نے اظہار ناراضگی فرمایا۔ اور قدم رنجہ فرما کر اس کی قبر تک تشریف لے گئے اور نماز جنازہ پڑھی۔

حضور علیہ السلام کی عادت مبارک تھی۔ کہ ایسے بیماروں کو جو زیادہ تکلیف اور خطرناک حالت میں ہوں، اپنے کاشانۂ رحمت کے قریب لے آتے۔ تاکہ ہر لحظہ اس کی خبرگیری اور دلجوئی ہو سکے۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جب غزوۂ احزاب میں زخمی ہوئے تو حضور علیہ السلام نے بدیں سبب ہی ان کا خیمہ مسجد میں نصب کرا دیا۔

حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور جب کسی مریض کی عیادت کو تشریف لے جاتے تو اس کے پاس یہ دُعا فرماتے۔ اے مولا کریم لوگوں کا خوف دُور کر۔ ان کو شفا عطا فرما۔ کیونکہ شفا عطا فرمانے والا تو ہی ہے، اور شفا در اصل تیری ہی شفا ہے۔ جو کسی بیماری کو نہیں چھوڑتی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے ایک مرتبہ خدمتِ والا میں حاضری دی۔ اس وقت سرکار کی طبیعت علیل تھی، اور بڑی شدت کا بخار تھا۔ میں نے عرض کیا۔ کہ حضور کو نہایت تیز بخار ہے۔ شاید اس لئے کہ حضور کو دوہرا اجر ملے گا۔ فرمایا ہاں۔ اور بیشک کسی مسلمان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی، مگر خداوند عالم اس سے اس کے بدلے میں اس کے گناہ اس طرح گرا دیتا ہے جیسے خشک درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔

حیوانات پر رحمت

کائنات بھر کے رسول علیہ السلام کی بعثت سے قبل جو مظالم اس بے زبان طبقہ پر ہوتے تھے۔ اس کو دیکھ کر آپ کی رقیق القلبی اور رحمۃ اللعالمینی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے حضور علیہ السلام نے حیوانات پر نرمی کرنے اور ان پر رحم کھانے کے متعلق بار بار انسانوں کو تاکید فرمائی، اور حیوان ناطق کو ان کے مکروہ و مذموم اعمال پر شدت سے منع فرمایا۔ کیونکہ ان بے تہذیب انسانوں کا رویہ نہایت سنگدلانہ تھا۔ زندہ جانوروں کے بدن کا ٹکڑا کاٹ لینا۔ دُم اور بال قطع کرنا۔ جس سے جانور کو ایذا پہنچے، اپنے جانوروں کا آپس میں شرط اور بازی پر لڑانا۔ چند دل خوش کن مشغلے

تھے ۔ بعض اوقات جانوروں کو ایک جگہ باندھ کر نشانہ بازی کی مشق کرنا اپنی تفریح سمجھی جاتی تھی ۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن تمام بے رحمیوں کو روکا ۔ اور بندوں کو ہدایت فرمائی کہ ان پر رحم کرنا چاہیئے ۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور علیہ السّلام نے بیان فرمایا کہ جنّت میرے اس قدر قریب ہوگئی تھی ۔ اگر میں چاہتا تو اس کے خوشوں میں سے ایک خوشہ توڑ کر تمہارے پاس لے آتا ۔ اور دوزخ بھی میرے قریب ہوگئی تھی ۔ یہاں تک کہ میں نے کہا ۔ اے میرے پروردگار کیا میں ان لوگوں میں رکھا جاؤنگا کہ اچانک ایک عورت نظر پڑی ۔ جس کو ایک بلّی پنجے مار رہی تھی ۔ تو میں نے اس کا حال پوچھا تو لوگوں نے کہا کہ اس عورت نے بلّی کو باندھے رکھا تھا یہانتک کہ وہ بھوک اور پیاس سے مرگئی اور اس عورت نے نہ ہی اس کو کھلایا اور نہ پلایا ۔ اور نہ ہی اس نے اس کو چھوڑا ۔ تاکہ وہ خود کہیں سے کھا پی لیتی ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السّلام نے فرمایا کہ ایک بدکار عورت صرف اس بات پر بخش دی گئی کہ اس کا گزر جب ایک مرتبہ ایک کتّے پر ہوا جو مٹی چاٹ رہا تھا ۔ اور قریب تھا کہ اس کو پیاس ہلاک کردے تو اس عورت نے اپنا موزہ اُتارا ۔ اور اس کو اپنے دوپٹہ سے باندھ کر کنوئیں میں لٹکا کر پانی نکالا ۔ اور اس کتّے کو پلایا ۔ اس کارِ خیر کی وجہ سے وہ نجات پاگئی ۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا گزر ایک ایسی جماعت پر ہوا ، جو مرغی کو رسّی سے ایک جگہ باندھ کر نشانہ لگا رہے تھے ۔ آپ کو دیکھ کر سب منتشر ہوگئے ۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ یہ فعل کون کر رہا تھا ۔ تم یاد رکھو کہ ایسا کرنے والے پر اور جانوروں کے مثلہ کرنے والے پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے ۔

ایک مرتبہ ایک اونٹ راستہ میں آپ کی نظر پڑا ۔ جس کے پیٹ اور پیٹھ میں بھوکا رہنے کی وجہ سے کوئی فرق نہ رہا تھا ۔ آپ نے فرمایا ان بے زبانوں کے متعلق خداوند

عالم سے ڈرو۔ ایسے ہی ایک بار ایک گدھے کو دیکھا جس کا چہرہ داغا ہوا تھا۔ تو آپ نے فرمایا چہرہ داغنے والے پر خدا کی لعنت ہے۔

ایک حمّالی حضور علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جس نے اپنی چادر میں جانوروں کے کچھ بچے چھپا رکھے تھے۔ آپ نے اس سے دریافت فرمایا تو اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھاڑی سے آواز آرہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو یہ چھوٹے بچے تھے۔ میں نے ان کو اٹھالیا۔ ان کی ماں نے جب دیکھا تو سر پر منڈلانے لگی۔ حضور علیہ السّلام نے فرمایا۔ واپس جاؤ اور ان کو وہیں رکھ آؤ۔

ایک بار حضور علیہ السّلام جنگل کو تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شکاری نے ایک ہرنی پکڑ رکھی ہے۔ حضور نے فرمایا کہ یہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لئے جانا چاہتی ہے۔ اور التجا کرتی ہے کہ اس کو اجازت ہو تو یہ بچوں کو دودھ پلاکر واپس آجائے شکاری نے عرض کیا کہ حضور یہ جنگل کے جانور ہاتھ سے نکل کر واپس کب آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں ضمانت میں تمہارے پاس بیٹھتا ہوں۔ اسے جانے دو یہ واپس آجائیگی چنانچہ شکاری نے اس کو چھوڑ دیا۔ وہ بھاگی ہوئی گئی۔ اور جاتے ہی اپنے دو بچوں کو لیکر واپس آگئی کہ اللہ کریم کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میری ضمانت میں ہیں۔ آپ کو انتظار کی تکلیف نہ ہو۔ اس واقعہ سے شکاری مشرف باسلام ہوگیا۔ اور ہرنی کو بچوں سمیت رہا کردیا۔

غرضیکہ سرکار دوجہاں مختار کون و مکاں صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ایک وہ بے مثال زندگی ہے۔ جس میں بے شمار ایسے حقائق پوشیدہ ہیں۔ یتیموں پر شفقت۔ بیواؤں کی اعانت۔ بیماروں اور تنگدستوں کی دستگیری۔ جانوروں پر رحم کے واقعات اس کثرت سے ملتے ہیں کہ سیرت نبوی علیہ السّلام کا ہر مطالعہ کرنے والا ان سے ناواقف نہیں۔ نزول وحی کی ابتداء میں جب آپ بہت ہراساں تھے تو آپ کی رفیقۂ حیات حضرت اُم المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے آپ کو

ان الفاظ کے ساتھ تسکین دلائی کہ خداوند عالم جل شانہٗ آپ کو کبھی ہلاک نہیں فرمائیگا آپ صلۂ رحم فرماتے ہیں۔ مقروضوں کا بار اُٹھاتے ہیں۔ غریبوں کی اعانت کرتے ہیں مہمانوں کی تواضع میں حصہ لیتے ہیں۔ حق کی حمایت کرتے اور مصیبت میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ پھر حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جن سے زیادہ آپ کے پوشیدہ احوال کا جاننے والا اور کوئی دوسرا نہیں۔ آپ کے اخلاق کے متعلق ارشاد فرماتی ہیں۔ کہ آپ نے تمام عمر کسی کو اذیت نہیں پہنچائی۔ آپ نے ذاتی معاملہ میں کسی سے انتقام نہیں لیا۔ کسی کو بُرا نہیں کہا۔ اور کسی سے ترشروئی کے ساتھ پیش نہیں آئے۔ کسی حاجتمند کو مایوس نہیں فرمایا۔ اور عام معاملات تو درکنار سیاسی معاملات تک میں آپ کی شان رحمت کا یہی رنگ تھا۔ آپ نے اپنے ابنائے نوع کے لئے ایک ایسی تعلیم چھوڑی ہے جو دنیا و آخرت میں ان کو حقیقی مصیبت سے بچنے کے لئے بہترین وسیلہ ہے۔ جس پر عمل کر کے ہر انسان اپنا۔ اپنے اہل و عیال کا۔ اپنی قوم اور اپنے ابنائے جنس کا بلکہ تمام جاندار و بے جان مخلوقات کا اور سب سے بالاتر یہ کہ اپنے معبود حقیقی کا ٹھیک حق ادا کر سکتا ہے۔

پس جب تک یہ تعلیم دُنیا میں قائم ہے۔ جب تک اس کا پیرو دنیا میں زندہ ہے۔ جب تک اس کی جانب اہل جہان کو دعوت دی جارہی ہے۔ اور جب تک اس دعوت کے اصولوں سے دُنیا بالواسطہ و بلاواسطہ فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ اس وقت تک قرآن کریم کا یہ دعویٰ صداقت پر مبنی مانا جائے گا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ط

میثاقِ ازلی

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۔ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۔ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ؕ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ؕ (آل عمران) ترجمہ۔

اور جب اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہٗ نے تمام پیغمبروں سے ان کا عہد لیا کہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تشریف لائیں تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائیں تو تم ضرور بالضرور ان پر ایمان لانا، اور ضرور بالضرور ان کی مدد کرنا۔ فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور ہماری ذمہ لیا؟ سب نے عرض کی کہ ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ رہو، اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ پھر جو کوئی بھی اس کے بعد روگردانی کریگا تو وہ فاسقوں میں شمار ہوگا۔

فضائے نور میں ایک بزم نورانی کا انعقاد ہوا۔ خالق الکل جل شانہٗ بخود میر مجلس بنے۔ بسرِ عرشِ علیٰ نور والے کے نور کی وہ فراوانی ہوئی کہ انوارِ ربانی تمام عالم ارواح کو محیط ہوگئے۔ اس وقت نہ دنیا تھی اور نہ موجودات عالم کا کوئی وجودی منظر تھا۔ یہ شان مجلس آرائی حسن ادراک سے ارفع اور قیام ازل کی جلوہ فرمائی

خیال وگمان سے بالاتر ہو رہی تھی۔ ایسی خفیہ مجلس جس میں تمام مخلوق نوری وناری کی شمولیت ممنوع قرار دی گئی۔ اور قدوسیوں اور ملائکہ کو بھی شریک مجلس نہیں فرمایا گیا۔ اس لئے کہ یہ راز داردں اور ان ارواح نورانی انبیاء علیہم السلام کی جلسہ گاہ تھی۔ جن پر قیامت سے پرے تک کی وہ ذمہ داریاں ڈالی جانے والی تھیں جن میں معرفت الٰہی کے اسرار کا بار تھا۔ اور جن میں کفر وایمان کے تمام مسائل کے علاوہ ایک اس بے پناہ نور رسالت کے اقرار کا تذکرہ جو باعث تخلیق کون ومکان اور رسول خدائے جن وانسان تھا۔ جمیع انبیاء علیہم السّلام باادب حضورِ حق میں کھڑے ہیں۔ فضائے عرش رحمانی نور رب سے منور ہو رہی ہے۔ اور وہ مجلس میثاق سلطان رسالت ہے۔ جس میں کائنات بھر کے رسول مکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ لاثانی کا اعلان ہونے والا ہے۔ یکایک خلوت عرش بریں سے ایک صدا آتی ہے۔ اے گروہ مرسلین، اے جماعت انبیائے صادقین۔ اے انس وجان کے ہادیو، آج تم سے ایک مستحکم میثاق لیا جائیگا اور تم کو ایک محکم عہد کرنا ہوگا۔ لہٰذا اس کے لئے ہمارے حضور میں سجدہ ریز ہو جاؤ۔ اور میرے ارشاد پر کان لگاؤ۔ کہ ہم تم کو کتاب وحکمت کے اسرار مرحمت فرمائیں گے۔ اور صحائف نبوت ورسالت دیں گے۔ اور تم اپنے اپنے وقت میں کام کروگے۔ مگر یاد رکھو۔ اگر تم میں سے کسی کے وقت میں میرا وہ رسول خاص جس کے ظہور کے لئے یہ مجلس آراستہ کی گئی ہے تشریف لے آئے۔ اور تمہارے اوصاف رسالت ونبوت کی تصدیق کرے اور تمہارے علم وحکمت کا مصدق ہو تو اس میرے محبوب رسول پر بصدق دل ایمان لاؤ۔ اور بصد اخلاص اس کی نصرت وامداد کا وعدہ کرو۔ یہ فرمان خلاق دوعالم کا عنوان تھا۔ پھر غیب سے انبیاء کو ارشاد ہوا کہ کیا تم نے اقرار کرلیا۔ کیا یہ میثاق ازلی قبول ہے؟ سب نے بیک آواز عرض کی۔ ہاں یہ عہد خداوندی ہمیں منظور وقبول ہے۔ اور ہم ایسا ہی کریں گے۔ ارشاد باری ہوا تم اس کے لئے ایک دوسرے پر گواہ رہو۔ اور ہم بھی تم سب

پر یا تم سب کے ساتھ گواہ ہیں۔ حضرت آدم سے لیکر حضرت عیسٰی علیہم السّلام تک تمام انبیاء نے عہد فرمایا۔ اور سرکار دو عالم محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر معاہدہ میں حکم ربّانی کی تکمیل کردی۔ پھر جب حضور باری تعالیٰ میں معصوم ارواح کا یہ میثاق محکم ہوچکا تو آخر میں پھر حکم ہوا کہ اے انبیاء آگاہ رہو کہ اس اقرار کے بعد اگر کوئی معاہدہ شکنی کرے یا پھر جائے۔ تو وہ حضور حق میں فاسق سمجھا جائے گا۔

معاہدے تین قسم کے قرآن پاک میں مذکور ہوئے ہیں۔ پہلا معاہدہ مولا کریم نے اپنی ربوبیّت کا لیا۔ جس کا ذکر قرآن پاک میں بالفاظ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی سے مذکور ہے۔ دوسرا اظہار دین کا جو خاص علمائے کرام سے لیا گیا۔ جو آیت میں یوں ارشاد ہوا ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ۔ تیسرا عہد سرکار کائنات مختار شمش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی خدمت واطاعت کرنے کا جو بلا واسطہ سارے انبیاء ومرسلین علیہم السّلام سے اور بالواسطہ اُن کی اُمتوں سے لیا گیا۔ جس کو تین تاکیدوں سے مضبوط فرمایا۔ اوّل یہ کہ تمام انبیاء ومرسلین کو ایک دوسرے پر گواہ بنایا۔ دوسرے یہ کہ اپنی گواہی بھی ان کے ساتھ قائم فرمائی سوم یہ کہ اس عہد کی مخالفت پر سزا مقرر فرما کر متنبہ فرمایا اور اس میثاق کی تیسری تاکید میں اس طرح اظہار حقیقت کیا۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ یعنی رسالت ونبوّت جاتی رہے۔ اور فسق کی سزا ہو جائے۔ فسق لغوی معنوں کے لحاظ سے تقویٰ وپرہیز گاری سے نکل جانے کو کہتے ہیں۔ اور بعض جگہ مفسّرین نے فسق کے معنی اسلام سے نکل جانا بھی مراد لئے ہیں۔ جو کفر ہے۔ مگر یہاں یہ پہلے معنیٰ ہی مراد ہوں گے۔ کیونکہ انبیاء کرام علیہم السّلام شرک وکفر سے معصوم ہیں۔ یہ بھی دھیان رہے کہ اس سزا کے مقرر فرمانے سے صرف میثاق کا اہتمام مقصود ہے۔ ورنہ مرسلین علیہم السّلام کو شرک وکفر سے کیا واسطہ۔ ہاں بعض

مفسرین نے یہ معنی بھی لئے ہیں اور فرماتے ہیں۔ کہ اس عہد و میثاق خداوندی کے بعد نبی آخر الزمان سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے منہ پھیرنا کفر ہے۔ اور جو منہ موڑے گا کافر ہو جائے گا۔ پھر اس معاہدہ میں ایک لفظ اِصْرِیْ آیا ہے۔ جس کے معنی بوجھل اور بھاری ہونے کے ہیں۔ اور اس کو بھاری اس لئے فرمایا۔ کہ جب کوئی شخص دنیا میں آکر اپنی کوشش سے کوئی کام کرے اور اس پر کوئی جماعت متبع تیار بھی کر لے، پھر وہ محنت کا ثمرہ اُٹھانے سے قبل کسی دوسرے کی اطاعت میں وہ جماعت دینا ضروری سمجھے تو اس کے دل پر ایک بوجھ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی صورت انبیاء علیہم السلام کو بیان فرمائی۔ کہ جب میں اپنی کتاب یا صحیفہ اور اپنا علم و حکمت عطا فرما کر تمہیں سرفرازی بخشوں، پھر اس حال میں کہ تم تبلیغ کرو۔ اور تمہاری نبوت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہو۔ اور دنیا میں تمہارا کلمہ پڑھا جا رہا ہو۔ مخلوق کے قلوب میں تمہاری عظمت گھر کر چکی ہو۔ اور وہ سب سے آخری رسول ساری کائنات ارضی و سماوی و ما فیہا کا ہادی عرش و فرش کا مختار نبی احمد مجتبیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے پاس تشریف لے آئیں تو تم ان پر ایمان لاؤ۔ اور ان کا کلمہ پڑھو۔ اور اپنی تمام طاقت اپنی جماعت۔ اپنی شریعت۔ اپنی کتاب۔ اپنی تبلیغ سب کچھ چھوڑ کر اس کی اعانت و اطاعت میں لگ جاؤ۔ کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس بھاری ذمہ کو اُٹھاتے ہو؟ سب نے عرض کیا کہ اے مولا کریم ہم کو اس کا اقرار ہے۔ اور ہم اس کی پابندی کا عہد کرتے ہیں کہ ہم آپ کے اس بھاری معاہدہ پر مستقیم رہیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سرور کائنات مفخر موجودات مختار شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام کائنات کے رسول اور تمام رسولوں کے بھی رسول ہیں۔ اور حضور تمام انبیاء کے نبی اور تمام نبی آپ کے اُمتی ہیں۔ اور اسی لئے آپ کی امت تمام اُمتوں سے افضل ہے۔ ہم نے کسی دوسرے باب میں آپ کی بے مثل بشریت پر بحث کی ہے۔ مگر یہاں پر بھی یہ بتا دینا چاہتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام کی اپنی بے مثل ذات

کا تو مقام ہی الگ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور کو جو کچھ بھی ملا ہے وہ سب کچھ بےمثل ملا ہے۔ چنانچہ حضور کی ذات بےمثل، صفات بےمثل، رسالت بےمثل، کتاب بےمثل، معراج بےمثل، جماعت بےمثل، ازواج بےمثل، اولاد بےمثل، امت بےمثل۔ اگر بےمثلی کے ضمن میں باور نہ ہو تو قرآن کریم کا مطالعہ کیجئے۔

۱۔ آپ کی ذات وصفات کی بےمثلی پر سارا قرآن شاہد ہے اور یہ میثاق جس میں مولا کریم بھی حضور کی فضیلت وبلند مدارج پر گواہ ہیں۔ ایک روشن دلیل ہے۔

۲۔ رسالت تامہ دمستقلہ کی بےمثلی بدیں وجہ مسلمہ ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین اس معاہدہ کی رو سے آپ کے امتی اور زیرنگیں ہیں۔ اگر آپ کی رسالت کو یوں تسلیم نہ فرماتے۔ کسی کو نبوت و رسالت نہ ملتی اور نہ کوئی اس درجہ کا مستحق سمجھا جاتا۔

۳۔ کتاب کی بےمثلی پر کتاب کا اپنا دعویٰ شاہد ہے فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ۔ اگر اس کی مثل ہوتی تو آج تک لاکھوں بےمثلی منہ چڑانے کو میدان میں نکل آتے۔ مگر غیر عربوں کی حیثیت کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ یہ وہ بےمثل کلام ہے۔ جس کے سامنے عرب کے فصحاء نے سجدے کئے اور پکار اٹھے کہ مَا هٰذَا کَلَامُ الْبَشَرِ

۴۔ معراج کے متعلق ارشاد ہوا۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ اور مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی یعنی معراج دی اور قرب خاص سے ایسا نوازا اور دیدار سے اس طرح سرفراز فرمایا۔ جس کی مثال کسی نبی کے قرب میں نہیں ملتی۔ اور فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی نے تو مکالمہ بالمشافہ کو سب کچھ اور سب سے صیغہ راز میں رکھ کر ثابت کر دیا کہ محبوب و محب کی گفتگو کسی دوسرے کو سننے کا حق ہی نہیں بےمثل ذات کے رازوں کو اس کے بےمثل محبوب ہی پا سکتے ہیں۔

۵۔ امت کی بےمثلی پر کیا مزید ارشہادت ہے کہ۔ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ یعنی اے میرے محبوب کے امتیو ہمارا انبیاء کا معاملہ تو الگ ہے۔ ہم نے تو تم کو بہترین امت لوگوں کے لئے بنایا ہے۔

۶۔ حضور علیہ السّلام کی ازواج مطہرات اور مومنوں کی مائیں بھی اپنی حقیقت

وحیثیت اور شان و آن میں بیمثل ہیں جن کے لئے حکم ہوتا ہے۔ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ. کیا کوئی گستاخ بتا سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی عورت اس شان کی حصہ دار ہے۔ اور کیا قرآن پاک نے حضور علیہ السّلام کی طفیل ان تمام درجات میں حضور علیہ السّلام کی ازواج مطہرات اور حضور کی تمام متعلقات کو ہر ماسوا اللہ سے بیمثل نہیں رکھا؟

الغرض اس معاہدہ کی غرض وغایت ہی یہی تھی۔ کہ اپنے محبوب علیہ السّلام کی ساری کائنات کے افضلوں پر افضلیت ثابت کی جائے اور جہان بھر کے راہنماؤں کا رہنما بنایا جائے۔ کیونکہ حضور ہی کی طفیل تمام راہنما راہنما بنے۔ اور حضور علیہ السّلام ہی کی تصدیق سے سب کی سچائی پر اظہار سچائی ہوا۔ اور حضور ہی نے ان پر ایمان لانا فرض فرمادیا۔ کیونکہ سب کتابوں میں حضور علیہ السّلام کی پیشینگوئیاں درج تھیں اور حضور ہی کی تشریف آوری اور رسالت نہ کسی زمانہ کی منتہ تھی اور نہ کسی جگہ و کسی مقام سے متعلق۔ نہ کسی قوم سے وابستہ۔ ساری خلقت کے رسول تھے۔ اور عرش و فرش پہ ہر جگہ ان کا سکہ جاری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ معاہدہ میں حضور کی تشریف آوری کا وقت مذکور نہیں ہوا۔ بعض معترضین نے یہاں لفظ رسول پر ایک نئی جدت نکالی ہے کہ یہ سارے پیغمبروں کا عہد ہے۔ جس میں خود حضور علیہ السّلام بھی داخل ہیں۔ یعنی ہر ایک سے کہا گیا کہ اگر تم کسی ایک دوسرے کا زمانہ پاؤ تو ایمان لانا۔ مگر یہ جدت ایسی ہے۔ کہ اس قول کی بنا پر آیت میں بہت سی تاویلیں کرنی پڑیں گی۔ جو بعیدانہ مطلب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ازروئے علم خود بخود پتہ چل جاتا ہے۔ کہ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ۔ میں لفظ رسول پر تنوین عظمت کی ہے۔ جس سے مراد صرف سرکار انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ عظیم الشان نبی اور ساری کائنات کے مطلق رسول حضور علیہ السلام ہی ہیں۔ اسی لئے کوئی ہم زمانہ پیغمبر دوسرے پیغمبر پر ایمان نہیں لایا۔

اسی طرح بعض نے ایک اور پخ لگائی ہے اور کہتے ہیں کہ مولا کریم کو پتہ تھا۔ کہ حضور

علیہ السلام یعنی میرے محبوب خاص سب سے آخر میں تشریف لے جانے والے ہیں اور کسی نبی کے زمانہ میں بھی نہیں جائیں گے۔ تو پھر اس عہد کے معنے کیا ہوئے۔ مگر وہ حکمت الہٰی کو نہیں سمجھ سکے۔ اس لئے یہ نئی بات پیدا کرنے میں جہالت سے کام لینے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مصدق وہی ہو سکتا ہے جو سب سے بعد میں تشریف لائے۔ خیال رہے کہ اگلا نبی پچھلوں کی بشارت دے گا، اور پچھلا نبی پہلوں کی تصدیق کرے گا۔ چنانچہ آدم علیہ السلام سب کے مبشر ہیں کسی نبی کے مصدق نہیں اور حضور علیہ السلام سب کے مصدق ہیں مبشر کسی کے نہیں۔ کیونکہ حضور کے بعد نبوت ختم ہے۔ اور درمیان کے پیغمبر اگلوں کے مصدق اور پچھلوں کیلئے مبشر ہوئے ہیں۔ اور عیسٰی علیہ السلام کا یہ ارشاد مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗ اَحْمَدُ ط اس بات پر دلیل ہے۔ اور سب کا مصدق ہونا حضور علیہ السلام ہی کی صفت ہے۔ یہاں سے مسیح علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کی بھی وجہ معلوم ہو گئی۔ کہ مسیح علیہ السلام مبشر ہو کر تشریف لائے اور مصدق ہونے کی حیثیت پانے کو چرخ چہارم پر اٹھائے گئے۔ تاکہ وہ ایک مستقل رسول اور مستقل کتاب کے مالک اور مبشر رسول ہونے کی حیثیت سے دوبارہ نزول فرما کر رسول علیہ السلام پر ایمان لائیں۔ اور اپنی کتاب و شریعت کو چھوڑ کر اعانت کا عہد پورا کریں۔ تاکہ ان کی مصدق ہونے کی حیثیت بھی ظاہر ہو جائے اور مولا کریم کے میثاق ازلی کی تعمیل میں عدم تکمیل کا شبہ نہ رہے۔ اگر مسیح علیہ السلام کو اس غرض و غائیت کے لئے نہ اٹھایا جاتا۔ تو نعوذ باللہ میثاق ازلی پر لغو ہونے کا سوال پیدا ہو جاتا۔

کیونکہ اگر کوئی مستقل شریعت و کتاب کا مالک نبی موجود نہ ہوتا۔ اور حضور علیہ السلام کی تصدیق نہ کرتا۔ تو اس عہد کی کوئی محکم حیثیت نہ رہتی۔ مسیح علیہ السلام کے زندہ اٹھائے جانے اور دوبارہ نزول فرمانے کا یہی مقصد سمجھ میں آتا ہے۔ اور یونہی

قانون قدرت کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے۔

نیز مسیح علیہ السّلام کے آسمان پر اُٹھائے جانے اور دوبارہ تشریف لاکر حضور علیہ السّلام پر ایمان لانے میں ایک نہایت لطیف اشارہ قرآن کریم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مسیح علیہ السّلام قیامت کے نشانوں میں سے ایک نشان ہیں۔ گویا قیامت کے اور مسیح کے درمیان اور کوئی پیغمبر حائل نہیں۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آ سکے۔ ورنہ مسیح کا نزول اگر نہ ہوتا ہوتا تو حقیقت یہ ہے کہ حضور علیہ السّلام خود قیامت کے نشانوں میں سے ایک نشان ہوتے۔ کیونکہ مسیح علیہ السّلام کی نبوت کے زمانے اور قیامت کے وقت کے درمیان حضور علیہ السّلام ہی موجود ہیں۔ اور مسیح اسی صورت میں قیامت کے نشانوں سے نشان ہو سکتے ہیں۔ جب وہ حضور علیہ السّلام کے زمانہ میں تشریف لائیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر آپ کے لئے اعانت ونصرت کے میثاق کی تعمیل فرمائیں۔ اس بحث سے سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کی تفسیر کی بھی تائید ہو جاتی ہے۔ جو آپ نے فرمایا ہے۔ کہ دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے حضور علیہ السّلام پر ایمان لانے کا عہد لیا۔ پھر ان پیغمبروں نے اپنی قوم سے عہد لیا۔ کہ اگر تم ان کا زمانہ پاؤ۔ تو ان پر ایمان لانا اور انکی خدمت کرنا۔

اب یہاں یہ ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کہ مسیح علیہ السّلام کا تشریف لانا جو مذکور ہوا ہے۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ مغالطہ کھایا کہ مسیح تو صلیب دیا جا چکا ہے (حالانکہ یہ عقیدہ عیسائیوں کا ہے) تو اب جس مسیح کے دُنیا میں حضور علیہ السّلام کے بعد تشریف لانے کا ارشاد ہے۔ وہ کوئی مسیح دوسرا ہوگا۔ جو اس خدمت کو انجام دے گا۔ جو اس معاہدہ کی رُو سے اس کے ذمّہ ہو سکتی ہے۔ یعنی سرکار انبیاءؑ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور مدد کرنا۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھ سکے۔ کہ حضرت مسیح علیہ السّلام کی نسبت جہاں بھی ذکر قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں مذکور ہے۔ اس سے مراد مسیح ابن مریم ہی لئے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے علاوہ کسی دوسرے مسیح کا کوئی ذکر نہیں۔ اور جہاں کہیں کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ میں ذکر

آیا ہے اس کے ساتھ دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک مسیح ابن مریم اور دوسرا مسیح موعود۔ اور یہ دونوں لفظ ایک ہی ذات کے لئے بولے گئے ہیں۔ یعنی مسیح ابن مریم ہی مسیح موعود ہیں۔ کیونکہ جس مسیح کے دوبارہ آنے کا وعدہ دیا گیا ہے۔ وہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔ اور وعدہ ہمیشہ اسی ذات کے لئے دیا جاتا ہے جو دوبارہ مذکور ہونے سے قبل متعارف ہو۔ یعنی جس سے ذکر کیا جائے وہ ذکر سے پہلے بھی اس سے تعارف رکھتا ہو۔ اور اس مسئلہ میں اگر کوئی متعارف مسیح ہو سکتا ہے تو وہ مسیح ابن مریم ہی ہے اور اُسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اسی کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور اسی کو مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ پھر مسیح موعود کوئی دوسرا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ جس سے جہان والے واقف ہی نہیں۔ اور نہ اس میں مسیح علیہ السلام کے نشانات پائے جائیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جو مسیح موعود کے نام پر غیر متعارف ہستی دنیا میں دعویٰ کرے جس کا ذکر پہلے قرآن وحدیث میں نہ ہو۔ اور اس میں صفات مسیح علیہ السلام کے نشانات بھی نہ پائے جاتے ہوں تو وہ کاذب ہے۔ بعض نے یہ آڑ لے کر مسیح کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی ہے۔ کہ وہ اتنا عرصہ ہوا نہیں آیا۔ اگر آنا ہوتا تو آ نہ جاتا! لہٰذا جس کا وعدہ دیا گیا ہے وہ ہم ہی ہیں۔ تو اس تاخیر کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اس کی تاخیر سے اسکی خصوصیت اور انتظار ہی ختم ہو جائے گی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک مسافر کہیں جانے کے لئے سفر کا ارادہ کر کے ریلوے سٹیشن پر پہنچے اور اس کو پتہ چلے کہ جہاں وہ جانا چاہتا ہے وہاں کی گاڑی میں دیر ہے۔ تو وہ انتظار کرنے کی بجائے یہ کہہ کر کہ سٹیشن پر کون انتظار کرے کسی دوسری جانب کی گاڑی پر جو تیار ہے چڑھ جائے۔ تو کون عقلمند ایسے جلد باز مسافر کو عقلمند سمجھے گا۔ اور کون یہ اندازہ لگائے گا۔ کہ اس کی یہ غلط روی اس کو اس کی منزل مقصود پر پہنچا سکے گی۔ ایسی بے سمجھی کی بھی حد ہوگئی ہے کہ اللہ کی مرضی کے خلاف مسیح علیہ السلام کے پانے میں اتنی جلد بازی سے کام لینا کہ اگر مسیح کو اللہ تعالیٰ کے علم میں دنیا پر تشریف لانے میں دیر ہے۔ تو اس عرصہ میں جو بھی مدعی کاذب سامنے آجائے۔ اسے ہی مسیح موعود مان لیا جائے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ

الّا باللہ۔ کیا خداوند عالم کا نظام کائنات (نعوذ باللہ) اتنا ہی لبودا ہے۔ کہ وہ مسیح کی ضرورت کا وقت اپنے علم کے باعث نہیں سمجھ سکتا۔ بریں عقل و دانش بباید گریست یہاں مسیح علیہ السّلام کی تشریف آوری پر بحث کرنا مقصود نہیں ورنہ بتا دیا جاتا۔ کہ اس حقیقت میں اہل ایمان کیونکر تحقیق رکھتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ یہ میثاق اظہار رسالت رسول اللہ اور شان رسول اللہ اور جاہ و جلال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھا۔ تاکہ آپ کا شرف و مجد تخلیق دو عالم سے پہلے انبیاء و مرسلین مان لیں اور اسی ذکر حضرت کی پہلی انجمن میں مولا کریم اپنے کریم محبوب کی شان بیان فرما کر وجود عالم میں آنے والوں کو شناسائی کرا دیں۔ اسی بنا پر خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم اُس وقت بھی نبی تھے۔ جب آدم علیہ السّلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔ یا آب و گل کی جسدی منازل طے کر رہے تھے، اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ ہم اللہ کریم کے نزدیک تمام اوّلین و آخرین سے افضل ہیں ؛

مُبشّرات

حق و صداقت میں کچھ ایسی مقناطیسی طاقت و ولیعت ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنی تاثیر کے لحاظ سے قلوب و ارواح کو خود بخود اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، بشرطیکہ قلوب و ارواح پر فطری حجابات نہ ہوں، اور کسی خاص جذبے یا عقیدے نے ان پر تقلید آبائی اور تعصب کے سبب سے علوم اور حقائق تک راہنمائی کے دروازے بند نہ کردیئے ہوں۔ کیونکہ فطرت صحیحہ کو جو چیز مسخ کرتی ہے، اور قلب کے آئینۂ جہان نما کو زنگ آلود کردیتی ہے۔ وہ صرف تعصب ہے۔ جیساکہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ ہر ایک قلب باعتبار اپنی فطرت کے حقائق اشیاء کے دریافت کرلینے کی صلاحیت و استعداد رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک امر ربی ہے، اور تمام جواہر عالم پر اپنی اس شرافت و خاصیت کی وجہ سے فوقیت رکھتا ہے۔ اور اس کی اس صلاحیت و استعداد کی طرف یہ آیہ مبارکہ اشارہ بھی کرتی ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ .... الآخر۔ یعنی یہ استعداد آسمان میں ہے نہ زمین میں اور نہ پہاڑوں میں، مگر اس کا کیا علاج کہ تعصب کو فطرت صحیحہ کے لئے حجاب اور علوم و ادراک کے ادراک کی راہ میں روک بناکر کسی دوسرے مذہب یا انسان کی کسی خوبی کے اعتراف اور کسی حقیقت کے تسلیم کرنے کی مطلق گنجائش ہی نہ سمجھی جائے۔

چونکہ تعصب اور تنگ دلی کا اندھا جوش کسی حقیقت اور سچائی تک پہنچنے نہیں دیتا۔ بنابریں اگر غیر مذاہب والوں سے اسلامی تعلیمات اور بانیٔ اسلام کی ذات وصفات کے متعلق اچھی رائے کا اظہار کرنا۔ اور ان کی خوبیوں کا معترف ہونا ثابت ہو جائے۔ تو یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی صداقت کا وہ روشن اور مہتم بالشان ثبوت ہے، جو متلاشیان حق و صداقت کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔ درحقیقت

سچائی وہی ہوتی ہے، جس کا اعتراف دشمن بھی کرے۔

مسلمان علماء اور فقراء میں ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے۔ جو ہندو مذہب اور اس کی مقدس کتابوں کے متعلق اگر یقین کامل نہیں تو ظن غالب ضرور رکھتا ہے۔ کہ ان میں بھی کچھ نہ کچھ اصلیت ہے، اور وہ بھی خدا کے اس کارخانہ نشر و اشاعت سے واسطہ رکھتے ہیں، جہاں سے خداوند عالم نے اپنے رسولوں اور نبیوں، رشیوں اور اوتاروں کو دنیا میں ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ نے خداوند عالم کو بھلا دیا تھا۔ اور اس کے نبیوں کو خدا یا خدا کا بیٹا ماننا شروع کر دیا اسی طرح ہندوؤں نے بھی کچھ وقت گذرنے کے بعد خدا کے بھیجے ہوئے اولیاء اور ہادیوں کو جہالت سے خدا ماننا لازم سمجھ لیا اور رفتہ رفتہ ان کے یہ عقائد ان کو بت پرستی کی چوکھٹ پر لے گئے۔ مگر صوفیائے کرام نے اس خیال سے کہ توراۃ، زبور، انجیل میں باوجود تحریف و تنسیخ کے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیاں موجود ہیں تو کیا عجب ہے کہ ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں ان کے رشیوں کے احوال میں بھی اس جلیل القدر رسول کا تذکرہ پایا جائے۔ چنانچہ اس نظریہ سے جب اہل تصوف نے غور و خوض کیا تو وہ اس فیصلہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ کہ

۱۔ ہندوؤں میں کوئی پیغمبر ضرور کتاب لیکر آیا۔ لیکن بعد کو تصویر کشی سے متجاوز ہو کر یہ قوم بت پرستی میں مبتلا ہو گئی۔ یہ ارشاد حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جو ایک بڑے صوفی اور صوفیوں کی ایک جماعت کے راہنما گذرے ہیں۔

۲۔ اپنے ارشادات میں ایک دوسری جگہ بھی آپ تحریر فرماتے ہیں، کہ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ موجود ہے۔ اور نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

پھر اس تحقیق کے میدان میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اکیلے ہی نہیں ہیں، بلکہ حضرت مولانا شاہ عبد العزیز۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا عبد الرحمن چشتی عالم سنسکرت مؤلف مرآۃ المخلوقات، مولینا محمد حسن مؤلف تصدیق الہنود

وکشف الاستار وغیرہ۔ ومولوی طالب حسین نومسلم فرخ آبادی اور مولینا سیف اللہ گورکھپوری اور مولوی عبدالعزیز مؤلف بشارات احمدیہ سب متفق ہیں۔

بلکہ مؤلف کشف الاستار مولوی محمد حسن صاحب نے بنارس اور راجوچھیا میں ایک زمانہ تک ہندوؤں میں رہ کر تحصیل علوم وید کی اور بڑے بڑے فاضل اور پاک نفس برہمنوں اور خدارسیدہ سادہوؤں کی صحبت حاصل کر کے انہوں نے دیکھا کہ اکثر جنگلوں اور پہاڑوں میں تارک الدنیا جوگی کسی بڑی ہستی اور کسی تعریف کی گئی ذات کی یاد میں بھجن گاتے اور اس کی جے مناتے ہیں۔ چنانچہ جب انہوں نے اُترکھنڈی کا پاٹ کیا تو انہیں یہ مضمون ملا۔

(۱) کلنکی پران میں جس مُرسل اور اوتار کا ذکر ہے وہ مخلوق سے نہیں ڈرے گا نہایت شجاع اور عرفان والا ہو گا۔ (مہادیوجی)

(۲) ان (مہامت) کی وضع کو دیکھ کر لوگ حیران ہوں گے، نئی طرح کا ان کا احوال دیکھیں گے۔ اور جو پوجا اُن کی قوم کے لوگ کریں گے، وہ نہ کریں گے۔ اور اپنی قوم سے کہیں گے کہ مجھ کو اس قادر ایک ذات کا جس کا کوئی شریک نہیں حکم ہے کہ اس طرح کی بے معنی پوجا مت کرو۔ اور میں سوائے اللہ کی ایک ذات پاک کے اور کسی طرف رجوع نہیں کرتا۔ اور تم میری تابعداری کرو۔ اور ان کی قوم اس وجہ سے ساری کی ساری ان سے جُدا ہو جائے گی۔ (مہادیوجی)

پھر مولوی محمد حسن اپنی تصنیف کشف الاستار میں یوں بھی کہتے ہیں کہ اتھرین وید میں اللہ کا لفظ پایا جاتا ہے۔ اور حضور علیہ السلام کا اسم پاک بھی احمد اور محمد موجود ہے۔ جس کا اشارہ رکھ کھنڈ میں اس طرح ہے دسری تورم سرمُوداتی وکالی کماتی احمد نار دوہاتی)۔ اور یجروید میں یوں پڑھا گیا ہے۔

الانک نج الوجان محمد الانک کرمان جان میجان نندمائی جان جان نہاہی جیو سان کجان۔ ہم نے اکثر سادہوؤں اور فقیروں سے پوچھا کہ منزل فقر میں جب راستے طے کرتے ہو تو کیا کسی منزل میں پیغمبر عرب صلی اللہ علیہ وسلم کی راہنمائی

اور روشنی سے مدد ملتی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ چلتے چلتے ایک مقام ایسا آتا ہے۔ جہاں ہندو اور غیر ہندو کا فرق باقی نہیں رہتا۔ اور حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔ وہاں سے آگے ایک قدم بھی بغیر اقرار اور وسیلہ محمدؐ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں جا سکتے۔ چنانچہ سوامی سدھ گر صاحب نے رامائن کے آخری بالکنڈ حصہ سے یہ کچھ بھجن ایک خاص لہجہ میں پڑھے اور سنائے۔

راج سیدنت بھو پریت دکھلائے　　آپن مت سب کا سمجھائے
نکلم اگم ہوئی پنچ اوپارا　　پتی ابا او نمت مجھارا
تب لگ سلازم چھپے کوئی　　بنا محمدؐ پار نہ ہوئی
ماہر سلازم نمان ہنینہ ہوئے　　تلسی بچن ست مت کوئے

ترجمہ:۔ وہ بادشاہی قاعدے سکھائے گا۔ خوف اور محبت سے کام لیگا اور اپنا دین سب کو بتائے گا۔ سمندر کے پھیلاؤ کی طرح ان کا جلال ہوگا۔ جس طرح کمہار آوے میں آگ لگاتا ہے، جو تمام جگہ پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح ان کا دین ہر جگہ پہنچ جائے گا۔ جب تک ان کی پیروی نہ کی جائے بغیر محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اس کے بعد خدائی پیغام نہ آئے گا۔ اور تلسی داس سچ سچ کہتا ہے۔

راجہ بھوج ایک بڑے مشہور حکمران ہوئے ہیں۔ جو پلیلا کے باشندے تھے۔ جس کو عام لوگ بھوج پور بھی کہتے ہیں۔ وہاں ایک عمارت رصد خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ مگر جنتر منتر اس کا عرف عام ہے۔ وہ بہت پرانی عمارت ہے۔ اور فلکیات کے زائچے اور نجوم کے حسابات اس پر نقش ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسی جگہ راجہ بھوج کے شاہی محلات تھے۔ راجہ بھوج شق القمر کے معجزہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کا اسلامی نام شیخ عبد اللہ تھا۔ ان کے ایمان لانے سے اُن کے گھر والے اور سب دوسرے لوگ مخالف ہو گئے۔ اور وہ ترک وطن کر کے دھار وار گجرات چلے گئے۔ اور باقی زندگی انہوں نے سلطنت کو خیر باد کہکر یاد الہٰی میں گذار دی۔

انہیں تصدیق کنندوں میں سے ایک بزرگ بابا رتن تھے۔ جو خود حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لائے۔ اور حضور علیہ السلام نے اپنے دست مبارک سے چھ کھجوریں ان کو کھلائیں، اور ان کے لئے طویل العمر ہونے کی دُعا فرمائی، اور ایک اپنا پیراہن مبارک بھی عطا فرمایا۔ چنانچہ اس دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت حاجی بابا رتن رضی اللہ عنہ کی عمر چھ سو چھتیس ۶۳۶ سال کی ہوئی۔ آپکا مزار بٹھنڈہ سٹیشن کے قریب ریاست پٹیالہ میں ہے۔

مولنا سیف اللہ گورکھپوری جن کو سنسکرت اور بھاشا میں بڑا کمال حاصل تھا اپنی تحقیقات میں اور مولوی عبدالعزیز صاحب اپنی تصنیف بشارات احمدیہ میں لکھتے میں کہ کنداکے مصنف نے اپنی کتاب کپل برگرن میں یہ بشارت محمدیہ بارھویں ادھیائی چھٹی ورشسٹ کونٹ میں یوں لکھی ہے۔

اووت پن۔ انتم مہی ندھم، اان سینکبارتم، بلونت سورتم، پرتھوی۔ مدھی سرب اونماسن گرام۔ پرسن پر پرموتم، لیوتا وامنکرابت چھاک کور ووم سن گرم تہ بسیجمد سولین کوزدوہ رتب یم کرالیو چھیم پرتھوی مدھم بت کاگرس گیہ نیو تیرمیت نری بھوکھمبم ایتارم پرتھوی مدھی پال ہرہارم گرگ گرہ اوت پن تم پرتھوی کرنتیس ہری۔ پری بتر حیر ندیم نارائن وکش واپال رونگ یدب نوی جرس کرتے کھتم پرم پراکت پرایتم۔

ترجمہ:۔ یعنے نجات کا دینے والا اوتار جو ہے وہ پیدا ہوگا۔ اندھیری دُور کرنے والی زمین کے بیچوں بیچ میں، دشمن کا مارنے والا، زور والا، بڑا بہادر۔ زمین کی ناف میں وہ سرب نما ہوگا۔ اس لفظ کے معنے ہیں، تعریف کیا گیا۔ جو اسم پاک محمدؐ کا ترجمہ ہے۔ بذریعہ جہاد کے دین پھیلائے گا۔ کوڑا مارنے والے کو لڑائی کے ساتھ وہ پچھم کی جانب ملے گا۔ اس کے ملنے کی تین شرطیں ہوں گی۔

(۱) پیداوار زمین کی تقسیم کرو۔ ہمارا عقیدہ قبول کرو وہ بڑی عزت والا ہوگا۔ راجہ بڑا راجہ لوہے کی چلانے والی زمین کے بیچوں بیچ میں بیوقونی کا مٹانے والا پیدا ہوگا۔

زمین کے بیچوں بیچ میں اچھے لوگوں کے گھر والوں میں جو بے عیب ہوں گے۔ ان کا پیارا بیٹا خدا کے قدم پاک میں اس کی روح رہی مدت تک وہ آنے والا جب قدم چھوڑیگا آجائے گا۔ پرائے گھر کی سرحد میں۔ اور اسی مضمون کی بشارت کتاب سمرت و سمار اسکنت میں بھی جو ۲۰ سمرتیوں پر مشتمل ہے ملتی ہے، جو ہم یہاں نقل کرتے ہیں :۔

مہابھوی برہ نہ ہرنک پہری پوترین سار لبتی، چرنہ سمرسری گھم ششرم نئی دہ پررکھتی دم، اپتی سارم برہ بارنم سو دیہ پرمی پونر نم اوتار نہ۔

ترجمہ:۔ زمین کے بیچوں بیچ میں سورج کی طرح بڑے خاندان میں خدا کی طرف سے اوتار ہوگا، اور اس ملک کا پتہ یہ ہے، کہ وہاں ایک وست آوریتی ہوگی، اس ملک کے لوگ ان کے وسیلہ سے پاک ہونگے، گناہوں سے نجات حاصل کریں گے، وہ بڑا دریا اُدنیا ان کا دامن پکڑ کر پار اترے گی۔ اور اس سرزمین میں خدا کا پیارا خدا کے قدموں کو چھوڑ کر اُترے گا، وہاں کے پہاڑوں پر گھاس نہ ہوگی۔ یعنے اس ملک کے پہاڑ خشک ہونگے کچھ دیا کرو یا لڑو۔ ورنہ ہماری بات مانو۔ خدا کا نام ہی ان کے پاس جائے گا۔ ایکدفعہ اُترے گا گناہوں کو کاٹنے والا۔

یہ وہ شہادتیں ہیں، جن کو پڑھ کر کوئی حق کا متلاشی انسان و موکہ میں نہیں رہ سکتا۔ ہاں مسٹر پٹیل نائب وزیر اعظم بھارت کی طرح کسی غلطی پر اڑ جانا ایک دوسری بات ہے۔ ان کو جب فیصلہ ہندوستان کتاب کے مصنف انگریز نے ان کے ایک بڑے تیرتھ کی بیہودہ رسومات پر توجہ دلائی اور کہا کہ یہ آرین تہذیب کا قطعی مسخ شدہ اور انسانیت سوز منظر ہے آپ اس کو کس طرح تسلیم کرتے ہیں تو مسٹر پٹیل نے یہ کہکر اپنے آپ کو بچایا کہ یہ میرا مذہب کا معاملہ ہے اس میں ہم کو یہیں رہنے دیجئے۔ ہمیں طعن کرنا مقصود نہیں۔ حقیقت پر متوجہ کرنا مقصود ہے۔

پھر بھوتنک اوتر یہ ان کے مصنف بیاس جی جو ایک مشہور ہندو رشی ہیں۔ کہتے ہیں، کہ آئندہ زمانے میں مہامرت پیدا ہوں گے۔ ان کا نشان یہ ہوگا کہ ان پر بدلی سایہ کرے گی۔ اور ان کے جسم کا سایہ نہ ہوگا۔ وہ دُنیا کے لئے کچھ تلاش نہ کرینگے

اِن کی تلاش دین کے لئے ہوگی، جو کچھ پیدا کریں گے اللہ کی راہ میں خرچ کردیں گے تمام عمر کم کھائیں گے، عرب کے سرداران کے دشمن ہوں گے، اور وہ اللہ کے دوست ہوں گے۔ وہ قادر و توانا ان کو تیس ادھیان پران بھیجے گا۔

۲۔ کلنکی پران میں دس اوتاروں کا ذکر لکھا ہے، جن میں ایک اوتار کا نام کلنکی ہے۔ اس کے متعلق یوں وضاحت ہے کہ کلنکی اوتار ظاہر ہوں گے (۱) جن کے باپ کا نام وشنو لیس یعنی عبداللہ ہوگا (۲) ان کی ماں کا نام سومتی یعنی امن امان والی بھروسہ کی گئی یا آمنہ ہوگا۔ (۳) وہ غار میں تپسیا کریں گے، (۴) تمام نیک اور پاک لوگوں کی تصدیق کریں گے۔ (۵) پرش رام یعنی روح الامین سے تعلیم پائیں گے۔ (۶) اپنے وطن سے ہجرت کریں گے۔

۳۔ رگوید منتر میں آپ کا نام احمد اور اتھر وید میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم لکھا ہے اور لکھا ہے کہ لا الہ ھرلی پاپن الا اللہ پرم پدم جنم بیکنٹھ پرایت ہوئی تو جلیئے نام محمدم یعنی لا الہ الا اللہ کہنے سے پاپ کٹتے اور پرم پدم ملتے ہیں جنم بیکنٹھ ہونا چاہو، یعنی ہمیشہ کی بہشت چاہتے ہو۔ تو نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وظیفہ کرو۔

۴۔ اتھر وید میں آیا ہے۔ برھما ن الا مرالرسول محمد رکاکم برشی، یعنی پیدا کرنے والا اللہ ہے، رسول محمد زور آور کا کون ہے اس کی برابر کا۔

۵۔ سام وید میں یوں لکھا ہے، کہ ممود دتنا د بھا دا گا ڈ مانتی بتتا بشنو نامک بھنہا نیوسد: ابید شاستر مے شریتیا۔ یعنی جس بزرگ کے نام کا پہلا حرف میم اور آخری حرف دال ہوگا۔ اور اس کے پیروگئو بھکھن (ذبیحہ گاؤ) کرتے ہوں گے، وہی وید شاستر کی رو سے بڑا رشی ہے۔

۶۔ اتھر وید کانڈ ۱۹ میں ہے۔ یا ہیجہ محمدؐ بھگت اجائیں، یعنی محمدؐ کے بغیر بندگی ضائع ہے۔

۷۔ گوسائیں تلسی داس لکھتے ہیں، کا ستی پربت یا دھن تیر تھ سبھی نکام

بیکنٹھ باس نہ پائی بناں محمدؐ نام

۸۔ جنم ساکھی کلاں صفحہ ۱۴۱ میں ہے :-

پاک پڑھیو کلمہ ربدا محمدؐ نال ملائے اومعشوق خدائیدا ہو یا تُل الائے

۹۔ پوتھی راہ سنگھ رام چھٹی کانڈ منتر ۱۱۱ پر گوسائیں تلسی داس جی فرماتے ہیں۔ کہ :-

یہاں نہ کچھ بات میں راکھوں بید پران ست مت بھاکھوں
بر کھسس دش سندام ہوئی پتہ کی بات نہ پائے کوئی
دیس عرب بھر کھتا سہائی سوتھل بھوئیں گت سونکھک رائی
سنبھو سمت تاکر ہوئے سندام اودیس بھتتھ سبھوئی
سمت بکرم کی دو وانگا نہاکوک تس چھیتر سانگا
راج پرنٹ بھو پریت دکھاوے ابن مرت سب کو سمجھاوے
تب لگ جے سندام چہ کوئی بنا محمدؐ پار نہ ہوئی!

ترجمہ :۔ طرفداری نہیں جو ویدمیں لکھا ہے صاف کہوں گا۔ دس ہزار برس میں رسالت تمام ہوگی۔ پھر کوئی نہ پاسکے گا۔ عرب میں ایک خوشنما ستارا اور بابرکت زمین ہوگی۔ معجزے ظاہر ہوں گے۔ اور نبی اللہ کو قاسم کہا جائے گا۔ سمت بکرما جیت کی سمندروں کی تعداد کے برابر والی صدی میں پیدا ہوگا۔ اور الوالعزمانہ قاعدے پر اپنا مذہب سب کو سکھائے گا۔ اور اس کے دین کے جاری رہنے تک بغیر محمدؐ کے کوئی پار نہ ہوگا۔

۱۰۔ بابا گورو نانک لکھتے ہیں :-

توریت زبور انجیل ترے سن ڈٹھے وید
رہے قرآن کتاب کل جگ میں پروان

یعنی توریت، انجیل، زبور کو ہم نے بغور دیکھا ہے۔ اور ویدوں کو بھی۔ مگر دنیا کے لئے جو کتاب ہدایت کاملہ کا موجب ہو سکتی ہے، وہ قرآن ہے۔

پھر لکھا ور بار صاحب صفحہ ۵۲۳ میں ہے

جگ میں مورکھ بندہ کیا بوجھے | اندھے کو دیپک کیا سوجھے
بن احمد کچھوے بھید نہ پائیو | مورکھ اندھا گنوار کہلائیو

الف احد سے احمد بھیو | ایسا بھید کچھو نہ لیو!
احمد بھیو احد کے رنگا | جیسی جوت چاند سنگا

۱۱۔ جنم ساکھی بھائی بالا صفحہ ۳۰۶ میں آتا ہے۔ کہ:ہے

اول آدم مہیش ہوئے دوجا برہما ہوئے
تیجا آدم مہا ویو محمد کہے سب کوئے!

۱۲۔ سیدنا عیسٰی علیہ السلام کی بشارتوں سے بعض اس طرح پائی گئی ہیں مثلاً انجیل یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶ میں ہے، آپ نے فرمایا" اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔ یعنی سچائی کی وہ روح جس کو دُنیا حاصل نہیں کر سکتی۔ پھر باب ۱۴۔ آیت ۳۰ میں فرمایا اور اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہدیا ہے، تاکہ جب ہو جائے تو تم یقین کرو۔ اس سے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا۔ کیونکہ وہ دنیا کا سردار آتا ہے۔ اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر میں جاؤں گا۔ تو وہ تمہارے پاس بھیجدوں گا۔ جب وہ سچائی کی روح تمہارے پاس آئے گی تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گی۔

۱۳۔ انجیل برنباس فصل ۹۶ صفحہ ۱۴۸ میں ہے۔ (مسیح) سے کاہن نے جواب میں کہا کہ موسیٰ کی کتاب میں لکھا ہے کہ ہمارا اللہ عنقریب ہمارے پاس ایک مسیحا بھیجے گا۔ جو ہمیں اللہ کے ارادے کی خبر دینے آئے گا۔ اور دنیا کے لئے راحت کا پیغام لائے گا۔ اس لئے تو بتا کیا تو ہی اللہ کا مسیحا ہے

تو یسوع نے جواب دیا کہ حق یہ ہے کہ اللہ نے ایسا ہی وعدہ کیا ہے۔ مگر میں وہ نہیں ہوں، وہ مجھ سے پہلے پیدا کیا گیا ہے، اور مجھ سے بعد کو آئے گا۔

پھر اسی انجیل برنباس فصل ۹۷ صفحہ ۱۴۶ میں ہے (مسیح نے کہا) میری تعلیم نجس ہو جائے گی۔ قریب قریب تیس مومن بھی باقی نہ رہیں گے، اس وقت اللہ دنیا پر اپنا رحم کرے گا۔ اور اس رسول کو بھیجے گا، جس کے لئے سب چیزیں پیدا کی گئی ہیں۔ جو اس پر ایمان لائے گا وہ مبارک ہوگا۔ (پھر فرمایا) باوجود اس کے کہ میں اس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کا بھی مستحق نہیں ہوں۔ میں نے خدا کی طرف سے نعمت اور رحمت کے طور پر یہ رتبہ پایا ہے کہ اس کو دیکھوں اس وقت کاہن نے کہا، مسیحا کا نام کیا رکھا جائے گا۔ تو یسوع نے جواب دیا کہ مسیحا کا نام عجیب ہے۔ اس لئے کہ اللہ نے جس وقت اس کی ذات کو پیدا کیا تو اسے آسمانی روشنی میں رکھا۔ اللہ نے کہا اے محمدؐ تو صبر کر میں تیرے ہی لئے جنت، اور دنیا اور مخلوقات کی بڑی بھیڑ جو تجھے بخشوں گا۔ پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور جس وقت میں تجھے دنیا میں بھیجوں گا، تجھے اپنا رسول بناؤں گا میرا کلام سچا ہوگا۔ زمین و آسمان کمزور ہو جائیں گے۔ مگر تیرا ایمان کمزور نہ ہوگا اور اس کا نام مبارک محمدؐ ہوگا۔

۱۴۔ زبور باب ۱۶، آیت ۲۵ میں ہے کہ میں تم کو پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن وہ میرے بعد آتا ہے۔ مجھ سے قوی تر ہے، وہ تمہیں روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا۔ ایسے ہی انجیل متی باب ۳ میں ہے۔

۱۵۔ کعب احبار اپنے والد کی وفات اور تورات کے دو ورقوں کا قصہ بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ ان دو ورقوں میں لکھا تھا۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ

۱۶۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے۔ کہ میں نے ابو مالک بن سنان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں ایک روز قبیلہ بنی عبد الاشہل میں گیا تو

یوشع یہودی سے یہ کہتے ہوئے سُنا کہ ایک نبی کے پیدا ہونے کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ جن کو احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہا جائے گا۔ جو حرم میں پیدا ہوں گے۔ پھر ابو مالک بن سنان کہتے ہیں۔ کہ وہاں سے میں بنو قریظہ میں پہنچا تو ایک جماعت دیکھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کر رہی تھی۔ اِن میں سے زبیر بن باطا نے کہا کہ کوکب احمر طلوع ہو چکا ہے۔ اور یہ ستارا جبھی طلوع ہوتا ہے۔ جب کوئی نبی پیدا ہونا ہو۔ اور اب احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا کسی کی پیدائش باقی نہیں رہی۔ اور یہ شہر ان کی ہجرت گاہ ہے۔

۱۷۔ خصائص کبریٰ میں امام سیوطی نے امام شعبی کی نسبت دے کر لکھا ہے کہ صحیفہ ابراہیم علیہ السلام میں لکھا ہوا تھا۔ انہ کائن من ولدہ شعوب حتی یاتی النبی الامی الذی یکون خاتم الانبیاء، یعنی آپ کی اولاد میں قبائل در قبائل ہوتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ نبی اُمی آجائیں۔ اور وہ خاتم الانبیا ہونگے۔

۱۸۔ سیدنا آدم علیہ السلام نے اپنے بیٹے شیث علیہ السّلام کو وصیت فرمائی کہ تم میرے بعد خلیفہ ہو گے۔ تقویٰ اور عروۃ الوثقیٰ کو لازم پکڑنا۔ اور خدا کے ذکر کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی لازم پکڑنا۔ کیونکہ وہ عرش پر اور ہر جگہ میں نے لکھا دیکھا۔ اور وہی میری عفو کا باعث ہوا۔

۱۹۔ امام التفسیر ابن جریر طبری آیت کریمہ واذ اخذ الالواح کے ماتحت ایک طویل حدیث نقل فرماتے ہیں۔ جس سے تورات شریف میں ذکر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ثابت ہوتا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بارگاہ الوہیت میں عرض کیا کہ اے میرے رب میں لواح توریت میں ایک ایسی اُمت کا تذکرہ پاتا ہوں۔ جو پیدائش میں سب سے آخری ہے۔ اور جنت میں داخل ہونے کو سب سے مقدم سوائے میرے رب ان کو میری اُمت بنا دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہے۔

ختمِ نبوّت

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۔

ترجمہ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ بلکہ وہ خدا تعالیٰ کے رسول ہیں، اور سلسلۂ انبیاء کے ختم کرنے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنی ہر مشیت کا جاننے والا ہے۔ یہ آیت ۵ہجری میں نازل ہوئی ہے۔ (جیسا کہ روح المعانی و تاریخ الخمیس صفحہ ۵۰۰ جلد ا میں ہے)۔

عقیدہ چونکہ انبیاء علیہم السّلام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو فوز و فلاح کا بہترین طریقۂ نجات۔ زندگی کا ارفع و اعلیٰ نصب العین اور روحانی مدارج طے کرنے کا یقینی ذریعہ عطا کر دیا جائے۔ لہٰذا بفحوائے نص قرآنی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی شکل میں انسان کو کامل ہدایت عطا فرما دی اور جس مقصد کے لئے انبیاء کا سلسلہ جاری کیا گیا تھا وہ لامحالہ ختم ہو گیا۔ اور منطق کا مسلمہ اصول ہے۔ اذا فات الشرط فات المشروط (یعنے جب شرط فوت ہو جائے تو مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے) چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے وہ کامل ہدایت عطا فرمائی جا چکی ہے۔ اس لئے آپ منطقی طور پر اس سلسلہ کے خاتم ہیں۔ بنا بریں ساڑھے تیرہ سو سال سے جمہور مسلمانوں متقدمین و متاخرین کا یہ عقیدہ ہے، اور جمیع علماء ربانی و فضلاء حقانی اسلام کا اس مسئلہ پر اجماع رہا ہے، کہ آنحضرت سرور کائنات فخر موجودات

مختارِ شش جہات رحمت اللعٰلمین خاتم النبیین، محبوب خدا محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات پر سلسلہ نبوت ختم ہوچکا ہے، اور قرآن حکیم، احادیث نبی کریم علیہ التحیات والتسلیم کی تصریحات وتعلیمات کی جامعیت و بالغیت اس حقیقت پر شاہد ہے۔ کہ مولا کریم جل مجدہٗ نے انسان کو اس کی علمی اور عملی قوتوں میں مترقیانہ صلاحیت وقابلیت کی تکمیل کرکے ایسا کامل ومکمل دستورِ حیات بخش دیا ہے جسکی ہدایت تامہ کی روشنی میں آئندہ ہر زمانے کا انسان دینی ودنیوی کامیابیاں اور ظاہری وباطنی کامرانیاں حاصل کرسکتا ہے۔ لہٰذا نہ اب کسی نبی خواہ وہ تشریعی ہو یا غیر تشریعی کے آنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی پیغمبر ظلی وبروزی کے ظہور کی حاجت۔ اور یہی اسلام کا وہ بنیادی اصول ہے۔ جس پر مسلمانوں نے ہر زمانہ میں یہ ثابت کر دکھایا ہے۔ کہ اگر توحیدِ الٰہی کا عقیدہ اسلام میں بمنزلہ بنیاد ہے تو ختم نبوت کا عقیدہ بمنزلہ عمارت ہے، اور ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی انبیاء کا سلسلہ جاری رہنا تسلیم کرلیا جاتا تو پھر اسلام کا قصرِ رفیع کبھی کا منہدم ہوگیا ہوتا۔

اگر مسلمانوں نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ آئندہ آنے والے انبیاء سے مسلمانوں کو کوئی عداوت ہے، بلکہ وہ اس لئے اس عقیدہ پر مُصر ہیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کسی نبی کی ضرورت باقی ہے، تو حضور علیہ السلام کی وہ خصوصیت جو آپ کو جمیع انبیاءؑ سے ممتاز کرتی ہے، نعوذ باللہ باطل ہوجائے گی، اور جو شخص یہ عقیدہ رکھے گا، وہ یکسر دائرۂ اسلام سے خارج ہوجائے گا۔ اور اس کو اسلام سے قطعاً کوئی علاقہ نہ رہے گا۔ کیونکہ یہی ایک عقیدہ نوعِ انسانی کی نقابت کی تاریخ میں سب سے پہلا اور سب سے پاک ترین عقیدہ ہے۔

چونکہ حضور علیہ السّلام کے بعد اس عقیدے کے خلاف مدعیانِ کاذب کے ظہور کا امکان تھا، اس لئے مخبرِ صادق علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے پہلے ہی پیشینگوئی فرمادی کہ میرے بعد میری اُمت میں تیس جھوٹے نبی مدعی نبوت پیدا ہوں گے۔ جو سب کے

سب اپنے دعووں میں کاذب ہوں گے۔ کیونکہ میں خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔

چنانچہ اس پیشگوئی کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں کئی لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ مسیلمہ کذاب۔ اسود عنسی سجاح بنت حارث۔ مختار ثقفی۔ میمون قداح۔ طلیح بن خویلد ابن مقنع۔ سلیمان قرمطی۔ بابک خرمی اور علیٰی بن مہرویہ۔ مشہور دجال وکذاب گذرے ہیں۔ جنہوں نے عرب وایران میں کافی بربادی پھیلائی اور ہزارہا بندگان خدا کا خون گرایا۔ ان کے بعد قریباً ایک ہزار سال تک اسلامی دنیا میں کامل امن وامان رہ کر پنجاب کی بیرحاصل سرزمین سے پھر ایک فتنہ نے سر اٹھایا اور ایک مدعی نبوت نے ازسرنو لوگوں پر بداعتقادی کا دروازہ کھولا۔ جس کی مفصل تشریح آئندہ صفحات میں نظر آئے گی۔ اگرچہ اس مدعی پنجابی نے بہت سی ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا۔ جو اس کی بطالت کی بجائے خود ایک بین دلیل ہے۔ تاہم ان منازل کے تذکرے کیوجہ سے اس کے دعوے کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

لفظ نبوّت کی تحقیق

نبیٌ۔ نبوٌ۔ منبأ۔ یہ تین لفظ ہیں۔ جن سے نبوت کا لفظ ماخوذ ہے۔ ازروئے لغت نبی بروزن فعیل کا مفہوم ہے۔ اطلاع دینے والا یا اطلاع پہنچانے والا۔ پس اطلاع دینا بھی نبوت اور اطلاع پہنچانا بھی نبوت ہی ہوگا۔ جس پر قرآن کریم کے الفاظ شاہد ہیں پہلے پارہ میں پروردگار کی طرف سے ایک مکالمہ کا اشارہ ہے۔ جس میں سوال کیا گیا ہے۔ انبئونی (یعنی مجھے بتاؤ) ذالک من انباء الغیب (آل عمران) یہ غیبی اطلاعات ہیں۔ مَنْ اَنبأکَ ھٰذا۔ تمہیں یہ بات کس نے بتائی۔ گویا کوئی عظیم الشان بات بتلا دینا یا پہنچا دینا اس کا نام لغت میں نبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کرام نے تسلیم کیا ہے کہ لفظ نبوت شرعاً منقول ہے۔ (شرح مواقف صفحہ ۶۶۳) لغوی معنوں میں جو وسعت ہے۔ وہ شرعی معنوں میں نہیں۔

ہر ذی علم کو پتہ ہے کہ سُود لغت میں فائدے کو کہتے ہیں۔ فلاں بات سود مند ہے۔ فلاں چیز سے سود حاصل کرو۔ فلاں کام میں سود نہیں۔ لیکن شرع میں یہی لفظ سود اپنے مخصوص معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ ایسے ہی لفظ نبوت میں بھی لغتہً گو وسعت ہے، لیکن شرعاً یہ وسعت محدود ہو جائے گی۔ صلوٰۃ لغتہً اظہار نیاز مندی کو کہتے ہیں، اور کائنات کا ہر ذرّہ اس لحاظ سے نیاز مند ہے۔ یہ نہ چرند، درند بلکہ کائنات کا ہر ذرّہ اور ہر شئے اپنے اپنے رنگ میں بزبان حال نیاز مند ہے۔ لیکن یہی لفظ جب یقیمون الصّلوٰۃ۔ اقیموا الصّلوٰۃ میں آئیگا تو اس کے معنوں میں وہ وسعت نہیں رہے گی جو لغت میں ہے۔ بلکہ یہ محدود ہو جائے گی۔ اور اس کے معنے محض اظہار نیازمندی کے نہ ہوں گے، بلکہ یہاں مخصوص طریق عبادت مقصود ہوگا۔ یعنے لغوی وسعت بسا اوقات شریعت میں قائم نہیں رہتی بلکہ محدود ہو جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص نبوّت کے لغوی معنوں کی وسعت کو سامنے رکھ کر نبوت کا دعوےٰ کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں نبی ہوں۔ تو ہر اطلاع دینے والا خواہ کوئی ہو۔ اور ہر اطلاع پہنچانے والا خواہ کیسا ہو۔ اس درجہ کا مستحق ہوگا۔ اور وہ دعوائے نبوت کرسکیگا پھر اس وسعت لغت کے ماتحت زید ہی کے دعویٰ کی تخصیص کیا ہوگی۔ لہذا یہ ماننا پڑے گا، کہ شریعت اسلامیہ میں اس لفظ نبوت کے معنے محدود اور مخصوص ہیں۔ غیر محدود اور غیر مخصوص سمجھنے میں وہ استحالہ پیش آئے گا۔ جس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ مثلاً

۱ ۔ اگر نبوّت کا معیار لغوی معنی کو قرار دیا جائے تو پھر اطلاع دہندگی اور اطلاع یا بندگی کے لحاظ سے ہر شخص نبی قرار دیا جائے گا۔ اور یہ شدید غلطی ہے۔

۲ ۔ اگر لغوی معنوں میں یہ تخصیص کی جائے، کہ اطلاع یا بندگی من جانب اللہ ہو تو نبوّت ہوگی تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ہر مسلمان نبی ہوگا اس لئے کہ اگر ایک نے دوسرے سے کہا کہ قرآن حکیم میں حکم آیا ہے نماز پڑھو

تواس مفروضہ کی بنا پر زید اور بکر دونوں نبی ہیں۔ اس نے نماز کی اطلاع اللہ کی طرف سے دی اور دوسرے نے پائی۔

۳۔ اگر رویائے صادقہ کو نبوت کا معیار دیا جائے۔ تو یہ بھی اس دعویٰ میں صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ سچے خواب کفار کو بھی آسکتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے قیدی ساتھیوں نے جیل میں سچا خواب دیکھا تھا۔ اور اسی زمانہ میں غیر مسلم بادشاہ شاہ مصر نے سچا خواب دیکھا۔ جسکی تعبیر خود حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمائی۔ تو خواب یا عالم کشف میں یا عالم مثال میں کسی بات کا کسی کیلئے دیکھ لینا اور اس کا سچا ہو جانا۔ نبوت کی دلیل نہیں سکتا۔ اور یہ سب النسانی اصطلاحات ہیں۔

۴۔ بعض اہل علم کا خیال ہے۔ کہ نبی وہ ہے۔ جس کی پاکیزگی اور طہارت کا اعلان حذا وند عالم کی طرف سے ہو جائے۔ لیکن یہ معیار بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں حضرت مریمؑ کی پاکیزگی بیان فرمائی ہے حالانکہ وہ نبیہ نہ تھیں۔ اور وہ کیا دنیا بھر میں کوئی عورت اس درجہ پر فائز نہیں ہوئی۔

۵۔ اگر صرف مکالمہ و مخاطبہ کو معیار نبوت مانا جائے۔ تو اس سے بھی انکار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ مکالمہ ابلیس سے بھی ہوا۔ مخاطب فرعون کو بھی کیا گیا۔ خطاب یافتہ زمین و آسمان اور کائنات کا ذرہ ذرہ بھی ہے۔ آسمان کا پانی روکنے اور زمین کو پانی چوسنے کا حکم اس پر گواہ ہے۔ لیکن زمانہ جانتا ہے۔ کہ یہ سب محض مکالمہ و مخاطبہ کی بدولت نبی نہیں بن گئے۔

۶۔ اگر یہ کہا جائے کہ نبوت الہام و وحی کے نزول کا نام ہے۔ تو کیا نبوت کا مدار الہام و وحی پر ہو سکتا ہے؟ قرآن ارشاد فرماتا ہے۔ کہ یہ بھی غلط ہے۔ اگر یہ صحیح مان لیا جائے۔ تو اس مفروضہ کی بنا پر شہد کی مکھی، کیڑے مکوڑے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، حضرت عیسےٰ کے حواری سب نبی

سمجھے جانے کے مستحق ہوں گے۔ بلکہ ہر شخص کیونکہ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا۔ رب العزت کا ارشاد محکم موجود ہے۔

۷۔ اگر تبلیغ آیات اللہ کو دلیل نبوت مانا جائے، تو بھی کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ اس صورت میں بلغوا عنّی ولو اٰیۃ کے مطابق ہر مبلّغ نبی ہو جائے گا۔ اور بہت سے تبلیغی مشنوں کا کام کرنے والے افراد اس کی ذیل میں آجائیں گے۔

معلوم ہوا کہ یہ جس قدر معیار نبوّت لوگوں نے اپنے دعاوی میں مقرر کئے ہیں۔ اور جن پر وہ اپنی نبوت کی بنیادیں استوار کرتے ہیں، سب کے سب لغو اور غلط ہیں۔ آیئے اب دیکھیں کہ قرآن مجید نے نبوت کا معیار کس چیز کو قرار دیا ہے۔

معیار نبوّت و رسالت

قرآن کریم میں تفکر و تدبّر کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ

> نبی وہ شخص ہے جو نجات انسانی کے لئے خدا تعالیٰ کے تجویز فرمودہ نصب العین یا پروگرام سے براہ راست مطلع ہو کر اس کو نسل انسانی کے سامنے کتاب کی شکل میں پیش کرے۔ اور خود اس پر عمل کر کے لوگوں کو دکھائے، تاکہ ان میں بھی اس پر عامل ہونے کی ترغیب پیدا ہو۔ اس نصب العین کو عرف عام میں کتاب یا شریعت یا ہدایت کہتے ہیں۔ ہر نبی اپنے ساتھ ہدایت لاتا ہے۔ کیونکہ یہ بات عقلاً محال ہے۔ کہ نبی (پیغامبر) آئے اور کوئی پیغام نہ لائے۔

گویا خداوند عالم نے ضروریات زندگی میں انسان کی رہنمائی کے لئے پہلے اس کو وجدان کی ہدایت سے نوازا۔ جس کی رہنمائی ایک محدود دائرے تک تھی۔ پھر عقل کی راہنمائی کا دور شروع ہوا۔ جو ایک خاص حد تک پہنچ کر ختم ہو گیا۔ پھر ہدایت نبوّت کی ضرورت سمجھی گئی۔ یعنے نسل انسانی کی نجات اور

فلاح و سعادت دارین جس خدائی نصب العین کی پابندی پر موقوف ہے اس کا کسی ایسے انسان کے ذریعہ سے پیش کرنا جس کی امانت اور دیانت پر نامزدگی سے قبل عوام الناس کو پورا پورا اعتماد ہو۔ گویا ہدایت نبوت ایسے شخص کی وساطت سے نسل انسانی کے سامنے ایک ایسے پروگرام کے ماتحت رکھ دینے کا نام ہے۔ جس پر نسل انسانی کی نجات کا دارومدار ہو اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ نبوت تنہا مکالمہ و مخاطبہ، تنہا وحی اور الہام، تنہا رویائے صادقہ کا نام نہیں، بلکہ نسل انسانی کی سعادت و فلاح جس نصب العین پر موقوف ہے۔ وہی مرتبہ و مقام نبوّت ہے، جس کے نزول کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کا سلسلہ قائم کیا۔ اور اس کا عطا فرمانا کمال احسان اور مہربانی سے اپنے آپ پر لازم قرار دے لیا۔ حالانکہ کوئی طاقت خدا کو کسی کام کرنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتی۔ اور وہ جو کچھ کرتا ہے۔ اپنی مرضی اور اختیار سے کرتا ہے۔ فرماتا ہے۔ اور لقد مَنَّ اللّٰہ عَلَی المؤمنین اِذ بَعَثَ فیھم رسولًا مِن انفسھم میں اسی کمال احسان کی جانب اشارہ ہے۔ اور یہاں سے نبوت کا وہبی ہونا بھی مترشح ہوتا ہے۔

یہ امر بھی قابل یاد ہے۔ کہ قانون ارتقاء کے ماتحت نصب العین کے اس حصہ میں جس کو شریعت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اختلاف ہوتا رہا ہے۔ لیکن اصلی حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ جو نبی خداوند عالم کی طرف سے دنیا میں تشریف لائے۔ سب نے ایک ہی حقیقت کو پیش فرمایا۔ اعبدوا اللّٰہ ربی و ربکم ولا تشرکوا باللّٰہ شیئًا۔ یعنے احکام شریعت میں ہر ماحول کے مطابق تبدیلی ہوتی رہی، لیکن نصب العین ہر زمانہ میں ایک ہی رہا۔

متحقق ہوا۔ کہ نبوت ایک ایسے نصب العین، ایک کتاب، ایک دستور العمل عقائد و اعمال کے مجموعہ۔ جس کے حسن و قبح میں تمیز کرنے سے انسانی عقل عاجز ہے) کا نام ہے۔ اس کو آپ زبور کہیں، کتاب کہیں۔ آیات بینات کہیں

نور کہیں، شفا کہیں۔ فرقان کہیں۔ قرآن کہیں۔ ذکر کہیں، رسول کہیں۔ بہرحال یہ سب کچھ اسی نصب العین الٰہی کی جس کے تجویز کرنے میں کسی انسان یا کسی فرشتے کا ذرہ برابر مشورہ شامل نہیں) تعبیر ہیں۔ اور علیمٌ بذات الصدور ہی کا صرف اپنا تجویز فرمودہ نصب العین ہے ؎

ضرورت لقاءِ نصب العین

چونکہ ضرورت تھی بقائے سنت ایزدی کی۔ ضرورت تھی بقاء نصب العین کی۔ ضرورت تھی تحفظ دین کی۔ اس لئے خداوند عالم الغیب نے جس کا علم ماضی کی طرح مستقبل پر بھی مکمل طور پر حاوی ہے، اس سلسلے کو ختم کرنے کے لیے تاکہ کسی شخص کے دعوائے نبوت کے بعد اس کی تصدیق کی ضرورت کا امکان ہی نہ رہے۔ اور آئندہ کے لئے لوگوں کو اس امر کا انتظار ہی نہ رہے۔ کہ دنیا میں کوئی اور بھی نصب العین پیش ہونے والا ہے، تحدی کے ساتھ فرما دیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ اب کوئی یوم کو خواہ متعارف معنوں میں لے یا غیر متعارف معنوں میں، بہرحال خدا کا یوم یوم القرآن ہے۔ نبی کا یوم یوم نبوت ہے۔ اور نزول قرآن کا سارا وقت یوم ہے۔ جس میں یہ نور ہدایت سرکار دوجہان صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے پیش ہوتا رہا۔

یہاں یہ بیان کر دینا بعید از فہم نہ ہوگا، کہ ہر چیز جو شروع ہوتی ہے، اس کی تکمیل اور اختتام بھی ضروری ہے۔ جس کے بعد اس کی غرض میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک وقت ہوتا ہے، جب طالب علم کی تعلیم کی ابتداء ہوتی ہے، پھر وہ وقت بھی آتا ہے، جب اس کی انتہا ہو جاتی ہے، اور وہ تعلیم کی تکمیل کے بعد کسی مزید تعلیم کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اسی طرح بچہ پیدا ہوتا ہے، تو اس کا لباس بہت چھوٹا اور قمیص معمولی بالشت بھر کا ہوتا ہے، لیکن اپنی جسمانی نشوونما اور ارتقاء کے ماتحت ہر لحظہ اس کا ناپ اور سائز بدلتا رہتا ہے، مگر ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے۔ جس میں اس کے جسم کا بڑھاؤ ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ وہ لباس پہن لیتا ہے۔ جس کے بعد

اس کے لباس میں کوئی بڑھاؤ قطعاً متصور نہیں ہوتا۔

ایسے ہی یہ مثال نصب العین ہدایت انسانی کا ہے۔ جو آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر مسیح تک مختلف احکام شرع کے ساتھ بدلتا چلا آیا۔ اور بعد کو اس کی انتہا تکمیل کو لازم سمجھا گیا۔ کہ جس کے ذریعہ ہدایت اُخروی اور نجات ابدی کا مکمل نظام انسان کو عطا کرکے اس نعمت عظمیٰ کو تمام کردیا جائے۔

پس آیت الیوم اکملت لکم دینکم اس ضرورت پر قطعی الدلالت ہے۔ جس کے لحاظ سے قرآن کریم خاتم الکتب اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین یعنے نبیوں کے آخری نبی یا نبوت کے ختم کرنے والے نبی ہیں۔ اور آپ پر ہر قسم کی نبوت کا خاتمہ ہوگیا۔ اب کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جب مکمل اور بہترین نصب العین پیش ہو چکا ہو۔ اور وہ کسی وقت کے لیے موقت بھی نہ ہو (کیونکہ اگر موقت ہوتا تو اسکی ہمیشگی پر حفاظت کے دعوے نہ کئے جاتے) پھر اس کی موجودگی میں کسی دوسرے نصب العین کی ضرورت بھی نہ ہو۔ تو دوسرا کوئی نبی کس کام کے لئے آئے گا۔ فافہم

خاتم النبیین کا مفہوم اور ایک مرزائی کی زٹل!

فقیر نے گذشتہ بحث میں یہ عرض کردیا ہے کہ تمام متقدمین و متاخرین اہل اسلام اس عقیدہ میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین (نبیوں کے ختم کردینے والے نبی ہیں) متفق ہیں، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اپنی نفس پرستیوں اور خود غرضیوں کے ماتحت اس عقیدہ سے منکر ہوکر میدان نبوت میں رینگنے کی جرأت کی ہے۔ یا اُن کے بعض حواریوں نے ان کی تائید میں بے جا سمند قلم کو چلانے کی سعی سے کام لیا ہے۔ اور ان لوگوں میں سے ایک پنجابی مدعی نبوت کے خادم کوئی خادم صاحب بی۔ اے بھی ہیں۔ جنہوں نے لفظ خاتم النبیین کے صحیح مفہوم بتانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنی علمی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ کہ ایک ان پڑھ انسان بھی اُن کی اس شوخی کی تردید کئے بغیر نہیں رہ سکتا طرز بیان وہ ہے۔ جس کے انداز سے جہالت یوں ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے اُن کے دو ورقی

ترکیب کا عنوان، چنانچہ ان خادم مرزا صاحب نے خاتم النبیین کا مفہوم سمجھانے میں جو اصول قائم کئے ہیں، اور مرزا صاحب کو نبی بنانے میں جن الفاظ پر پسینہ پسینہ ہوئے ہیں وہ اُنہیں کے الفاظ میں درج ذیل ہیں۔ قارئین کرام خود پڑھ لیں، اور اُن کی منکرانہ سعی کو سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔ کہتے ہیں:۔

ہر عقلمند انسان باسانی سمجھ سکتا ہے کہ خاتم النبیین کا خطاب جو ہمارے سید و مولے حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو دربار خداوندی سے عطا ہوا وہ قرآن مجید میں مذکور ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ ترکیب اُردو۔ فارسی یا پنجابی زبان کی نہیں، بلکہ عربی زبان کی ہے، اس لئے اس کے معنے اہل عرب کے محاورہ اور اسلوب بیان کے مطابق کرنے ہوں گے۔ نہ کہ پنجابی، اردو، فارسی کے لحاظ سے۔ اگر خاتم النبیین پنجابی، اُردو یا فارسی کی ترکیب ہوتی تو ہمیں اس کا ترجمہ نبیوں کا بند کرنے والا ماننے میں کوئی عذر نہ ہوتا، لیکن ہمارا دعوےٰ ہے، کہ عربی زبان میں لفظ خاتم جمع کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں ہرگز ہرگز آخری کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمیشہ افضل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ہماری طرف سے بارہا چیلنج دیا جا چکا ہے کہ کوئی مولوی خواہ وہ مرتضیٰ احمد خان ہو یا کوئی اور ہمیں قرآن، حدیث، یا محاورات اور اسلوب بیان اہل عرب سے ایک ہی مثال اس امر کی پیش کر دیں کہ لفظ خاتم تا کی فتح کے ساتھ کسی صیغہ جمع مثلاً شعراء فقہاء علماء اولیاء۔ محدثین یا مجددین وغیرہ کی طرف مضاف مستعمل ہوا ہو، اور اس کے معنے آخری یا بند کرنے والے کے ہوں۔ یعنے کبھی کسی موقعہ پر خاتم الانبیاء یا خاتم المحدثین آیا ہو، اور اس جگہ اس سے مراد یہ ہو کہ موصوف اولیاء و محدثین کو بند کرنے والا ہے، اب اس کے بعد کوئی ولی یا محدث پیدا نہ ہوگا۔ ہمارا دعوےٰ ہے کہ قیامت تک اس قسم کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی اگر صاحب تاج العروس۔ قاموس۔ لسان العرب۔ منتہی الادب وغیرہ نے

اپنی کتابوں میں خاتم النبیین کے معنے آخری نبی یا نبیوں کا ختم کرنے والا لکھے ہیں۔ تو انہوں نے محض اپنے عقیدہ کا اظہار کیا ہے۔ جو حجت نہیں۔ عربی زبان میں ان معنوں کی تائید میں ایک بھی دلیل نہیں۔

یہ ہے خادم مرزا صاحب کا تمام تر زور ایمان، اور یہ ہے ایمان والوں کو کھلا چیلنج جس میں قیامت تک کے لئے شرط لگائی گئی ہے، اور یہ دعوے کیا گیا ہے، کہ نہ ہم سے زیادہ کوئی اعلم دنیا میں موجود ہے، اور نہ ہی کوئی جواب دے سکیگا۔ خادم صاحب کے مقام انسانیت کی بھی حد ہو گئی، لیکن مزہ جب تھا۔ کہ مومنین کو چیلنج کرنے سے پہلے اپنی چارپائی کے نیچے ڈنگوری پھیر لیتے۔ کہ کہیں گھر سے ہی تردید نہ ہو جائے۔ اور بمصداق ایں گنا ہیست کہ در شہر شما نیز کنند، میں ہی نہ رگڑے جائیں، یہ تو صحیح ہے کہ لفظ خاتم النبیین کلام عربی کا لفظ ہے، اردو یا پنجابی نہیں، اور اس کے معنے بھی عربی زبان سے ہی سمجھنے چاہئیں مگر خود تو آپ نے عربیت چھوڑ پنجابیت اور اردویت سے بھی علیحدگی اختیار کر کے محض انگریزیت اور بی ایت سے کام لیا ہے۔ یہ جو آپ کا دعوے ہے۔ کہ لفظ خاتم جمع کی طرف مضاف ہونے سے ہرگز ہرگز (آخری) کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمیشہ افضل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم سچائی سے بالکل دور پاتے ہیں، اس لئے کہ آپ کے مرزا جی اس لفظ خاتم کو جمع کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں آخری اور ختم کرنے کے معنی میں استعمال کر رہے ہیں۔ جبھی تو کہا ہے، کہ پہلے اپنی ہی تعلیم کا عبور کر کے پھر معترض بنتے۔ ذرا ملاحظہ ہو۔ اپنے مرزا جی کی تریاق القلوب صفحہ ۱۵۷ لکھتے ہیں کہ

جیسا کہ میں ابھی لکھ چکا ہوں، میرے ساتھ ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ "جس کا نام جنت تھا۔ اور پہلے وہ لڑکی پیٹ سے باہر نکلی تھی، اور بعد اس کے میں نکلا تھا، اور میرے بعد میرے والدین کے گھر میں اور کوئی لڑکی یا لڑکا نہیں ہوا، اور میں ان کے لئے خاتم الاولاد تھا۔"

اس عبارت میں لفظ خاتم جمع اولاد کی طرف مضاف ہے، اور پھر بھی "آخر" کے معنوں میں ہے نہ افضل کے معنوں میں، اس لئے کہ پہلا جملہ میرے بعد میرے والدین

کے گھر میں اور کوئی لڑکا یا لڑکی نہیں ہوا۔ بالکلیہ افضل کے معنوں کی تکذیب کرتا ہے۔ اور اس پر مزید براں کریں ان کے لئے خاتم الاولاد تھا۔ آپ کے خودساختہ دعوے کی مٹی ہی خراب کر گیا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں پہلے خاتم النبیین کے مفہوم میں مرزاجی کے ہی اقوال سے استدلال کرلیا جائے۔ تاکہ معترض صاحب جھنجلاہٹ کی بجائے دوسرے دلائل کو ٹھنڈے دماغ سے سوچ سکیں۔ اوران کو پتہ لگ جائے۔ کہ متقدمین نے جو معنے خاتم النبیین کے آخری نبی یا نبیوں کا ختم کرنے والے کئے ہیں۔ وہ محض اپنے عقیدہ کے لحاظ سے نہیں کئے۔ بلکہ اس کے معنے ہو ہی یہی سکتے ہیں۔ اور اگر انہوں نے عقیدہ کے ماتحت یہ معنے کئے ہیں۔ توآپ کے مرزا صاحب نے کس عقیدہ کا اظہار کیا ہے۔ جن کے لئے آپ یوں بلاوجہ ایمان کی لٹیا ڈبو رہے ہیں۔ اور مسئلہ ختم نبوت سے منکر ہوئے جاتے ہیں۔ آیئے ذرا لگے ہاتھوں اورحوالہ جات بھی مرزا صاحب کی تحریرات سے ملاحظہ کرلیجئے۔ تاکہ کسی دوسرے پر خوش عقیدتی کا شبہ ہی نہ رہے۔

(۱) اور ہمارے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی کیونکر آسکتا ہے۔ درآنحالیکہ آپ کی وفات کے بعد وحی منقطع ہوگئی۔ اور اللہ تعالےٰ نے آپ پر نبیوں کا خاتمہ فرما دیا۔ حمامۃ البشریٰ صفحہ ۳۴

(۲) خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی کیسا۔ انجام آتھم صفحہ ۲۸

(۳) یہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ کہ نبی کریم خاتم الانبیاء ہوں۔ اور پھر کوئی دوسرا نبی آجائے۔ ایام الصلح صفحہ ۷۴

(۴) ہست او خیر الرسل خیر الانام   ہر نبوت را بروشد اختتام

(۵) مجھے کب جائز ہے کہ میں نبوت کا دعوےٰ کرکے اسلام سے خارج ہوجاؤں۔ اور کافروں کی جماعت سے جاملوں۔ حمامۃ البشریٰ صفحہ ۹۷

راس اقتباس سے یہ بات بھی مرزا صاحب کی زبانی ثابت ہوگئی۔ کہ جو مسلمان

حضور علیہ السلام کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے)

(۶) کیا ایسا بدبخت مفتری جو خود رسالت اور نبوت کا دعوےٰ کرتا ہے۔ قرآن شریف پر ایمان رکھ سکتا ہے۔ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی اور رسول ہوں۔ انجام آتھم صفحہ ۲۷

(۷) اور قرآن شریف جس کا لفظ لفظ قطعی ہے اپنی آیت ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین سے بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ کہ فی الحقیقت ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو چکی ہے۔ کتاب البریہ صفحہ ۸۴ حاشیہ

(اس عبارت میں خاتم النبیین کی تفسیر اس جملہ سے کی جاتی ہے (نبوت ختم ہو چکی) ذرا غور تو کیجئے۔ کہ یہ لغویوں کی غلطی تھی۔ اور خوش عقیدتی یا آپ کے پیر و مرشد بھی ان کی طرح اسی بات کے مستحق ہوں گے)۔

(۸) قرآن کریم بعد خاتم النبیین کسی رسول کا آنا جائز نہیں رکھتا۔ خواہ وہ نیا ہو یا پرانا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۷۶۱)

(۹) اللہ کی شان نہیں کہ خاتم النبیین کے بعد نبی بھیجے اور نہ ہی شایاں کہ سلسلہ نبوت کو دوبارہ از سر نو شروع کر دے۔ بعد اس کے کہ اُسے قطع کر چکا ہو۔
(آئینہ کمالات صفحہ ۳۱)

(۱۰) اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ نبیوں کو ختم کر دیا۔ (ترجمہ آئینہ کمالات صفحہ ۳۱)

(۱۱) لما کان سیدنا المصطفیٰ اعلیٰ مقام الختم من النبوۃ و انہ خاتم الانبیاء۔ ترجمہ۔ مرزا جی خود اس کا ترجمہ لکھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے سلسلہ کو ختم کرنے والے تھے۔ اور وہ خاتم الانبیاء ہیں۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۳۵)

اس عبارت میں مرزا جی خاتم الانبیاء کا ترجمہ خود نبوت اور نبیوں کو ختم کرنے والے کر رہے ہیں۔ مہر، افضل وغیرہ کا دخل نہیں۔

(۱۲) وتعین ان ھذا الوقت ھو وقت اٰخر الخلفاء لامۃ نبینا خیر

الوریٰ - ترجمہ - اور مقرر ہوگیا کہ یہ وقت وہی وقت ہے جس میں خاتم الخلفاء کا مبعوث ہونا ضروری تھا - (خطبہ الہامیہ صفحہ ۴۰)

قارئین کرام نے مندرجہ بالا حوالے مرزا صاحب کی اپنی تصانیف سے ہی پڑھ لئے ہیں، جن کے خادم کا خود ساختہ قاعدہ کہ خاتم کا ترجمہ جمع کی طرف مضاف ہونے سے آخری اور بند کرنے والا نہیں آتا - ان کے پیشوا ہی کی تحریروں سے باطل ہوگیا ہے - اور ضرورت ہی نہیں رہی - کہ اس بے سروپا اعتراض پر کلام عرب سے کچھ پیش کیا جائے - اور اگر یہ مرزا صاحب کے اقوال معترض کے نزدیک سچے ہیں، تو پھر معترض جھوٹا ہے - اور اگر معترض اپنے دعوےٰ میں سچا ہے - تو مرزا صاحب کے متعلق وہ خود ہی حکم شریعت صادر کرے - ہم کہیں گے تو برائی ہوگی - ہم نے تو معترض کے چیلنج کا جواب بوضاحت دے دیا ہے - تاکہ ان کو قیامت تک کا انتظار نہ رہے - شعر

سمجھ کر قدم رکھنا میکدہ میں خادم مرزا

یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں

یہ تو تھی خادم مرزا کی کہانی ان کے اپنے پیشوائے قادیانی کی زبانی - اب مناسب معلوم ہوتا ہے - کہ عقیدہ حقہ حضرات اہلسنت والجماعت متقدمین و متأخرین کے وہ دلائل پیش کر دیئے جائیں، جن کی بنا پر وہ آنحضرت سرور کائنات مفخر موجودات مختار شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین تسلیم کرتے ہیں، اور یہ بحث چار عنوانات پر ہوگی - تاکہ قارئین کتاب ہذا بوبی طرح اس شان نبوت تامہ کو سمجھ سکیں -

(۱) قرآن کریم (۲) حدیث شریف (۳) اجماع امت (۴) عقل سلیم

وَمَا توفیقی اِلَّا باللہ

اگرچہ قرآن کریم میں ختم نبوت پر متعدد نصوص موجود ہیں - لیکن اس مختصر مضمون میں صرف مندرجہ بالا تین نصوص پر ہی اکتفا کر کے اب احادیث صحیحہ بیشیا کی

جاتی ہیں۔ جن سے مسئلہ ختم نبوت اور واضح ہو جائے۔

احادیث

حدیث نمبر۱:۔ لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰی یُبْعَثَ دَجَّالُوْنَ کَذَّابُوْنَ کُلُّهُمْ یَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِیٌّ وَّ اَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔ (ابو داؤد و ترمذی) قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک بہت سے دجال اور کذاب نہ اُٹھائے جائیں۔ جن میں سے ہر ایک یہ گمان کرتا ہو گا کہ وہ نبی ہے۔ حالانکہ میں تو خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہو گا۔

اس حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فیصلہ کن بات فرمائی ہے۔ جس کے بعد کوئی مسلمان جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہو گا۔ خاتم النبیین کے حقیقی اور صحیح مفہوم میں شک نہیں کر سکتا۔ حضور علیہ السلام نے اس کے معنے خود کر دیئے ہیں، کہ میں سلسلۂ انبیاء کا ختم کرنے والا ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔

لا نبی بعدی میں لائے نافیہ جنس کی نفی کرتا ہے۔ یعنے کسی قسم کا بھی نبی پیدا نہیں ہو گا۔ ہر قسم کی نبوت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ خود مرزا قادیانی نے بھی ایام الصلح کے صفحہ ۱۴۴ پر لکھا ہے۔ کہ لا نبی بعدی میں لائے نافیہ جنس کی نفی کرتا ہے۔ کسی قسم کا بھی نبی خواہ نیا ہو یا پرانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دُنیا میں نہیں آ سکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے بعد کون سی وحی ایسی نازل ہو گئی تھی۔ جس کی رُو سے لا نبی بعدی میں وہی لائے نافیہ جنس کی نفی نہیں کرتا۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

حدیث نمبر۲:۔ ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتاً و اجمله الا موضع لبنة من زاویة فجعل الناس یطوفون ویعجبون له ویقولون هلاّ وضعت هٰذه اللبنة قال فانا اللبنة وانا خاتم النبیین

(رواہ بخاری و مسلم وغیرهما)

ترجمہ:۔ میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السّلام کی مثال ایسی ہے۔ جیسے

کسی شخص نے کوئی گھر بنایا ہو اور اس کو آراستہ پیراستہ کیا ہو، مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی ہو۔ لوگ اس کے پاس چکر لگاتے ہوں اور خوش ہوتے ہوں۔ اور کہتے ہوں کہ یہ ایک اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی (کہ عمارت مکمل ہو جاتی) فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں ہی وہ آخری اینٹ ہوں۔ اور میں ہی خاتم النبیین ہوں۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ خاتم النبیین کے معنے آخر الانبیاء کے ہیں اور یہ قصر نبوت مکمل ہو چکا ہے۔ اب کسی اینٹ کی گنجائش نہیں۔ قربان جائیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ نے کیسی خوبصورتی کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان فرما دیا ہے کہ میں آخری نبی ہوں۔ آپ فرماتے ہیں، کہ سلسلہ بعثت انبیاء کو ایک عمارت تصور کر لو عمارت اینٹوں سے پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ معمار ایک عرصہ تک اس عمارت کو اینٹوں سے بناتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اور صرف ایک اینٹ کی کسر باقی رہ گئی۔ آخر ایک دن اس نے وہ آخری اینٹ بھی لگا دی۔ کیا اب کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی بڑا کاریگر کیوں نہ ہو، اس عمارت میں کسی اینٹ کا اضافہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح اس قصر نبوت کی تکمیل کے بعد نہ تشریعی نبوت کی اینٹ کی گنجائش ہے نہ غیر تشریعی یا ظلی و بروزی یا لغوی و مجازی کی۔ ہاں خلق خدا کو گمراہ کرنے کا ٹھیکیدار بن جانا ایک دوسری بات ہے۔ نبوت تو درکنار لوگوں نے خدائی کے دعووں تک سے دریغ نہیں کیا۔

حدیث نمبر ۳۔ وَخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ (رواہ مسلم فی الفضائل) امام مسلم نے اس حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کے باب میں درج کیا ہے۔ اس حدیث میں چھ فضیلتوں کا ذکر ہے۔ جن میں سے چھٹی فضیلت یہ ہے کہ میرے ساتھ تمام انبیاء علیہم السلام کو ختم کیا گیا۔ اس حدیث میں اس تحریف کی بھی جڑ کاٹ دی گئی، جو لفظ خاتم میں کی جاتی ہے۔ خاتم النبیین کی جگہ ختم بی النبیون فرمایا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کے نبی کا استثنا موجود نہیں۔

حدیث نمبر ۴: بروایت ابن ماجہ باب فتنۃ الدجال۔ اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتُمْ

اٰخِرُ الْاُمَمِ ۔ یعنے ہیں سب نبیوں کے آخر میں آنے والا ہوں، اور تم سب امتوں کے آخر میں آنے والی امت ہو، گویا آپ کے بعد کوئی شخص اس امت کے لئے نبی بنا کر نہیں بھیجا جائے گا۔ ان احادیث صحیحہ کی موجودگی میں نہ کوئی مسلمان نبوت کا دعویٰ خود کر سکتا ہے، نہ کسی مدعی کاذب کے دعوے پر ایمان لا سکتا ہے۔ مگر داد دیجئے اُن بھٹکے ہوؤں کے ایمان کی جو اپنا ایمان کسی کاذب مدعی نبوت کی سپرد کر کے عوام کیلئے بھی بہکاوٹ کی صد ہا راہیں نکالتے رہتے ہیں۔ اور ایک مدعی کی بطالت کو ثابت کرنے کے لئے ہزاروں جھوٹ بولتے اور لاکھوں تاویلات کو کام میں لاتے ہیں۔ ایمان رہے یا نہ رہے، اور ان احادیث کو پڑھ کر بھی کوشش جاری رہتی ہے کہ کوئی ضعیف حدیث یا کوئی گرا ہوا متقدمین کا قول ہی مل جائے جو ہم بھی اپنے دعوے میں پیش کر سکیں، چنانچہ مسئلہ ختم نبوت کے مخالف ایک حدیث صحیح پیش کیا کرتے ہیں جس کا مفہوم حقیقی تو وہی ہے۔ جو جمیع اہل اسلام نے خاتم النبیین کا سمجھا ہے، مگر وہ ہیں کہ اگر مگر پر قیاس آرائی کرتے ہوئے اپنے راہنما کے لئے پورا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں، کہ اس حدیث کے اگر سے کچھ نفع اٹھانے کی صورت پیدا کر لیں، مگر وائے آرزو کہ خاک شدہ، ہزاروں ٹکریں مارتے ہیں۔ مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ فقیر یہاں وہ حدیث شریف نقل کر کے مخالفین کے لئے مفصل بحث کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ اگر مگر کی بھول بھلیوں سے نکل کر ابدی صراط مستقیم پا سکیں وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ ۔

حدیث شریف یوں ہے۔ کہ لَوْعَاشَ اِبْرَاھِیْمُ لَکَانَ صِدِّیْقًا نَبِیًّا۔ ابن ماجہ جلد صفحہ ۲۷۰ مطبوعہ مصر۔ یہ حدیث اپنی صحت کے لحاظ بشہادت شہاب علی البیضاوی جلد، صفحہ ۱۷۵ میں یوں بیان کی گئی ہے۔ کہ اِمَّا صِحَّۃُ الْحَدِیْثِ فَلَا شُبْہَۃَ فِیْھَا لِاَنَّہٗ رَوَاہُ اِبْنُ مَاجَۃَ وَغَیْرُہٗ کَمَا ذَکَرَہٗ ابن حجر، یعنے اس حدیث کی صحت میں کوئی شبہ نہیں، جیسا کہ ابن حجر نے ذکر کیا ہے۔ اور اس حدیث کو ابن ماجہ کے علاوہ اور محدثین نے بھی ذکر کیا ہے۔

اس کی تشریح یہ ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے سیدنا ابراہیم ۸ھ ہجری المقدس میں پیدا ہوئے۔ اور ربیع الاول ۱۰ھ کو بروز منگل وفات پا گئے۔ اِن کی وفات پر حضور علیہ السّلام نے فرمایا۔ اگر ابراہیم زندہ رہتے تو ضرور صدیق نبی ہوتے۔ مرزائی اس اگر میں مرزائے قادیانی کی نبوت کو ثابت کرنے لئے یہ استدلال کرتے ہیں۔ کہ دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کا آنا ممکن اور ثابت ہوگیا۔ یعنے اگر ابراہیم زندہ رہتے تو نبی ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ اجرائے نبوت لازم ہے۔ چونکہ ابراہیم فوت ہوگئے، اس لئے نبی نہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ اس کا نبی نہ ہونا اس کی موت کا سبب تھا، ورنہ نبوت جاری ہے اور حضور نے آیت خاتم النبیین سے نبوت کو کلی مسدود نہیں سمجھا۔ اور اسی طرح کی ایک اور حدیث بھی جس کے الفاظ یہ ہیں، پیش کیا کرتے ہیں۔ لوکان بعدی نبیاً لکان عمر۔ یعنے اگر میرے بعد کسی نبی کا ہونا ممکن ہوتا، تو بلاشبہ حضرت عمر نبی ہوتے۔ یہاں بھی وہی اگر نظر آرہا ہے۔ جس کے معنے نہ سمجھتے ہوئے خواہ مخواہ کھینچ کر مرزا صاحب کی نبوت نکالنے اور منوانے کی سعی کی جارہی ہے۔ ان دلدادگان پیشوا سے پوچھا جائے کہ جہاں حرف اگر آئے گا اس مطلب کا آئندہ اجرا ہی مقصود ہوگا۔ یا یہ اگر کسی اور مطلب کے لئے بھی آتا ہے۔ یہاں تو بات سیدھی اور صاف تھی۔ کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم تھی۔ لہٰذا حضرت عمر کا نبی ہو سکنا محال ہوا، اور صاحبزادہ ابراہیم کی وفات اس لئے ہوئی کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آنا تھا۔ اگر زندہ رہتے تو نبی ہوتے۔ اور نبوت تھی ختم۔ لہٰذا فوت کر لئے گئے۔ کیونکہ اگر زندہ رہ کر نبی نہ ہوتے تو یہ حضور خاتم النبیین علیہ السّلام کی کسرِ شان تھی، کہ باقی انبیاء کی اولاد زندہ رہ کر نبوت پائے اور حضور کی اولاد محروم النبوّت ہو۔ چنانچہ اسی مفہوم کی تائید میں بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن ادفیٰ کے یہ الفاظ موجود ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم اس لئے زندہ نہ رہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں (ولکن لا نبی بعدہٗ) ایسے ہی حضرت

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ وَلَوْ بَقِیَ لَکَانَ نَبِیًّا۔ اگر حضرت ابراہیم زندہ رہتے تو ضرور نبی ہوتے۔ وَلٰکِن لَمْ یَکُنْ یَبْقٰی (لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ زندہ رہیں) لِاَنَّ نَبِیَّکُمْ اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ اس لئے کہ تمہارے نبی علیہ السلام آخری نبی ہیں۔ یعنے آخری نبی کے بعد اور نبی نہیں آسکتا۔ کیا صحابہ کرام کی تشریح سے بھی یہ مطلب ذہن نشین نہیں ہوگا۔ کہ حضرت صاحبزادہ سیدنا ابراہیمؓ کی موت کس بنا پر ہوئی۔ اور اگر اس کا مفہوم یہی فرض کرلیا جائے جو مرزا صاحب کے مرید کہتے ہیں، تو کیا حضرت عمرؓ کی نبوت تو موت سے ختم نہیں ہوئی۔ انہوں نے تمہارے اس غلط استدلال کے ماتحت نبوت کا دعویٰ کیوں نہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ختم نبوت کے صحیح مفہوم کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اگر حرف لَو آپ کے نزدیک اپنی مطالب کا حائل ہے۔ تو ذرا دو مثالوں پر غور فرمانے کے بعد جاری رہنے کے معنوں کی ہٹ دھرمی دیکھئے۔

۱۔ قرآن مجید وحدت خدا کے اثبات پر دلیل پیش کرتا ہے۔ لَوْ کَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ یعنے اگر کائنات میں اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی اور خدا بھی ہوتا تو نظام عالم بگڑ جاتا۔ اور اس میں فساد آجاتا۔ کیا یہاں دوسرے خدا کا ہونا حرف لَو کے ماتحت ممکن ہے، جس طرح اس سے پہلے استدلال کیا جاچکا ہے۔ یا یہاں پر لَو اس حقیقت کا ترجمان ہوگا۔ کہ اللہ کے سوا کسی اور خدا کا ہونا محال ہے۔ اور اگر یہاں بھی اسی جدت علمی سے کام لیا جائے گا۔ تو وہ علم ظاہر کرنے سے پہلے ایمان کی فکر کرنی پڑے گی، ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ لَو عاش ابراہیمؑ میں بھی ان کا زندہ رہنا محال تھا۔ اب کہیں یہ نہ کہدیں کہ دوسرے خدا کے لئے گنجائش تو ہے مگر یہ ایک الگ بات ہے۔ کہ اتفاق سے دوسرا خدا نہیں۔ اور اگر سوچا جائے، تو آیت میں حرف لَو موجود ہے، لہٰذا دوسرا خدا ہو تو سکتا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

۲۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ لوکان موسیٰ حیًّا لَمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے، تو انہیں لامحالہ میری اطاعت کرنی پڑتی۔ کیا یہاں سے موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا اجرا ثابت ہوگا، گو وہ حضور علیہ السلام سے

ملاقات نہیں فرما سکتے۔ مختصر بات صرف یہ ہے کہ جیسے لَو دو خداؤں کی نفی ظاہر فرماتا ہے۔ ویسے ہی حیات موسےٰ کی نفی کرتا ہے۔ اور ایسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صغیر سن بیٹے ابراہیم کی نبوّت کی نفی پر دال ہے۔ اور لَو عاش کا صحیح ترجمہ وہی ہو سکتا ہے، جو احادیث کے مطابق اور تشریح صحابہ کرام کے موافق ہو۔

۵۔ ابن ماجہ میں ایک حدیث ہے۔ کہ انا آخر الانبیاء یعنے میں آخری نبی ہوں۔ گویا بتا دیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

۶۔ صحیح مسلم میں ہے۔ فانی آخر الانبیاء۔ اس میں قطعاً شبہ نہیں، کہ تحقیق میں آخری نبی ہوں، اس سے صاف طور پر واضح فرما دیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

۷۔ کنز العمال میں ہے۔ انا خاتم الانبیاء یعنے میں تمام نبیوں کا ختم کرنے والا ہوں۔

۸۔ مسلم و بخاری میں ہے۔ لَمْ یَبْقَ من النبوۃ الا المبشرات الصالحات یعنے نبوت کا کوئی جزو باقی نہیں رہا۔ مگر مبشرات الصالحات باقی ہیں، صحابہ عرض کرتے ہیں۔ یا رسول اللہ مبشرات کیا ہیں۔ فرمایا۔ الرویا الصالحۃ (سچی خوابیں) مطلب یہ کہ نبوت ختم ہو گئی ہے۔

۹۔ ترمذی شریف میں ہے۔ حضور علیہ السّلام نے فرمایا۔ یا اباذر اول الانبیا آدم واٰخرھم محمد واول نبی من انبیاء بنی اسرائیل موسےٰ واٰخرھم عیسےٰ یعنے اے ابوذر سب سے پہلے نبی آدم ہیں اور سب سے آخری نبی محمدؐ ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے سب سے پہلے نبی موسےٰ اور آخری نبی عیسیٰ ہیں۔

کیا مسلمان کے لئے یہ وضاحت کافی ہے۔ اگر بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السّلام میں عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا، تو آنحضور علیہ السّلام کے بعد اس امت میں اس حدیث کے ماتحت کیوں کر کوئی نبی آسکتا ہے۔

۱۰۔ مسند امام احمد حنبل میں ہے۔ عن عائشۃ۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یبقی بعدی من النبوۃ شیٔ الا المبشرات قالو یا رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم وما المبشرات قال الرویا الصالحۃ ۔ حضرت اُم المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے بعد نبوت میں سے کوئی چیز سوائے مبشرات کے باقی نہیں رہی۔ اس پر صحابہ کی طرف سے گذارش کی گئی، کہ مبشرات کیا ہیں، تو حضور نے جواب میں فرمایا۔ کہ نیک اور سچی خوابیں۔

کیا صاف الفاظ ہیں، کہ نبوت میں سے بجز سچی خوابوں کے اور کچھ باقی نہیں رہا لہذا کوئی شخص نبی نہیں بن سکتا، ہاں کسی کو سچے خواب ضرور آسکتے ہیں کیونکہ مبشرات کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ یہ تو تھی حدیث شریف کی روشنی میں تشریح ختم نبوت اب مفسرین و متقدمین کے اقوال و اعتقادات بھی سن لیجئے۔

(۱) ابو جعفر ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں حضرت قتادہ سے خاتم النبیّین کے معنے یوں بیان فرماتے ہیں: عن قتادۃ رضی اللہ عنہ ولکن رسول اللہ و خاتم النبیّین ای اٰخرھم ۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور خاتم النبیّین بمعنے آخر النبیّین ہیں۔

(۲) امام سیوطی نے درمنثور میں بحوالہ عبد اللہ بن حمید حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ عَنِ الْحَسَنِ فِیْ قَوْلِہٖ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ قَالَ خَتَمَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ بِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہ علیہ وسلم وکان اٰخر من بُعِثَ ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر دیا، اور آپ ان تمام رسولوں میں سے جو اللہ کریم نے مبعوث فرمائے آخری نبی ہیں۔

(۳) علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں بنایا جائے گا۔ نبوت آپ کی ذات پر ختم ہو گئی ہے (کشاف جلد دوئم صفحہ ۲۱۵)

(۴) امام رازی نے بھی یہی معنے کئے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کوئی نبی مبعوث نہ ہو گا۔ (تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۶۱۷)

(۵) علامہ آلوسی بغدادی اپنی تفسیر روح المعانی میں کہتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اس لئے حضور خاتم المرسلین بھی ہیں۔ آپ کے بعد قیامت تک اب وصفِ نبوت و رسالت کسی جن و انس میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ ختم نبوت کی تصریح قرآن کریم میں موجود ہے۔ اور اس پر ایمان رکھنا از بس ضروری ہے۔ اور اس کا منکر کافر ہے۔ (روح المعانی جلد ہفتم صفحہ ۶۰)

(۶) علامہ زرقانی شرح مواہب لدنیہ جلد ۵ صفحہ ۲۶۷ میں بیان کرتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے، کہ آپ سب انبیاء و رُسل کے ختم کرنے والے ہیں۔

مقام غور ہے۔ کہ دنیائے اسلام کے برگزیدہ مفسرین نے خاتم النبیین کے معنے یہی کئے ہیں۔ کہ آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ پھر کس قدر جائے تعجب ہے۔ کہ اس قدر تصریحات کے باوجود نہایت بیباکی کے ساتھ نبوت کا دعویٰ کرنا اور اپنے نہ ماننے والوں کو کافر گردانتا۔ پھر اپنی خود ساختہ تفسیر و تقسیم کے دامن ظل و بروز میں پناہ لینا حقیقت سے دُوری نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی کے زمانہ میں اور بعد کو مسیلمہ کذاب کا اتنا ہی قصور نہ تھا۔ کہ اس نے نبوت کا دعوےٰ کیا۔ حالانکہ وہ آپ کی رسالت و قرآن کریم کا منکر نہ تھا اور صحابہ کرام نے اس سے وہی سلوک کیا جو کفار کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ دیکھو تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۲۴۴ میں مرقوم ہے۔ کہ مسیلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، قرآن بھی اور جمیع اسلامی احکام پر ایمان رکھتا تھا۔ لیکن ختم نبوت کے بدیہی مسئلہ کے انکار پر اور مدعی نبوت ہونے کی وجہ سے تمام صحابہ اور عامۃ المسلمین نے اس کو کافر سمجھا۔ اور کسی ایک نے بھی یہ نہ کہا، کہ یہ لوگ اہل قبلہ ہیں۔ کلمہ گو ہیں، نماز پڑھتے ہیں ان کو کافر نہ کہنا چاہیئے۔ جس طرح چودہویں صدی کا مسلمان ہر منکر کی طرفداری میں کہہ گذرتا ہے۔ اور الحاح وزاری کرتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نبوت کی شان اور حقیقت سے واقف نہیں رہا۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی توہین و تنقیص ہوتی ہے

تو ہو دیگر اپنے تعلقات بھائی بندی اور خطاب روشن خیالی میں فرق نہ آنے پائے حضور کی اہانت گوارا ہے۔ مگر ایک بے رہر و بھٹکے ہوئے دوست کی گوارا نہیں۔ اس تعلق سفلی نے ان کے دلوں پر بیجا محبت دنیا و اہل دنیا کی مہر کر دی ہے۔ جو چند احباب کی خوشنودی کے لئے حق سے ہٹ کر گذارہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر بہت زیادہ تحقیق علمی نہیں رکھتے تھے۔ تو ان کو اپنے مایۂ ناز شاعر علامہ اقبال ہی سے پوچھنا چاہیئے تھا۔ کہ ختم نبوت کے مسئلہ کو تو نے کیا سمجھا ہے۔ چونکہ انگریزی خوان طبقہ اقبال مرحوم سے ایک خاص عقیدت رکھتا ہے۔ اور قادیانیوں کی تبلیغ کا شکار بھی یہی زیادہ ہوا ہے۔ لہٰذا علامہ اقبال مرحوم کے عقیدہ ختم نبوت کے متعلق جو خیالات اُن کی اپنی تصنیف رموز بیخودی میں بیان ہوئے ہیں۔ ان سے مسلمانوں کو روشناس کرا دینا غیر مفید نہ ہوگا۔ دیکھئے رموز بیخودی صفحہ ۸ ا! پر علامہ مرحوم یوں اظہار عقیدت فرماتے ہیں۔ ے

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد	بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را	او رُسل را ختم و ما اقوام را
خدمت ساقی گری با ما گذاشت	داد ما را آخرین جامے کہ داشت
لا نبی بعدی ز احسانِ خدا است	پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو	حفظ سرِ وحدت ملت ازو
حق تعالےٰ نقش ہر دعوےٰ شکست	تا ابد اسلام را شیرازہ بست

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ جل و علیٰ مجدہٗ نے ہم مسلمانوں پر اپنی پسندیدہ شریعت اور ہمارے رسول مکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کو ختم کر دیا۔ دنیا کی رونق قیامت تک اب ہمارے ہی دم سے وابستہ ہے۔ حضور علیہ السّلام رسولوں کے ختم کرنیوالے ہیں۔ اور ہم قوموں کے۔ مالک الملک نے (ساقی گری) توحید کا جام اہل جہان کو پلانے کا کام ہمارے سپرد کر دیا۔ اور یہ آخری جام (قرآن پاک) بھی ہمیں ہی عنایت فرما دیا۔ اور یہ ختم نبوت بہت بڑا احسان الٰہی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کا خاتم النبیین ہونا ہی آپ کے مذہب کیلئے باعث امتیاز ہے۔ یعنے آپ کے آخر الانبیاء ہونے ہی کے سبب سے ملت اسلامیہ کو قوت وطاقت حاصل ہوئی اور ہوتی رہے گی رکیونکہ اسی نکتہ میں ملّت کی وحدت کا راز مضمر ہے۔ نہ اب کوئی نیا نبی آسکتا ہے۔ اور نہ کوئی جداگانہ نئی اُمت پیدا ہو سکتی ہے۔ گویا آپ کے بعد کسی شخص کو نبی تسلیم کرنا آپ کی صریح توہین وتحقیر ہی نہیں۔ بلکہ اسلام سے خارج ہو جانا بھی ہے ۔

نتیجہ پیغمبری کی حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد یہ ماننا پڑے گا۔ کہ پیغمبر روز بروز پیدا نہیں ہوتے اور نہ آتے ہیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر قوم کے لئے ہر وقت ایک پیغمبر موجود ہو۔ پیغمبر کی زندگی دراصل اس کی تعلیم وہدایت کی زندگی ہے۔ یعنے جب تک اس کی تعلیم اور ہدایت زندہ ہے، اس وقت تک گویا وہ خود زندہ ہے۔ پچھلے پیغمبر اس لئے مر گئے ہوئے اعتقاد کئے گئے کہ جو کچھ تعلیم انہوں نے فرمائی تھی اہل دُنیا نے اُسے بدل ڈالا اور جو کتابیں ان پر نازل ہوئیں۔ یا بالفاظ دیگر وہ لائے اُن میں سے ایک بھی آج اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں۔ اور نہ ہی اُن کے پیرو یہ دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس ہمارے رسول کی لائی ہوئی کتاب اصلی حالت میں موجود ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السّلام کی سیرتوں کو بھی بھُلا دیا۔ یہ الزام نہیں امر واقعی ہے۔ کہ سابقہ پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر کے بھی صحیح حالات زندگی آج نہیں ملتے، اور سوانح حیات کا ملنا تو درکنار اتنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں اور کس زمانہ میں پیدا ہوئے، اور انہوں نے کیا کام کئے یا کیسے زندگی گذاری۔ اور یہی ان کی اُمم کی معنوی موت ہے، مگر سید الکونین تاجدار کائنات مختار شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور حیات النبی ہوتے ہوئے اس طرح بھی زندہ ہیں کہ حضور علیہ السّلام کی تعلیم وہدایت زندہ ہے ۔ اور جو کتاب انہوں نے زمانہ کے سامنے پیش کی تھی وہ اپنے مکمل متن اور پورے الفاظ کے ساتھ موجود ہے، جس میں ایک حرف، ایک لفظ، ایک نقطہ ایک زبر، ایک زیر۔ ایک ضمہ کا فرق نہیں۔ آپ کی پاکیزہ زندگی کے حالات، آپ کے ارشادات اور آپ کے

اعمال وافعال سب کے سب بلاکم وکاست محفوظ اور موجود ہیں، اور آج تیرہ سو پچھتر[۱۳۷۵] سال سے زیادہ مدت گذر جانے کے بعد بھی تاریخ میں ان کا نقشہ ایسا صاف نظر آتا ہے۔ کہ گویا ہم خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو برائی العین دیکھ رہے ہیں، دنیا میں آنیوالے اشخاص وافراد میں سے کسی شخص وفرد کی زندگی اتنی محفوظ نہیں، جتنی تاریخ میں حضور علیہ السّلام کی حیات طیبہ محفوظ ہے، دور نہ جائیں، آج بھی جو لوگ بہ ارادہ زیارت مدینہ طیبہ حاضر ہوتے ہیں۔ وہ دیکھ سکتے ہیں، کہ مسجد قباء کے صحن کے عین وسط میں ایک برآمدہ چبوترہ نما بنا ہوا ہے، بظاہر جس کی کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس کا ہونا مسجد کی کسی ضرورت کا حامل نظر آتا ہے، مگر دریافت کرنے پر معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ وہ مقام ہے، جہاں ہجرت کے موقعہ پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی خود بخود ماموربن اللہ ہونے کی حیثیت میں بیٹھی تھی۔ اور حضور اس مقام پر اتر پڑے تھے۔ سبحان اللہ، جس اولوالعزم رسول علیہ السّلام کی اونٹنی کے پاؤں کا نشان چودہ سو[۱۴] سال تک اس کی امت نے گم اور آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اس کی باقی حیات مقدسہ کیونکر غیر محفوظ چھوڑی جا سکتی تھی۔ یوں سمجھئے کہ ہم اپنی زندگی کے معاملہ میں ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے ایسا سبق لے سکتے ہیں۔ جس کی ہم کو ضرورت پڑے، یہی اس امر کی پختہ دلیل ہے، کہ سرکار دو عالم زندہ ہیں، اور آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی کسی دوسرے نبی کی ضرورت نہیں۔

محققین نے لکھا ہے کہ ایک پیغمبر کے بعد دوسرا پیغمبر آنے کی صرف تین وجہیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) یا تو پہلے نبی کی تعلیم وہدایت نابود ہو چکی اور مرگئی ہو، اور اس کو پھر زندہ کرنے کی ضرورت ہو۔

(۲) یا پہلے نبی کی تعلیم مکمل نہ ہو، اور اس میں ترمیم یا اضافہ کی ضرورت ہو۔

(۳) یا پہلا نبی کسی خاص قوم یا طبقہ کے لئے آیا ہو، اور اب ایک دوسری قوم کیلئے دوسرے نبی کی ضرورت ہو۔

اور یہ تینوں وجوہات ہی اب باقی نہیں ہیں۔ کیونکہ حضور علیہ السّلام کی تعلیم و ہدایت زندہ ہے۔ جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ لہٰذا پہلی وجہ دُور ہو گئی۔ کیونکہ نبی کی تعلیم و ہدایت کا زندہ ہونا گویا خود نبی کا زندہ ہونا ہوتا ہے۔ اور جب ایک نبی اپنے عہدہ اور منصب پر موجود ہو تو دوسرا نبی کیسے آسکتا ہے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے دُنیا کو اسلام کی مکمل تعلیم دی جا چکی ہے۔ اب نہ اس میں کسی کمی بیشی کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی کوئی ایسا نقص باقی رہ گیا ہے۔ جس کی تکمیل کیلئے کسی نئے نبی کے آنے کی حاجت ہو۔ لہٰذا دوسری وجہ بھی دُور ہو گئی۔

(۳) سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ کسی خاص قوم کے لئے نہیں بلکہ ساری کائنات کے لئے رسُول مبعوث ہوئے ہیں۔ اور تمام اہل جہان کیلئے آپ کی تعلیم و ہدایت کافی ہے۔ اس لئے اب کسی بھی قوم کے لئے نبی آنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے تیسری وجہ بھی جاتی رہی۔ اور اسی بنا پر قرآن کریم حضور علیہ السّلام کو خاتم النبیین فرماتا ہے۔ یعنے سلسلۂ نبوت کو ختم کر دینے والے اس لئے اب دُنیا کو کسی نبی و رسول کی حاجت باقی نہیں۔ بلکہ صرف ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر خود چلیں۔ اور آپ کی تعلیمات کو سمجھ کر خود عمل کریں اور اہل دُنیا سے کرائیں۔ فقط

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (سورہ اعراف) وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا (سورۂ سبا) وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (سورۂ انبیاء)

ترجمہ:۔ (۱) اے محبوب آپ فرماویں کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول بھیجا گیا ہوں۔

(۲) یعنے ہم نے آپ کو سب لوگوں کے واسطے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بھیجا ہے۔

(۳) یعنے ہم نے آپ کو کل جہانوں اور جہانیوں کے لئے رحمت کرکے بھیجا ہے۔

قرآن کریم کی ان ہر سہ آیات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ حضرت نبی کریم رؤف و رحیم علیہ الصلوٰت والتسلیم کی بعثت محض ملک عرب کے لئے ہی نہ تھی۔ بلکہ کل دنیا کے لئے مبعوث ہوکر تشریف لائے تھے۔ چونکہ حضرت موسےٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء اسرائیلیہ کی بعثت صرف انہی کی قوم تک محدود تھی۔ اس لئے وہ اکثر خدا تعالیٰ کو بنی اسرائیل کا خدا کہکر پکارتے تھے۔ لیکن سرور کائنات محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا صرف قریش یا عربوں کا خدا نہیں۔ بلکہ کل جہانوں کا خدا تھا اور ہے۔ اس لئے اس کے آخری رسول بھی کل دنیا کی طرف مامور ہوکر تشریف لائے۔ حضور نبی کریم علیہ السلام نے اپنے تئیں صرف قریش کے خدا کا رسول نہیں فرمایا۔ بلکہ ربّ السمٰوٰت والارض کا رسول ہونے کا دعوےٰ کیا۔ جو حضورؐ سے قبل کسی سے باوجود خدا کا رسول و نبی ہونیکے بھی وقوع پذیر

نہیں ہوا۔ یعنے معرض ادعا و تکلم میں نہیں آیا۔

اب قابل غور یہ چیز ہے کہ تمام نبی ایک ایک گروہ، ایک ایک جماعت یا قبیلہ ایک ایک علاقہ کی طرف مبعوث ہوتے رہے۔ اور اکثر اُن میں سے قوموں کی جہالت وتعدی کی وجہ سے اپنے اپنے اُس مختصر ماحول میں بھی اپنے تبلیغی مشن کو انجام تک نہ پہنچا سکے۔ قرآن کریم کے ارشاد کے پیش نظر یا تو عذاب لاکر اور قوم کو اس میں مبتلا کرکے تشریف لے گئے۔ یا وہ خود ذبح ہوگئے۔ برخلاف اُس کے کہ حضور علیہ السّلام اس مشن کی تکمیل کے لئے جس کی ابتدا آدم علیہ السّلام سے اور انتہا مسیح علیہ السّلام پر ہوئی۔ تمام کائنات کے رسُول ہوکر تشریف لائے۔ چونکہ حضورؐ کی تشریف آوری سے قبل جداگانہ طور پر جداگانہ رسالت ونبوت کے ماتحت جُدا جُدا دُنیا کے ہرگروہ کو پیغام الٰہی مل چکا تھا۔ اس لئے اب اُس سارے قانون کو مجموعی طور پر کل دُنیا کے سامنے ترمیم وتنسیخ کے ساتھ اس طرح پیش کرنے کی ضرورت تھی جس کے بعد تغیر و تبدّل فطرتاً ناممکن ہو۔ اور وہ قانون الٰہی ایسا جامع مانع ہو کہ قیامت تک اس میں انسانی زندگی کا کوئی پہلو، انسانیت کی کوئی منزل، اور انسان کی ضرورت دین و دُنیا کا کوئی مسئلہ بیان میں آنے سے رہ نہ گیا ہو۔ اور جہاں انسان وانسانیت کے لوازم کی تکمیل کردی گئی تھی۔ وہاں قانون بھی اتنا ہی کامل ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے، تو اس کے کپڑے کا ناپ اس کے چھوٹے سے قد کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کی چارپائی، اس کے برتن، اس کی ضروریات کا سامان سب کچھ اس کے اپنے ماپ کا ہوتا ہے۔ اور جوں جوں وہ بڑھتا ہے، ساتھ ساتھ اس کی ہر چیز کا سائز بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے، جبکہ اس کا بڑھاؤ ختم ہوجاتا ہے۔ اور اس کی ہر شئے کا سائز ایک معیّن رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے لباس میں کمی ہوتی ہے نہ بیشی۔ اور وہی ماپ اس اس کو ہمیشہ کام دیتا رہتا ہے۔ بعینہٖ یہی حال، دُنیا میں اس قانون فطرت کا ہے۔ جو بندوں کے لئے سب سے بعد میں بھیجا گیا۔ پہلے ایک وقت میں ایک انسان پیدا

فرمایا گیا تھا۔ اور اس کے لئے اور اس کی اولاد کے لئے بہت چھوٹا سا قانون تھا۔
کیونکہ اس کی وسعت ہی اتنی تھی۔ مثلاً اگر آدم علیہ السلام پر قرآن کریم کے حکم کے
ماتحت یہ فرض کر دیا جاتا۔ کہ ایک ہی ماں باپ کی پیدا شدہ ذرّیت کا نکاح آپس
میں حرام اور بہن بھائی کا رشتہ ممنوع ہے۔ تو آدم علیہ السلام کہاں سے بچوں کا
ماموں لاتے۔ اور کس جگہ سے ان کا چچا پیدا کرتے۔ جن کے لڑکے اور لڑکیاں اِنکی
اولاد کے لئے حلال ہوتے۔

لہذا فطرت انسانیہ کے لئے جو ابتدائے عالم سے چھوٹے پیمانے پر نافذ ہونا
شروع ہوا تھا۔ انسان کی بہتات کے ساتھ ساتھ اس کی وسعت ہوتی گئی اور ہر زمانہ
میں اس کی وسعت اور فضا کے مطابق قوانین کا نفوذ ہوتا رہا۔ لہذا وہ وقت آگیا
کہ یہ طالب علم ابتدائی تعلیم سے گذر کر مختلف اُستادوں کے سامنے زانوئے ادب
تہ کرتا ہوا ایک سب سے بڑے اُستاد (ہیڈ ماسٹر) کی ضرورت کو محسوس کرنے
لگا۔ اور اس کی ابتدائی تعلیم نے ایک انتہائی ڈگری کا تقاضا کرنا چاہا۔ جس کے بعد
اس کی تعلیم ایسی کامل ہو جائے۔ کہ پھر اس کو کسی اُستاد، کسی کتاب اور کسی تعلیم کی ضرورت
نہ رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور زمانے نے دیکھا کہ وہ بالآخر وہ دنیا کا اُستاد کامل
اور اس کالج کا مدرس اُس آخری قانون کے ساتھ دُنیا پر ظہور فرما ہوا جس کی تعلیم
نے ابن آدم کو ہر تعلیم سے اور جس کی کتاب نے انسان کو ہر کتاب سے بے نیاز کر دیا۔
چونکہ ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام ایسے وقت پر مبعوث ہوتے رہے تھے۔
جب دُنیا معصیت کاریوں۔ بدکرداریوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں خلائے قدوس
اور اس کی پاک تعلیم ہدایت کو بھول چکی ہوتی تھی۔ لہذا اس آخری نبی۔ آخری اُستاد
آخری رسُول۔ آخری ہادی علیہ السّلام کی بعثت پر بھی دیکھنا ہے۔ کہ اس دُنیا کا کیا
حال تھا۔ اور حضور نے کیوں کر تمام دُنیا کی راہنمائی کا بیڑہ اٹھایا۔ اور کیونکر اہل زمانہ
کو اپنی صداقت منوائی۔ تاکہ معترض یہ نہ کہے۔ کہ سابقہ انبیاء و مرسلین کی بوئی ہوئی
کھیتی کو کاٹا گیا ہے۔ یا اُن کی بنائی ہوئی زمین میں بیج ڈال لیا گیا ہے۔

حضورؐ کی بعثت پر دنیا کا رنگ

یہ تھا۔ کہ وہ انسانوں کے درمیان تبادلۂ خیال کے وسائل قطعاً مفقود۔ قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلقات کے ذرائع بالکل مسدود۔ انسان کی معلومات محدود اور خیالات نہایت تنگ تھے۔ وہم و توحش کا غلبہ تھا جہالت کی تاریکی میں نہ مطابع نہ اشاعت خانے۔ نہ مدرسے نہ کالج۔ نہ اخبارات نہ رسالے نہ کتابیں نہ ان کی اشاعت تھی۔ بت پرستی، انسان پرستی۔ سورج پرستی۔ آتش پرستی حیوان پرستی۔ غرضیکہ بے شمار پرستشوں کا ابن آدم پر قبضہ تھا۔ اور نام نہاد مذہبی پیشواؤں کی زبان ہی مذہب کا سارا ڈھانچہ تھی۔ اس زمانے کے ایک عالم کی معلومات بعض حیثیات سے موجودہ زمانے کے ایک عامی کی نسبت بھی کم تھیں۔ اسوقت کا ایک نہایت روشن خیال آدمی آجکل کے ایک تاریک خیال سے بھی زیادہ تاریک خیال تھا۔ جو معلومات آج ہوش سنبھالتے ہی ایک بچے کو حاصل ہوجاتی ہیں اُن کے لئے اس زمانہ میں سیکڑوں میل کی مسافتیں طے کرنا پڑتی تھیں جن باتوں کو آج دُنیا خرافات سے تعبیر کرتی ہے۔ وہ اس زمانہ کے حقائق تھے۔ جن افعال و اعمال کو آج بدتہذیب اور وحشیانہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس زمانہ کے معمولات تھے اور انسان کی عجائب پرستی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ کہ وہ کسی چیز میں اسوقت تک کوئی صداقت۔ کوئی تقدیس، کوئی پاکیزگی تسلیم ہی نہ کرسکتا تھا۔ جب تک وہ فوق الفطرت نہ ہو۔ خلاف عادت نہ ہو، غیر معمولی نہ ہو۔ اور انسان خود کو اسقدر ذلیل سمجھتا تھا۔ کہ اس کا خدا رسیدہ ہونا۔ اور کسی خدا رسیدہ ہستی کا انسان ہونا۔ اس کے تصور کی رسائی سے بہت دُور تھا۔

پھر ان حالات میں جبکہ زمین کا ہر گوشہ ظلمت و جہالت میں ڈوبا ہوا ہو۔ کون ہو سکتا تھا کہ مشعل ہدایت روشن کرسکے، اور اگر کسی نے کی اور کامیاب ہوگیا تو اس کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ اس زمین پر تو ہدایت کا نہ کوئی ذریعہ رہا تھا نہ روشنی، اور اگر روشنی حاصل کرنے کی کوشش بھی کی جاتی، تو اپنا چراغ جلانے کیلئے

توارات و انجیل، ویدوں اور ژند کی جانب رجوع کیا جاتا۔ جو مشعلیں خود ہی بجھ چکی ہوئی تھیں۔ اب تو صرف آسمان ہی سے روشنی کے نمودار ہونے کی توقع ہو سکتی تھی۔ جو ہوئی اور اللہ کریم نے ایک پیکرِ نور کو نورِ ہدایت دیکر دُنیا بھر کی ہدایت پر مامور فرمایا۔ جس نے انسان کو شدید ضلالت وگمراہی میں دیکھ کر آیات الٰہی سُنائیں۔ ان کو اخلاق ذمیمہ سے پاک کیا۔ اُنہیں قرآنی اوامر ونواہی سمجھائے۔ اور آئین وعمل کی تعلیم دے کر نیابت الٰہی کا اہل بنا دیا۔

یہی وجہ ہے کہ اس کی لائی ہوئی کتاب قانون اور اس کے تعلیم و ہدایت یافتہ غلام اس کو ساری کائنات کا رسول اور سرور عالم کہتے ہیں۔ جس کے عام معنے سید جہان، سردار کائنات اور سرور زمانہ ہو سکتے ہیں۔ اور ہندی زبان میں اس کو جگت گورو کے جامع الفاظ میں ذکر کیا جا سکتا ہے۔

گو بظاہر یہ بہت بڑا خطاب ہے۔ جس کو حضور کے متعلق سننے والا محو حیرت ہو جاتا ہے۔ مگر اس کو یہ پتہ نہیں، کہ جس عالی قدر، بلند پایہ، اولوالعزم و برگزیدہ ہستی کو یہ خطاب دیا گیا ہے۔ اس کی عملی حیثیت اور اس کا کارنامہ حیات واقعی ایسا ہے۔ جس کو سرور کائنات یا سرور عالم کہنا مبالغہ نہیں بلکہ عین حقیقت ہے۔ اور یہ خطاب اس کے تابعداروں کی خوش اعتقادی کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اس کے مبعوث فرمانے والے خدائے واحد نے اس کو خود عطا فرما رکھا ہے۔ قبل اسکے کہ اس خطاب کی حقیقت اعلیٰ پر کچھ کہا جائے۔ قرآن کریم کی اُن آیات کی مختصر تشریح کر دینا ضروری ہے۔ جن میں اس پیکرِ نور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خطاب سے مخاطب فرمایا گیا اور نوازا گیا ہے۔

آیت اوّل:۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ یعنے ہم نے تجھ کو کل عالموں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ حضور جب تمام جہانوں اور جہانیوں کے لئے رحمت ہیں۔ تو آپ کی دعوت بھی تمام کائنات کیلئے ہی ہوگی۔ کسی ایک مخصوص طبقہ۔ یا علاقہ۔ یا گروہ۔ یا قوم یا جماعت کیلئے نہیں ہو سکتی

جس قدر آپ کے درجات کی وسعت ہے، اسی قدر دعوت و تبلیغ کے لیے بھی وسیع میدان لازم آئے گا۔ لہٰذا جن ہو یا انس، مومن ہو یا کافر، حاضر ہو یا غائب۔ زندہ ہو یا مردہ، ماقبل ہو یا مابعد، آپ کی رحمت مطلقہ، تامہ، عامہ، کاملہ، شاملہ، جامعہ محیط بجمیع مقیدات، رحمت غیبیہ و شہادت علمیہ و عینیہ و وجودیہ و شہودیہ و سابقہ ولاحقہ وغیر ذالک تمام جہانوں کے لئے عالم ارواح ہوں یا عالم اجسام۔ ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول سب کے لئے حضور علیہ السلام کی ذات رحمت ہے۔ اور جب تمام عالموں کیلئے رحمت ہونا لازم ہوا تو لامحالہ آپ کی ذات سب سے افضل اور آپ کی دعوت سب کیلئے ثابت ہوئی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ کہ حضور کا رحمت ہونا عام ہے، ایمان والے کیلئے بھی، اور اس کے لئے بھی جو ایمان نہ لایا، مومن کے لئے تو آپ دنیا و آخرت دونوں میں رحمت ہیں، اور جو ایمان نہ لایا، اس کے لئے آپ صرف دنیا میں رحمت ہیں۔ کہ آپ کی بدولت اس کے حق میں تاخیر عذاب ہوئی۔ اور خسف و مسخ اور استیصال کے عذاب بھی اٹھا دیئے گئے۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عجمی کو اس طرح نہیں دھتکارا جس طرح یسوع نے کنعان کی ایک عورت کو یہ کہہ کر دھتکار دیا تھا کہ میں تو اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف بھیجا گیا ہوں، اور نہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح علیہ السلام کی طرح غیر اسرائیلیوں کو "کتے" کہہ کر پکارا (متی باب ۲۶) بلکہ آپ نے اپنے دعوائے رحمۃ اللعالمین کے ماتحت ہر اسود و احمر، ہر سرخ و سفید، ہر ادنیٰ و اعلیٰ، ہر عربی و عجمی، ہر اپنے بیگانے کے ساتھ وہی رافت و رحمت فرمائی جو حضور کا حصہ اور حضور ہی کے شایان شان تھی۔ تو بھی حاضر دربار ہوا، اس نے دامن مراد بھرا، اور کوئی خائب و نامراد نہیں گیا۔ گویا منعم

نرفت لا بزبان مبارکش ہرگز ۔ مگر در اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

آیت دوئم: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا یعنے ہم نے تجھ کو اے محبوب سب لوگوں کے واسطے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بھیجا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ حضور علیہ السّلام کی رسالت عامہ ہے۔ اور تمام انسان گورے ہوں یا کالے، عربی ہوں یا عجمی، پہلے ہوں یا پچھلے، سب اس کے احاطہ میں ہیں اور آپ سب کے رسُول اور وہ سب آپ کے اُمتی ہیں۔ چنانچہ بخاری و مسلم کی حدیث ہے۔ کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں ۱۔ ایک ماہ کی مسافت کے رُعب سے میری مدد کی گئی۔ ۲۔ تمام زمین میرے لئے مسجد اور پاک بنا دی گئی کہ جہاں میرے اُمتی کو نماز کا وقت آئے نماز پڑھ لے۔ ۳۔ میرے واسطے غنیمتیں حلال کی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھیں۔ ۴۔ مجھے مرتبہ شفاعت عطا فرمایا گیا ۵۔ اور انبیاء خاص خاص اپنی قوموں کی طرف مبعوث فرمائے گئے تھے، مگر میں تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ ان کے علاوہ احادیث میں آپ کے بے شمار فضائل مخصوصہ کا بیان ہے۔ جن میں سے ایک آپ کی رسالت عامہ ہے۔ جو تمام جن وانس کو شامل ہے۔ الغرض حضور تمام مخلوقات کے لئے رسول ہیں۔ اور یہ مرتبہ آپ ہی کی ذات کے لئے خاص ہے، سورۂ فرقان کی پہلی آیت سے بھی اسی مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے۔ کہ آپ تمام خلق کی طرف رسول مبعوث ہوئے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ مخلوق انسان ہوں یا جن۔ ملائکہ ہوں یا دوسری مخلوقات سب آپ کے اُمتی ہیں۔ کیوں کہ عالم ماسوی اللہ کو کہتے ہیں۔ اور ماسوی اللہ میں سب مخلوق شامل ہے۔ بعض مفسرین نے ملائکہ کو اس دعوت و نبوت سے مستثنے کیا ہے۔ جو بالکل بے دلیل اور بعید از قیاس تاویل ہے۔ علاوہ ازیں مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے۔ اُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَافَّۃً، یعنے میری رسالت تمام خلقت کے لئے ہے۔ اور علامہ علی قاری نے مرقات میں اور امام قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں اسی عقیدہ کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کیونکہ خود حضور علیہ الصلوات والسّلام ابتدا سے ہی اپنی بعثت کو عالمگیر خیال فرماتے تھے۔ اور جب مکہ میں رہنے والے بعض بیرونی لوگ آپ پر ایمان لائے، تو آپ نے انکو اُن ملکوں کے سابقین کہکر پکارا جن ممالک کے وہ رہنے والے

تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ممالک سے متاخرین کی اُمید اور بڑی بڑی فصلیں کاٹنے کی توقع تھی، چنانچہ آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا نام حبشہ کا پہلا آدمی رکھا۔ اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا سابق الروم یعنے رومیوں میں سے ایمان پر پہلا آنے والا۔ چونکہ یہ لوگ حضور علیہ السّلام پر شروع ہی میں ایمان لائے تھے۔ اس لئے جو القابات آپ نے ان کو دیئے ان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے تئیں صرف عرب ہی کا نبی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ آپ کو علم اور یقین تھا۔ کہ آپ ساری دنیا وما فیہا کے لئے مبعوث فرمائے گئے ہیں، اور آپ کا یہ مقدس دین نہ صرف عرب ہی قبول کریں گے۔ بلکہ اس کی اشاعت دور دراز دیگر ممالک میں بھی ضرور ہوگی۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں من حیث التبلیغ زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسلام کل دنیا کی طرف آنے کا مدعی ہے، اور دیگر مذاہب قبیلوں اور جماعتوں اور گوتوں ویرلوں کی حدود کے پابند ہیں۔ بالخصوص عیسائیت تو اعلان کرتی ہے۔ کہ اپنے بچوں کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنا مناسب ہی نہیں۔ اور جب اسرائیل کے بچوں کے ہاں جگہ نہیں ملتی۔ اور اسرائیلی بچے مسیح کی لائی ہوئی روٹی لینے سے انکار کرتے ہیں، تو مجبوراً وہی روٹی غیر اسرائیلی کتوں کے آگے ڈالنی پڑتی ہے۔ لیکن قابل غور یہ بات ہے۔ کہ آنحضرت نبی کریم رؤف ورحیم صلے اللہ علیہ وسلم نے مسیح علیہ السّلام کی طرح دُنیا کے بسنے والوں میں سے نہ کسی کو کتا فرمایا ہے اور نہ بلا۔ بلکہ روئے زمین کی تمام اقوام کو اپنے "بچے" ہی سمجھا۔ اور اپنی رسالت کو تمام جہانوں کیلئے ہی رحمت ظاہر فرمایا۔

آیت سوئم:۔ قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا۔ یعنے اے محبوب آپ فرما دیں۔ کہ اے انسانوں میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اور حضور علیہ السّلام نے آیت شریفہ کے ماتحت نرا دعوے ہی نہیں کیا۔ بلکہ عملاً ثابت کر دیا۔ کہ حضورؐ کی رسالت تمام لوگوں کیلئے تھی۔ جو حضور کی بعثت کے وقت میں بصورت کائنات ارضی وسماوی موجود تھے۔ چنانچہ آپ کی یہ حقیقت آپکی

تبلیغی جدوجہد سے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ مثلاً ابتداء تبلیغ میں جن مشکلات کا سامنا حضورؐ کو کرنا پڑا۔ اور جس شقاوت و قساوت جس درندگی و بہیمیت، جس فرعونیت و نمرودیت سے آپ دوچار ہوئے اس کی نظیر دُنیا بھر کی تاریخ میں نہیں ملتی، کسی کو تو ایک فرعون ایک نمرود سے واسطہ پڑا ہو گا لیکن یہاں تو مکّہ و طائف کا ہر رئیس اور جنگل میں دو چار نخلستان رکھنے والا ہر جاگیردار بجائے خود فرعون اور نمرود تھا۔ دوسرے انبیاء کے مقابل میں ایک سردار آدمی کی ہاں یا نہ پر قوم کی قوم کا فیصلہ تھا، لیکن مکہ میں یہ حالت تھی، کہ لوگ اسلام قبول کرنا چاہتے تھے مگر نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ حالات اس قدر پیچیدہ اور اس قدر اُلجھے ہوئے اور اتنے نازک تھے کہ اُن سے عہدہ برا ہونا قریباً قریباً ناممکن تھا۔ یہاں کی مخالفت میں صرف مذہبی رنگ ہی دخیل نہ تھا۔ بلکہ سیاست، اقتصاد۔ تاریخ۔ خاندانی روایات، رقابت اور سیادت، صد ہا موانع اور روکاوٹیں تھیں۔ ایک پتھر راستہ سے ہٹایا جاتا تو دوسرا اس سے زیادہ وزنی آگے آجاتا۔ یہ کیفیت ایک جگہ مکّہ اور طائف کی تھی۔ تبلیغ کے میدان میں جو جو مصائب آپ اور آپ کے غلاموں پر آئے۔ اس خونچکاں داستان کا یہاں بیان کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ ان مظالم کے دور میں عرب سے باہر اسلام کا پھیلنا۔ اس آیت کریمہ کی منہ بولتی تفسیر ہے

جوں ہی قریش کے جنگوں سے آپ کو فرصت ملی، اسی وقت حضورؐ نے قرب جوار کے لوگوں کو دعوت دینی شروع کر دی، اگرچہ آپ کا بہت سا وقت اپنے بیشمار دشمنوں کے حملوں کی مدافعت میں صرف ہوا، تاہم ساتھ ساتھ مختلف قوموں میں اسلام کی منادی کرنے کے لئے واعظ تیار کرتے رہے، بہت سے ایسے صحابہ تھے جن کو اسی غرض کے لئے حضور علیہ السّلام نے قرآن کریم حفظ کرایا تھا۔ تاکہ دوسروں کو سنا کر تبلیغ کر سکیں، اور جو صحابہ رجیع اور بیر معونہ پر شہید ہوئے تھے۔ وہ سب مبلغ اور حافظ قرآن تھے، حضرت نے زید بن ثابت کو ہوشیار دیکھ کر یہ خواہش ظاہر

فرمائی۔ کہ بیرونی ممالک کی تبلیغ کے پیشِ نظر وہ عبرانی و سریانی زبانیں بھی سیکھ لے۔ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے، کہ حضور علیہ السلام اشاعت کو صرف عرب تک ہی محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ غیر ممالک میں بھی اپنے واعظ اور سفیر بھیج کر یہ ثابت فرمایا کہ اسلام ساری دُنیا کا مذہب ہے اور ساری دنیا میں پھیل کر رہے گا۔ چنانچہ اسلام مشرق و مغرب، شمال و جنوب ہر سمت میں پہنچا۔ جس کے روشن نقوش آج بھی ظاہر و باہر ہیں۔

ایک محققانہ نظریہ

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ آخری ہادی کے مبعوث فرمانے والے خدائے واحد کے ارشادات تھے۔

اب تحقیق کے طور پر چند باتیں اور ذہن نشین کیجئے۔ یعنے محققانہ طور پر غور فرمائیے کہ اگر کوئی ہستی تمام کائنات کی راہنما اور پھر قیامت تک کے لئے ایک ہی راہنما ہونے کی دعویدار ہو۔ تو کیا اس کا یہ دعوٰے محض اس کے ارشاد کے ماتحت تسلیم کر لینے کی ضرورت ہوگی، یا اس کو اس دعوئے کا مدعی ہونے اور تسلیم کرنے کے لئے کچھ عقلی و نقلی دلائل درکار ہوں گے۔ اگر مؤخر الذکر قول صحیح ہے تو پھر غور کیجئے کہ وہ دلائل کیا ہیں۔ جن کے ماتحت ایسی مدعی ہستی کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

۱۔ کسی شخصیّت کو تمام جہان کا ہادی و راہنما قیامت تک ماننے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہیئے۔ کہ اس کا تمام تر تبلیغی عمل کسی خاص قوم یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لئے مختص نہ ہو۔ بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کی بھلائی کے لئے یکساں نظر آئے۔

۲۔ اس دنیا بھر کیلئے مدعی، راہنما یا لیڈر نے وہ اصول پیش کئے ہوں، جو تمام جہان والوں کی راہنمائی کرتے ہوں۔ اور اُن میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے اہم مسائل کا حل بھی ہر وقت موجود ہو۔

۳۔ ایسی مدعی ہستی کی راہنمائی کسی خاص وقت یا زمانہ کے لئے مخصوص نہ ہو۔ بلکہ اس کے وضع کردہ اصول ہر زمانہ اور ہر حال میں یکساں مفید، یکساں صحیح اور

یکساں قابل قبول و پذیرائی ہوں۔

۴۔ مدعی نے صرف چند اصول پیش کر دینے پر اکتفا نہ کی ہو۔ بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو اپنی زندگی میں عملاً جاری کر کے دکھلا دیا ہو۔ اور ان کی بنا پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی بھی پیدا کر دی ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیا بھر میں جس قدر راہنما ہوئے ہیں، کیا ان میں سے کسی میں یہ چاروں شرطیں پائی گئی ہیں۔ اس کسوٹی پر عین حقیقت کے ماتحت بلا مبالغہ صرف ایک ہی ہستی ثابت ہو سکے گی۔ جس کو صرف مسلمان ہی سرورِ عالم کہتے ہیں، اور اس سے یقیناً انکار بھی نہ ہو سکیگا، کہ حضور علیہ السّلام سے قبل کسی راہنما کے لئے اس خطاب کا ذکر تک بھی کتب مذاہب میں نہیں آیا، کیونکہ ان تمام بزرگوں کی تبلیغ و دعوت کا دائرہ بالکل محدود تھا، اور ان میں سے خود بھی کسی کو خیال تک نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ اس کی حیثیت دُنیا بھر کے ہادی و راہنما کی ہے یا ہو سکتی ہے۔

رہی یہ بات کہ کیا مُسلمان خوش عقیدتی کے ماتحت تو اس کو تسلیم نہیں کرتا؟ اس کا جواب نہایت کورا اور نفی میں ہوگا۔ کیونکہ ایک محب وطن یا ایک قوم پرست لیڈر کی آپ اس حیثیت سے جتنی چاہیں قدر کریں، کہ اس نے اپنے لوگوں کی بڑی خدمت کی۔ لیکن اگر آپ اس کے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں، تو وہ بہرحال آپ کا لیڈر نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کی محبت، خیر خواہی اور کارگذاری سب کچھ اس کے اپنے وطن یا قوم تک محدود ہو۔ اس کو کسی دوسرے وطن یا کسی دوسری قوم کا فرد کسی صورت میں بھی اپنا راہنما اور خیر خواہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ مثلاً ایک مصلح قوم و رہبر کی کارگذاری ساری کی ساری سپین یا چین تک ہی موقوف ہو تو ایک ہندوستانی کو اس سے کیا واسطہ کہ وہ اس کو اپنا لیڈر تسلیم کرے، بلکہ اگر وہ اپنی قوم کو دوسروں سے افضل ٹھیراتا ہو۔ اور دوسروں کو گرا کر اپنی قوم کو بڑھانا چاہتا ہو۔ جیسا کہ فی زمانہ ہندوستان میں ہندو کانگرسی لیڈروں کا شیوہ ہے۔ تو

دوسری اقوام یقیناً ان سے نفرت کرنے پر مجبور ہونگی، تمام اقوام کے انسان ایک شخص کو اپنا راہنما صرف اسی صورت میں مان سکتے ہیں۔ جب اس کی نگاہ میں تمام اقوام اور تمام افراد یکساں ہوں۔ اور وہ سب کا ایسا یکساں ہمدرد و بہی خواہ ہو کہ اپنی خیر خواہی میں کسی طرح بھی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔

اب آپ اس پہلی شرط پر دنیا بھر کے راہنماؤں کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک نظر محبوب خدا محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر بھی ماریں۔ تو ایک ہی نظر میں آپ محسوس کرنے لگیں گے۔ کہ یہ کسی قوم پرست یا محبِ وطن کی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ ایک محبِ انسانیت اور ایک عالمگیر ہمدردانہ نظریہ رکھنے والے کامل ترین انسان کی زندگی ہے۔ جن کی نگاہ میں تمام انسان یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ کسی خاندان۔ کسی نسل۔ کسی طبقہ۔ کسی قوم۔ کسی ملک کے خاص مفاد سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ امیر اور غریب اونچ اور نیچ۔ کالے اور گورے۔ عرب اور غیر عرب۔ مشرقی اور مغربی۔ سامی اور آرین۔ سب کو وہ اس حیثیت سے دیکھتے تھے۔ کہ یہ سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ ان کی زبان سے تمام عمر کوئی ایک لفظ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہیں نکلا۔ اور نہ زندگی بھر میں کوئی کام انہوں نے ایسا کیا۔ جس سے یہ شبہ کیا جاسکتا ہو۔ کہ انہیں ایک طبقۂ انسانی کے مقابلہ میں کسی دوسرے طبقۂ انسانی کے ہر مفاد سے زیادہ تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان کی حیات مقدس ہی میں حبشی۔ ایرانی۔ رومی۔ مصری۔ عربی۔ ابراہیمی۔ اسرائیلی۔ اسی طرح اُن کے محبت اور رفیق کار بنے۔ اور دُنیا کے ہر گوشے میں ہر نسل اور قوم نے اسی طرح ان کو اپنا راہنما تسلیم کیا۔ جس طرح ان کی اپنی قوم اُن پر ایمان لائی۔ کیا یہ حضور کی کامل ترین انسانیت اور رحمۃ اللعالمینی ہی کا کرشمہ نہیں۔ کہ آج آپ ایک ہندوستانی کو اُس ہستی کے صرف نام پاک کی عظمت و عزت پر قربان ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ جس کا آج سے صدیوں پہلے عرب میں ظہور ہوا تھا۔

اب دوسری اہم شرط کو لیجئے، جس میں ایسے اصولوں کا تذکرہ ہے۔ جو تمام دُنیا کے انسانوں کی راہنمائی کرتے ہوں، اور جن میں انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل کا حل موجود ہو۔

چونکہ لیڈر کے معنے ہی راہنما کے ہیں۔ اور لیڈر کی ضرورت ہوتی ہی اسلئے ہے کہ وہ فلاح اور بہتری کا راستہ بتلائے، لہذا دنیا بھر کا لیڈر وہی ہو سکتا ہے جو ساری دُنیا کے انسانوں کو ایسا طریق اور گُر بتائے۔ جس میں سب کی فلاح ہو چنانچہ تاجدار کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ایک وہ ذات ستودہ صفات ہے۔ جنہوں نے مخصوص قوموں اور مخصوص ملکوں کے وقتی اور مقامی مسائل سے بحث کرنے میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں فرمایا۔ بلکہ اپنی پوری قوت دُنیا میں انسانیت کے اُس سب سے بڑے مسئلے کو حل کرنے پر صرف کر دی، جس سے تمام انسانوں کے سارے چھوٹے چھوٹے مسائل خود ہی حل ہو جاتے ہیں۔

وہ بڑا مسئلہ کیا ہے

صرف یہ کہ کائنات کا نظام فی الواقع جس اصول پر قائم ہے، انسان کی زندگی کا نظام بھی اس کے مطابق ہو۔ کیونکہ انسان اس کائنات کا ایک جزو ہے اور جزو کی حرکت کا کل کے خلاف ہونا ہی خرابی کا باعث ہے۔ اگر آپ اس بات کو مفصل طور پر سمجھنا چاہتے ہیں، تو اس کی آسان صورت یہ ہے، کہ اپنی نگاہ کو ذرا کوشش کر کے زمان اور مکان کی قیود سے آزاد کر لیجئے۔ اور پورے کرۂ ارضی پر اس طرح نگاہ ڈالئے کہ ابتداء سے آج تک اور آئندہ غیر محدود زمانہ تک بسنے والے تمام انسان بیک وقت آپ کے تصور میں آپ کے سامنے آجائیں۔ پھر دیکھیئے کہ انسان کی زندگی میں خرابی کی جتنی صورتیں پیدا ہوئی ہیں یا ہونی ممکن ہیں، ان سب کی بنیادی چیز کیا ہے یا کیا ہو سکتی ہے؟ اس سوال پر آپ جتنا غور کریں گے۔ اور جتنی چھان بین سے کام لیں گے، حاصل یہی نکلے گا۔ کہ انسان کی خدا سے بغاوت

تمام خرابیوں کی جڑ ہے، اس لئے کہ خدا سے باغی ہو کر انسان لازمی طور پر دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت اختیار کرتا ہے، یا تو وہ اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمہ دار سمجھ کر من مانی کاروائیاں کرنے لگتا ہے، اور یہ چیز اس کو ظالم بنا دیتی ہے۔ یا پھر وہ خدا کے سوا دوسروں کے حکم کے آگے سر جھکانے لگتا ہے، اور اس سے دنیا میں فساد کی بیشمار صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اب یہ سوچنے کی بات ہے، کہ خدا سے بے پرواہ ہو کر یہ خرابیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے، کہ ایسا کرنا چونکہ حقیقت کے خلاف ہے۔ اس لئے اس کا نتیجہ برا نکلتا ہے یہ ساری کائنات فی الواقع خدائے قدوس کی سلطنت ہے، زمین، سورج، چاند روشنی۔ ہوا، پانی سب خداوند عالم کی ملک ہیں، اور انسان اس سلطنت میں پیدائشی بندے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پوری سلطنت جس نظام پر قائم ہے، اور جس نظام پر چل رہی ہے۔ اگر انسان اسکا ایک جزو ہونیکے باوجود اس سے مختلف رویہ اختیار کرے تو وہ لامحالہ تباہ کن نتائج پیدا کریگا۔ انسان کا یہ سمجھنا کہ مجھ سے اوپر کوئی مقتدر اعلیٰ نہیں ہے۔ جس کے سامنے مجھے جواب دہ ہونا ہے واقعہ کے خلاف ہے، اس لئے جب وہ مختار بنکر غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر کام کرتا ہے، اور اپنا قانون زندگی آپ گھڑ لیتا ہے، تو اس کا نتیجہ برا نکلتا ہے، پھر اسی طرح اس کا خدائے واحد کے سوا کسی اور کو صاحب اختیار و اقتدار تسلیم کر لینا اور اس سے خوف یا لالچ رکھنا، اور اس کی آقائی و مولائی کے آگے جھک جانا بھی حقیقت کے خلاف ہے، کیونکہ فی الحقیقت اس پوری کائنات میں خداوند جل مجدہٗ کے سوا کوئی بھی یہ حیثیت نہیں رکھتا، کہ اس کو معبود مسجود اور موجود مانا جائے، لہذا اس کا نتیجہ برا ہی نکلتا ہے، کیونکہ صحیح نتیجہ برآمد ہونیکی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ کہ زمین اور آسمان میں جو حقیقی حکومت ہے انسان اسی کے سامنے سر جھکا دے۔ اپنی خودی و خود سری کو اس کے آگے ڈال دے۔ اپنی اطاعت اور بندگی کو اس کے لئے خاص کر دے۔ اور اپنی زندگی کا ضابطہ و قانون خود بنانے یا دوسروں سے قبول کرنے کی بجائے اسی مالک الملک سے قبول کرے۔

تیسری لازمی شرط میں یہ مذکور ہوا تھا کہ ایسے مدعی کی راہنمائی کسی خاص زمانے کے لئے نہ ہو۔ بلکہ ہر زمانے اور ہر حال میں یکساں مفید اور یکساں قابل پیروی ہو۔ اور اگر وہ ایسی نہ ہو یا کسی مابعد وقت میں آکر اس میں اختلاف پیدا ہو جائے اور کسی وقت میں وہ عوام کے استفادہ کے قابل نہ پائی جائے۔ تو وہ اپنے دعوے کی آپ تردید کرے گی۔ کیونکہ جس راہنما کی راہنمائی ایک زمانہ میں کارآمد اور دوسرے زمانہ میں بیکار ثابت ہو وہ دنیا بھر کا راہنما کہلانے کا مستحق نہیں۔ دنیا بھر کا راہنما اور لیڈر تو وہی ہو سکتا ہے کہ جب تک دنیا قائم رہے اس کی راہنمائی کے پیش کردہ قوانین بھی ابدی طور پر کارآمد رہیں۔ اور یہی وہ بنیادی چیز ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کے سوا دوسری کوئی زندگی پیش نہیں کر رہی، کیونکہ وہ حیات مقدسہ مشرق و مغرب کی قید سے آزاد ہے۔ اور روئے زمین میں جہاں جہاں انسان آباد ہیں، اُن کی بگڑی کو بنانے کے لئے صرف حضورؐ ہی کی ایک زندگی اسوۂ حسنہ کا کام دے سکتی ہے۔ اور آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے آپکی راہنمائی جتنی اور جس طرح کارگر تھی، اتنی ہی آج بھی ہے۔ اور اُتنی ہی اور اسی طرح ہزار ہا برس بعد بھی ہوگی۔

اب صرف ایک چوتھی لازمی شرط قابل غور باقی رہ گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مدعی صرف اصول پیش کرنے پر ہی اکتفا نہ کرے۔ بلکہ وہ زندگی میں عملاً جاری کر کے بھی دکھائے۔ اور ان کی بنیاد پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی پیدا کر دے۔ کیونکہ محض اصول پیش کرنے والا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کہا جا سکتا ہے۔ لیڈر یا راہنما نہیں ہو سکتا۔ لیڈر یا راہنما ہونے کیلئے یہ ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے اصولوں کو عملی جامہ پہنا کر دکھائے۔ اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ رب العزت کے آخری نبی حضرت سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف خیالی نقشہ ہی پیش نہیں فرمایا بلکہ اس نقشے پر ایک زندہ سوسائٹی بھی پیدا کر کے دکھا دی۔ اور ۲۳ سال کی مختصر مدت میں لاکھوں انسانوں کو خدائے واحد کی حکومت کے آگے سر اطاعت و عبادت جھکانے پر آمادہ کر لیا۔ اُن سے خود پہچا

جاہ پرستی، صنم پرستی، شاہ پرستی غرضیکہ ساری پرستاریاں چھڑوا کر اور غیر کی بندگی سے بچا کر خالص خداوند عالم کی بندگی پر ایک نیا نظام اخلاق، نیا نظام تمدن، نیا نظام معیشت اور نیا نظام حکومت بنایا اور تمام دنیا کے سامنے یہ عملی مظاہرہ کر کے دکھا دیا، کہ جو اصول وہ پیش فرما رہے ہیں، اس پر کیسی زندگی بنتی ہے، اور دوسرے اصولوں کی زندگی کے مقابلہ میں وہ کتنی پاکیزہ اور کتنی صالح زندگی ہے۔

یہی وہ عظیم الشان اور رفیع البیان کارنامہ ہے، جس کی بنا پر مسلمان دل و جان سے اپنے مختار و محبوب نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سردار زمان، سید کون و مکان، اور سرور عالم تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ حضور کا یہ کام کسی خاص ملک اور قوم کے لئے نہ تھا۔ بلکہ تمام انسانوں کے لئے تھا۔ یہ انسانیت کی مشترک میراث ہے جس پر کسی کا حق کسی دوسرے سے کم یا زیادہ نہیں، جو چاہے خلوص دل سے حضور کی غلامی کرے اور اس میراث سے فائدہ اٹھائے، نہیں سمجھا جا سکتا۔ کہ اس مابہ الامتیاز تحقیق کے بعد حضور کی ذات کے خلاف کسی متعصب کو تعصب رکھنے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے، جن کی راہنمائی متعصب کے خیالات، اصول حیات قوانین عمل اور اُس کے عصر جدید کی روح میں بھی پیوست ہو چکی ہے:

کیا وہ نہیں دیکھتا، کہ حضورؐ ہی نے دنیا کے تصورات کا رُخ وہمیت و رہبانیت کی طرف سے پھیر کر عقلیت، حقیقت پسندی اور متقیانہ دنیا داری کی طرف کر دیا ہے۔

حضورؐ ہی نے حسیّ معجزے مانگنے والی دُنیا میں عقلی معجزوں کو سمجھنے اور انہی کو معیار صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔

حضورؐ ہی نے خرق عادات میں خدا کی خدائی کے آثار ڈھونڈھنے والوں کی آنکھیں کھولیں اور انہیں آثار فطرت میں آیات الٰہی دیکھنے کا خوگر بنایا۔

حضورؐ ہی نے خیالی گھوڑے دوڑانے والوں کو تعطل و تفکر اور مشاہدہ و تحقیق کے راستہ پر لگایا۔

حضورؐ ہی نے عقل اور حس اور وجدان کے امتیازی حدود انسان کو بتائے مادیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی، دین اور علم وعمل کا باہم ایک ربط قائم کیا اور مذہب کی طاقت سے بھٹکی ہوئی مخلوق کو خدا کا دروازہ دکھا دیا۔

حضورؐ ہی نے شرک اور مخلوق پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا۔ اور علم ما کان و ما یکون کی طاقت سے اعتقاد توحید ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم کیا، کہ مشرکوں اور بت پرستوں کے مذہب بھی واحدانیت کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

حضورؐ ہی نے اخلاق اور روحانیت کے بنیادی تصورات کو بدلا، جو لوگ ترک دُنیا ونفس کشی کو عین اخلاق سمجھتے تھے۔ جن کے نزدیک نفس وجسم کے حقوق ادا کرنے اور دنیوی زندگی کے معاملات میں حصہ لینے کے ساتھ روحانی ترقی اور نجات ممکن ہی نہ تھی۔ ان کو آنحضرتؐ نے ہی تمدن اور حضارت اور عمل دُنیا میں فضیلت اخلاق وارتقائے روحانی اور حصول نجات کی راہ دکھائی۔

حضورؐ ہی نے انسان کو اس کی حقیقی قدر وقیمت اور شرافت وفضیلت سے آگاہ کیا۔ اور جو لوگ اوتار، بھگوان، ابن اللہ کے سوا کسی کو ہادی اور راہنما تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے، ان کو بتایا کہ انسان ہی مظہر خدا اور آسمانی بادشاہت کا نمائندہ اور اپنے خالق کا خلیفہ ہو سکتا ہے۔

حضور ہی نے ارباب من دون اللہ کی حیثیت کو برباد کیا۔ اور جو لوگ طاقتور انسانوں کے یہاں تک قائل ہو چکے تھے، ان کو سمجھایا کہ انسان بجز انسان کے اور کچھ نہیں، نہ کوئی تقدس وحکمرانی کا پیدائشی حق لیکر آیا ہے اور نہ کسی پر محکومیت و غلامی اور ناپاکی کا داغ لگا ہوا ہے، تم میں سب سے قابل تکریم وہ شخص ہے۔ جو اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں زیادہ متقی ہے۔ شعر

سمجھائی اس نے ہی سب جہاں کو پستئ ما سوا پرستی
اُسی سے سیکھا کہ خود پرستی ہے درحقیقت خدا پرستی

بےمثل بشریت

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

ترجمہ: اے محبوب فرما دیجئے کہ میں تم جیسا بشر ہوں۔ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود خدائے واحد ہے۔

خواجۂ کائنات مختار شش جہات مالک ثقلین زبدۂ کونین احمد مجتبیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی بجائے خود ان معجزات سے ایک مجسم معجزہ ہے، جو معرفت الٰہی میں تصدیق قلب اور اقرار لسانی کے لئے عوام کو نورانی مشعل کا کام دیتے ہیں، جس ہستی کی ہر حرکتِ لب اور ہر جنبش ابرو و انگشت معجزات کی حامل ہو۔ جس کا سینہ انوار الٰہی کا گنجینہ۔ جس کا قول خدا کا قول، جس کی گفتگو خدا کی گفتگو، جس کا دست دست شفا، جس کا لعاب دہن ہر مرض کی دوا، جس کا بال بال رحمت و برہان، جس کی عمر پاک جس کی پیشانی منور اور جس کی گلیوں کی خداوند عالم نے قسمیں کھائی ہوں، اور جو بیدائشی معصوم و مصطفےٰ ہو، اس کی حیات طیبہ کا اور اس کے اوصاف انسانی کا ظاہری آنکھ سے مطالعہ کرنا اور اس کی بشریت میں مماثلت کا زور بھرنا ایک کھلی گمراہی ہے، مسلمان جب تک صحیح عقیدت اور چشم حقیقت سے اس نور مجسم کو دیکھنے کی کوشش نہ کریں گے، اپنی ایمانی خصوصیت میں عہدہ برآ نہیں ہونگے حضور کی ذات ستودہ صفات کا بار بار مطالعہ کرنا ہمارے لئے جب ہی مفید ہو سکتا ہے اور ہمارا جذبۂ تقلید واتباع جب ہی بھڑک سکتا ہے، جبکہ ہم صحیح عقیدت اور ان اوصاف کے ماتحت ایمان رکھیں، جن کے ساتھ مولا کریم نے حضور نبی کریم علیہ التسلیم کو مبعوث

فرمایا ہے۔ اور اسی سے ہمارا اپنی رگوں میں اتباع کا ایک نہ مٹنے والا جوش محسوس کرنا ہمیں وہ انسان بنا سکتا ہے۔ جس کے دامن پر فرشتوں کو بھی نماز پڑھنے میں کوئی عذر نہ ہو۔

بعض کوتاہ نظر جن کی ذہنیت میں عقل و عدل کا جوہر نہیں ہوتا بے سوچے سمجھے ہیجو منتی اور ہیجو مانی کے نعرے لگانے لگ جاتے ہیں۔ مگر یہ تعصب آفرین تقریرات اہل دانش کی نگاہ میں ذرہ بھر بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ اور ان نعروں کی حیثیت ایک جُغد صحرائی کے نالہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ اکثریت کے خیال پر شہرت دوام اور عزت و احترام منحصر ہوتا ہے۔ علی وجہ الکمال یہ شرف ہمارے آقا و مولا اُمی مدنی صلی اللہ علیہ وسلم پر جمہور اہل مذاہب کے فیصلہ کے مطابق صادق آتا ہے۔ جس پر دلائل کی حاجت نہیں۔ بلاشبہ تہذیب اخلاق انسانی کے اوصاف جانچنے کا بہترین فیصلہ ہے صدق مقال۔ طبع سلیم۔ تواضع۔ دیانت۔ شفقت و رحم۔ جود و مروت۔ عدل والضاف وغیرہ اوصاف اخلاق کا جزو ہیں۔

سیاست مدن زندگی کا ایک رفیع شعبہ ہے۔ جو اعلیٰ انسانوں میں بوجہ اتم موجود ہونا چاہیئے۔ امیرانہ شکوہ۔ شاہانہ سطوت۔ ملکی تدبیر۔ حاکمانہ غور و فکر۔ سپاہیانہ شجاعت نظم و سلطنت وغیرہ سیاسیات کے شعبے ہیں۔ تدبیر منزل بھی ضروریات کا اہم ترین حصہ ہے۔ ارتباط باہمی۔ تعلقات غیر اقوام۔ آداب مجلس۔ حقوق شناسی۔ تنظیم ملی۔ تبلیغ دینی۔ قوت اصلاح۔ ترویج تعلیم وغیرہ اسی شعبہ کی خصوصیات ہیں۔ اسی طرح مال جمال۔ کمال دوسری خصوصیات ہیں۔ جو انسان کو ایک عالمگیر ہر دلعزیزی عطا کرتی ہیں ان میں سے جو خصوصیت جس انسان میں ہو گی۔ وہ برگزیدہ و مقبول خلائق ہو گا۔ مال جس میں ثروت و حکومت بھی شامل ہیں۔ ہر انسان کو صاحب اقتدار بنانے کے لئے کافی ہے۔ جمال وہ ایک سحر مبین ہے۔ جس کو ملے دُنیا اس کی راہ میں آنکھیں نہیں بلکہ دل ہر وقت بچھانے کو حاضر ہے۔ کمال ایک جوہر ذاتی ہے۔ جو ہر انسان کو معراج ترقی پر پہنچا دیتا ہے۔ علمی۔ روحانی۔ کسبی۔ وہبی۔ فنی۔ عملی کسی قسم کا کمال ہو۔ ہر صاحب

کمال عزت وشہرت کا آفتاب بن کر چمکتا ہے۔

اب اس معیار پر اُس خلق مجسّم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقائع زندگی کو جانچئے۔ اور شرف نبوت وکمال رسالت کو قطعًا اس بحث میں نہ لائیے۔ بصرف قرآنی نقشہ کے مطابق سیدنا محمد عربی (فداہ امی وابی) کے لئے قرآن پاک کے اسی ارشاد کو کہ محبوب آپ فرما دیں میں بھی تمہاری مثل ایک بشر ہوں) پیش نظر رکھئے۔ تو واقعات خود بتا دیں گے۔ اور حیات طیبہ خود گواہی دے گی۔ کہ یہ ذات کامل بحیثیت انسان ہونے کے تمام انسانوں سے ایک بالاتر اور ایک اس ۱۔ رفع واعلیٰ انسانیت کی مالک ہے جس کی حقیقتاً مثال نہیں ملتی۔

کس کس وصف پر جداگانہ بحث کی جائے من کل الوجوہ آپ میں وہ تمام انسانی اوصاف موجود تھے جن کے باعث دنیا کے تمام کامل انسان آپ کو انسان کامل ماننے اور کہنے پر مجبور ہوئے۔ اور بحیثیت انسان کامل آپ بلا حیل وحجت اور بلا ریب وشک بےمثل بشر اور افضل الناس کہے جانے کے مستحق ہیں۔

اب دیکھئے قرآن کریم نے قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ فرما کر اس کا کیا مفہوم سمجھایا ہے۔ وہ مفہوم نابینا ملّاؤں کے معنوں میں نہیں۔ جن کے نزدیک نعوذ باللہ حضور علیہ السلام اور لوٹا بیلا ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے اور ایک ہی پانی کی پیدائش ہیں۔ نہ ان کو کچھ خبر نہ اس کو کوئی پتہ صرف ذرا سا نزول وحی کے وقت فرق ہوتا تھا اور بس یعنی مثلیت میں مبائنت ہو جاتی تھی۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ ایک وہ روشن ضمیر دُور سے دُور کی دیکھنے والا تمام عالم کے ذرّے ذرّے پر نظر ڈالنے والا۔ مشروح الصدر۔ غیب دان۔ ھٰذا یُجلّی فتجلّی لِیْ کُلِّ شیئٍ اور ایک وہ کور باطن۔ سیاہ دل۔ لایعقل۔ نئی تہذیب کا راندہ ہوا گدھا۔ دونوں برابر سمجھے جا سکتے ہیں بدہ خاک بسر انتہائی بدنصیب ہے جو محبوب خدا، سید الانبیاء۔ معصوم ومصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جیسا بشر سمجھتا ہے۔ جو کسی بھی صفت میں مخلوق سے نہیں ملتے۔ اور نہ کوئی مخلوق کسی ایک صفت میں بھی ان سے مطابقت کرتی ہے۔ کیونکہ وہ بے شک وشبہ

بمثل ہیں ۔
قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ جس چیز کو بیان فرماتا ہے، اس کی ہر عملی سٹیج کو جداگانہ نام اور حیثیت دیتا ہے۔ تاکہ ایک ہی صنف میں جو مدارج کا فرق ہے وہ واضح ہو جائے گا ورنہ ہر درجہ میں ایک ہی حیثیت لازم آئے گی۔ اور وہ فرق مدارج میں فتور پیدا کرے گی۔ چنانچہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اسی انسان کے بلحاظ مدارج جو سات نام رکھے ہیں، جو اپنے محل استعمال میں جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں، اور اگر ان کو ایک ہی معنیٰ میں استعمال کیا جائے گا تو قرآن کریم کے طرز بیان پر ایک وہ نقص وارد ہو گا۔ جو لطافت بیان کو قطعاً مٹا دے گا اور قرآنی مفہوم جو مختلف الفاظ میں مراد تھا۔ یکسر بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ مثلاً: آدم۔ انسان۔ ناس۔ انس۔ بشر۔ بشر۔ عبد یہ سب کس کے نام ہیں اور کس کے لئے وضع کئے گئے ہیں؟ پھر کیا ہر آدم عبد ہو سکتا ہے یا ہر بشر عبد کہلا سکتا ہے۔ یا ہر انسان بشر اور ہر ناس آدم یا ہر انس بشر کہے جانے کا مستحق ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں کیونکہ ان انسانی درجات میں لغوی اور اصطلاحی لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے۔ تو بتائیے عبد میں معراج کی بلندیاں اور بشر میں اخلاقی پستیاں کہاں برمطابقت پائیں گی۔ آدم اوّل کی حیثیت ابوالبشری اور مسجود ملائکہ ہونا ہر انس و ناس کے خطاب عبادت میں کیونکر برابر کا سمجھا جا سکے گا۔ اور کیا حفظ مراتب نہ کنی زندیقی کا مقولہ یہاں پر صادق نہ آئے گا؟

کیا وہ وجود جس کا بول و براز پاک۔ جس کا تفل خوشبوناک، جس کا خون موجب نجات از ہلاک، جس کا زور غیر اللہ سے بے باک۔ جس کے لعاب سے تشنہ سیراب جس کا بول پینے سے شاداب مستحق ثواب اس قابل ہے کہ اس سے مماثلت کا دعویٰ کیا جائے اور اپنی ناپاک جان کو اس کے مدمقابل لایا جائے؟ خدا کے لئے اگر ان اوصاف کا کوئی ماں جایا پوت ہے تو ہمیں بھی بتائیے، اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو منہ نہ چڑائیے چاند پر تھوکنے سے اپنا منہ ہی ملوث ہوتا ہے، صحابہ کرام کا آپ کو اشجع الناس

اجود الناس اکرم الناس ادبی الناس علیٰ نفسہ کہنا کیا عامۃ الناس سے مستثنیٰ کر دینے کا ارادہ ثابت نہیں کرتا۔ اور کیا اَیُّکُمْ مِثْلِی کی تفصیل یہی نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ آپ کی دوسرے بشروں سے نوع بشریت میں معمولی سی مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن بفحوائے یُوحیٰ اِلَیَّ۔ اس میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ جس میں کسی کی بھی آپ کے ساتھ مماثلت نہیں۔ اور اس درجہ میں بھی آپ سب سے بےمثل ہیں کیونکہ وحی الہٰی کوئی ایسی چیز تو ہے جو اپنی کوشش سے کسی بادشاہ یا کسی امیر کو حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ ایک بےمثل عطیۂ ربانی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہستی جس پر وحی ہو تمام جہان سے سرفراز و بےمثل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں پہلے بغرض موانست مماثلت فی البشریت بیان فرمائی۔ پھر یوحیٰ الیّ کا درجہ بیان کر کے بروئے وحدت فی الحقیقت آپ کو بےمثل بنا دیا۔

ذرا عقل و فکر سے کام لیکر نبوت کے گرد و پیش پر نظر ڈالئے تو بےشمار مثالیں ایسی ملیں گی۔ جن کے سامنے برابری کے سارے دعویداروں کی حقیقت مثلیت تارِ عنکبوت ہو کر رہ جائے گی۔ مثلاً اللہ کریم جل و علا شانہٗ نے قرآن کی نسبت بھی تو فرمایا ہے۔ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ اور فاتوا بسورۃٍ من مثلہ گویا بےشک و شبہ قرآن کی جامعیت اور اس کی فصاحت و بلاغت بےمثل ہے۔ اگرچہ اس کے حروف کی صورت وہی ہے۔ جو مخلوق کے لکھے ہوئے حروف کی ہے۔ اور اس کا کاغذی لباس ایسا ہی ہے جو دیگر کتب کا تو کیا یہ مماثلت صحیح ہو گی؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح وجود مقدس نبوی علیہ السلام جس کو اس بےمثل عطیہ ربانی یعنی وحی الہٰی کا مظہر بنایا گیا ہے۔ بےمثل ہے۔ اگرچہ ظاہری صورت پاک اور صورتوں کے مشابہ پائی جائے۔ حالانکہ خصائص میں وہ بھی بےمثل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولا کریم نے آپکو قرآن سے تشبیہ دی ہے جسطرح قرآن کو کتاب۔ نور ہدیٰ اور رسول فرمایا۔ اسی طرح آپ کو بھی کتاب۔ نور، ہدیٰ اور رسول فرمایا ہے۔ پس مشابہت میں جب مشبہ بہٖ بےمثل ہوگا۔ تو مشبہ ضرور بےمثل ہوگا، کیونکہ وجہ شبہ صرف بےمثلی ہے۔ پھر ماننا اور کہنا پڑے گا کہ خدا کا قرآن بےمثل ہے۔ تو خداوند کریم کے نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی بےمثل ہیں۔

یہاں پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کفر فی الرسالت پر اگر غور کیا جائے تو قرآن کریم نے اس کی ایک ہی موٹی وجہ بیان فرمائی ہے۔ جو مماثلت کا دعویٰ کرنے والوں نے رسولوں اور نبیوں کے حق میں سامنے رکھی اور وہ یہ ہے مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا یعنی تم کچھ نہیں مگر ہم جیسے بشر اور ان کے لئے ان کی اتنی ہی بات ان کے کفر کا باعث بن گئی۔ فی زمانہ بھی خدا کے کافر تو بہت کم نظر آتے ہیں، یہ جتنے کافر پھر رہے ہیں، یہ اسی انکار نبوت اور مماثلت کے ماتحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے کافر ہیں، کیونکہ وہ سرکار دوجہان مختار کون و مکان ممتاز انس و جان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثل حقیقت باطنی کو نہیں سمجھ سکے۔ ان کو اگر ظاہری مشابہت ہی مماثلت پر مجبور کر رہی ہے تو فرعون، شداد، یزید ہامان کی برابری سے کیوں انحراف ہے۔ ابھی کسی کو فرعون یا یزید کہکر دیکھئے۔ فوراً معلوم ہو جائے گا، کہ آناً فاناً کتنی لاٹھیاں اٹھتی ہیں، پھر کیا شرم کا مقام نہیں کہ فرعون و نمرود اور شداد و یزید سے مماثلت ظاہری پر بھی نتھنے پھولنے لگیں۔ حالانکہ وہ بادشاہ تھے، اور نبوت تامہ کی بے ادبی ہر طرح گوارا رکھی جائے۔ شور بختی کی بھی حد ہو گئی ہے، اللہ کریم ہدایت عطا فرمائے۔

ظاہریت اور جسمانیت پر ہی مماثلت کی نگاہ سہی، مگر کیا وہ جسم اطہر اور تمام اسکے وہ اعضائے شریفہ جن کے فضلات خارجہ، بول و براز، خون و پسینہ وغیرہ سب کچھ ہی پاک ہوں کی برابری کا کوئی دعویدار میدان میں آسکتا ہے۔ قیامت تک کا ایسا علم کس کو ہے کہ آسمان پر کوئی پرندہ پر نہیں مارے گا۔ جو حضور علیہ السلام نے بیان نہ فرما دیا ہو۔ کیا نہیں جانتے کہ انبیاء علیہم السّلام بسبب تعلیم الٰہی عالم ہیں نیز جن کو تعلیم الٰہی نہیں اور جن عوام کا دل علم الٰہی کے نور سے منور نہیں، وہ ان روشن ضمیر و روشن قلوب ہستیوں کے مد مقابل کیونکر آسکتے ہیں، علم الٰہی کے عطیہ کو بھی برطرف رکھئے، محض جسمی مماثلت جو ان کے قلوب قاسیہ کو ہر لحظہ تڑپا رہی ہے، اور یہ کہے چلے جاتے ہیں، کہ کیوں صاحب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شکل و صورت کے لحاظ

سے ہم اگر بشر نہ کہیں تو کیا کہیں اور وہ ہم جیسے نہیں تو وہ کس سے ملتے ہیں۔ کیا ان کے ہاتھ، منہ، ناک، کان ہم جیسے نہیں تھے۔ لے دیکے ہمیں ایک بشر خدا سے ملا تھا جس سے ہم کچھ نفع اٹھا سکتے، مگر ان چودھویں صدی کے اہلسنت والجماعت نے اس کو بھی نور بنا دیا ہے۔

خدا کی پناہ کس سادگی اور بیوقوفی سے عوام کو فریب دیا جا رہا ہے۔ کوئی اس معترض متلی میاں سے یہ نہیں پوچھتا کس نے کہا ان کے ہاتھ، منہ انسانوں سے نہ ملتے تھے۔ مگر "شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور"

اب اپنی اس لغو مطابقت سے آگے ذرا بڑھئے اور بتائیے کہ داروں کا بندر دعوائے انسانیت میں کتنا حق بجانب ہے۔ اعضاء ملتے ہی صحیح، مگر کسی ہیچو شبلی کی وہ انگلیاں تو دکھائیے، جن سے پانی کے چشمے جاری ہو رہے ہوں وہ ہاتھ دکھائیے جس کو مادمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ کی حقیقت میں خدا کا ہاتھ ہونے کی شان حاصل ہو۔ وہ دہن دکھائیے، جس کا لعاب کھار کنوؤں کا میٹھا کر دے، وہ آنکھیں دکھائیے۔ جو آگے پیچھے یکساں دیکھتی ہوں اور زمین و زماں خاک و افلاک پر ہر لحظہ ان کی نگاہ ہو، اور گھر بیٹھے شش جہات کا مطالعہ کریں، وہ پاؤں دکھائیے جو نعلین سمیت سر عرش چڑھ جائیں، پھر مانا جائے گا کہ تم میں کوئی برابری کا دعوے دار اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ فَاِنْ لَّمْ تفعلوا ولن تفعلوا پھر اگر قیامت تک ایسا نہ کر سکو اور یقیناً نہ کر سکو گے تو بتائیے اس بےمثل سے یہ بغض وعداوت کس بنا پر ہے؟ کیا اس کے احسان کا بدلہ یہی ہے کہ وہ تمہیں بھی زمانہ بھر کی امتوں سے بےمثل بنانے کی فکر میں ہو۔ اور تم اس افضل المخلوقات بےمثل ہستی کو اپنے جیسا بنانے کی کوشش میں لگے رہو۔ یاد رکھو محبوب خدا نور الٰہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عروج افضلیت سے ہیچو تو و بشریت میں تنزل دینے کے لئے جتنے کوشاں رہو گے اور اپنی مانند بنانے کا لچر عقیدہ رکھو گے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے، مکتب قدس کا سند یافتہ اور وہی و امرت سر کا حاس ملحقہ

برابر نہیں ہوا کرتے، عالم و بے عمل، اندھے اور آنکھ والے کی برابری کا گمان کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے، خداوند عالم جل مجدہٗ کو جو ناراضگی اس مسئلہ میں (انبیاء علیہم السلام کو مِثْلُنَا) کہنے پر ہے اور جو وبال اس عقیدہ کے رکھنے والوں پر اس نے بھیجے ہیں۔ وہ قرآن پاک و حدیث شریف میں عیاں ہیں۔ یہ بات مولا کریم کو نہایت ناپسند ہوئی، کہ جب کوئی بدکاروں کو رو کتے اور بے نوروں کو نور بخشنے کو اس کی طرف آتا تو عوام یہ کہکر اس سے الگ ہو جاتے کہ تم ہم جیسے بشر ہو، اور اُن میں اور اپنے آپ میں فرق نہ جانتے۔

دیکھئے یہ تو ظاہر ہے کہ تمام انبیاء علیہم السّلام کی آپسمیں صورت ظاہری کی مطابقت ہے، مگر یہ ارشاد فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کا فرق کس حقیقت کو پیش کر رہا ہے۔ اور یہ وہ ہستیاں ہیں کہ جو بلندیٔ مراتب کے لحاظ سے یا وحی الٰہی کی حقیقت میں مماثلت کی مدعی ہو سکتی تھیں۔ مگر قرآن پاک نے ان کی فضیلت کو بھی ایک دوسرے پر ثابت کر کے مماثلت ختم کر دی۔ اور خصوصیت سے ہمارے مولا و آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کی مماثلت نہیں رہنے دی۔ بلکہ روز ازل کا معاہدہ جو خود مولائے کریم نے تمام انبیائے کرام علیہم السّلام سے بحق حضور شافعٔ یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم لیا ایک وہ حد فاصل ہے، جس میں کسی کو بھی حضور علیہم السّلام سے مماثلت نہیں رہتی۔ بدیں وجہ یہ ماننا پڑے گا۔ کہ اگر کفار انبیاء علیہم السّلام کو مِثْلُنَا فی الصورت سمجھتے تھے تو رب العزت جلّ و علا شانہٗ کس بات سے ناراض ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ناراضگی صرف اس بات کی ہے کہ وہ ان کو مِثْلُنَا فی الحقیقت سمجھتے تھے۔ جناب سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ بغرض موانست فی الصورت ہے۔ نہ بغرض مثل در حقیقت، کیونکہ نبوت ظہور احدیت ہے، اور بدیں جہت مظہر بھی خاص حقیقت میں ہونا چاہیئے۔ یعنی مظہر بے مثل کو بے مثل ہونا لازم آئے گا۔

حقیقت تو در حقیقت آپ کی بے مثل ہے۔ مگر آپ تو بشریت میں بھی اپنے ساتھ کسی کو نہیں ملنے دیتے۔ اور اِنِّی لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ فرما کر اپنے آپ کو بے مثل قرار دے دیتے ہیں۔ اور اگر آپ بیمثل ہو کر دنیا میں تشریف نہ لاتے جیسے کہ تمام انبیاء علیہم السّلام اپنے اپنے اوقات میں بیمثل ہوتے رہے تو آپ سے ظاہر و باطن میں معارضہ ہوتا۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے۔ کہ جو نبی آتا ہے وہ ظاہر و باطن میں عیوب بشری سے پاک ہوتا ہے۔ اور حدیث علی کرم اللہ وجہ، لَمْ اَرَ مِثْلَہٗ قَبْلَہٗ وَلَا بَعْدَہٗ کا آپ کی صورت بیمثلی پر دال ہے گویا بشریت کے لغوی معنوں میں تو آپ بشریت کے حامل ہیں۔ لیکن آپ کی بشریت میں جو خواص ہیں وہ کسی ایک میں بھی نہیں۔ لہذا آپ کی بشریت بھی بیمثل بشریت ہے۔ بدیں سبب عام بشر اور سید الانبیاء محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم میں مماثلت کیسی ہو سکتی ہے۔ یہ شرکت تو ایسی بھی نہیں جو جنس عالی یا کسی عرض عام کے افراد کو انسان سے ہے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ کوئی کہدے اللہ ہماری طرح موجود ہے۔ اللہ ہماری طرح سمیع و بصیر ہے۔ کیونکہ کلمہ موجود و علیم ہر جگہ بولا جاتا ہے۔ مگر جس طرح قائل کی موجودیت اور مولا کریم کی موجودیت میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ ایسے ہی عوام کی بشریت اور محبوب علیہ السّلام کی بشریت میں کوئی نسبت نہیں۔

۱۱۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السّلام ایمان۔ عبادات۔ معاملات غرضیکہ کسی شئے میں بھی ہم جیسے نہیں۔ حضور علیہ السّلام کا کلمہ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ کوئی دوسرا ان الفاظ میں رسالت پر گواہی دے تو کافر ہو جائے حضور علیہ السّلام کا ایمان، جنت و دوزخ اور ملائکہ وغیرہ پر دیکھے ہوئے ہے۔ اور عوام کا سنی سنائی پر۔ اپنے جیسا ماننے والوں کے لئے ارکان اسلام پانچ اور حضور علیہ السّلام کے لئے چار۔ کیونکہ آپ پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ عام مسلمانوں پر نمازیں پانچ فرض ہیں۔ اور حضور علیہ السّلام پر مع تہجد چھ۔ کیونکہ آپ پر تہجد بھی فرض تھی۔ عام اہل اسلام چار

بیویوں کے پابند اور حضور علیہ السّلام کسی تعداد کے پابند نہیں ، ہر مسلمان کی بیوی اس کے مرنے پر نکاح ثانی کر سکے ۔ اور حضور علیہ السّلام کی ازواج پاک سب مسلمانوں کی مائیں جو کسی کے نکاح میں نہ آ سکیں ، ہر مسلمان کی میراث پر تقسیم کا حکم موجود مگر حضور کی متروکات نا قابل تقسیم ۔ تو کوئی عقلمند یہ بتائے کہ حضور علیہ السّلام لیمثل خالق کے بے مثل محبوب اور بے مثل عبد نہیں ، تو کیا ہیں ؟ لیکن لفظ بشر مغالطہ میں نہ ڈالے انبیاء علیہم السلام کا دعوائے بشریت ان کا کمال ہوتا ہے ۔ جیسے ایک حاکم وقت ایک کم حیثیت ہمنشیں سے یوں کہے کہ تم مجھ سے خوف نہ کھاؤ ، میں بھی تم جیسا انسان ہوں یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے امتیازی حیثیت عطا کر رکھی ہے ، مگر اس کے ایسا کہہ دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سننے والا اس کے مراتب کا فرق نہ جانے ۔

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ خداوند عالم بھی مومن اور نبی کریم بھی مومن اور یہ مماثلت کا حامی بندہ بھی مومن ۔ ان تینوں مومنوں میں کوئی فرق ہے یا برابر ہیں ، اگر یہاں بھی برابری کا دعویٰ قائم ہے تو ایمان کی فکر کر لیجئے ، اپنی عقل کے دشمنوں کے لئے علامہ اقبال مرحوم بشریت کے مسئلے کا کیا بہترین فیصلہ فرماتے ہیں ۔ شعر

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر ۔۔۔ او سراپا انتظار ایں منتظر

نہ اعبد ہونا اور ہے اور عبدہٗ ہونا اور ہے ، عبد محض کسی کے انتظار میں ہے اور عبدہٗ وہ ہے جس کا خدائے قدوس منتظر ہے ، گویا حضور علیہ السّلام کی عبدیت سے رب کی شان ظاہر ہوتی ہے ، اور رب کی عظمت سے ہماری عبدیت چمکتی ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

اے ہزاراں جبرائیل اندر بشر

بہر حق سوئے غریباں یک نظر !

الغرض افضلیت محمدی عقلاً و نقلاً پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہوئی ہے ، اور اسلام کی حد میں رہتے ہوئے اس سے کسی صورت میں بھی انکار ممکن نہیں ۔ اور یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ حضور علیہ السّلام کی افضلیت صرف کمالات ہی میں واجب التسلیم

نہیں، بلکہ ہر لحاظ صفات اور معجزات میں بھی واجب الایمان ہے۔ مولا کریم نے حضور علیہ السّلام کو اس زمانہ میں بھیجا جبکہ اہل عرب سارے ساز و سامان سے درست تھے۔ یعنے عرب کی شاعری اور خطبہ خوانی بھی نہایت عروج کو پہنچی ہوئی تھی، اور ان کے لغت کو بھی بہت کچھ استحکام حاصل ہو چکا تھا۔ آپ نے تشریف لاکر ان کے ادنیٰ و اعلیٰ کو خدا کی واحدانیت اور اپنی رسالت کی تصدیق کی طرف متوجہ کیا اور دلیلیں قائم کر کے اپنا دعوائے بے مثلیت ثابت کر دیا۔ تمام شکوک و شبہات دفع کر دیئے اور ان کے لئے ناواقفی کے عذر کرنے کا کوئی موقع نہ چھوڑا۔ اب ان کا اعتراض کرنا چودھویں صدی کے بھٹکے ہوئے نام نہاد مسلمان کی طرح محض ہوا و ہوس اور ناحق طرفداری کی بنا پر رہ گیا تھا۔ ابتداء میں جب آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کے آثار نمودار ہوئے تو تاریکئی کفر و الحاد میں نور ہدایت کی جگمگاہٹ پیدا ہونے لگی۔ یہود و نصاریٰ کے عابد و راہب ہر گوشہ سے پکار اٹھے کہ نبی آخر الزمان و رسول خاتم پیغمبراں عنقریب ظاہر ہوا چاہتے ہیں۔ ستارہ پرست۔ کاہن و رمال بر ملا کہنے لگے اب ہمارے جن آسمان پر نہیں جاسکتے، کیونکہ آخری نبی مبعوث ہونے والے ہیں۔ یہ ظہور نبوت کا وقت تھا جس کی قریبی ساعتوں کے باعث رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشغال شبانہ روزی میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ ذکر و فکر اور خلوت و تنہائی کی موانست بڑھتی گئی، تجارتی کاروبار اور امور خانہ داری کے لگاؤ میں کمی آنے لگی۔ غار حرا میں تشریف لیجاتے اور کئی کئی راتیں وہیں تنہا گذارتے۔ رویا صادقہ نظر آنے لگے۔ اسی غار میں حقیقت کا انکشاف ہوا۔ جمعتہ المبارک کو ختم رسالت کے منصب کے اعلان کا حکم ہوا۔ اور نور ہدایت کی روشن قندیل لیکر غار حرا سے قوم کی طرف تشریف فرما ہوئے۔ احکام رسالت قومی رواج کے خلاف تھے۔ اس لئے پہلے پہلے خاص رازداروں کی جانب توجہ فرمائی، جن کو بارگاہِ رب العزت جلّ و علا شانہ سے السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ کی بشارت دی گئی۔ اور آنکھوں والوں نے دیکھا کہ بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر مسیح علیہ السّلام کے ظہور سے تقریباً چھ سو برس بعد فخر بنو اسمٰعیل قیم ملت ابراہیم خلیل اللہ، خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام فضیلتوں کے ساتھ دنیا کی ہدایت کیلئے مبعوث ہو چکے ہیں اور آخر وہ وقت بھی آیا کہ اسلام کا حسن مکمل ہوا۔ اور حضور دنیا سے تشریف لے گئے۔

کہ ہاں تشریف لیگئے ہیں، نور والوں نے حضور کی آخری آرامگاہ کا فیصلہ فرمایا اور یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ حضور اکرم رحمۃ اللعٰلمین حیّ ہیں، اور ابدالآباد تک حیّ رہیں گے، آپ کی امامت منقطع نہیں اور فیضان رسالت تاقیامت برابر جاری رہے گا۔ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر بحکم قرآن شفاعت مانگنا مسلمان کی ابدی نجات کا باعث ہوگا۔ کیونکہ حضور علیہ السّلام ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ آپ کا تمام جہانوں کے لئے رحمت ہونا ثابت کرتا ہے۔ کہ رحمت سب جہانوں کو محیط ہے، لہٰذا حضور کی شان ہے کہ آپ سب جہانوں کو محیط ہیں جتنی کائنات کا خالق السمٰوٰت والارض رب ہے، اُتنی کیلئے حضور رحمت ہیں اور آیت لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولٌ مِّنۡ أَنفُسِكُمۡ الآخر۔ سے بھی حضور علیہ السلام کا حاضر و ناظر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ شعر

آنکھوں میں ہیں وہ مثل نظر اور دل میں ہیں جیسے جسم میں جان
ہیں مجھ میں ولیکن مجھ سے نہاں کس شان کی جلوہ نمائی ہے

ہم کسی پر اعتراض تو نہیں کرتے، لیکن اتنا پوچھے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ کہ اگر قلب میں وہی ایمان ہے۔ جو سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا ہے تاکہ مالک الملک اور خالق الکل کی معرفت حاصل ہو تو ذرا بتایئے، کہ کیا آپ کی بشریت میں مماثلت اور مماثلت بشریت کوئی اور بھی ہے، جس کی یہ شان ہو کہ اس کے حضور میں قیامت تک ہر لحظہ مغفرت کے لئے پھر حاضر ہونے والا مولا کریم کو تو بہ قبول کرنے والا مہربان پائے گا۔ پھر اس آیت میں نہ کسی مکان و زمان کی تخصیص اور نہ کہیں کا تعین۔ قیامت تک جو حاضر ہو اور جہاں سے پکارے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بے مثل بشریت کے ساتھ اس کی پکار کو سُنیں، اس کے درد کو محسوس فرمائیں، اور اس کی امداد کو پہنچیں۔

کاش کہ ظاہر پرستوں کا ٹولہ قرآن پاک کی روشنی میں محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کا مطالعہ کرتا۔

رفعتِ محمدیہ علیہ السلام

وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ

ہم نے تیرے لئے تیرا ذکر بلند فرما رکھا ہے

گذشتہ مباحث میں واضح ہو چکا ہے۔ کہ سب انسان اپنے تمدن۔ تمصر۔ اجتماع۔ انتظام۔ اقتصاد۔ اعتدال۔ قومی۔ اصلاحِ اخلاق اور تزکیۂ نفوس کے لئے قانونِ الٰہی کے محتاج ہیں۔ اور یہ قانون انبیاء ومرسلین کے ذریعہ سے مخلوقِ الٰہی کو پہنچتا چلا آیا ہے۔ اور ہر زمانہ میں ہر مخلوق اس سے فائدہ حاصل کرتی چلی آتی ہے۔ لیکن گذشتہ زمانہ میں جس قدر قوانین الٰہی اور شرائع الہامی پوری دنیا پر نازل ہوئے۔ وہ ہر ایک قوم کے لئے جداگانہ اور علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان میں کوئی قانون ایسا نہ تھا۔ جو تمام عالم کے لئے یکساں مفید ہو یا تمام اقوام اسکو ماننے کیلئے مکلف ہوں۔ مگر اخیر زمانہ میں جب تمام ہادیوں اور نبیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور قوانین الٰہی کے عاملوں یعنے انبیاؤ مرسلین کی تسبیح کے تمام دانے منظم طریقہ پر مسلسل پروئے گئے تو ان سب کے امام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں مبعوث ہوئے۔ اور ایک مکمل ضابطۂ حیات اور مسلم قانونِ الٰہی تمام جہان والوں کے سامنے پیش فرمایا۔ اور ارشاد کیا کہ یہ قانون ساری دنیا کی تاریکی دور کرنے کیلئے نور اور تمام گمراہ انسانوں کے لئے مشعلِ ہدایت ہے چنانچہ اس قانون کو جن لوگوں نے مانا اور جن ذی عقل انسانوں نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا وہ مسلمان کہلائے اور جن بے راہرو لوگوں نے اس سے سرتابی اور سرکشی کی انکو کافر یا منکر کے لقب سے پکارا گیا۔ اور یہ کھلی ہوئی بات اور ایک واضح

حقیقت ہے۔ کہ جس ذاتِ گرامی کے آوردہ قانون سے گمراہ انسانوں کو دینی و دنیوی فلاح و بہبود حاصل ہو وہ ذاتِ مقدس یقیناً اس قابل ہے کہ اس پر اپنا تمام عزیز ترین سرمایہ اور محبوب ترین متاع قربان کرنے میں دریغ نہ کیا جائے۔ اور یہی وہ بات ہے جس کے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ نبی و رسول کو اسکی اس شان نبوت تک جاننا اور ماننا جس سے وہ متصف ہو لازم و واجب ہے۔ اور اس کے مرتبہ و حیثیت سے کم سمجھنا اسکی توہین ہے۔ جو صریحاً کفر ہے۔

یہاں پر یہ مسئلہ بھی قابل یاد ہے۔ کہ ہر ایک رسول و نبی کا مرتبہ ہر ایک کی شان اور ہر ایک کا درجہ بالکل جدا جدا ہے۔ اور ایک کا درجہ دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتا۔ کسی کو اس کے مرتبۂ نبوت میں گھٹانا یا بڑھانا انبیاء کے ارشاد کی اتباع و تعمیل نہیں۔ بلکہ کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ ایمان یہی ہے۔ کہ جس شان سے کوئی نبی و رسول مبعوث ہو اسکو اسی طرح اور ان ہی صفات کا حامل مانا جائے جو اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہوں۔ اسی لئے سرکار دو عالم نبی مکرم محمد رسول اللہ الاعظم کا درجہ مندرجہ بالا آیت کے ماتحت تمام انبیا و مرسلین علیہ السلام کے مدارج سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ جمیع انبیاء و مرسلین کے اپنے اپنے مذاہب میں الگ الگ فرق و فضیلت ہے۔ مگر حضور علیہ السلام سب سے افضل و اکمل ہیں۔ اور آپ کے لائے ہوئے احکام کے سامنے بلا چون و چرا سر جھکا دینا تسلیم کر لینا اور عمل کے لئے تیار ہو جانا ہی سبب نجات اور ذریعۂ رہائی ہو سکتا ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال و اعمال سے یہ بات صریح ثابت ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنی گفتار، رفتار، کردار اور تمام اوضاع و اطوار میں بلا کسی قسم کے تردد و توقف کے آپکی پیروی کرتے تھے۔ ہاں وہ امور جو مخصوصات نبوت ہوتے تھے۔ اور صحابہ

کرام کو انکی تخصیص کا علم بھی ہوتا تھا۔ تو ان کے اتباع میں کوشش نہ فرماتے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے نماز کیلئے جب اپنی نعلین مبارک اتاریں تو صحابہ نے بھی اتار دیں حضور علیہ السلام نے اپنی انگوٹھی اتاری توانہوں نے بھی اپنی اپنی انگوٹھیاں اتار دیں۔ اس لئے کہ صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز زندگی۔ نشست و برخاست۔ خورد و نوش۔ اور صورت و سیرت میں بہت زیادہ تفتیش و تحقیق کا شغف رکھنے والے تھے۔ تاکہ حضور کی پیروی کی پوری پوری سعادت حاصل کرسکیں۔ بعض صحابہ کرام نے جب دنیا کو ترک کردینے اور شب و روز عبادت کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں کھاتا بھی ہوں اور پیتا بھی ہوں۔ سوتا بھی ہوں جاگتا ہوں۔ اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے پھر جائے وہ مجھ سے نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سنت نبوی کا اتباع بلا چون و چرا کرنا چاہیئے۔ اپنی عقل سے اس میں تصرف کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اسی لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ کہ ہمارے دین کی بنیاد منقول پر ہے۔ اور حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اصول الدین میں فرمایا ہے۔ کہ دین میں اپنی عقل سے تصرف نہ کرو۔ اور یہ خیال نہ کرو کہ جو چیز بہتر اور مفید ہوگی۔ وہ جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر وہ زیادہ نافع بھی ہوگی۔ کیونکہ تمہاری عقل اسرار الہٰی کا ادراک نہیں کرسکتی۔ انکی حقیقت کو صرف قوت نبوی ہی پاسکتی ہے۔ لہٰذا تم اتباع نبوی کو لازم سمجھو۔ کیونکہ خاص باتیں ہر شخص کے قیاس سے نہیں معلوم ہوسکتیں

الغرض سرور کائنات مختار شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے سردار سب رسولوں کے قافلہ سالار سب میں اعلیٰ و افضل اور سب کے مقام سے بلند ہیں۔ وہ اس طرح کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے تمام فضائل و کمالات خداوند عالم جل مجدہٗ کے عطا کردہ تھے اور وہ

خداوندعالم کی کسی ایک صفت سے مستفید تھے گو سب انبیا میں قلیل وکثیر تمام ہی صفات کا ظہور تھا۔ مگر اصلی منبع فیض کوئی ایک ہی صفت خاص تھی۔

مثلاً حضرت موسےٰ علیہ السلام شرف تکلم سے مستفید تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام احیاء موتےٰ اور شفاء امراض کی صفت خاص سے مستفید تھے مگر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم صفت علمی میں ممتاز و سرفراز ہیں۔ اور سب جانتے ہیں کہ علمی صفت وہ صفت اور فضیلت ہے جس کو تمام محاسن واوصاف اور انسانی کمالات پر فوقیت اور فضیلت حاصل ہے۔ تمام صفات اپنی کارگذاری میں علم کے محتاج ہیں۔ اور علم ہی پر مراتب صفات ختم ہوتے ہیں۔

پس جو نبی صفتِ علم سے مستفید ہو وہی مراتب میں سب انبیاء علیہم السلام میں از روئے مقام نبوت زیادہ بلند اور مخدوم و مکرم ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو نبی کمالاتِ علمی و عملی میں سب سے بلند ہو وہی سید الانبیاء بھی ہوسکتا ہے۔ اور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی خصوصیت اور سب سے بڑا شرف و امتیاز یہی ہے۔

بزرگانِ دین نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ حضور جامع حیثیات و اوصاف اور ہر لحاظ سے مشعلِ ہدایت اور نمونۂ عمل تھے۔ اور اسی وجہ سے آپکی بلندی مرتبت و رفعتِ مقام ویسی مسلمہ ہے کہ کوئی پہلو بلندی کا آپکے مکمل اسوہ سے باہر نہیں۔ بلکہ اس کا پایا جانا ایسا متحقق ہے کہ اس میں ازلیت و اخرویت پائے بغیر چارہ نہیں۔ تاکہ تمام افراد اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق آپ سے ہدائت اور روشنی حاصل کرسکیں۔ آپ صرف پیغمبر نہ تھے جو تبلیغ ہی پر اکتفا فرماتے نہ صرف عابد تھے جو کسی جنگل یا پہاڑ کے درہ میں بیٹھ کر محض اللہ اللہ کرتے نہ صرف دنیا دار تھے کہ زندگی جاہ و طمطراق کے ساتھ گذار دیتے۔ آپکو تو ہر خیال اور ہر درجہ کے لوگوں کو ہر قسم کی پاکیزہ

تعلیم دینی تھی۔ تاکہ شاہ و گدا۔ امیر و غریب۔ اور ادنیٰ و اعلیٰ سب حضور کے فیض سے فیض اندوز ہو سکیں۔ اور یہی ہر نوع سے رفعت ذکر کا سبب ہے۔

منقولات کو اگر ہر طرف بھی رکھ دیا جائے۔ تو معقولات میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ رفعتِ ذکر کا مقام۔ مولا کریم کے ذکر کے ساتھ۔ عالم بالا میں۔ ملاء الاعلیٰ میں ملائکہ میں۔ عرشِ اعظم پر۔ کتب سماویہ میں۔ تحت الثریٰ میں۔ نمازوں میں۔ اذانوں میں۔ آبادیوں میں ویرانوں میں۔ سمندروں میں۔ پہاڑوں میں۔ عبادات و اخلاق میں۔ رعب و داب میں۔ حقائق و دقائق میں اسطرح ثابت ہوتا ہے۔ کہ اسکی حقیقت سے کسی انجان سے انجان کو بھی تسلیم کے بغیر چارہ نہیں۔ عملی دنیا کے عملی اولوالعزموں کا مطالعہ کیجئے تو یہ رازیوں بھی طشت از بام ہو جاتا ہے۔

اہل اللہ کروڑوں تو شائد مگر لاکھوں بندے اللہ کے یقیناً ایسے مل گئے جو اپنی نجات سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ اور آج ہی نہیں بلکہ سینکڑوں برس سے سمجھتے چلے آئے ہیں۔ یہاں عقیدہ کی صحت و غلطی پر بحث نہیں بلکہ مقصود نفس ہے۔ کہ انکی زبانوں پر نام ہے۔ تو غوث الاعظم کا۔ دلوں میں اعتقاد ہے تو محبوب سبحانی کا۔ لیکن ذرا سوچ کر بتایئے۔ کہ شیخ ممدوح اور ان کے سارے پیش رو اور پس رو حسن بصری۔ جنید بغدادی۔ خواجہ اجمیری۔ شیخ احمد سرہندی۔ نظام الدین دہلوی۔ شہاب الدین سہروردی۔ فرید الدین اجودھنی۔ علی احمد صابر کلیری۔ گنج بخش علی ہجویری سب کے سب کس بات پر نازاں اور کس شئے پر فخر رکھنے والے ہیں۔ اپنی تقدیس و سرفرازی پر یا عرب کے اُمّی کی غلامی اور مکہ کے یتیم کی چاکری پر۔ اللہ اللہ کروڑوں کے پیشوا سرکار کے آستانِ پاک کی جاروب کشی فخر سمجھتے ہیں۔ دنیا میں بیشمار رشی۔

منی۔ راہنما و راہب اور اہل ریاضت گذرے ہیں۔ مگر یہ اعزاز و امتیاز نہ کسی کے حصے میں آیا ہے اور نہ آئیگا۔

محدثین امام بخاری کے مرتبہ و عظمت کو کون نہیں جانتا۔ جنکی کاوش و تحقیق کی نظیر کسی ملک و قوم میں نہیں ملتی ما و سا امام مسلم۔ امام مالک امام ابو داؤد۔ امام ترمذی۔ امام نسائی کے اشتغال علمی کسی سے پوشیدہ ہیں جنہوں نے اپنی ساری کی ساری عمریں اسی پر ختم کردیں۔ کہ وہ صرف ایک اُمی ہی کے ارشادات و اعمال جمع کریں۔ عسقلانی اور عینی۔ طیبی اور قسطلانی سخاوی اور شوکانی۔ قاضی اور نووی اور ان جیسے ہزاروں دوسروں نے اپنی زندگیوں کو کس چیز کے لئے وقف کردیا۔ یہی کہ کسی اُمی علیہ السلام کے اقوال کی شرح و تفسیر اور اسکی جانب منسوب الفاظ کی تنقیح و تنقید کریں۔

محققین ابن جوزی۔ و ابن تیمیہ اور ابن قیم کی ساری ساری زندگیوں کا کارنامہ یہی تو ہے۔ کہ فلاں فلاں بدعات اس محبوب کی سنت کے خلاف ہیں اور فلاں فلاں اقوال اس کی جانب منسوب کرنا اس پر افتراء کرنا ہے۔ کیا کسی بڑے سے بڑے ادیب۔ مہندس۔ فاضل۔ راہنما کے ملفوظات اس کاوش سے جمع کئے گئے ہیں۔ یا کسی کا ایک ایک لفظ۔ ایک ایک فقرہ اور ایک ایک قول اتنی سخت جرح اور موشگافیوں کے بعد پاکیزہ نفوس کے واسطہ اور سچوں کی شہادتوں سے یوں سلسلہ بہ سلسلہ منقول ہوکر اہل جہان تک من و عن پہنچا ہے کہنا پڑیگا نہیں اور ہرگز نہیں۔

مؤرخین ابن اسحاق اور ابن ہشام۔ سہیلی اور زرقانی۔ ابن سعد اور قاضی عیاض۔ دمیاطی اور مغلطائی اور ان کے صدہا شاگردوں اور دوستوں کے ضخیم مجلدات کس بات پر دلالت کرتے ہیں اسی پر کہ اُسی معلم کائنات کی کی سیرت کا ایک ایک گوشہ انہوں نے محفوظ کیا اور اُسی کی کتاب زندگی کی ایک ایک سطر حفظ کرنا اپنے لئے صد ہزار نجات سمجھی۔

آئمہ مجتہدین امام ہمام سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے۔ کوئی دل ایسا نہیں جو آپکی عظمت سے خالی ہو۔ آپ اور آپکے شاگرد۔ بلکہ ان کے شاگردوں کے شاگرد اس پایہ کے تھے۔ کہ معاصرین اور مابعد آنے والوں نے انہیں امام وقت تسلیم کیا۔ لیکن خود یہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی امام مالک اور امام احمد اور انکے احباب و رفقا۔ سفیان ثوری اور اوزاعی۔ ابو یوسف اور محمد۔ زفر اور حسن۔ حماد اور مزنی۔ طحاوی اور سرخسی اور ہزارہا فقہا جو آج تک ہو چکے ہیں۔ ان کا مشغلۂ حیات کیا رہا ہے۔ اور یہ گروہ در گروہ کیا کرتے رہے ہیں۔ اُسی اُمی محبوب کے لائے ہوئے قانون کی شرح و تفسیر۔ اور اُسی ان پڑھ کی بتائی ہوئی شریعت کے فروع کا حل اور جزئیات احکام کا استنباط۔ جس کو وہ وسعت حاصل ہے۔ جو کسی قانون کو نصیب نہیں۔

صوفیاء مثنوی شریف مولینا روم آج بھی کتنے دلوں کو مست کئے اور کتنی محفلوں کو گرمائے ہوئے ہے۔

پیر مولانا رومی۔ خواجہ حافظ۔ سعدی شیرازی۔ نظامی گنجوی۔ خسرو اور جامی عطار اور سنائی۔ صدیوں سے کس کے نام پر وجد کرتے اور کس کے گیت گاتے چلے آرہے ہیں۔ وہی بادیۂ عرب کا بوریا نشین جس کے لئے شاعری کوئی مرغوب اور دل خوش کن مشغلہ نہ تھا۔ اور وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ کا امتیازی نشان رکھتا تھا۔ جو شعر کہنا تو بجائے خود شعر کو موزونیت کیساتھ پڑھ بھی نہ سکتا تھا۔ جس کے سوا ایسی عقیدت قلب اور خلوص و ارادت کے ساتھ جہان بھر میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ اور نہ یوں بیتاب ہو ہو کر پکارا گیا ہے۔

عمر فاروق اور علی المرتضیٰ کے نام سے کس کا کلیجہ نہ دہلا۔ بڑے بڑے سورماؤں کے چھکے چھوٹے۔ خالد سیف اللہ کی شمشیر خارہ شگاف اور عمرو بن العاص کی تدبیروں نے پتھروں کو پانی پانی کر دیا۔ ہارون اور مامون۔ سلجوق اور دیلم۔ غزنوی و غوری۔ تیمور و بابر۔ عثمان و سلیم۔ طارق و قاسم۔ لودھی و خلجی۔

ہمایوں وجہانگیر۔ شاہجہان واورنگ زیب۔ کس شمع کے پروانے تھے اور کس کی خاکبوسی کو اپنا معراج کمال اور وسیلۂ نجات سمجھے۔ اسی حضرت عبداللہ کے نور نظر اور حضرت آمنہ کے لعل کی۔

غزالی کی تصانیف اور انکے نقش قدم پر چلنے عالموں نے اسرار دین اور معالجۂ امراض نفسانی پر جو فتروں کے دفتر تیار کر دیئے ان کا حاصل اور لب لباب کیا ہے۔ اسی نبی اُمّیؐ کے لائے اور پھیلائے ہوئے دین کی حمایت و نصرت اور اسی کی تبلیغ و ترویج۔ ابوالحسن اشعری۔ ابوبکر باقلانی۔ رازی اور آمدی۔ نسفی اور جرجانی نے عقائد و کلام میں تصانیف کا جو انبار لگا دیا ہے۔ اور ان کے متبّع جس طرح ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اور آج چودھویں صدی ہجری کے وسط میں بھی جو کام ہو رہا ہے۔ اس پایہ کا علم کلام کس شخصیت کا حصّہ ہے۔ صرف اُسی عرب کے صحرا کے نبی کا جو عبدالمطلب کا پوتہ اور عبداللہ ذبیح کا بیٹا تھا۔

مفسّرین مفسرین کرام کے اسماء گرامی اور ان کے علمی کارنامے کس پر روشن نہیں۔ تابعین میں ضحاک اور قتادہ مجاہد اور ابن زیاد نے جو معانی قرآن کی خدمت کی اس کا صلہ کس کے امکان میں ہے اور ابن جریر کی تیئیس مجلدات کو کون بھول سکتا ہے اور ابن کثیر کی محنت و جستجو کی داد کون دے سکتا ہے۔ بیضاوی و زمخشری کی قدر کس کے دل میں نہیں۔ ابن حبّان اور ابوسعود نے اپنی پیاری عمریں اسی خدمت کیلئے وقف کر دیں۔ چشم تصور دیکھ رہی ہے۔ کہ یہ سب کے سب اپنے اپنے مجلدات لئے ہوئے اسی اُمّی کی خدمت میں دست بستہ اس کی نگاہ کرم کے منتظر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور انکی سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ اس کے قدموں پر نثار ہو جائیں۔

صرفی و نحوی صرف و نحو اور لغت کی طرف آیئے۔ اس میدان میں بھی ایک سے ایک بڑھکر امام فن نظر آئیں گے ایسے کہ جن پر خود فن

کو ناز ہے۔ کسائی اور ابو الاسود۔ خلیل اور سیبویہ ابن مالک اور ابن حاجب مطرزی وجوہری ابن منظور وزبیدی۔ کسی نے صرف پر لکھا اور کسی نے نحو پر۔ اور کسی نے لغت کو اپنا موضوع بنایا۔ لیکن ان تمام ان تھک ریاضتوں اور بے حساب الفاظ کے ذخیروں کے پیچھے مقصود اصلی سب کا کیا رہا یہی کہ اس محبوب خدا کے فرمودہ دین کی خدمت۔ غور کا مقام ہے کہ کیا دنیا میں اُمیّوں کو یہی مرتبے حاصل ہوا کرتے ہیں۔ جو اولوالعزم اہل علم کو بھی نصیب نہیں ہوئے۔

فلسفی سب سے آخری فلسفیوں کے گروہ کو لیجئے۔ جو کبھی کسی کے نہیں ہوئے۔ ہر نظریہ ہیچ اور ہر دلیل متروک۔ لیکن یہاں انوکھا ہی طریق کار ہے۔ ابن سینا۔ ابن رشد۔ طوسی و فارابی۔ رازی و شیرازی سب کے سب اسی زلف معنبر کے اسیر اور سب کے دامن عقیدت اسی اُمّی کے بند نعلین سے وابستہ نظر آتے ہیں۔

پاکستان کے چھوٹے چھوٹے قریوں اور موضعوں سے لیکر عرب کے ریگستانوں اور چٹیل میدانوں۔ افریقہ کے صحراؤں اور بیابانوں۔ لندن پیرس اور امریکہ کے تمدن زاروں تک۔ ہر روز اور ہر روز میں بھی پانچ پانچ بار کس کے نام کی پکار اللہ تعالےٰ کے اسم پاک کیساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ اپنی ذاتی عقیدتمندی کو الگ رکھئے محض ایک خالی الذہن اور ناظر و غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے محض واقعات پر نظر کر کے فرمائیے کہ یہ مرتبہ و یہ اکرام کسی راہبر کسی ہادی کو حاصل ہوا ہے۔ جو آسمانوں کے نبی۔ چرند و پرند کے نبی۔ زمینوں کے نبی۔ عرش و فرش کے نبی۔ کوہ و دشت کے نبی سمندروں اور پہاڑوں کے نبی حیوانات و جمادات کے نبی اُمّی کو حاصل ہوا۔ اور حاصل بھی اس وقت ہوا جبکہ قوت والے اور زور آور قریش اپنے خیال میں اس کو ہمیشہ کے لئے مٹا دینے کے مستحکم ارادے کر چکے تھے تو عدہ ہوتا ہے۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۔ ہمنے تیرے لئے تیرا ذکر بلند کر رکھا ہے جس میں ازلیت داولیت اور بقا و دوام کی مستحکم حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔

اگر ذکر اس کا بلند نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا۔ نام اس کا سرفراز نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا۔ بلندیٔ ذکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وہ تفسیر ہے۔ جو اوراق لیل و نہار پر پونے چودہ سو برس سے ثبت چلی آرہی ہے۔ اور حشر سے آگے تک چلی جائیگی پھر حشر کے دن بھی جو عنداللہ حضور کا مرتبہ ہوگا۔ وہ تو ہوگا ہی۔ اس سے قطع نظر کرکے صرف اس مرتبہ کا تصور کیجئے جو محض اس بلندیٔ ذکر کے لحاظ سے اس روز حاصل ہوگا کہیں سے ملوک وسلاطین فوج در فوج آرہے ہیں۔ کہیں سے تاجوروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ۔ کہیں سے محدثین اکرام اور فقہائے عظام جوق جوق حاضری کی تمنا لیکر بحاضر حضور ہو رہے ہیں کہیں سے مفسرین۔ اہل اصول۔ اہل تصوف۔ اہل لغت۔ اہل سیر۔ اہل رجال۔ اہل صرف و نحو۔ اہل معانی۔ اہل بیان۔ اہل اخلاق اہل منطق۔ اہل فلسفہ غرضیکہ جس فن کو لیجئے اسی کے آئمہ ادب سے بڑے جاتے اور ہاتھ باندھے خاموشانہ انداز میں کھڑے ہیں۔ کون ہے جو اس انعام کی تصویر کھینچے اور اس میدان کا تصور کر سکے۔ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ

آدابِ دربارِ رسالت

اِنَّ النَّبِیَّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ

تحقیق نبی صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کو اپنی جان سے بھی اولٰے ہیں

چشمِ فلک نے ملکوکھا دنیوی تاجداروں کے درباروں کا جاہ و جلال اور تزئین آرائش بھی دیکھی ہوگی۔ کہ چاوش و نقیب، خیل و حشم، تخت و تاج، تزک و احتشام اور حاجب و دربان سب کچھ موجود ہوتے ہیں، جب کہیں جا کر شاہی رعب و داب بمشکل کام کرسکتا ہے، لیکن دربارِ رسالت میں یہ کچھ بھی نہ تھا، ایک سادگی تھی جو پورے دربار پر چھائی ہوئی تھی، نہ روک تھی نہ ٹوک، نہ در نہ دربان، نہ قالینوں کا فرش نہ زرق برق وردیوں والے چوب دار، نہ تخت و تاج کی آرائش اس کے باوجود وہ ہیبت تھی، وہ جلال تھا، کہ لوگ بیٹھے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے، کہ ان کو کھجوروں کے کھوکھ سمجھ کر ان کے سروں پر چڑیاں آ بیٹھتی تھیں، جب سرورِ کائنات مفخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کچھ کلام فرماتے تو دربار بھر میں ایک سناٹا چھا جاتا، ہر شخص مؤدب ہوتا اور سب کے سر فرطِ ادب سے جھکے دکھائی دیتے۔ کوئی فخر و امتیاز نظر نہ آتا۔ اور نہ ہی کسی امیر یا غریب درباری کی نشستوں کا یقین ہوتا جس مرتبہ و لیاقت کا آدمی ہوتا، حضور اس سے اسی قسم کی گفتگو فرماتے، اور اس کی صوری و معنوی حیثیت کے مطابق پیش آتے، روم و ایران کے درباروں کی طرح گو اس دربار میں رسمی تعظیم و قیام و سجدہ نہ تھا۔ تاہم آپ جوشِ محبت میں کبھی کبھی کسی کیلئے ضرور کھڑے ہوجاتے کیونکہ تعظیم و محبت میں بڑا فرق ہے اور اس کھڑے ہونے میں حلیمہ سعدیہ آپکا رضائی بھائی حضرت زہر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کا زمانہ آپکی مسجد ہی تھی مسجد ہی عدالت مسجد ہی، مدرسہ مسجد ہی مہمان خانہ مسجد ہی کچہری۔ اور مسجد ہی درس و ارشاد کا گہوارہ تھی۔ صحابہ کرام نے

ایک جانب آپ کے لئے چھوٹا سا مسجد کا چبوترہ بنا دیا تھا حضور اسی پر جلوہ افروز ہوتے، تو چاروں طرف صحابہ کرام حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے کوئی امتیاز نہ تھا اور باہر سے آنے والا یہ امتیاز ہی نہ کر سکتا تھا کہ شمع محفل کون ہے، اور اس دربار کی سیادت کسے حاصل ہے، بدوؤں کے اکثر قبائل آتے۔ اور وحشیانہ انداز میں مخاطب ہوتے، مگر آپ پرواہ بھی نہ فرماتے، تعلیم وارشاد کی صحبتیں صبح کے وقت منعقد ہوتیں۔ اور ہر قسم کے مسائل زیر بحث آتے، کبھی ہر نماز کے بعد بھی وعظ فرمایا جاتا مگر پند و نصائح کے مبحث پر خصوصاً تیسرے موز گفتگو ہوئی، بعض اوقات لوگ رونے لگ جاتے، اور کبھی کبھی ہلکا سا تبسمانہ رنگ بھی پیدا ہو جاتا آپ دقیق مسائل اور عسیر الفہم موضوعات پر گفتگو پسند نہ فرماتے جنہیں عوام نہ سمجھ سکیں، ایک مرتبہ بعض صحابہ میں مسئلہ تقدیر پر بحث چھڑی ہوئی تھی کہ حضور حجرۂ شریفہ سے باہر تشریف لے آئے۔ اور فرمایا کہ کیا تم قرآن کو ٹکرا دینے کے لئے پیدا ہوئے ہو، گذشتہ اقوام ایسے ہی عمل سے برباد ہوئی ہیں، لوگ شہرت طلبی کو بالعموم خلوص عمل کے مخالف سمجھتے تھے، لیکن حضور نے فرمایا کہ اگر کوئی ثواب کا کام کریگا تو شہرت لازماً ہوگی مگر مقصد ثواب ہونا چاہئے

غرضیکہ دربار کیا تھا ایک فیض قدس تھا جس سے لوگ بڑی بڑی بصیرتیں حاصل کرتے، کیونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات انسانی کا ہر دائرہ مکمل تھا، جہاں آپنے عامہ اہل عالم کو شریعت غرا کی کامل تعلیم دیکر استاد جہاں اور بہترین خلائق بنا دیا تھا۔ وہاں خواص کو طریقت کی تعلیم سے روحانیت و عرفان کے مشاہدات بھی کرائے اور وَفِيٓ اَنۡفُسِكُمۡ ۚ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ کی عملی تفسیریں بھی سمجھائیں، تا کہ یہ سلسلہ اولیاء اللہ کے ذریعے تا قیام قیامت اصلاح امت کا کام کرتا رہے۔ اور صوفیائے عظام حضور علیہ السلام کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہر ضرورت کے وقت میدان میں آئیں۔

ایک روز اسی قسم کی ایک مجلس عرفان منعقد تھی جس میں حضرت صدیق اکبر

علی المرتضیٰ، عثمان ذوالنورین، ابو ہریرہ، عبداللہ بن مسعود، خالد بلال، ہلال اور دیگر سخن شناس صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مجلس میں تشریف فرما تھے، اور حضور علیہ السلام ایک پیر طریقت اور مرشد حقیقت کی حیثیت سے سجادہ پر تشریف رکھتے۔ ہوئے حقائق معرفت اسرار عرفان۔ اور رموز مخفی، خاص محویت و خاص انداز کے ساتھ بیان فرما رہے تھے محفل کی محفل ایک بقعۂ نور بنی ہوئی تھی تجلیات پر تو افگن تھیں۔ عجیب کیفیت اور عجیب رنگ تھا۔ کہ حضرت عمر بھی تشریف لے آئے۔ آپ کے محفل میں بیٹھتے ہی سرکار دو عالم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ حاضرین متعجب ہوئے کہ شاید یہ حقائق و اسرار ربانی سرکار دو عالم حضرت عمر کو بتانا نہیں چاہتے۔ حضور نے حاضرین کے اس خیال سے آگاہی پاتے ہی فرمایا یہ بات نہیں۔ کہ میں حضرت عمر سے کچھ چھپانا چاہتا ہوں۔ مگر طفل شیر خوار کو گوشت اور حلوہ نقصان کرتا ہے۔ اور جب بچہ بالغ ہو جاتا ہے۔ پھر سب کچھ کھاتا ہے۔ حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا۔ کہ اس وقت حضرت عمر اسلام میں ایک مبتدی کی حیثیت میں تھے۔ اور آپکی تعلیم روحانی ابتدائی تھی۔ جو بعد کو مکمل ہوئی۔ یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی۔ کہ وہ پیر غلطی کرتے ہیں۔ جو مبتدیوں اور نااہلوں کے سامنے اسرار معرفت بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ راز کی بات جب بھی باہر جائے گی۔ شریعت و طریقت کو نقصان پہنچیگا اور دونوں نظریات ٹکرا کر فتنہ برپا ہوگا۔ چنانچہ اس سکوت کے بعد اسی مجلس میں

حضور علیہ السلام نے حضرت عمر کو آگے تعلیم دینی شروع کی اور فرمایا مَنْ عَرَفَ اللّٰهَ لَا يَقُوْلُ اللّٰهَ وَمَنْ يَقُوْلُ اللّٰهَ لَا عَرَفَ اللّٰهَ۔ یعنی جو کوئی پہچانتا ہے۔ اللہ کو کہتا نہیں اللہ اور جو کوئی کہتا ہے اللہ وہ پہچانتا نہیں اللہ گویا بچہ جب تک باپ کے رتبہ سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اسی وقت تک اس کا نام لیتا ہے۔ جب واقف ہو جاتا ہے۔ تو اس کے بعد ادب باپ کا نام لینے سے باز رکھتا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ یہ کیا شناخت

ہوئی کہ بندہ آقا کا نام نہ لے۔ اور اس کو یاد نہ کرے فرمایا۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ اے عمر جو شخص اپنے آقا کے ہمراہ یا حضور میں حاضر ہو اور اسے دیکھ بھی رہا ہو۔ اس کا اس کو پکارنا یا یاد کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ قربان ہوں خدا ہمراہ کہاں ہے۔ فرمایا اِنَّ اللّٰہَ فِیْ قُلُوْبِ الْعِبَادِ ط یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کے دلوں میں موجود ہے۔ پھر عرض کیا بندہ کہاں ہے فرمایا وَھُوَ الْاِنْسَانُ یعنی وہ انسان ہے لیکن اے عمر ذہن نشین کر لو کہ دل کی بھی دو قسمیں ہیں ایک قلب مجازی اور دوسرا قلب حقیقی۔ قلب حقیقی وہ دل ہے جو نہ بائیں طرف ہے نہ دائیں طرف نہ نیچے ہے۔ نہ اوپر نہ دور ہے نہ نزدیک لیکن مرشد کامل کے ارشاد اور صحبت کے بغیر کوئی بھی اسے سمجھ نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرب ربانی پر یہ چیز حاصل ہوتی ہے۔ ارشاد ہے کہ قُلُوْبُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَرْشُ اللّٰہِ تَعَالٰی وَقَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَامِرَۃٌ مِنْ ذِکْرٍ کَثِیْرٍ فَھُوَ حَیٌّ ط یعنی مومنوں کے دل رب العزت جل وعلا شانہ کا عرش ہیں۔ اور مومن کا قلب زیادہ ذکر و شغل میں رہنے سے زندہ ہو جاتا ہے۔ اور حضرات صوفیائے کرام اور درویشان عظام کی اصطلاح میں یہی مقام ذکر خفی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومن اور مسلم میں کیا فرق ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا لیس المومنون الذین یجتمعون فی المسا جد ویقولون لا الٰہ الا اللہ علی الرسم یعنی جو لوگ مسجدوں میں جمع ہو کر محض رسمی طور پر کلمہ پڑھتے ہیں وہ مومن نہیں۔ اے عمرؓ رسمی طور پر کلمہ پڑھنے والے حقیقت میں مومن سے بے خبر ہیں۔ اور مومن سے بے خبر ہونا تو در کنار رہا منافق ہیں۔ اس لئے کہ زبان ظاہری سے تو لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں لیکن حقیقت سے بالکل بے بہرہ اور بہت دور ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ کلمہ کیا اور اس کا مقصود کیا ہے، اس کے معانی کیا ہیں؟ ان معنوں میں لا الٰہ الا اللہ کہنا کہ

ہے اور نہیں ہے۔ اول نہیں ہے کہتے ہیں۔ اور آخر میں ہے۔ کہتے ہیں اس طرح وہم و شک میں پڑ جاتے ہیں۔ جو قطعی کفر ہے۔ رسمی کلمہ کو گویائی زبان کے سوا اور بجز زبانی جمع خرچ کے کچھ نہیں جانتے۔ کہ کسی کی نفی کر رہے ہیں اور کس کا اثبات حضرت عمر رضی اللہ عنہ پھر عرض گذار ہوئے۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر کلمہ کیا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ حق سبحانہٗ و تعالےٰ کے سوا کوئی موجود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ظہور خدا ہیں۔ اس لئے چاہئے کہ خطرۂ ما سوا اللہ کی نفی کرے اور ذات احدیت کو ہر چیز اور ہر جگہ میں ثابت قرار دے۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالےٰ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ ۰ یعنی ہر جگہ کہ منہ کرو اسی جانب اللہ تعالےٰ کا منہ پاؤ گے۔ اے عمر جب بندہ اپنی صفات کی نفی اور ذات خدا کی اثبات کرے تو وہ درجہ نہایت پر پہنچے گا۔ اور مَنْ عَرَفَ رَبَّہٗ کَلَّ لِسَانُہٗ کی منزل میں آئے گا۔ یعنی جو اپنے رب کو پہچان لیتا ہے۔ اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ اور یاد الٰہی و ذکر خداوندی کی وادی سے بڑھ جاتا ہے۔ اے عمر یقین رکھ اور خوب سمجھ لے کہ جب تک سالک اپنی نفی نہ کرے اور یاد اللہ سے نہ گذرے وہ وحدت کی منزل میں نہیں آتا۔ اور دوئی کے جھمیلے میں پڑا رہتا ہے۔ اور دوئی ہی عین شرک و کفر ہے۔ اور حقیقی کلمہ کا یہی مطلب ہے۔

حضور علیہ السلام کی یہ تعلیم محض لفظی اور عقلی نہ تھی۔ جو ارشاد کیا جاتا تھا۔ وہ دکھایا بھی جاتا تھا۔ یہ کلمہ کی تعلیم تھی۔ جو تصوف کی اعلیٰ ثانوی تعلیم کا پہلا یعنی ندرس تھا۔ اور یہی مفہوم ہے۔ اس ارشاد باریتعالیٰ کا۔

یا ایھا الذین اٰمنوا استجیبو اللّٰہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم

یعنی اے ایمان والو قبول کرو واسطے اللہ تعالےٰ کے اور واسطے رسول علیہ السلام کے جب پکارے تم کو اس لئے کہ زندہ کریگا تم کو۔ یعنی مومنوں کو لازم ہے۔ کہ جس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلائیں۔ خواہ وہ کسی حالت میں ہو فوراً بلا توقف جواب دیکر حاضر حضور ہو جائے۔ خواہ عبادت

کی حالت میں ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جو نماز وہ ادا کر رہا ہے اسکی ہی منسوخی کا حکم آ گیا ہو۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ سرکار دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز ایک صحابی ابو سعید بن کعب کی طرف سے گذرے۔
آپنے ان کو طلب فرمایا۔ سرکار کی آواز تو انہوں نے سن لی۔ مگر ذرا دیر سے حاضر ہوئے۔ آپ نے ان سے تاخیر و توقف کا سبب پوچھا۔ تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نماز میں تھا اس لئے فوراً حاضر حضور نہ ہو سکا۔ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تو نے یہ حکم خداوندی قرآن کریم میں نہیں پڑھا کہ قبول حکم رسول بلا توقف واجب ہے۔ اور پھر آیت مندرجہ بالا تلاوت فرمائی اسیطرح آداب رسالت بھی سمجھائے جاتے اور عرفان و اسرار سرمدی کے راز بھی بے نقاب کر کے وعدہ و قال کے رموز سے آگاہ فرمایا جاتا۔ آداب نبوی علیہ السلام کے متعلق قرآن پاک میں ایک دوسری جگہ سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا۔ یعنی اے مومنو تم ہمارے محبوب کو پکارنا اور بلانا ایسے رنگ میں نہ اختیار کرو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ بلکہ حضور کو کمال تعظیم و توقیر سے بلاؤ۔ اس لئے کہ ہمارے محبوب نہایت عظیم الشان اور عالی قدر ہیں انکو دو سرد کے سامنے خیال کرنا اور عوام کی حیثیت پر محمول رکھنا بنص قرآنی حرام ہے۔ اسکے علاوہ اور بھی ایک آیت شریف سورۂ حجرات میں ہے۔ جس کے حکم نے صحابہ کرام میں سے بعض صحابہ کو دربار نبوت کی حاضری سے محروم کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ کہ
یا ایھا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا لہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون ط یعنی اے مومنو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو۔ اور نہ ہی آپس میں ایک دوسرے کو پکارنے کیطرح محبوب علیہ السلام کو پکارو (جیسے تم ایک دوسرے کو عمومی زبان میں پکارتے ہو) مبادا تمہارے تمام اعمال صالحہ جو تم نے کئے۔ (اور عبادی

جو تم نے کمائیں ضبط و حبط اور ضائع ہو جائیں اور تم بے خبر ہو۔

بخاری میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ کہ اس آیت شریفہ کے نزول کے بعد کئی دن تک حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ دربار رسالت میں حاضر نہ ہوئے۔ اس لئے کہ ان کی آواز قدرتی طور پر عام آوازوں سے موٹی اور بلند تھی۔ حاضرین دربار رسالت سے کسی نے کہا کہ میں ان کا حال معلوم کروں کہ وہ کیوں حاضر حضور نہیں ہوتے، چنانچہ وہ ان کے در دولت پر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سر جھکائے ہوئے مغموم و محزون بیٹھے ہیں۔ پوچھا کہ کیا حال ہے۔ ثابت رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ حال کیا عرض کروں۔ جب سے یہ آیت سرکار دو عالم پر نازل ہوئی ہے مجھے اپنے اعمال صالحہ کے حبط ہونے کا کھٹکا لگ گیا ہے۔ کیونکہ میں بلند آواز ہوں۔ اس شخص نے اس گفتگو کی اطلاع حضور علیہ السلام کی خدمت میں کی اور پھر واپس حضرت ثابت کے پاس آیا اور کہا کہ ثابت مجھے حضور علیہ السلام نے پھر بھیجا ہے۔ کہ تم کو بشارت دوں کہ انک لست من اھل النار ولکنک من اھل الجنۃ۔ یعنی تو ناری اور جہنمی نہیں بلکہ تو اہل جنت سے ہے۔ اور معالم میں یہ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے۔ کہ جب یہ آیت اتری تو ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ راستہ میں بیٹھ کر رونے لگ گئے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو پوچھا کیوں روتے ہو؟ بولے اس اس آیت کے نزول نے رلایا ہے، کیونکہ میں بلند آواز ہوں اور ڈرتا ہوں کہ یہ میرے حق میں ہی نہ اتری ہو۔ پھر وہاں سے اٹھکر گھر چلے آئے۔ اور بیوی سے کہا جب میں اپنے حجرے میں جاؤں تو دروازہ بند کر دینا۔ میں اس وقت تک باہر نہ نکلوں گا جب تک حضور علیہ السلام راضی نہ ہو جائیں۔ یا اللہ تعالٰے مجھے موت نہ دیدے۔ ادھر عاصم رضی اللہ عنہ دربار نبوت میں حاضر ہوئے۔ اور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت کا واقعہ بیان کیا۔ اسوقت

حضور علیہ السلام نے فرمایا جاؤ ثابت کو میرے حضور میں لاؤ۔ عاصم آئے اور حضور علیہ السلام کا ارشاد سنایا۔ ثابت ساتھ ہوئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ ارشاد ہوا اے ثابت تجھے کس چیز نے رلایا ہے۔ عرض کیا کہ اس آیت کا نزول میں نے سمجھا میرے حق میں ہے کیونکہ میں بلند آواز ہوں۔ فرمایا اے ثابت کیا تو خوش نہیں۔ کہ ان تعیش حمیدا فتقتل شہیدا او تدخل الجنۃ۔ یعنی تو زندہ رہے۔ تو نیکنام اور مارا جائے تو شہید اور داخل ہو جنت میں۔ اس بشارت کو سنکر ثابت نے عرض کیا رضیت ببشری اللہ ورسولہ ولا ارفع صوتی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معہ اللہ کریم جل شانہٗ کی بشارت کے ساتھ راضی ہوا۔ اور میں کبھی اپنی آواز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر بلند نہیں کروں گا۔ علماء امت کا اس مسئلہ میں اجماع ہے۔ کہ یہ تمام امور جیسا کہ حضور کی حیات طیبہ ظاہری میں ممنوع اور مومنوں کے لئے واجب العمل تھے ویسے ہی بعد میں بھی واجب العمل ہیں اور قیامت تک ممنوع رہیں گے۔ حضرت ثابت کے متعلق مشہور روایت ہے۔ کہ آپ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے ہو زندگی میں تھوڑا عرصہ زندہ رہے۔ اکثر صحابہ ان کو چلتے پھرتے دیکھکر کہا کرتے تھے کہ یہ جنتی جا رہا ہے۔ کیونکہ انہی کے اس عمل پر اس آیت کا نزول ہوا۔ ان الذین یغضون اصواتھم عند رسول اللہ اولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقویٰ لھم مغفرۃ واجر عظیم۔ یعنی بیشک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پست کرتے ہیں وہ وہی ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ نے تقویٰ سے آزمائے ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔ بزرگان دین نے فرمایا ہے کہ حضور علیہ السلام کی یہ حرمت حیات ظاہری اور حیات بعد الموت میں مساوی ہے۔ اور حضور روضۂ اقدس بھی آواز کا بلند کرنا اور بے تکلف بولنا حرام ہے۔ چنانچہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ دو آدمی مسجد

نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں زمانہ خلافت امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ
بلند آواز سے باتیں کرتے تھے۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے
اور ان کی گفتگو سن کر فرمایا کہ تم کو معلوم ہے تم کہاں بیٹھے ہو۔ اور یہ بتاؤ کہ تم
کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم طائف کے رہنے والے
اور حضور علیہ السلام کی مسجد میں بیٹھے ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر تم مدینہ
طیبہ کے رہنے والے ہوتے تو میں تم کو سزا دیتا۔ یہ اس لئے فرمایا کہ اہل مدینہ
ایسے مسائل میں بوجہ قرب وقت اسلام خوب جاننے والے تھے۔ اور
طائف والے دور ہونے کے باعث ما بعد الاسلام بھی تھے۔ کیونکہ انکا اسلام
لانا فتح مکہ کے بعد ہوا۔ لفظ لا تجهروا سے مفسرین نے آپ کو خالی نام
سے نہ پکارنا مراد لیا ہے۔ جیسے یا محمد یا احمد وغیرہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ
فرمایا یا نبی اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنا چاہیئے۔ تاکہ دوسروں
سے مساوات نہ ہو۔ اور آیت شریفہ یا ایہا الذین امنوا لا تقولوا
راعنا وقولوا انظرنا سے تو مستفاد ہوتا ہے۔ کہ وہ الفاظ ہی چھوڑ
دو۔ جن کے استعمال سے بیہود کی پکار میں کوئی ذرا سا پہلو بھی میرے محبوب
صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا نکلتا ہو۔ یعنی ابتدار میں جب تمام صحابہ کرام
رضوان اللہ علیہم اجمعین دربار نبوت میں حاضر ہوتے اور سرکار انبیاء صلی اللہ
علیہ وسلم کچھ پند و نصائح بیان فرماتے تو جو لوگ ذرا دور ہوتے یا آواز مبارک
پوری طرح نہ سنتے تو عرض کرتے راعنا یا رسول اللہ یعنی اے اللہ کے
رسول ہماری بھی رعایت فرمایئے۔ اور ہماری طرف بھی متوجہ ہو یئے ان الفاظ
کو سنکر بعض منافقین جو مسجد میں حاضر ہوتے اپنی زبانوں کو ذرا کھینچکر از راہ
توہین راعینا کہدیتے جس کے معنے بجائے رعایت کے چرواہے یا احمق
کے ہو جاتے ہیں۔ تو ان کا یہ حاسدانہ فریب مولا کریم جل وعلا شانہ کو اپنے محبوب
کے حق میں پسند نہ آیا۔ اور مومنوں کو ارشاد فرمادیا۔ کہ اے ایمان والو

تمہارے لفظ راعنا کے استعمال کرنے کو دیکھ کر کفار و منافقین بھی از راہ بغض و کینہ اپنی نافرمان زبانوں سے میرے محبوب کے حق میں رَاعِینَا بولتے ہیں۔ جس سے مخفی طور پر میرے محبوب کی توہین کا شائبہ پیدا کر لیتے ہیں۔ لہٰذا تم لفظ رَاعِنَا کا کہنا ہی ترک کر دو۔ اور لفظ اُنْظُرْنَا سے خطاب کرو۔ کہ یا رسول اللہ ہماری جانب نظر فرمایئے یا دیکھئے۔ تاکہ کفار و منافقین راعنا کہہ ہی نہ سکیں۔ کیونکہ تم ہمکلام ہوتے وقت اس کو بطور تعظیم و تکریم استعمال کرتے ہو اور وہ بباطن توہین و تحقیر کا مطلب لیتے ہیں۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ ایسا لفظ جس سے دشمن کا تکلم مخفی طور پر بھی محبوب علیہ السلام کی تحقیر و توہین پر دلالت کرتا ہو۔ ترک ہی کر دیا جائے۔ اس پر مفسرین نے لکھا ہے۔ کہ اسی لفظ پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا چند یہودیوں سے جھگڑا ہوا کہ تم یہ لفظ بول کر حضور کی توہین مراد لیتے ہو اگر تم نے پھر بولا تو تم میں سے ایک ایک کو قتل کر دونگا۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ اے سعد اس لفظ کا استعمال رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں مسلمان بھی تو جائز رکھتے ہیں۔ یہ سنکر حضرت سعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ کہ اے ایمان والو تم ہمارے پیغمبر کی جناب میں لفظ رَاعِنَا نہ کہو کیونکہ یہودی تمہارے قول کو سند ٹھہرا کر اور فاسد معنی مراد لیکر ہمارے محبوب کی خدمت میں استعمال کرتے ہیں۔ اور اس میں ایک قسم کی قبیح تلبیس اور بدباطنی کی بو آتی ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ندا یا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اس لئے ہے کہ تاکید و تنبیہ کمال شفقت کے ساتھ پائی جائے۔ کیونکہ مخاطب اس کے فدایان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

آداب رسالت و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک اور آیت نازل فرمائی

گئی ہے۔ جس میں کچھ زبان سے بولنا یا کہنا تو درکنار ہر ایسی بات جو حضور علیہ السلام کے مزاج معلّٰی پر بوجھ کا باعث بنے۔ مولا کریم نے مسلمانوں کے لئے وہ بھی ممنوع قرار دیدی ہے۔ چنانچہ سورۂ احزاب میں ارشاد ہوتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْكُمْ وَ اللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ یعنی اے ایمان والو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں نہ داخل ہو مگر یہ کہ تم کسی کھانے پر بلائے جاؤ۔ باتوں میں دل نہ لگاؤ کیونکہ تمہارا یہ فعل ہمارے محبوب کو تکلیف دیتا ہے۔ وہ تم سے حیا کرتے ہیں اللہ تعالےٰ حق فرمانے سے نہیں شرماتا۔

اس آیت کا شانِ نزول امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے زینب بنت جحش سے نکاح کیا تو طعام ولیمہ تیار کرایا۔ اور صحابہ کرام کو طلب فرمایا۔ ان میں سے ایک ایک گروہ آتا اور کھانا کھا کر چلا جاتا جب سب کھا کر فارغ ہو گئے تو حضرت انس نے عرض کیا کہ اب کیا ارشاد ہے۔ فرمایا کھانا بڑھا دو۔ چنانچہ کھانا بڑھا دیا گیا۔ اور دو تین آدمی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ حضور علیہ السلام خود اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ یہ آدمی بھی چلے جائیں۔ اور آپ ازواج مطہرات کے حجروں کی جانب تشریف لے گئے اور ہر حرم کے حجرہ پر پہنچکر فرماتے السلام علیکم یا اہل البیت ورحمۃ اللہ آگے سے جواب عرض ہوتا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ فرمایئے آپنے اپنے اہل کو کیسا پایا۔ اللہ تعالےٰ مبارک کرے۔ تمام حجروں سے ہو کر پھر آپ تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ دو تین آدمی ابھی بھی بیٹھے ہیں آپ نہایت باحیا تھے انکو کچھ نہ فرمایا۔ اور پھر واپس ہو کر حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کا رخ فرمایا

لیکن پیچھے سے آپکو اطلاع پہنچی کہ وہ اشخاص چلے گئے ہیں آپ واپس تشریف لے آئے۔ اور ایک پاؤں دروازے کے اندر رکھا۔ اور حجاب ڈالدیا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی سی اذیت قلبی بھی باریتعالےٰ کو منظور نہیں کہ بلائے ہوئے دوست اور مہمان کھانا کھانے کے بعد باتوں میں لگ جائیں۔ اور محبوب پران کا بیٹھنا تنگی پیدا کرے۔ فوراً حکم آگیا کہ کھانا کھاکر فوراً اجازت مانگ لیا کرو۔ تمہارے باتوں میں لگ جانے سے ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوتی ہے۔

ایسا ہی ایک لطیف اشارہ سورہ توبہ میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔
مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ ط یعنی مدینہ والوں اور اس کے اردگرد رہنے والوں کو جائز نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیں۔ اور اپنی جانوں کے تحفظ کی جانب راغب ہوں۔ تفسیر احمدی میں ہے کہ ابو خثیمہ رضی اللہ عنہ حضور کی ہمراہی سے رہ گئے تھے۔ اور مجاہدین کے چلے جانے کے بعد یہ اپنے باغ میں گئے۔ آپ کی حسین وجمیل بیوی نے فرش بچھایا۔ عمدہ کھجوریں پیش کیں۔ ٹھنڈا پانی حاضر کیا۔ آپ نے سب اشیاء دیکھ کر فرمایا گو سایہ گنجان۔ کھجوریں پختہ۔ آب سرد۔ بیوی حسین۔ سب کچھ موجود ہے۔ لیکن اگر حضور علیہ السلام دھوپ اور کڑکتی لو میں ہوں تو یہ اچھا نہیں کہ میں یہاں آرام کروں۔

خیال آتے ہی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ناقہ کسا۔ تلوار حمائل کی نیزہ اٹھایا اور تیز ہوا کی طرح روانہ ہوئے اور حضور علیہ السلام کو راستے میں ہی جا لیا۔

ادھر حضور علیہ السلام نے بھی راہ کی جانب نظر اٹھائی اور دیکھا کہ

ایک تیز رفتار سوار آرہا ہے۔ دیکھ کر بطور تمنا فرمایا کہ کیا اچھا ہو یہ سوار ابو خثیمہ ہو۔ پھر جب قریب آئے اور حضور علیہ السلام نے ان کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور ان کے حق میں طلب مغفرت فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ جملہ آیاتِ قرآنیہ سے روز روشن کی طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرکار انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق الٰہی سے اعلیٰ وبالا اور افضل واکرم ہیں اور بعد از خدا بزرگ توئی کا صحیح استحقاق حضور ہی کو حاصل ہے۔ جیسا کہ حضرت سراج الامت امام ہمام سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

وَاللّٰہُ یَا یٰسِیْنَ مِثْلُکَ لَمْ یَکُنْ
فِی الْعٰلَمِیْنَ وَحَقُّ مَنْ اَنْبَاکَ

یعنی خدا کی قسم تمام مخلوق الٰہیہ میں آپ جیسا نہ کوئی ہوا ہے نہ ہوگا اور قسم ہے اس کے حق کی جس نے آپ پر قرآن اتارا ہے بے شک آپکی ذات بابرکات بے مثل و بے مانند ہے۔ اور جہان بھر میں نہ کوئی آپ کا عدیل ہے نہ مثیل آپ اشرف المخلوقات اور اکمل المکنونات پیدا فرمائے گئے ہیں۔

بخاری شریف میں خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ایکم مثلی اور دوسری حدیث میں ارشاد ہوتا ہے لَسْتُ مِثْلَکُمْ یعنی تم میں میری مانند کون ہے۔ اور میں تمہاری مثل نہیں ہوں۔ پھر ایک تیسری حدیث شریف میں ہے لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ یعنی میں تمہاری ہیئت پر بھی نہیں ہوں۔

ان ارشادات کے بعد کونسا ایماندار ہے جو یہ کہنے کی جرأت کرے کہ آپ میری مثل ہیں۔ اور اگر ایسا کہنا جائز رکھتا ہے تو اس کو ایمان

کی فکر کرنی چاہئے جبکی مثل ساری کائنات میں پیدا نہیں فرمائی گئی ایک لا یعقل حیوان ناطق کو اس دعوے میں کہاں تک صادق سمجھا جا سکتا ہے ۔

عظمتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ؕ

ترجمہ: وہ خدا ہے جس نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کے ساتھ روانہ فرمایا۔ اور دین حق کیساتھ تاکہ اس کے دین کو سب دینوں پر غالب فرمائے اور کافی ہے اللہ تعالٰے گواہی دینے والا۔

عظیم انسانوں کی عظمت پر اہل دنیا کا ایمان لے آنا ایک مسلمہ امر ہے جہاں کی ہر ہستی اپنے اپنے خیال کے مطابق مظاہر عظمت کی زنگارنگ پرستاریاں کرتی ہے۔ لیکن مظاہر عظمت کا تخیل قطعاً جداگانہ ہے۔ جس میں کبھی بھی مشابہت نہیں ہوئی۔ ہر فرد اور ہر گروہ اپنا اپنا ذوق اور اپنی اپنی نظر رکھتا ہے۔ حکومت و حکمرانی میں عظمت ہے جس پر بادشاہ و حکام ایمان لاتے ہیں۔ اور شہرت کے بھوکے اس کی عبادت کرتے ہیں۔ طماع اور حریص اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ مال و دولت میں عظمت ہے دولتمند اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور دل و دماغ کے ساتھ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اسی طرح اہل علم و حکمت کی بھی ایک عظمت ہے۔ اور ان کے پجاری بھی موجود ہیں۔ حسن میں بھی عظمت ہے۔ اور اسکے پرستاروں کی بھی کمی نہیں۔ طاقت جسمانی میں بھی عظمت ہے۔ جس کے سامنے اکثر ضعیفوں اور کمزوروں کے سر جھکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ کوئی فن اور صفت ایسی نہیں جس

میں عظمت نہ ہو۔ اور اس کے معتقد اور پرستار بھی نہ ملتے ہوں۔
شاید کوئی بھی اس مبہم اور مضطرب مفہوم کی تحدید نہیں کر سکتا جس کا نام لوگوں نے عظمت رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ قدیم سے دنیا کے لئے ایک بڑا فتنہ رہا ہے۔ ہر شخص اس کو غرض وغایت قرار دیتا ہے۔ اس کے لئے جد وجہد کرتا ہے۔ اور اس کو انسانوں کے مراتب تولنے کی میزان سمجھتا ہے۔
اگر عظمت کا فتنہ اور عظماء کی پرستش موجود نہ ہوتی تو انبیاء کرام علیہم السلام کے ذکر پر کسی کے لئے روا نہ ہوتا کہ انہیں عظیم قرار دینے کی بحث کرے۔ اس لئے کہ انبیاء مرسلین علیہم السلام کی شان اس سے بہت ارفع واعلیٰ ہے۔ کہ انسانی عظمت کی تمام صفوں میں انکی جگہ ڈھونڈھی جائے کیونکہ یہ صفیں جسمانی کبریائی کے فریبوں اور مادی برائیوں کی ضلالت اندیشیوں سے اس درجہ پست ہو چکی ہیں کہ انسانیت اعلیٰ کے مظاہر علو ورفعت کیلئے ان کی طرف نظر بھی نہیں اٹھائی جا سکتی۔
پھر ہادئ سُبُل مولائے کل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو مقام رفعت اور بھی بلند ہے جبکی ذات اعظم واکمل نے اس کے سوا کچھ بھی قبول نہیں فرمایا۔ کہ تمام انسان کنگھی کے دندانوں کیطرح بالکل برابر ہو جائیں۔ نہ عربی کو عجمی پر اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی امتیاز ہو۔ انہوں نے یہ فتوے بھی دیدیا۔ کہ سب آدمی ہم مرتبہ ہیں اور سب آدم کی اولاد ہیں۔ انکی عظیم اور غیر عظیم دو قسمیں ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ آپ اس ارضی عظمت پر کبھی متوجہ نہیں ہوئے۔ جس کے فتنہ نے اہل دنیا کو مفتون بنا رکھا ہے۔ اس لئے کہ یہ عظمت درحقیقت بلند نفس۔ انسانوں کے لئے ذلت اور رب العلمین کی جناب میں شرک ہے۔ حضور علیہ السلام عظماء کی پرستش کے لئے دنیا میں تشریف نہیں لائے تھے۔ اور نہ ہی ایک نبی اکمل کی یہ شان ہو سکتی ہے۔ دنیا

خواہ بھاری کی ساری ہی عظیم شخصیتوں کی پجاری نظر آئے. حضور نے انسانی ساخت کی یہ عظمت کسی بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی تسلیم نہیں فرمائی اور نہ اپنی ذات ہی کے لئے پسند کی۔ حالانکہ وہ حضور علیہ السلام کے اپنے اختیار میں تھی۔ ایک عظمت نہیں ایسی ہزاروں عظمتیں جن پر اہل دنیا مرتے رہے حضور علیہ السلام کے سامنے آئیں۔ قدمبوس ہوئیں مگر سرکار نے کسی ایک پر بھی اظہار رغبت نہ فرمایا۔ اور منہ پھیر لیا۔ مولا کریم جلشانہٗ نے اختیار دیا کہ عبدیت کے ساتھ نبوت پسند فرمائیں۔ یا بادشاہت کے ساتھ نبی ہوں کائنات کے خزانوں کی کنجیاں سامنے ڈالدی گئیں۔ تاج و تخت کی ساری شوکتیں جمع کر کے مختار فرمایا گیا۔ مگر حضور نے عبدیت پسند فرمائی اور غربت کو اختیار کیا۔ اس لئے کہ آپکی ذات پاک و مقدس کی خوشی اس میں تھی کہ فقیری میں زندہ رہیں۔ فقیری میں آخری وقت دنیا سے تشریف لیجائیں اور فقیروں ہی کے زمرے میں حشر و نشر ہو۔

جو لوگ بادشاہت اور اسکی عظمت کے پجاری ہیں وہ دیکھ سکتے ہیں کہ سرکار دو عالم۔ نبی مکرم فخر بنی آدم و آدم۔ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو بادشاہ تھے اور نہ انہوں نے بادشاہ ہونا پسند فرمایا۔ آپ دنیا کے مال و دولت سے تہی دست تھے۔ اور انکی ابدی دولتوں کا خزانہ فقر و فاقہ تھا۔ جو لوگ دنیا کے عظیم سپہ سالاروں اور فاتحوں کے جاہ و جلال کے لئے نگاہ ادب اور دل عظمت سرار کھتے ہیں۔ یا دنیا کے فلاسفروں اور موجدوں کی عظمتوں کے آشنا اور پرستار ہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ کے رسول و محبوب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی فاتحانہ جنگیں وہ نہ تھیں جن میں بادشاہوں کی طرح وہ بھی کبر و غرور کا مجسمہ نظر آتے۔ اور نہ ان کے لئے یہ لکھنا تعجب میں ڈالتا ہے کہ وہ امی تھے کیونکہ دنیا کا صناعی لکھنا پڑھنا نہ تو انہوں نے سیکھا تھا اور نہ کسی نے انہیں سکھانے کی جرأت کی تھی۔ بلکہ انکی تعلیم کا کالج صرف خداوند

قادر مطلق کا دربار تھا۔

ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اس سوال کا جواب کہ کیا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بھی مادی یادگار چھوڑی جو مصر کے اہرام کی سی عظمت رکھتی ہو یا کوئی شہر بسایا جسکی عظمت قسطنطنیہ کے برابر ہو یا انکی تعریفیں کہیں سنگی لاٹوں (پتھریلے میناروں) پر کندہ پائی گئیں۔ ایک ہی ہے کہ ہرگز نہیں۔ نہ کوئی شہر ان کے نام نامی و اسم گرامی پر آباد نظر آتا ہے۔ اور نہ کوئی سڑک موسوم دیتی ہے ہزار و بادشاہوں کے ناموں پر شہر آباد دیکھے گئے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک پر۔ ایک بالشت زمین بھی کہیں نہیں پکاری گئی۔ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیالی اور فانی عظمتیں رکھنے والوں میں سے نہ تھے۔ ان کی تاریخ لکھنے والوں کو ان کی عظمت ان حقیر مظاہر عظمت میں تلاش نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ حضور علیہ السلام کی عظمت کے ڈھونڈھنے والے انسان کو اگر انکی عظمت معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ تو اسکو آپ کی عظمت صرف ایک کلمہ میں مل سکتی ہے جو وہ لائے تھے۔ اور اسی میں انکی پوری عظمت قائم بھی ہے۔ اور وہ کلمہ ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

مال و دولت کی عظمت۔ جاہ و حشمت کی عظمت۔ حکومت و سلطنت کی عظمت۔ علوم و فنون کی عظمت۔ غرضیکہ ہر طرح کے دنیوی اعزاز کی عظمتیں ملکر بھی اس عظمت کو نہیں پہنچ سکتیں۔ جو لا الٰہ الا اللہ میں پنہاں اور مضمر ہے۔ نہ دنیا کے تمام قارون۔ تمام سکندر۔ تمام ارسطو تمام بادشاہ اور تمام فلاسفر اس ایک کلمہ طیبہ کی عظمت کے سامنے کوئی وقعت رکھتے ہیں۔ اور نہ اسکی عظمت کے سامنے انکی فانی عظمتوں کی کوئی حقیقت ہو سکتی ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے۔ اور

یہی کلمہ اہل دنیا کے آگے پیش فرمایا مگر دنیا اسکی قدر نہ پہچان سکی. مخالفانہ آوازے کسے. تلواریں سونتیں. بھالے اور نیزے تانے. توپوں اور تیر وتفنگ سے اسکی حقیقت کا مقابلہ کرنا چاہا۔ مگر یہ ایک کلمہ تھا جو ساری دنیا سے ٹکرایا اور اس میں زلزلہ پیدا کردیا. نتیجہ یہ ہوا. کہ اہل دنیا مٹ گئے مگر وہ کلمہ ابدی طور پر دنیا میں باقی رہا. اور اپنی ناممکن التسخیر قوت قاہرہ سے اپنا راستہ بناتا رہا جس سے اس کی سرحدی اور آن مرٹ عظمت اب بھی باقی ہے. جوں جوں کفر نے اس کے مٹانے کے لئے اس کو جنگی دعوتیں دیں. توں توں یہ بھی میدان میں ڈٹ جانے والا ثابت ہوتا رہا۔ اور اس نے وہ جنگیں لڑیں جن میں اس کو آجتک کبھی شکست نہیں ہوئی اور اس کی یہ جنگیں جسم وآلات اور خون ریزی کی آرزومند جنگیں نہ تھیں. بلکہ اس کی جنگیں ہمیشہ حقیقت ومعنی اور زندگی کی جنگیں تھیں. اگر یہ دنیا کے پرستاروں کی طرح دنیا میں جنگوں کا سلسلہ لیکر آتا. تو اس کے لئے بھی قیام ودوام نہ ہوتا۔ آخر اہل جہان کو کہنا پڑا۔ شعر

مٹ گئے مٹتے ہیں. مٹ جائیں گے اعدا تیرے
نہ مٹا ہے نہ مٹیگا کبھی چرچا تیرا

سرور کائنات مختار شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ایک اُس رہنما کی حیثیت سے تشریف لائے جو صرف اہل دنیا کو یہ بتانے کے لئے تشریف لایا کرتا ہے. کہ اپنے آپکو خدا کا بنا کر عذاب الیم سے بچاؤ. اور زندگی مشیت ایزدی کے ماتحت گذارو. لیکن جہان والوں نے انکو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا. اور نفسانیت کے آئینہ میں اس کے مقدس مقصد اور اس کے پاکیزہ مشن پر شبہ کیا. کہ یہ دنیا کے لیڈروں کی طرح ہمیں اپنی اغراض پرستی کے ماتحت اڈے لگانا چاہتا ہے. مگر وہ آئینۂ انوار الٰہی وہ تھا جس میں ہر دیکھنے والے نے اپنا چہرہ اور اپنی

ہی شکل کے خدوخال دیکھے۔ ابوجہل کو حبشی سیاہ، فام کیطرح اس آئینہ سے اپنا چہرہ نظر آیا۔ اور صدیق اکبر کو اپنا۔ ایک ثالث بالخیر دیکھنے والی آنکھ نے محققانہ ٹوہ لگائی اور کہا۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ حق ہے یا باطل، اگر یہ کلمہ باطل ہے (حالانکہ وہ باطل نہیں) تو عالم وجود سے اسی طرح محو ہو جائیگا۔ جس طرح تمام باطل کلمے اور غلط نظریات محو ہو گئے۔ علم حق اور عقل سلیم کی روشنی اس کو اسی طرح ملیامیٹ کر دیگی جبطرح طلوع آفتاب کے ساتھ ہی ظلمت شب کافور ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ کلمہ طیبہ حق ہے (حالانکہ وہ حق ہے) تو علم حق اور عقل صادق کے انوار اس کے لئے اس دنیا میں اور بھی زیادہ کشادہ راستے کھول دینگے۔ تاکہ وہ تمام جہان پر چھا جائے۔ مشرق و مغرب پر قبضہ کرے۔ اور تمام دلوں میں اتر جائے۔ کالے، گورے۔ امیر غریب عربی عجمی۔ عالم جاہل۔ سب اس کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔

الغرض وہ دن ضرور آنیوالا ہے۔ جب صرف علم حق ہی کی سلطنت ہو گی۔ جاہلوں کی جہالت۔ حاسدوں کا حسد متعصبوں کا تعصب۔ وہم پرستوں کے اوہام۔ مدعیان علم باطل کے ظنون سب کے سب نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اور صرف ایک عقل صادق و فہم حقیقت اندیش ہی حکمران ہو گی۔ حق باطل سے جدا ہو جائیگا۔ اور طیب و خبیث میں اشتباہ باقی نہ رہیگا۔ صرف وہی تعلیم انسانیت کے سامنے آنے کی جرأت کر سکیگی جو کارساز فطرت کی حقیقی تعلیم ہو گی۔

حق و باطل کا فیصلہ نہ صلیبوں کی تلواریں کر سکیں گی۔ نہ مجاہدین کی شمشیریں۔ نہ پادریوں کی تبلیغی مشنیں اور نہ پیشوایانِ مذاہب کے خودساختہ دعوے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ حقیقت شناسی کے میدان میں نام نہاد علم و دانش کی روشن خیالیاں اور مقدس جمود و تقلید کی راسخ الاعتقادیاں بھی فضائی

ٹھیرے نمود سے زیادہ حیثیت نہیں رکھیں گی۔ یہ سب کچھ محض ایک غوغا ہے جو علم حق کا نعرہ بلند ہوتے ہی سکون موت میں تبدیل ہو جائیگا۔ اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی کامل فتح مندی بناوٹی علم و عقل کے بندھن توڑ کر جہل و غرور کی تمام چٹانوں کو پاش پاش کر دیگی۔ اور جہان والوں کی آنکھوں پر سے جہل و اوہام کے کثیف پردے اٹھ جائیں گے۔ خداوند عالم حق و باطل میں فیصلہ فرمائیگا اور کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ زمین کی خشکیوں اور تریوں پر سربلند چلیگا۔ ان کے سامنے ہر عظمت زائل ہو جائیگی اور ہر عظمت کا مدعی ہلاکت کی تاریکیوں میں گم ہو جائیگا۔ کیونکہ کلمہ لاالٰہ الا اللہ ہی ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ وہی اس جہان فانی کی تنہا ابدیت ہے۔ جو نہ کبھی زائل ہو گا نہ ہلاک۔ کیونکہ اس کی بنیاد حق ہے۔ اور وہ ایک ایسی عظمت ہے جس کا ستون الوہیت ہے۔ لہذا اسے الوہیت کا خلود اور ابدیت حاصل ہے۔ زمین بدل جائے۔ آسمان بدل جائے۔ نظام کون و مکاں بدل جائے۔ فلسفے مٹ جائیں۔ دانائیاں غائب ہو جائیں۔ مگر کلمہ لا الٰہ الا اللہ باقی ہے اور رہیگا۔ جبپر ہر طرف سے اشہد ان محمد رسول اللہ کی گواہی ثبت ہو گی۔ اور یہی وہ عظمت ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ جل و علا شانہٗ کی حی و قیوم ذات حی و قیوم ہے تبتک کلمہ طیبہ اور سید الانبیاءؐ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بھی لازوال اور انمٹ ہے۔

وصلی اللہ علی حبیبہ محمد و آلہ واصحابہ وسلم ؛

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شب اسریٰ

مسئلہ معراج قرآن پاک سے ثابت ہے۔ اور سورۂ اسریٰ کے شروع ہی میں ارشاد باری تعالےٰ ہے:۔

"سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ"

(ترجمہ:۔ پاک ذات ہے وہ اللہ جو اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو راتوں رات مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ سے مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک لے گیا۔ جس کے گرد اگرد ہم نے برکت عطا کر رکھی ہے تاکہ ہم اس کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلائیں۔ بےشک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔)

واضح ہو کہ "سبحٰن" میں اختلاف ہے۔ کہ یہ لفظ عربی علم صرف کی راہ سے کیا صیغہ ہے۔ بعض نے اس کو علم بھی گمان کیا ہے۔ اور وجہ اس کی "الذی" کی جانب صفت کی نظر کرکے ہے۔ اور بعض علمار کرام نے کہا ہے کہ "سبحٰن" باب تفعیل کا مصدر بھی آتا ہے۔ اور اسم مصدر بھی ہوتا ہے۔ اور ہر حال میں وہ علم جنسی واسطے تنزیہ و تقدیس کے ہے۔ اور مراد اس سے ہر نقص و برائی سے اظہار پاکیزگی اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہ نہیں کہ پاک کرنے سے اس میں پاکیزگی ہو۔ شیخ سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا مراد یہ ہے۔ کہ جن کلمات سے بندے سے تسبیح واقع ہوتی ہے

ان کا علم ہے۔ بالجملہ یہ لفظ کمال پاکیزگی بدرجۂ انتہا پر دلالت کرنے سے فقط اللہ تعالیٰ کے واسطے مخصوص ہو گیا ہے۔ تو ترجمہ یوں ہوا سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ "پاک ہے۔ وہ جو لے گیا اپنے بندے کو۔" اسریٰ اول شب یا شب کی رفتار کو کہتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ رات میں لیجانے کے ہیں۔ زجاج رحمتہ اللہ علیہ نے "اسریٰ" بمعنی سیر لیا ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہوا "بعبدہٖ" علماء امت کا اس میں اجماع ہے۔ اور کسی فرقہ یا فرد کا اختلاف نہیں کہ اس مقام پر "عبد" سے مراد سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اہل علم نے فرمایا کہ عبودیت اعلیٰ مقام ہے۔ کیونکہ اگر عبد سے زیادہ مکرم کوئی اہم ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس مقام پر وہ ارشاد فرماتے پس رسول و نبی سے زیادہ اشرف یہاں عبد کو فرمایا۔ اہل الحق یعنی اولیاء اللہ و مشائخین نے اسپر بالاتفاق تصریح فرمائی ہے۔ کہ الوہیت و ربوبیت میں یکتا ذات اللہ واحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ اور عبودیت میں ذات بابرکات سید کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اور آپ کے بعد تمام انبیاء ہیں۔ پس انبیاء میں سے بھی جسکی عبودیت میں باقی سب سے کم نقص ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسرے درجہ پر ہے اور ظاہراً وہ بقول اہل اللہ ابراہیم علیہ السلام ہیں و اللہ تعالیٰ اعلم اسی طرح درجہ بدرجہ مراتب انبیاء ہیں۔ مشائخین فرماتے ہیں کہ ہر زمانہ میں ایک ولی عبودیت میں بقدم آنحضرت سردار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے۔ اس کو قطب و غوث پکارا جاتا ہے۔ اور باقی اولیاء اللہ دیگر انبیاء کرام علیہم التحیۃ والسلام کے قدم پر ہوتے ہیں۔ وہ تمام کم اس ایک غوث کے تابع ہوتے ہیں۔ منجملہ مرتبہ عبودیت نہایت اعلیٰ مرتبہ ہے:

لیلاً۔ (رات میں) بطریق تجرید یا توضیح ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ اپنے

پاؤں سے چلا۔ یا منہ سے بات کرو۔ حالانکہ چلنا ہمیشہ پاؤں سے ہی ہوتا ہے۔ اور بات کرنا منہ سے۔ لَیلًا کو نکرہ فرمایا کہ اسی سے تقلیل کا فائدہ پہنچے۔ یعنی فرمایا کہ پوری رات بھر نہیں بلکہ رات کی تھوڑی سی مدت میں یہ واقعہ ہوا۔ کوئی اس کو تمام رات کی سیر نہ سمجھ لے۔ اور صاحب کشاف نے اس کی تائید میں قرأت بعض سلف کی پیش کی ہے۔ جنہوں نے لَیلًا کی بجائے مِنَ اللَّیل پڑھا۔ یعنی رات کے تھوڑے حصّہ میں واقعہ معراج ہوا۔ مِنَ الْمَسْجِدِ الحرام: مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ اور اس کے اردگرد کی جگہ (جو حرم میں داخل ہے) سے اِلَی الْمَسْجِدِ الاقصٰی: مسجد اقصیٰ تک جسے بیت المقدس بھی کہا جاتا ہے۔ یہ انبیاء کرام سابقین علیہ السلام کا قبلہ ہے۔ اہل کتاب اس کو ہیکل کہتے ہیں۔ یہ مسجد یروشلم ملک فلسطین میں حضرت سلیمان علیہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تخمینًا پانچ سو برس بعد تعمیر کی تھی۔ جس پر بنی اسرائیل کی شرارتوں سے کئی بار صدمے آئے۔ اور گرائی گئی۔ پھر بنائی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد معدلت مہد میں شہزادہ روم طیطس کی گرائی ہوئی مسجد کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ مسجد اس جگہ کا نام ہے جہاں ایک مرتبہ عمارت عبادتگاہ تعمیر ہو چکی تھی۔ عمارت کا نام مسجد نہیں ہوا۔ کیونکہ عمارت بدلتی رہتی ہے۔ مسجد نہیں بدلتی۔ مگر اس کے پاس پاس عیسائیوں نے مذہبی عمارات تعمیر کر رکھی تھیں۔ اس زمانہ میں انکو بھی بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کہتے تھے۔ جنکے نشان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی دریافت پر بیان فرمائے تھے۔ بعض اہل لغت نے اقصیٰ کے معنی آگے سے آگے کے بھی کئے ہیں۔ جس سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلندی وانتہائے سفر معلوم ہوتی ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مقام پر تشریف لے گئے جو آگے سے آگے تھا۔ جہاں تک رب العزت نے

چاہا اور جس کا اور اک محال ہے پھر مسجد اقصیٰ کی تعریف فرمائی گئی۔
اَلَّذِی بَارَکْنَا حَوْلَہٗ ۔ جس کے گرد ہمنے برکت وی ہے۔ اس برکت
کی پوری کیفیت تو علم الہٰی عزوجل میں ہے۔ مگر ظاہری برکات کی نسبت
تو خازن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دریاؤں۔ نہروں باغوں سے تمام علاقہ
سرسبز و شاداب ہے۔ اور باطنی برکات یہ ہیں کہ تمام انبیاء علیہ السلام
کا قبلہ ہونے کے علاوہ مزارات انبیاء و صالحین سے بھی پُر ہے۔ اور اسی
طرف قیامت کو خلائق کا حشر ہوگا۔ ایک حدیث شریف میں ہے
مبارک ہو شام کو ستر ہزار فرشتے ہر روز اس پر سایہ کرتے ہیں۔ اور اس
میں نماز کا ثواب پچاس ہزار نماز ہے۔ جیسے پچاس ہزار نماز کا ثواب مدینہ
طیبہ کی مسجد نبوی میں ہے۔ پھر اسریٰ کے فوائد میں سے بعض پر تشریح
فرمائی۔
لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیَاتِنَا تاکہ ہم اپنے بندے کو اپنی نشانیاں دکھلائیں۔
لیکن ہماری قدرت و عظمت میں وہ نشانیاں بھی تھوڑی ہیں۔ اس لئے
مِنْ تبعیضیہ سے فرمایا کہ بعض نشانیاں دکھلائیں۔
اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔ بیشک وہی سمیع اور بصیر ہے۔ بعض نے کہا
کہ ضمیرہٗ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اور شیخ عکبری نے تمیان میں نقل
کیا ہے۔ کہ ضمیر واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہے اور یہ مستحسن
ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سننے والا اور دیکھنے والا ہونا
مدح اور لیاقت معراج پر دال ہے۔ یعنی ایسے بندے کو یہ عروج دیا
جس کو اپنی قدرت کاملہ سے اس لائق فرمایا کہ وہ سمیع سماع خطاب کے
لائق تھا۔ اور آیات الہٰی کو ظاہری آنکھوں سے دیکھنے والا تھا۔ یہی وجہ ہے
کہ دوسرا کوئی بندہ اس مرتبہ کو نہ پاسکا۔ اور آپکی نبوت تامہ کے لئے جو
تمام زمانہ کے لئے ہو۔ ایسا ہی ہونا ضروری تھا بعض علماء نے فرمایا کہ

سمیع منکروں کے بیہودہ سوالات پر تہدید کے لئے آیا ۔ اور بصیر اس عجیب ترین سمیر میں حضرت کی نگھبانی کے لئے آیا ہے۔ یعنی جس قدر کا جو سفر تھا۔ وہ اللہ کی نگھبانی میں تھا۔ جیسے مسافر کو کہا جاتا ہے۔ اللہ تیرا نگھبان ہے۔ ایسے ہی یہاں اسم بصیر آیا ہے۔

اسی آیت مبارکہ میں اللہ کریم تبارک تعالیٰ نے اس عظیم الشان واقعہ معراج کا ذکر فرمایا ہے۔ جو اپنی نوعیت اور افضلیت کے لحاظ سے ہمارے حضور نبی الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ممتاز معجزہ ہے قبل اس کے کہ اس آیت کے مختلف پہلوؤں پہ ایک تحقیقی بحث کیجائے یہ ضروری ہے کہ قارئین کرام حقیقت معجزہ سے بھی روشناس کر دیئے جائیں

حقیقت معجزہ معجزہ وہ خلاف عادت عمل ہے۔ جو کسی نبی کے صدق کی دلیل ہو۔ اور اس کے تبلیغی اصولوں میں سے کسی اصل کے منافی نہ ہو۔ جو چیز کہ خلاف عادت اور خلاف قانون قدرت کسی شخص سے سرزد ہو تو اس کو خارق عادت کہتے ہیں۔ مثلاً عادت یوں جاری ہے کہ بھوک پیاس کھانے پینے سے دور ہوتی ہے۔ درخت اور پتھر اور حیوانات۔ گائے بھینس اونٹ گدھا وغیرہ انسان سے کلام نہیں کرتے۔ کوئی درخت یا پتھر کسی کے بلانے سے بحرکت ارادیہ نہیں آسکتا وغیرہ وغیرہ۔ پس جو کوئی ایسا کردے تو یہ کام اس کا خارق عادت ہوگا۔ اب یہاں سے یہ بات ظاہر ہوگئی جو کام بذریعہ آلات و اسباب ہوں خواہ وہ اسباب مخفی ہوں یا ظاہر۔ جیسے دوا سے بیمار کا تندرست ہونا کشتی سے دریا عبور کرنا خارق عادت نہیں پھر یہ خارق عادت اگر مدعی نبوت سے ظاہر ہو تو اس کو معجزہ کہتے ہیں کہ مخالف کو اسکی مثل پیش کرنے سے عاجز کردیتا ہے۔ اگر یہ خارق عادت نبی کے پیرو سے ثابت و

صادر ہو۔ اگر وہ ولی ہے تو اُسکو کرامت۔ اگر غیر ولی مومن صالح سے صادر ہو تو اس کو معاونت۔ نبوت سے قبل سرزد ہو تو ارہاص اور اگر کسی بُرے شخص سے صادر ہو تو اس کو استدراج کہتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ خدا کی رحمت عامہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ نبی کے ذریعہ اپنی مخلوق کو اپنے راز سے بہرہ مند کرے اور اس سے عام لوگوں کو نفع پہنچائے۔ طبیعت سلیم رکھنے والے تو نبی کو اس طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح بچہ بغیر کسی کے کہے سنے اور رغبت دلائے کے ماں باپ کو جان جاتا ہے۔ پس جو ہستی مبدءِ ولادت میں بچہ کو ماں کی چھاتیاں بتلا دیتی ہے وہی لوگوں کو مربی روحانی (نبی) کی خبر دیتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جنگی طبیعت میں کچھ کجی ہوتی ہے۔ بغیر کسی علامت دیکھنے کے تصدیق نہیں کرتے۔ جیسا کہ بعض بیمار دوا اکثر بغیر شیرینی ملا کے نہیں پی سکتے۔ پس جس طرح مہربان طبیب اس میں شیرینی ملا دیتا ہے۔ تاکہ مریض اپنی صحت کے لئے دوا کو قبول کرے اسی طرح وہ حکیم و رحیم خود بھی نبی کے ہاتھ کوئی امر خارق عادت جسے معجزہ کہتے ہیں۔ اُن کی تصدیق کے لئے صادر کرتا ہے۔ اور اس معجزہ سے بہت سے فوائد ظاہر کرنے مقصود ہوتے ہیں۔ مثلاً (۱) منکرین کو نبی کی تصدیق نصیب ہو جاتی ہے (۲) غالباً وہ معجزہ فی نفسہٖ کوئی خیر اور عام فائدہ کی چیز ہوتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی انگشتان مبارک سے پانی جاری کر کے ایک جم غفیر کو اس پانی سے سیراب کرنا۔ پھر لوگوں میں اس سے نور پیدا ہونا۔ وغیرہ وغیرہ۔

بعض فلسفیوں نے معجزہ کے متعلق بزور فلسفہ مخالف کلام کیا ہے۔ اور تاویلات رقیقہ کے ذریعہ سے قرآن اور مسلمانوں کی کتابوں سے استدلال کر کے انکار کی صورت نکالی ہے۔ جو سراسر ملمع کاری ہے پابند فلسفہ قدیمہ مسلمانوں میں ایک معتزلہ نامی فرقہ پیدا ہوا تھا۔ جن کے نزدیک قرآن

کی یہی بڑی خدمت تھی کہ وہ قرآن اور حدیث کو تاویلات کے ذریعہ سے فلسفہ یونانی کے موافق کیا کرتے تھے۔ اور جہاں موافقت نہ ہوسکتی تھی وہاں اس حدیث کا انکار کر دیتے تھے۔ یہ اس لئے کہ اس وقت کا فلسفہ ان کے نزدیک حق ثابت ہوگیا تھا۔ پھر ایسا کرنے سے اسلام فلسفہ کی ٹکر سے محفوظ رہتا تھا۔ ورنہ ان کے نزدیک چورچور ہو جاتا۔ جیسا کہ آجکل ہندوستان کے بھی بعض مسلمان فلسفہ حال کے مطابق وہی طرز اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مگر متقدمین اسلام نے جماعت معتزلہ کی تمام کوششوں کو بیکار جانا اور حقارت سے ٹھکرا دیا۔ جسکا نتیجہ آج سمجھ میں آرہا ہے۔ کہ انہوں نے خوب کیا تھا۔ کیونکہ جب پرانے فلسفہ کا آج کے نئے فلسفہ کی ٹکر سے چورا ہو گیا ہے۔ تو اس کے ساتھ اسلام کا بھی چورا ہو جاتا اس طرح موجودہ فلسفہ کا اگر آگے چلکر غلط ہونا ثابت ہوگیا۔ اور ہوگا اور ہوتا جاتا ہے، تو پھر اس کے مطابق اسلام کا کیا حشر ہوگا۔ لہٰذا معجزہ دوسرے معنوں میں بے ایمانوں کا ایمان ہے۔ اور یہ قوت قریبًا قریبًا تمام انبیاء علیہم السلام نے منکرین کے سامنے انکی طلب پر یا بلا طلب استعمال کی ہے۔ جس سے انکی دعوت کو زیادہ قلوب میں قبولیت کا موقعہ ملا۔ اور یہ حقیقت بھی معجزہ کے اظہار سے منکرین پر کھل گئی کہ رسالت کا مدعی رسول ہے۔ پس جس شخص نیک عادت ہادی سیرت نے نبوت کا دعوےٰ کرکے معجزہ دکھادیا خواہ اسی وقت یا بعد اس کے یا تعلیم امت کے یا اور وقت میں بلاشک وشبہ یہ بات ثابت ہو جائیگی کہ یہ شخص مدعی نبوت نبی ہے۔ الغرض عہدۂ نبوت کی تصدیق کے واسطے معجزہ فرمان خداوندی ہے۔ کہ جس کے دیکھتے ہی قلوب اس کی طرف اس طرح کھنچے آتے ہیں جسطرح لوہا مقناطیس کی طرف۔ اب جو شخص برخلاف مشاہدہ اس جذب مقناطیس کا انکار کرے وہ کج فہم ہی نہیں بلکہ ضدی ہے سرکار دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم سے بیشمار

معجزات اس غرض و غایت کے ماتحت ظہور میں آئے۔ جن میں سے جسمانیت کے معراج کا واقعہ حضور کی بزرگی و عظمت کا ایک اہم نشان ہے۔

اس معجزہ معراج کا تذکرہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر ستائیسویں پارہ کی سورۃ "النجم" کے شروع میں بھی آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خیالات مذکورہ آپ کے لئے کچھ اجنبیت رکھتے ہوں۔ مگر بہرحال میں یہ قابل غور ضرور ہیں۔ کیونکہ قرآن پاک کے قریب تر اور سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ اس مسئلہ کا مطالعہ محض واقعات و روایات کی بنا پر نہ کیا جائے۔ بلکہ معراج پر لیجانے والی ذات کے ارشاد ہی سے حقیقت کی منزل پر پہنچ کر بے معنی اعتراضات و خرافات سے نجات حاصل کیجائے۔ چونکہ اس واقعہ سے کمال عظمت و شان خداوندی اور منتہائے جمال نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے بعض عقل و نفس کے پجاری اور صرف محسوسات کو حدِّ ادراک سمجھنے والے اس پر زبان اعتراض کھول دیتے ہیں۔ حالانکہ واقع معراج میں کسی کو شک و شبہ نہیں۔ اور جمیع اہل اسلام ایمان رکھتے ہیں کہ معراج ہوئی اور ضرور ہوئی۔ مگر اختلاف اس امر پر ہے۔ کہ روحانی ہوئی یا جسمانی۔ خواب میں ہوئی یا بیداری میں۔ ایک بار جو اس ظاہری کے ساتھ ہوئی یا متعدد بار۔ لفظی اختلافات و تکرار احادیث اور ان کی تفاوت اور واقعات کے تنوع کی بنا پر بعض اصحاب نے یہ رائے قائم کرلی ہے۔ کہ معراج کا وقوع متعدد بار ہوا ہے۔ مگر یہ اصحاب احادیث میں تطابق نہ پیدا کر سکنے کے باعث معذور ہوگئے۔ کیونکہ متذکرہ معراج ایک ہی ہے۔ اور متنوع آیات و احادیث اس کی مختلف کیفیات کو بیان کرتی ہیں۔

مسئلہ معراج اور معترضین

صحیح مسلم شریف میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے
کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں مقام حجر میں اس حال کھڑا تھا
کہ قریش مجھ سے شب معراج کی سیر پوچھتے اور بیت المقدس کی بہت
سی چیزیں دریافت کرتے جاتے تھے۔ جن کو میں بوقت قیام بیت المقدس
محفوظ نہیں رکھ سکا تھا۔ جس سے مجھے کرب ہوا۔ پس اللہ تعالےٰ نے
بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا اور میں نے ہر اس سوال کا جواب
جو مجھ سے پوچھا گیا من وعن بیان فرما دیا۔ معترضین کو جب اپنے اعتراضات
کے جواب میں مجال دم زدن نہ رہی تو کہنے لگے کہ مسجد اقصیٰ کے اوصاف
وآثار تو آپ نے سب بیان فرما دیئے۔ اب ہمارے قافلوں کی جو
بیت المقدس کی طرف بغرض تجارت وغیرہ گئے ہیں خبر دیجئے۔ تو سرکار
دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے تین قافلے مجھے راہ
میں ملے۔ ایک تو روحا میں ملا۔ جو اپنا گم شدہ اونٹ ڈھونڈ رہا تھا۔
میں نے ان کے برتن سے پانی پیا تھا۔ جب وہ آئیں تو تم ان سے دریافت
کرنا کہ انہوں نے تلاش اونٹ سے واپس آکر اپنے برتن میں پانی پایا کہ
نہیں۔ اور دوسرا قافلہ مجھے ذی مردہ میں ملا تھا۔ دو آدمی اس کے ایک
اونٹ پر سوار تھے۔ کہ مرکب ان کا میرے مرکب سے بھڑکا۔ اور ان دونوں
میں سے ایک کا گر کر ہاتھ ٹوٹ گیا۔ اسی طرح کی ایک اور روایت میں ہے
کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب واپسی پر سوار ہی تشریف لا رہے تھے
ایک مقام پر ایک اور قافلہ ملا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں
کہ راہ میں ہمارا گذر قریش کے ایک قافلہ پر ہوا۔ جو اپنے اونٹوں پر

اناج لادے ہوئے آرہا تھا۔ ان میں ایک اونٹ پر دو بوریاں تھیں ایک کا رنگ سیاہ اور دوسری کا سفید تھا۔ جب میرا براق اس کے نزدیک پہنچا تو وہ بدکا اور چکرا کر منہ کے بل گرا جس سے اسکی گردن ٹوٹ گئی۔ اور تیسرے قافلے کو میں نے مقام تنعیم میں چھوڑا تھا۔ فلاں فلاں شخص ان میں کے خاکستری اونٹ پر سوار قافلہ کے آگے آگے چل رہے تھے۔ اور کل طلوع آفتاب تک یہاں آجائیگا۔ معترضین طلوع آفتاب کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔ کہ اگر سورج نکل آیا اور قافلہ نہ آیا۔ تو ہم حضور علیہ السلام کو منسوب بہ کذب کریں گے۔ کہ ناگہاں سورج نکلا۔ لوگوں نے دوڑ کر دیکھا۔ تو وہی قافلہ اردمکہ ہو رہا ہے۔ اور وہی دو شخص خاکی اونٹ پر سوار قافلہ کے آگے آگے چلے آرہے ہیں۔ پھر بعدہ ایسی بقیہ قافلوں کے حالات معلوم کئے گئے۔ سب نے حضور کی تصدیق فرمائی۔ اور بعینہٖ حضور علیہ السلام کا فرمودہ حال بیان کیا۔ مگر بعض مذبذبین اسپر بھی ایمان نہ لائے اور کہنے لگے۔ ھاھذا الا سحر مبین وجہ یہ تھی کہ انکی عقول پر جہالت اور گمراہی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس وجہ سے واقعہ معراج انکی سمجھ میں نہ آیا۔ برخلاف اس کے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عقل نور ایمان سے روشن اور منور تھی انہوں نے سنتے ہی تصدیق کی۔ پس جو اشخاص اب بھی ابوجہل کمرود کی طرح نافہم اور کور باطن ہیں وہ متبع ابوجہل بنکر انکار کر جاتے ہیں۔ اور جو تابع حضرت صدیق اکبر ہیں اور ایمان روشن رکھتے ہیں۔ وہ آج بھی بغیر تصدیق صادق نہیں رہ سکتے۔

زمانہ حاضرہ کے بعض اہل تحقیق نے لکھا ہے۔ کہ دراصل معراج نبوی ایک اعلیٰ درجہ کا کشف تھا۔ جو بیداری کے معنوں میں آجانا حقیقتاً ہو سکتا ہے۔ اور ایسے کشف کی حالت میں انسان ایک نکلی

جسم کے ساتھ حسب استعداد نفس ناطقہ اپنے کے آسمانوں کی سیر کرسکتا ہے. پس چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس ناطقہ کی استعداد نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اس لئے وہ اپنی ہر معراج میں عرش اعظم تک پہنچ گئے. دراصل یہ سیر انکشافی تھی۔ جو بیداری کے مشابہ ہوسکتی ہے. بلکہ اس کو ایک قسم کی بیداری سمجھنا چاہیئے. اس کا نام خواب نہیں رکھا جاسکتا. مگر یہ سیر اس جسم کثیف کے ساتھ بھی نہ تھی یہی تحقیق چودھویں صدی کے ایک نامور محقق اور قابل مورخ علامہ شبلی نعمانی مصنف سیرت النبیؐ کی ہے اسی طرح دیگر اہل تحقیق نے بھی صحت عقائد سے دور رہ کر وہ صریح ٹھوکریں کھائی ہیں. کہ جنکی حد نہیں ان کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی معراج چونتیس ہوئے ہیں۔ ان روحانی معراجوں میں تو کفار بھی معترض نہ نہ ہوئے۔ اس معراج میں کوئی خاص بات تھی کہ کفار مخالفت کرنے لگ گئے۔ اور دعویٰ معراج کو حیطۂ بشریت سے محال جان کر تکذیب کے درپے ہوگئے. معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خواب یا کسی ادنیٰ درجہ کے کشف کو ظاہر نہ فرما رہے تھے۔ ورنہ کافروں کو جھٹلانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیونکہ خواب میں ہر انسان عجائبات دیکھ سکتا ہے پھر ایسی حالت کس خصوصیت کی محتاج ہوتی ہے۔ اور اسکی عظمت و شان کیسی. قرآن کریم کا اس واقعہ کو بطور معجزہ مخالفین کے سامنے لانا. آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سینہ کا چیرا جانا. براق پر سوار ہونا. مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ امامت انبیاء کرانا سوالوں جوابوں کا ہونا. حضرت جبرائیل علیہ السلام کو انکی اصلی شکل میں دیکھنا سدرۃ المنتہیٰ میں دودھ کا پینا. پچاس نمازوں کے فرض ہونے پر موسیٰ علیہ السلام کی درخواست سے متواتر تخفیف کی گفتگو کرنا.

جنت و دوزخ کا ملاحظہ فرمانا۔ صبح مکہ میں کرنا۔ اس واقعہ کے اظہار بیان میں تامل و تردد سے کام لینا۔ پھر قریش کا تمسخر اڑانا۔ اور انکار و تعجب کرنا۔ بعض کمزور اعتقاد لوگوں کا اس واقعہ کا سنکر مرتد ہو جانا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اس واقعہ کی تصدیق پر صدیق کا لقب پانا۔ تمام صحابہ سلف و خلف کا معراج جسمانی پر اجماع ہونا۔ یہ سب امور جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ قطعی طور پر ثابت کرتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج شریف جسم و روح دونوں کے ساتھ تھا۔ اور عالم بیداری میں ہوا تھا۔ کیونکہ خواب کفار کے حق میں جب تک وارد نہ ہو۔ بطریق معجزہ نہیں ہوا کرتا۔ اور نہ شق صدر جسمانی، روحانی و انکشافی معراج کے لئے ضروری ہے۔ نہ روحانی و انکشافی پرواز محتاج براق تھی اور نہ نمازوں کی فرضیت کوئی خوابی فعل تھا۔ پھر ایسے اہم واقعہ کو جس کے ایک ایک جزو کا تعلق جسمانیت کا مقتضی ہے۔ بلاوجہ محض موجودہ سائنس و علوم سے مرعوب ہو کر بے جا تاویلات سے کام لینا۔ اور الفاظ قرآنی کے اصل مفہوم سے بلا دلیل شرعی ظاہر سے پھرنا ایک مومن کی شان سے بعید اور انتہائی درجہ کی ڈھٹائی ہے۔ چنانچہ حضرت محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں۔ کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسم شریف کے ساتھ ہوا ہے۔ اگر روح کیساتھ خواب یا نیند میں ہوتا تو کفار اس سے انکار نہ کرتے اور نہ جھگڑا کرتے۔ یہ جھگڑا محض اس لئے کیا تھا۔ کہ حضور علیہ السلام نے ان کو معراج جسمانی کی خبر دی تھی اور ان مقامات کی خبر دی تھی۔ جہاں جہاں آپ تشریف لے گئے تھے"!

بعض اہل عقل نے تو ایک نئی تنقیح اور نکالی ہے۔ کہ اسرائے بیت المقدس جسم مطہر کے ساتھ بیداری میں ہوا۔ اور اس سے

آگے صعود الی السماء انکشاف روحانی تھا۔ لیکن یہ ایک ہی سفر ہے۔ وقوع کے لحاظ سے دو جدا جدا امر نہیں ہیں۔ بعضوں کا کہنا کہ اسرائے بیت المقدس اور ہے اور معراج سماوی اور ہے اور سیر بیت المقدس جو قرآن کریم سے ثابت ہے۔ حالت بیداری و جسمانی میں ہوئی۔ مگر معراج سماوی روحانی صورت ہیں۔ کیونکہ بعض احادیث سے معراج سماوی میں سواری براق کا تذکرہ نہیں بلکہ یہ اسرائے بیت المقدس میں ہے۔
حقیقت یہ ہے۔ کہ جن احادیث میں سواری براق کا تذکرہ معراج سماوی کی نسبت نہیں ہے۔ وہ راویوں کی طرف سے بطریق اشتباہ یا اختصار بیان کی گئی ہیں۔ اور اسی پر محدثین متفق ہیں جیسے کہ بعض احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شب معراج میں تین پیالوں۔ دودھ اور شراب اور شہد کا پیش کیا جانا بیان ہوا ہے۔ اور بعض میں صرف دودھ اور شہد یا دودھ اور شراب کا تذکرہ ہے۔ اور بعض میں مقام انبیاء اور محل ملاقات میں ابراہیم علیہ اسلام کا چھٹے آسمان میں ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ اور بعض میں بیت المعمور کے ساتھ تکیہ لگائے ہوئے ساتویں آسمان میں مذکور ہوا ہے۔ تو یہ سب بسبب اشتباہ راویوں کے ہے نہ کہ اختلاف وقوع میں۔ جمہور محققین کا مذہب یہ ہے۔ کہ یہ واقعہ معراج بیداری میں حالت بدنی کے ساتھ ایک ہی بار ظہور میں آیا ہے۔ علیحدہ علیحدہ دو واقعات روحانی اور جسمانی نہیں ہیں۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ اسرائے بیت المقدس جسمانی بحالت بیداری اور معراج سماوی کشف روحانی تھی۔ تو اس کی وضاحت بھی کردی جاتی ہے۔ تاکہ معترضین کا اعتراض نہ رہے۔
چنانچہ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اشکال کو رجوا انبیاء علیہم السلام کو آسمانوں میں دیکھنے پر باوجود اس کے کہ بدن انکے قبروں میں ہیں لازم

آتا ہے) لکھکر جواب دیا ہے کہ ارواحیں انکی بدنوں کی صورت میں متشکل ہوئی تھیں یا ان کے بدن بمعہ ارواح حضرت کی ملاقات کو حاضر ہوئے تھے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا اس دنیا سے تشریف لیجانے کے بعد چلنا پھرنا احادیث سے ثابت ہے۔ اور وہ زندہ ہیں اللہ تعالےٰ نے زمین پر حرام فرمایا ہے۔ کہ ان کے بدنوں کو کھائے اور بدن ان کے ارواحوں کے مانند لطیف ہیں۔ پس ان کے ظہور کے لئے عالم ملک و ملکوت میں بوجہ کمال قدرت ذوالجلال کوئی بھی ایسا امر مانع نہیں ہے جیسے ترلمی نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ بیت المقدس میں اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام سے لیکر عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کے لئے جمع فرمایا۔ اور سات جماعتیں حضور علیہ السلام کے پیچھے تھیں۔ یہاں یہ بات خاص طور پر یاد کے قابل ہے۔ کہ بیت المقدس میں امامت انبیاء علیہ السلام کے لئے حضور علیہ السلام کو امام بنایا جانا باجسم عنصری تھا۔ کیونکہ نماز محض ارواح پر نہ تھی اور نہ ارواح ازروئے شریعت مکلف بدنماز ہو سکتی ہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی الزام آتا ہے کہ امام جسمانی کی اقتدا میں محض ارواح کا حاضر ہونا جماعت شرعی اور امامت شرعی کے منشار کو پورا نہیں کرتا۔ تو ثابت ہوا کہ سب انبیائنے حضور علیہ السلام کی اقتدا باجسام کی اور حضور علیہ السلام باجسد عنصری امام انبیاء ہوئے تھے۔ اور اگر حضور علیہ السلام کی امامت بہ روحانیت محضہ تھی۔ تو پھر عیسےٰ اور ادریس علیہ السلام نے اقتدا نہ کی ہوگی۔ کیونکہ وہ دونوں باعتقاد جمہور اہل سنت والجماعت باجسد عنصری آسمانوں پہ اٹھائے گئے ہیں۔ اور روح کی امامت میں جسمانیت کے ساتھ اقتدا، شرعاً صحیح اور قابل قبول نہیں۔ حالانکہ حدیثوں میں تمام انبیاء علیہم السلام کی شمولیت فرمائی گئی ہے اور یہ

بھی فرمایا گیا ہے۔ کہ لطافت اجسام کے لحاظ سے ان کے لئے کوئی بھی ایسا امر مانع نہیں۔ غرضیکہ اس باب میں کثرت احادیث سے ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام باجسد عنصری معراج کو تشریف لے گئے خاتم المحدثین علامہ زرقانی شرح مواہب اللدنیہ میں فرماتے ہیں کہ یہ بات کوئی ممتنع نہیں ہے۔ کہ سرکار دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم متشکل بجسد روح نظر آئیں کہ آپکو اور دیگر انبیا علیہم السلام کو بعد وفات انکی ارواح پھر انکو بل گئیں۔ اور اجازت ہو گئی کہ اپنے قبور سے نکل کر عالم بالا اور عالم ماتحت میں تصرف کریں۔

یہاں پر سب سے اہم یہ کہ آیت مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عبد کو سیر کرائی اس لفظ سے باقتضا النص ثابت ہوتا ہے کہ یہ سیر جسمانی تھی۔ کیونکہ عبد مجموعہ روح و جسد کو کہا جاتا ہے نہ کہ اسکا اطلاق صرف روح پر صحیح ہو۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی یہ لفظ آیا ہے اس سے مراد روح مع الجسد ہی ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

(۱) نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ :- یعنی قرآن کریم نازل کیا ہم نے اپنے بندے کے۔ پس مثل اس کی کوئی سورت لے آؤ۔

کیا یہاں عبد سے مراد صرف روح ہے یا روح مع الجسد ہے ایک معمولی فہم کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کریم کا نزول محض روح پر نہیں ہوا۔ اور یہاں عبد سے روح مع الجسم ہی مراد لیا جائیگا

(ب) اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی :- کیا تو نے اس کو یعنی "ابوجہل" کو دیکھا ہے۔ جو بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ اس آیت سے بھی مراد روح مع الجسد ہے۔ کیونکہ ابوجہل صرف نمازی کی روح کو نماز پڑھنے سے نہیں روکتا تھا۔

(ج) وانہ لما قام عبد اللہ کاد و یکونون علیہ لبدا:۔
(یعنی جب اللہ کا بندہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، نماز پڑھنے کو کھڑا ہوا تو قرآن سننے کے لئے جن اس پر ٹوٹے پڑتے تھے)
اس سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے کے لئے صرف آپ کی روح نہیں کھڑی ہوئی تھی۔ بلکہ مع الجسد نماز پڑھا کرتے تھے جنوں کا اجتماع صرف روح پر نہیں تھا۔
(د) کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین یعنی (وہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں)
اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ کسی عورت کا کسی عبد کے گھر میں ہونا۔ محض روح سے متعلق بعلاقہ زوجیت نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ اس کے خلاف کوئی عقلی یا علمی دلیل ہے۔ جہاں خاوند محض روح اور اس کی عورت با علاقہ زوجیت جسمانی صورت میں اس کی روح سے ہی تعلق رکھے۔
پانچویں آیت میں ہے۔ ذکر رحمۃ ربک عبدہ زکریا اس آیت میں بھی عبد سے مراد روح مع جسد ہے۔ غرضیکہ اس قسم کی قرآن کریم میں بیشمار مثالیں موجود ہیں جن سے عبد سے مراد روح مع الجسد ہے۔ پس اس سیر کو روحانی قرار دینا یا انکشافی کہنا کسی طرح بھی قرآن کریم کی منشار کے مطابق نہیں۔
علامہ شبلی نے قرآن و حدیث سے عبد کے مفہوم کو روحانی عبد بلا جسم مراد لینے میں بڑا زور لگایا ہے۔ اور بڑی کوشش کے بعد ایک آیت پیش کر سکے۔ وہ بھی جس کا ظہور خطاب اس مطلب کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس کا صحیح خطاب نفس مطمئنہ کی طرف ہو رہا ہے۔ اور خدا کے بقول

بندوں کے ساتھ ہونے کا ارشاد ہوتا ہے۔ نفس مطمئنہ کو عبد کے لفظ سے مخاطب نہیں فرمایا گیا۔ بلکہ عبادی کا لفظ اس جماعت پر بولا گیا ہے جو اپنے صالح عمل کی بنا پر دنیوی زندگی میں روح مع الجسد رکھتے ہوئے پاکیزہ نفوس کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں ممتاز تھے اور اس کے بعد نیک انجام ہونے کے باعث اہل جنت فرمائے گئے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ عبادی سے مراد عباد بلا جسد ہوں۔ نفس مطمئنہ ملوامہ ملہمہ۔ امارہ اور ہے۔ اور عبد اور چیز ہے۔ نفس مطمئنہ عبد نہیں ہو سکتا۔ اس مفہوم کے تحت ابن جریر نے کہا کہ مراد فادخلی فی عبادی سے یہ ہے کہ اپنے جسم کی طرف لوٹ جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفس مطمئنہ اور ہے اور مراد لعبادی۔ عباد مجسم یا اجسام عباد اور ہیں۔

یہاں پر رفع شکوک کے لئے ہم ان تینوں بزرگوں کے ارشادات کی بھی توضیح کئے دیتے ہیں۔ جنکو بطور دلائل منکرین معراج جسمانی پیش کرتے ہیں تاکہ متلاشی حق پر اصلیت کا انکشاف ہو جائے۔ الغرض نقلی روایات کی بنا پر جو لوگ معراج کو روحانی قرار دیتے ہیں۔ اور جسمانی معراج کا انکار کرتے ہیں وہ اپنے دعوےٰ کی تائید میں صحابہؓ سے صرف تین بزرگوں کے اقوال پیش کرتے ہیں۔ حضرت سیدنا خدیفہ وام المومنین حضرت عائشہؓ اور امیر المومنین حضرت معاویہؓ ابن ابی سفیان اور انہی کو علامہ محمد بن جریر طبری نے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ معراج کے تمام واقعات خواب تھے۔ حضور علیہ السلام کا جسد اطہر اپنی آرامگاہ سے جدا نہ ہوا تھا۔ صرف آپکی روح کو سیر کرائی گئی اور اس کے قریب حضرت خدیفہؓ و حضرت امیر معاویہ کے بیانات ہیں مگر معترضین اپنے اعتراضات اور روایات پیش کردہ کی اصلیت پر غور نہیں کرتے کہ یہ دلائل دعویٰ میں کہاں تک تقویت رکھتے ہیں۔ ہم ان ہی دلائل کی

رو سے یہ ثابت کریں گے کہ معراج مبارک روحانی نہیں بلکہ جسمانی تھی

نمبرا ترمذی شریف میں جو حدیث آئی ہے۔ اس میں سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول موجود ہے۔ کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ المعراج میں براق کو بیت المقدس کے حلقہ سے باندھا تھا۔ ان کا قول غلط ہے کیا براق آپکا مطیع نہ تھا۔ جو آپکو اس کے باندھنے کی ضرورت پڑی۔ اس کو تو اللہ کریم نے آپ کا مسخر فرما دیا تھا پس حضرت حذیفہ کے اس قول سے صاف عیاں ہے کہ ان کو جمہور سے تمام مسئلہ معراج میں اختلاف نہیں۔ بلکہ صرف براق کے پتھر سے باندھنے یا نہ باندھنے میں اختلاف تھا۔ شائد منکرین نے ان ہی الفاظ سے اپنے انکار کو تقویت پہنچانی چاہی ہو۔ حالانکہ یہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا اپنا اجتہادی قول ہے۔ انہوں نے یہ نہیں فرمایا۔ کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا سنا ہے۔ برخلاف اس کے کہ جو اصحابہ کرام رضوان اللہ علیہم معراج جسمانی کے قائل ہیں اور احادیث معراج کو روایت کرتے ہیں وہ بالتصریح انکی روایت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے ہیں۔ نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ واقع معراج کے بعد اسلام لائے ہیں تو ان کے قول سے سابق الاسلام صحابہ کرام کی احادیث کا معارضہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ جو معراج جسمانی کے قائل ہیں۔

نمبر۲:۔ واقعہ معراج ہجرت سے پہلے کا ہے۔ خود امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اسوقت ایمان نہیں لائے تھے۔ آپ ہجرت سے ایک سال بعد مدینہ منورہ میں مشرف باسلام ہوئے۔ ان کی وہ روایت جو ابن جریر نے تفسیر اسراء بسیرت ابن اسحاق ذکر معراج میں لکھی اور جس کی بنا پر حضور کی معراج کو روحانی یا رویائے صادقہ کہا جاتا

ہے مع سند کے حسب ذیل ہے۔

"عن محمد بن اسحاق قال حدثنی یعقوب بن عتبہ بن المغیرۃ ان معاویہ بن ابی سفیان کان اذا سئل عن الاسری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقول کانت رویا من اللہ صادقۃ"

ترجمہ :- محمد ابن اسحاق سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ نے بیان کیا کہ معاویہ بن ابی سفیان سے جب معراج کا واقعہ پوچھا جاتا۔ تو وہ کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ایک سچا خواب تھا۔

حالانکہ یہ روایت جمہور محدثین کے نزدیک منقطع ہے۔ کیونکہ یعقوب نے حضرت معاویہ سے خود نہیں سنا ہے اور نہ ہی انہوں نے حضرت معاویہ کا زمانہ پایا ہے۔

نمبر ۳ :- بعض لوگوں کو معراج جسمانی میں جس حدیث حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا سے دھوکا ہوا ہے وہ یہ ہے:

"حدثنا ابن حمید قال حدثنا سلمۃ عن محمد قال حدثنی بعض آل ابی بکر ان عائشۃ کانت تقول ما فقد جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکن اسرا بروحہ اور ایک دوسری روائت میں ہے۔ وعن معاویہ مثلہ۔

ترجمہ :- ابن حمید نے ہم سے بیان کیا۔ ان سے سلمہ نے بسلمہ سے محمد بن اسحاق نے انہوں نے کہا کہ حضرت ابو بکر کے خاندان کے ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک گم نہیں کیا گیا۔ بلکہ آپ نے روح مبارک کے ساتھ عروج فرمایا۔ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اسی کی مانند روایت فرماتے ہیں"۔

اس روایت سے بھی معراج جسمانی کا اختلاف ثابت نہیں ہوتا۔
کیونکہ اس روایت کے سلسلہ میں محمد بن اسحاق اور حضرت عائشہ
صدیقہ رضی اللہ عنہا کے درمیان کوئی نامعلوم الاسم راوی ہے
یعنی خاندان ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک شخص جس کا نام و نشان ہی
مذکور نہیں۔ اس لئے یہ بھی پایۂ صحت سے فروتر ہے۔ مشکواۃ شریف
جلد ثانی باب الولی فصل اول میں ایک حدیث آئی ہے۔ جس کا خلاصہ
یہ ہے کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا عقد
سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے سات سال کی عمر میں (معراج
جسدی سے دو برس قبل) در ایام ماہ شوال مکہ معظمہ میں ہوا۔ اور جب
آپکی عمر مبارک نو برس کو ہوئی تو رخصتی ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ جس ماہ آپ حضور صلی اللہ علیہ کے یہاں رخصت ہو کر آئیں۔
وہی مہینہ معراج شریف کا تھا۔ چونکہ تاریخ آمد حرم سرائے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم بس آپکی صحیح مذکور نہیں۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا
کہ وہ معراج سے کتنے دن قبل یا بعد تشریف لائیں۔ ہاں قرائن
سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بعد معراج شریف تشریف لائیں کیونکہ
اگر معراج سے پہلے تشریف لے آئی ہوتیں تو حضور معراج کی شب مکان
اُم ہانی میں استراحت نہ فرماتے جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے
اور اگر آپ بعد میں تشریف لائی ہیں تو پھر معراج جسمانی کے انکار میں
آپ کا کوئی ارشاد پیش کرنا یا کسی ایسے ارشاد کو آپ کی جانب
منسوب کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر حضور علیہ السلام سے نقل
فرمایا ہوتا تو حجت ہو سکتا تھا۔

معراج کا عقلی ثبوت

معراج علمی کے ثبوت کے بعد عقلی دلائل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس سے کہ وہ لوگ جن کی وید کسی ایمانی عینک کی محتاج ہے۔ اور جو فلسفہ کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہدایت پا سکیں۔

نمبر ۱:- کہا جاتا ہے۔ کہ واقعہ معراج خلاف عقل ہے۔ اور جسم کثیف کا صعود الی السماء محال ہے۔ جیسے مٹی کا ڈھیلا جب اوپر پھینکا جاتا ہے۔ تو جسم کثیف کی بنا پر زمین کی جانب واپس آ جاتا ہے معترضین کا یہ اعتراض خود یہ ثبوت بہم پہنچا رہا ہے۔ کہ جو چیز اوپر کو پھینکی جاتی ہے۔ اوپر جاتی تو ہے کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اوپر پھینکنے پر ڈھیلا کشش ثقل کے باعث ہاتھ سے نکلتے ہی زمین پر گر جائے۔ بلکہ بے روک ٹوک اوپر کو چلا جاتا ہے۔

رہی یہ بات کہ اوپر جا کر فوراً واپس آ جاتا ہے۔ بہت دیر ٹھہرتا نہیں تو ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر (جو چند منٹوں کے لئے معترض کے خیال پر کثیف ہی مان لیا جائے حالانکہ وہ ہماری جانوں سے بھی زیادہ لطیف ہے) تو حضور وہاں کب ٹھہر کر رہ گئے۔ آپ تو اس قدر جلدی اتنا طویل سفر کر کے واپس تشریف لائے۔ کہ:۔

زنجیر بھی ہلتی رہی بستر بھی رہا گرم
ایک دم میں سر عرش گئے آئے محمدؐ

جہاں تک ڈھیلے کی بلندی کا سوال ہے۔ یہ پھینکنے والے کی طاقت

پر منحصر ہے۔ مثلاً ایک جوان شخص کا پھینکا ہوا ڈھیلا ایک بچے کے پھینکے ہوئے ڈھیلے کی بہ نسبت زیادہ بلندی پر جائیگا اور توپ کے دہانے سے پھینکا ہوا گولہ بندوق کی گولی کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ بلندی طے کریگا۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ قوی ترین طاقت کا مالک ہے اور وہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرِ عرش لے جانا چاہتا ہے تو استدلال بالاکب مانع ہے۔

نمبر ۱۲۔ کہا جاتا ہے کہ جسم عنصری کا قلیل وقت میں بیت المقدس یعنی مسجد اقصیٰ پہنچنا آسمانوں پر اور آسمانوں سے آگے عرش تک جانا۔ باوجود جسم عنصری کے روحانیت سے ملنا۔ جنت و دوزخ کا دیکھنا عقلاً ممنوع ہے۔ اور حکما نے اس کے محال ہونے پر اور آسمانوں کے خرق والتیام کے محال ہونے پر دلائل قائم کئے ہیں اور اہل ادیان حقہ سے عیسائی یہودی کوئی اس کا قائل نہیں

اس قول معترض کا جواب یہ ہے کہ ایسے جسم عنصری کا جس کی عنصریت اپنی لطافت کے لحاظ سے روحانیت سے بھی بڑھ کر ہو۔ ایسی حرکت سریع کرنا محالات سے نہیں۔ ایک عالم کا تجربہ شاہد ہے کہ ریل اور تار برقی کی حرکت اسی نوعیت سے ہے۔ جس کو کبھی بھی محال نہیں سمجھا گیا۔ اور اسی طرح آسمانوں کا فرق والتیام جن خیالات فاسدہ سے محال ثابت کیا جاتا ہے۔ انکی حکماء اسلام نے اپنی تحقیق میں پوری قلعی کھولدی ہے۔ اور یہ امر واضح تر کردیا ہے۔ کہ حکماء یونان نے محض اپنے عقلی ڈھکوسلوں سے زمین وآسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ مسائل طبیعات وہیئت میں کوئی ٹھوس بات پیش نہیں کرسکے اناجیل و بائیبل کو ماننے والے یکے عیسائی آسمانوں کے خرق والتیام کو محالات سے نہیں مانتے۔ ہاں اگر کوئی ملحد عیسائی تسلیم نہ کرے

تو یہ اسکی ہٹ دھرمی اور کج فہمی ہے۔ دیکھئے انجیل مرقس کے سولھویں[16] باب انیسویں درس میں ہے کہ مسیح خداوند لوگوں سے کلام کرنے کے بعد آسمانوں پر چڑھ گیا۔ اور خدا تعالےٰ کے داہنے ہاتھ پر جا بیٹھا۔ یعنی حضرت عیسٰی آسمان پر چلے گئے۔ اور اسی طرح دوسری کتاب السلاطین کے دوسرے باب میں مذکور ہے۔ کہ ایلیا یعنی حضرت الیاس علیہ السلام اور الیسع باتیں کرتے جاتے تھے۔ کہ ایک گاڑی اور آگ کے گھوڑے نمودار ہوئے۔ اس پر چڑھکر ایلیا آسمان پر چلا گیا۔ اور اسی طرح ایک شخص نسیس ولیم اسمٹ اپنی کتاب طریق الاولیاء میں حضرت اخنوخ علیہ السلام کا زندہ آسمان پر جانا بیان کرتا ہے۔ اہل اسلام تو قاطبتہً اس پر متفق ہیں کہ :۔

(ل) :۔ مثلاً جرم آفتاب جو ایکسو چھیاسٹھ کرہ ارضی کے برابر ہے۔ ایک لمحہ میں کئی ہزار سالہ راہ طے کرتا ہے۔ اور اسکی سرعت وحرکت کو عندالعقل بعید نہیں سمجھا جاتا۔ تو سرعت رفتار آفتاب فلک رسالت کو کیوں تعجب سے دیکھا جاتا۔

(ب) :۔ آفتابی شعائیں اور کرنیں اور ضو قمری موٹے شفاف شیشہ سے دوسری طرف نکل جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ مجسم ہیں۔ اور اس تیزی سے ان کا نفاذ ہوتا ہے۔ کہ عقل انسانی متحیر رہ جاتی ہے۔ یعنی فی گھنٹہ بہتر[2] کروڑ میل حرکت کرجاتی ہیں۔ پس ایسے ہی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ سراپا نوری جسم جو شعاع آفتابی سے کئی ہزار گنا زیادہ حرکت نفوذ رکھتا ہے۔ صاف شفاف آسمانوں سے گذر جائے تو کونسا تعجب کا مقام ہے۔

(ج) ابلیس لعین کہ جو بدترین خلق ہے۔ اس سرعت سے مشرق و

مغرب کی سیر کرلے کہ وہم وگمان میں نہ آئے۔ اور پھر بہر شرارت کے ساتھ اس کا الحاق بھی مان لیا جائے۔ تو اس بہترین کائنات سے آن کی آن میں زمین سے عرش تک کی مسافت طے کرتے میں کیونکر شبہ ہوسکتا ہے۔ کیا مزے کی بات ہے۔ کہ معترضین جیسے خود کثیف تر انسان خود مریخ، قمر میں کودنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور نبوت کے لطیف تر اور نوری جسم مطہر کو معذور جانتے ہیں۔

(د) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چرخِ چہارم پر قیام اور حضرت ادریس علیہ السلام کا بہشت میں سیر سماوات کے بعد داخل ہونا روح مع جسم نص قطعی سے ثابت ہو۔ پھر سید الانبیاء علیہ السلام کا کہ ان سے مرتبہ میں رفیع الشان ہیں۔ آسمانوں پر جانا کیونکر ناممکن ہوسکتا ہے۔

(ہ) دیکھا گیا ہے کہ باز کے پاؤں میں چوب تر باندھ دیتے ہیں۔ کہ اس کے بوجھ کی وجہ سے پرواز نہ کرسکے۔ لیکن اگر وہ لکڑی خشک ہو جائے۔ اور اس کا ذاتی وزن خشکی کے سبب ضائع ہو جائے تو پھر باز کا معہ چوب خشک ہوا میں اڑ جانا کیونکہ بعید از قیاس ہوسکتا ہے۔ یونہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہ شہباز اقتضائے انا نورًا من نور اللہ کے تھے اور آشیانہ وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین میں نزول فرمایا تھا۔ انما انا بشر مثلکم کی چوب گراں قدم کرم میں رکھی گئی تاکہ اس کے باعث امت گنہگار میں قرار پائیں۔ پھر جو تابشِ آفتابِ عنایت الٰہی سے اس وجود کا ثقل بشریت دور ہونے سے جسم معہ روح فوق العرش پرواز کریں تو کیا تعجب ہے۔

(و) تجربہ شاہد ہے کہ تماشہ کرنے والے انڈے کے اندر کی زردی بذریعہ سوزن نکال کر اس کے اندر شبنم بھر دیتے ہیں۔ اور اس کے سوراخ کو موم سے بند کرکے جب دھوپ میں رکھتے ہیں

تو گرمئ آفتاب سے شبنم گرم ہو کر اوپر کو اٹھتی ہے۔ اور ساتھ انڈے کو بھی لے جاتی ہے۔ پھر کیا مشکل ہے کہ وجود نورِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریح " الم نشرح لك صدرك " کے بعد طبائع بشریت اور اخلاط جسمیت کثیف سے پاک ہو کر اعانت کشاکشِ سبحان الذی اسریٰ سے پرواز کرے تو عقل باور نہ کرے۔

(ز) پارہ اور پٹرول پر بھی غور کیجئے جنکی اصل کثیف ہے جب ذراسی گرمی پہنچی۔ فوراً آسمان کو اڑ گئے تو جاننا چاہیئے کہ کثیف لطیف کیطرف کیونکر گیا۔ جو حضور علیہ السلام مع الجسد آسمان پر نہیں جا سکتے۔

(ح) شریعت کا قاعدہ ہے کہ اگر دو چیزیں جو غالب و مغلوب ہوں آپس میں ملی ہوں۔ تو حکم غلبہ کے باعث غالب کو ہوتا ہے۔ مثلاً آب دہن خون آلود نکلے تو حکم غالب پر ہے۔ اگر خون غالب ہے تو ناقض وضو ہے۔ وگرنہ وضو رہیگا۔ یہی صورت نقوذ میں ہوگی۔ اگر نقرہ غالب ہے۔ حکم جید کا دیا جائیگا۔ اگر غش یعنی کھوٹ غالب ہے تو حکم کھوٹے کا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ تو اسی پر غور کیجئے کہ جب روح پر فتوح محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم پرواز کناں ہوا پھر کیا جائے تعجب ہے؟

(ط) دورِ حاضرہ میں عام مشاہدہ ہو رہا ہے۔ کہ ہوائی جہاز جو جسم کثیف رکھتا ہے۔ معہ سینکڑوں جسم کثیف کے پرواز کرتا رہتا ہے اور یہ جسم کثیف مانع پرواز نہیں تو جسم اطہر حضور پر نور صلے اللہ علیہ وسلم جو الطف عن الهوا ہو۔ براق پر چشم زدن میں سیر افلاک کرے تو کون سا استحالہ لازم آتا ہے۔

(ی) منکرین کوتاہ نظر اپنے ہی نفد باصرہ پر ذرا توجہ فرمائیں کہ

آنکھ اٹھاتے ہی احساس سیارات فلک کرنے لگتا ہے۔ پھر جسم مطہر محمدی صلی اللہ علیہ وسلم جو آنکی نگاہوں سے لاکھوں گنا درجے لطیف تر ہے۔ قطع مسافت زمین و آسمان فرمائے۔ تو اس کے محال ہونے کی کیا وجہ ہے؟

نمبر ۳۔ معترضین اعتراض کرتے ہیں کہ حدیث میں آتا ہے۔ کہ معراج کے متعلق جب بیت المقدس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ نے تامل سے فرمایا۔ پھر جب حجابات نظر اٹھا دیئے گئے تو آپ نے سوالوں کے جواب دیئے۔ حالانکہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ بیت المقدس جو خاص ہیکل سلیمانی تھی بخت نصر کے حادثے میں برباد کردی گئی تھی۔ اور اس کی تعمیر جو بعد میں ہوئی اس کو انطاکیہ کے بادشاہ انٹیوکس نے حضرت مسیح علیہ السلام سے پیشتر ہی گرا دیا تھا۔ اس کے بعد جو تعمیر ہوئی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ تک نہیں ہوئی تھی جسکی سرپرستی ہیرودیس حاکم شام کرتا تھا۔ جو قیاصرہ روم کا گورنر تھا۔ اس کو حضرت مسیح علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق آپ کے صعود سے تخمیناً چالیس برس بعد قیصر روم طیطوس نے بیخ و بن سے گرا دیا تھا۔ اور اسکی بنیادوں میں ہل چلا دیئے تھے۔ اس کے بعد اس کی تعمیر کا قصد کوئی نہ کرسکا۔ اور مدتوں تک اس بنیاد سے آگ کے شعلے نکلتے رہے۔ جو یہود پر مسیح کے ساتھ بدسلوکی کرنے سے قہر الٰہی تھا آخر کار وہ تعمیر حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانے تک خراب پڑی رہی۔ اور پھر آپ نے اس کی تعمیر کی۔ تو دریں حالت وہاں نمازیں کیونکر پڑھی گئیں۔ اور پھر کون سے نشانات کے متعلق سوالوں کے جواب دیئے گئے۔

معترضین حضرات کو یہ معلوم ہونا چاہئے۔ کہ مسجد اس جگہ کا نام ہے۔ جو عمارات کے گر جانے یا بدل جانے سے نہیں بدلتی۔ اور وہ اپنی حیثیت میں زمین سے آسمان تک مسجد ہی ہوتی ہے۔ بیت المقدس یعنی وہ خاص ہیکل جس کو معترض نے پیش کیا ہے۔ گو منہدم ہو چکی تھی۔ مگر اس کے پاس عیسائیوں نے مکانات بنا رکھے تھے۔ جن کو خود عیسائی اور عام لوگ ہیکل اور بیت المقدس ہی کہتے تھے جن کو قریش مکہ نے جبکہ وہ بغرض تجارت اس دیار میں جاتے تھے تو دیکھا تھا انہیں کی نسبت وقت معراج میں جو ہیکل کی موجودہ حالت تھی۔ کفار کے استفسار پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا۔ رہا اس کا (ہیکل کا) مکہ میں آپ کے سامنے موجود ہونا جسے دیکھ دیکھ کر آپؐ قریش کو جواب فرماتے اور نشانیاں بتلاتے تھے۔ جیساکہ صحیح مسلم شریف میں مروی ہے۔ تو اس سے مراد یہ نہیں کہ ملائکہ ان مکانات کو اٹھا کر مکہ لائے تھے۔ بلکہ آپؐ کو روحانی انکشاف تھا۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محال نہیں۔ کیونکہ آپ مؤید بالہام تھے

نمبر ۴:۔ کہا جاتا ہے کہ زمین آسمان کے مابین کرۂ نار اور کرہ زمہریہ واقع ہیں۔ جن میں سے گذرنا محال امر ہے۔ معترضین کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ فی زمانہ یہ سوال بے سود سا ہے۔ کیونکہ موجودہ سائنس نے اس کا جواب مکمل طور پر پیش کر دیا ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ تیزی رفتار کی کوئی حد معین نہیں ہے۔ جو چیز آپ جلتی آگ میں پھینکیں گے۔ خواہ وہ روئی کا گالا کیوں نہ ہو۔ جس زور سے پھینکی جائیگی۔ اتنی ہی وہ بے ضرر آگ سے پار جا نکلے گی۔ یہی حال طبقۂ برودت کا ہوگا۔

اب بلندی پر جانے والے ہوں سرکار کائنات مختار شش جہت

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا جسم اطہر ہماری جانوں سے زیادہ لطیف ہے اور لیجانیوالی ذات اللہ تعالیٰ اجل وعلیٰ شانہٗ کی ہو۔ تو کرۂ نار و کرۂ زمہریہ سے گذرنا معترض کے نزدیک کیونکر ناممکن ہے

۵۔ کہاجاتا ہے کہ اگر واقعہ معراج سرکار دوجہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیداری کا ہوتا تو قرآن کریم میں اسکو لفظ لیل کی قید سے مقید نہ فرمایا جاتا لہذا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے معترضین کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ چونکہ واقعہ معراج رات کو ہوا۔ اس لئے "لیل" کا لفظ لایا گیا اگر دن کا ہوتا تو نہارٌ استعمال کیا جاتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں کسی فعل کے پورا ہونے میں لفظ "لیل" آئے۔ وہ واقعہ خواب ہی کا ہوتا ہے۔ اس مقام پر "لیلا" کا لفظ نکرہ واقع ہوا ہے: تاکہ تقلیل کا فائدہ پہنچے جس سے مراد پوری رات نہیں بلکہ رات کا بعض حصہ ہے۔ اس لفظ سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہ اس قدر طویل سفر اور لمبی سیر رات کے تھوڑے عرصے میں کرائی گئی جس سے قادر وقیوم کی قدرت کا عظیم الشان اظہار ہوتا ہے۔ اس سے یہ نظریہ قائم کرلینا ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ کہ واقعہ معراج خواب تھا۔ کیونکہ قرآن کریم میں متعدد واقعات کا تعین لفظ "لیل" سے کیا گیا ہے:۔

مثلاً ارشاد ہے۔ فاسر بعبادی لیلاً انکم متبعون۔ پس میرے بندوں کو راتوں رات لیکر چل بتحقیق تم پیچھا کئے جاؤ گے۔" یہ آیت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو فرعون کے شہر سے نکال کر لیجانیکا واقعہ ہے۔ جو عین عالم بیداری میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ دوسری جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے۔ فاسر باھلك بقطع من الیل۔ یعنی لے نکل اہل اپنے کو رات میں" یہاں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قوم لوط کا واقعہ رات کو چل نکلنے کا ہوا جسکے نکل جانیکے بعد انکے باقی اہل دہ کو عذاب کیا گیا۔ تو یہ خواب نہ تھا۔ کہ لیل کے مذکور ہونے سے بیداری کا انکار کرادے۔

نمبر ۶:۔ کہا جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج

کو تشریف لے گئے تو کئی برسوں کی مدت کا اندازہ قیام فرمایا تھا۔ پھر اتنی دیر آپکا بستر کیونکہ گرم رہا اور زنجیر درِ حجرہ کیونکہ متحرک رہی۔

موجودہ سائنس کے ایجادات کی بنا پر ایسے اعتراضات زبان پر لانا بھی عقل و فہم کی توہین ہے۔ مثلاً تھرماس (سفری بوتل) میں حسب منشا چیزیں سرد یا گرم رکھی جا سکتی ہیں اور جہاں تک حرکت کا تعلق ہے ہے کلاک یا ٹائم پیس سال ہا سال لگاتار متحرک رہتے ہیں۔ اب ذرا غور کیا جائے۔ تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ خدائے قادر و توانا جو انسانی قوت کا خالق ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر کو گرم اور زنجیر درِ حجرہ متحرک رکھے تو کونسا استحالہ لازم آتا ہے۔

نمبر ۷ :۔ اعتراض ہوتا ہے۔ کہ افقِ اعلیٰ کے قریب جسے عرفِ عام میں سدرۃ المنتہیٰ کہا جاتا ہے۔ کانٹے دار درختوں کا ہونا سدرہ کیا معنی رکھتا ہے؟

معترض صاحب کو سدرہ کے لفظ نے ایسا مبہوت کیا ہے۔ کہ وہ خار دار بیری کے علاوہ سدرہ کا اور کوئی مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ حالانکہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں۔ جنکے نام انکی جنسیت کی بنا پر خود حضرتِ انسان نے وضع کر لئے ہیں۔ اور اُن سے ان کے نام کا مطلب یکسر موضوع نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً ڈاکٹر اقبال کی کتاب بالِ جبریل کیا وہی بالِ جبرائیل ہے۔ جو اپنا اصل موضوع رکھتا ہے۔ کسی شہر کا نام اللہ آباد ہو نیسے یہ نتیجہ لازم نہیں آتا۔ کہ وہاں خدا کی رہائش ہے۔ یونہی سدرۃ المنتہیٰ کا تذکرہ ہے۔ اور وہ اپنی بلندی کے لحاظ سے ایک خاص مقام ہے اُس کے نام کے لحاظ سے درخت بیر کا وہاں سمجھنا اور کانٹوں کا خطرہ محسوس کرنا ایک بے ضرورت استنباط ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم اس کی

نفی نہیں فرماتا۔ کہ اس دنیا کے علاوہ کہیں اور بیری کا درخت ہی نہیں بلکہ اس نے بہشت میں بیری کے درخت کا ہونا ذکر فرمایا ہے۔ یعنی سدرٍ مخضود و طلحٍ منضود۔ ترجمہ:۔ کانٹے صاف کی ہوئی بیریاں اور پھل سے لدے ہوئے کیلے کے پودے ہوں گے۔ ؎

رسائی نہیں عالم ہو میں اس کی
گذر خاک پر ہے نظر خاک پر ہے
یہ باعث ہے لعنت کا اس خاکدا کی
کہ وہ عالم پاک سے بے خبر ہے

غرضیکہ جو لوگ واقع معراج کو روحانی یا خواب کی رویت مانکر بعید از امکان ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں انہیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ آخر اس واقعہ کی اصل غرض و غایت کیا ہے جو اس شد و مد سے اس واقعہ کی عظمت کا اعلان ہو رہا ہے۔

معترضین حضرات اگر تعصب کی عینک اتار کر واقعہ معراج کی اصلیت پر غور کریں۔ تو یہ پتہ چل جائیگا کہ یہ صریحاً تعلیم امت کے لئے نبی کی طرف سے ایک فعل ہے۔ کیونکہ نبوت کے تمام احکام اس کی اپنی ذات کے لئے نہیں ہوتے۔ لہذا ہمیں ان فوائد و بصائر کی جانب بھی متوجہ ہونا چاہئے۔ جو اس آئت میں اشارۃً فرمائے گئے ہیں۔

حقیقتِ کلام

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

ترجمہ:- اور یہ پیغمبر اپنی خواہش سے بات نہیں بولتا۔ اس کی بات سوائے وحی کے جو اس کو بھیجی گئی ہے اور کچھ نہیں،

یہ جملہ اولیٰ (ما ضل صاحبکم وما غوی) کی دلیل ہے کہ حضور کا بھٹکنا اور بے راہ چلنا ممکن و متصور ہی نہیں۔ کیونکہ آپ اپنی خواہش سے کوئی بات فرماتے ہی نہیں۔ جو فرماتے ہیں وحی الٰہی ہوتی ہے۔ اور اس میں آپکے خلق عظیم اور اعلیٰ منزلت کا بیان ہے۔ نفس کا سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ وہ اپنی خواہش ترک کر دے، اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال میں فنا کے اس مقام پر پہنچے کہ اپنا کچھ باقی نہ رہا۔ تجلی ربانی کا یہ استیلا تام ہوا کہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ وحی الٰہی ہوتی ہے،

اور متعدد تفاسیر میں یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے پاکیزہ ہیں، کہ ان میں سوائے ارادۂ حق تعالیٰ کے اپنی خواہش جسمانی کا کچھ نشان ہی نہیں۔ لہذا آپ اپنی خواہش کے موافق کوئی بات نہیں فرماتے بلکہ جو کچھ ان کی زبانِ مبارک سے نکلتا ہے وہ عین وحیِ حق تعالیٰ ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ قرآن مجید کے علاوہ جو بھی کچھ آپ فرماتے تھے۔ وہ سب وحی خفی ہوتی تھی۔ اور قرآن وحی جلی ہے۔

حضرت اشعیا علیہ السلام وانبیائے سابقین کی زبان سے لوگوں کو آگاہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس خاتم النبیین پیغمبر

علیہ السلام کے منہ میں جس کے لئے ازل میں معاہدہ لیا گیا تھا۔ اپنا کلام ڈالوں گا وہ میری ہی زبان سے کلام کریگا۔ جس نے نہ مانا میں اس سے انتقام لونگا

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ میری امت کے ایک آدمی کی شفاعت سے اللہ تعالےٰ جنت میں قبیلۂ ربیع یا مضر کے برابر لوگوں کو داخل فرمائیگے ایک صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ربیعہ بہت تھوڑے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میری زبان سے وہی نکلتا ہے جو مجھکو وحی ہوتی ہے (رواہ احمد)

اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ ابتدا میں جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے تھے یاد رکھنے کی غرض سے لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قریش کے چند آدمیوں نے ان سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات لکھ لیتے ہو حالانکہ حضور بھی ایک بشر ہیں۔ اور بعض اوقات آپ غصے کی حالت میں بھی کلام فرماتے ہیں، عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے یہ سنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں لکھنا چھوڑ دیں۔ پھر میں نے حضور سے اس بات کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ تو لکھا کر پس قسم ہے حق عزوجل کی کہ میری زبان سے وہی بات نکلتی ہے جو حق ہے (رواہ احمد و ابوداؤد)

حدیث ابو ہریرہ میں ہے کہ ایک مرتبہ بعض اصحاب نے عرض کیا کہ آپ ہم سے خوش طبعی اور مزاح کی بات بھی فرماتے ہیں (تو کیا ایسے موقع پر بھی آپ حق ہی فرماتے ہیں) آپنے فرمایا کہ ہاں میں وہی کہتا ہوں جو حق ہے (رواہ احمد)

مثلاً ایک مرتبہ ایک ضعیفہ کو آپنے فرمایا کہ بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی۔ تو وہ عورت غمگین ہوگئی۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنّت میں اللہ تعالیٰ انکو نوجوان باکرہ کرکے داخل کریگا۔ معلوم ہوا کہ آپ کی خوش طبعی بھی حق گوئی پر مبنی ہوتی تھی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں لوگوں کو دیکھا کہ درخت خرما میں نر کو مادہ درخت کے ساتھ اس خیال سے لگاتے ہیں کہ ان میں پھل زیادہ آئے تو آپ نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ چنانچہ آئندہ سال پھل کم پیدا ہوا۔ تو آپنے فرمایا کہ اپنی دنیا کے معاملات میں تم جانو اور میں جب تم کو امر دین میں حکم دوں تو اس کی اتباع کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امور دنیا میں آپ کا کلام وحی الہٰی سے متعلق نہیں ہوتا تھا۔ سو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بعض کلام کے اسرار و حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آتے، یہ تو ہماری سمجھ کا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی حسن نیت کی بنا پر اس کے لئے دنیاوی معیشت کے واسطے آسائش و فراخی کی ایسی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ جو عادت کے خلاف ہو۔ مگر یہاں پر توکل اور بھروسہ پورا پورا چاہئے۔ اور اگر کسی عادت کی وجہ سے دل میں تردّد ہوا تو وہ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور تردّد کے معاملہ میں انسان مجبور ہے، مثلاً خرما میں مادہ کو نر کے ساتھ ملانے سے پھل کے زیادہ پیدا ہونیکا خیال ان کے دلوں میں جما ہوا تھا۔ اور اس عادت کے چھوڑنے میں انکو ہیجان پیدا ہوا۔ اور اس بنا پر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آئندہ سال قلت پھل کی شکایت کی۔ حالانکہ ایسا ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ کیونکہ حضور بلا ارادہ بھی کوئی ارشاد فرما دیتے تو وہ غیر ممکن امر بھی ممکن ہو کر رہتا۔ پھر یہاں خرما کے معاملہ تو حضور علیہ السلام نے بالارادہ ارشاد فرمایا تھا، یہ پورا کیونکر نہ ہوتا۔ درحقیقت یہ ان لوگوں کا تخیل اور واہمہ تھا۔ جس میں وہ مدت سے مبتلا تھے۔ اگر سرکا بر

انبیاء علیہ السلام کے ارشاد پر اسی طرح قائم رہتے جیسا کہ ارشاد ہوا تھا تو پھلوں کی کمی کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جاتا۔ بعض اوقات انسان کا اپنا وہم بھی بلا وجہ اس کو پابند بلا کر دیتا ہے۔ صاحب تفسیر مرادیہ نے اسی بات پر ایک حکایت لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری رحمتہ اللہ علیہ ایک مرتبہ اپنے ایک ارادتمند کے پاس گئے اور فرمایا کہ گھر سے دودھ لاؤ کہ گرم کر کے پئیں۔ مرید نے عرض کیا کہ قبلہ ہمارے ہاں یہ سلسلہ مدت سے جاری ہے۔ کہ اگر بھینس یا گائے کے بچہ جننے کے بعد چالیس دن کے اندر اندر ہم دودھ کو آگ پر گرم کریں تو بھینس مر جاتی ہے۔ آپ کو تعجب ہوا کہ یہ کیا قصہ ہے آپنے ارادتمند کو مجبور کیا کہ دودھ لاؤ۔ اور اپنی ہی بھینس کا لاؤ تاکہ ہم اس کا تجربہ کریں۔ اس نے عرض کیا آپکا تجربہ ہو گا ہماری بھینس مر جائیگی۔ مگر آپنے اس کو تسلی دی اور سہ بارہ اس کو گھر سے دودھ لانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ دودھ لے آیا۔ جب آگ پر رکھا تو گھر سے پیغام آیا کہ بھینس کھڑی کھڑ گر گئی ہے اور مر رہی ہے۔ حضرت شرف الدین منیری بسنکر ان کے گھر تشریف لے گئے دیکھا تو واقعی بھینس مر رہی ہے۔ آپنے گری ہوئی بھینس کے منہ پر دو چار جوتے مارے اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ مرید متعجب ہوا اور پوچھا کہ حضرت یہ کیا بات تھی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے جب اس کو دیکھا کہ مر رہی ہے تو مکاشفہ سے معلوم کیا کہ تمہارے خیال کے قیام کے واسطے شیطان اس کا سانس روک کر اس کے نتھنے اور منہ بند کئے ہوئے ہے۔ تاکہ آئندہ بھی یہ قائم رہے میں نے لاحول پڑھکر جوتے رسید کئے تو چھوٹ کر بھاگ گیا۔ اور بھینس کا سانس جو رکا ہوا تھا کھل گیا۔ اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

جو کوئی اللہ تعالیٰ پر توکل کرے یعنی بالکل مطمئن ہو تو اللہ تعالے آسان طریقے سے اس کے لئے وہی نتیجہ پیدا کر دیتا ہے۔ جو دوسرا کو مشقت سے حاصل ہوتا ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ آپ کا کلام سب کلام حق ہے۔ اور سمجھنے کے واسطے البتہ معرفت درکار ہے۔ بعض لوگوں نے گمان کیا کہ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ فقط احکام شریعت کے ساتھ خاص ہے۔ کیونکہ بعض افعال میں آپنے فرمایا کہ میں بشر ہوں جیسے تم بھولتے ہو میں بھی کبھی بھول جاتا ہوں جیسا کہ آپ ایک مرتبہ نماز فجر کے وقت سو گئے۔ جیسے کہ دوسرے لوگ سو جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی ذاتِ مبارک سے انسانی ہدایت مقصود تھی۔ لہذا آپکے حق میں وہ بشری افعال جاری ہوتے تھے۔ تاکہ ان احکام سے امت کو آگاہی ہو۔ اگرچہ آپ کو انکی خود کوئی ضرورت نہ تھی۔ صبح کے وقت نماز میں غفلت طاری ہونا آپ کی ذاتِ مبارک سے بعید تھا۔ کیونکہ آپ عین الشہود کی معرفت میں تھے۔ آپ کا سونا بھی ہزار بیداری سے افضل تھا۔

چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل نہیں سوتا۔ چونکہ طلوع فجر وغیرہ کے احکام آنکھ سے متعلق ہیں۔ لہذا اس حکم کے بیان کرنے کے لئے روح مبارک کو روک لیا گیا۔ تاکہ امت پر رحمت و آسانی ظاہر ہو۔

معلوم ہوا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل سب وحی الٰہی کے ماتحت تھا۔ اور جو کچھ سرکار انبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور پذیر ہوتا وہ آپکی ذات کے لئے نہیں بلکہ تعلیم امت کے لئے بحکم ربانی ہوتا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

مسئلۂ علم غیب رسول صلی اللہ علیہ وسلم

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (سورۂ نساء)

(ترجمہ:- اور سکھلا دیئے تجھکو وہ سب علوم جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالےٰ کا یہ فضل ہے بڑا)

کسی مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ اور قائل اس کی حقیقت کو اپنے عقیدہ اور خیال میں کیونکر جگہ دیتا ہے۔ کیونکہ اس وضاحت سے معترض بھی تعجیل سے کام نہیں لیتا۔ اور قائل بھی اپنے قول میں لغزش نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اسی تحت میں جب ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ علم غیب کیا ہے۔ اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور وہ اس کے کیونکر متحق ہیں۔ اور علم غیب الٰہی اور نبوی میں کیا فرق ہے اور اس عقیدہ کے رکھنے یا نہ رکھنے سے ایک مسلمان گنہگار تو نہیں ہوتا۔ پھر یقیناً ایک بے تعصب اور ذی علم و فہم انسان صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔

غور کرو مذہب کیا چیز ہے اور اسکی حقیقت کیا ہے مذہب انسان کی عملی زندگی کے لئے چراغ راہ ہے۔ انسان اور اسکی عملی زندگی کا تعلق تمام تر مادیات سے ہے اسلئے ماورائے مادہ کی نسبت صرف وہیں تک اسکو تعلق ہے جہاں تک انسان کی عملی زندگی کے لئے ضروری ہے یعنے مذہب میں دو چیزیں ہوتی ہیں عقائد اور عبادات۔ اور دوسرے الفاظ میں اسکی یہ تعبیر ہوسکتی ہے۔ کہ مذہب علم اور عمل سے مرکب ہے

پھر علم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو مادیات سے ماخوذ اور انہی سے وابستہ ہے۔ اور اسکے متعلق ہم میں بذریعہ مشاہدہ اور تجربہ کے یقین پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا وہ علم ہے جس کا تعلق ماورائے مادہ سے ہے۔ اور جس کے جاننے کا ذریعہ صرف تخیل۔ تصوّر اور ظن ہے۔ مثلاً آگ جلاتی ہے۔ یہ علم مادی ذریعۂ احساس سے ہم کو حاصل ہوا ہے۔ اس لئے سب کو اس درجہ یقین ہے۔ کہ غلطی سے بھی ہم آگ میں کودنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ لیکن دوسرا علم یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد دوسرا جنم لیتا ہے۔ مگر اس علم پر اعتماد کر کے کیا کوئی انسان اپنی زندگی کا آپ خاتمہ کر دینے کو تیار ہو گا؟

حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک خط میں امام فخرالدین رازی علیہ الرحمت کو نصیحت فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب عقلمند کے لئے مناسب ہے۔ کہ وہ خدا کے جود و کرم کی خوشبوؤں سے فائدہ اٹھائے اور نظر و استدلال کی قید میں نہ پھنسا رہے۔ کیونکہ وہ اس طرح ہمیشہ مشتبہ حالت میں رہیگا۔ چنانچہ مجھ سے تمہارے ایک دوست نے ملاقات کی جو تمہارے ساتھ حُسن عقیدت رکھتا تھا۔ اور بیان کیا کہ اس نے تم کو ایک روز روتے ہوئے دیکھا۔

پھر جب اس نے اور دوسرے حاضرین نے رونے کا سبب دریافت کیا۔ تو تم نے یہ جواب دیا۔ کہ ایک مسئلہ جس پر تیس برس سے میں اعتقاد جمائے ہوئے تھا۔ اس وقت ایک دلیل سے مجھکو غلط ثابت ہوا ہے۔ اندر دنا اس امر کا ہے۔ اس کے بعد مجھکو کیا اطمینان ہے۔ کہ جو تحقیق مجھ پر اب ظاہر ہوئی ہے۔ وہ بھی پہلی طرح غلط نہ ہو گی۔ یہ خود تمہارا قول ہے اور شاقی وہ شخص جو عقل اور استدلال کے مرتبے سے آگے نہیں بڑھا۔ اس کے لئے ناممکن ہے کہ سکون و اطمینان

حاصل کر سکے۔ اور بالخصوص خدائے تعالیٰ کی معرفت میں۔ سو اے بھائی تم کیوں اس استدلال کے گرداب میں پڑے ہو اور کیوں ریاضات و مجاہدات اور مکاشفات و خلوات کا وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع فرمایا ہے۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم بھی وہ چیز حاصل کر لو۔ جو انھوں نے حاصل فرمائی۔

حضرت محی الدین ابن عربی رحمت اللہ علیہ وسلم کے متذکرہ بالا خط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو شخص انوار نبوت سے مستنیر ہوئے بغیر محض اپنی عقلی تحقیق پر بھروسہ کر کے الہیات کی کنہہ تک پہنچنا چاہیگا یا کائنات ارضی و سماوی کو اپنی عقل کے ناتمام گز سے ناپتا رہیگا وہ یقیناً بجائے کعبہ کے ترکستان کو چلا جائیگا۔ اس کے اوہام اسکی عقل سے مزاحمت نہ کریں گے۔ اور وہ ہمیشہ تخیلات و شکوک کے گرداب میں پھنسا رہیگا۔

نبوّت اور نبی کا مفہوم

حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ انسان اصل پیدائش کے لحاظ سے جاہل محض پیدا ہوا ہے۔ پیدا ہونے کے وقت وہ اقسام موجودات میں سے کسی چیز سے واقف نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے اس میں لمس کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ سے وہ ان چیزوں کو محسوس کرتا ہے۔ جو چھونے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً حرارت برودت رطوبت۔ یبوست اور نرمی و سختی اس حاسہ کو مرئیات و مسموعات سے کوئی تعلق نہیں جو شئے محض سننے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اس کے حق میں یہ حاسہ بالکل معدوم ہے۔ اس کے بعد انسان میں دیکھنے کا حاسہ پیدا ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ رنگ اور مقدار کا ادراک کر سکتا ہے۔ پھر سننے کی قوت پیدا ہوتی ہے پھر چکھنے کی یہاں تک

کہ محسوسات کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ اور ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس میں تمیز کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اور ان چیزوں کا خیال کر سکتا ہے جو حواس کی دسترس سے باہر نہیں۔ پھر آگے حل کا زمانہ آتا ہے۔ جس سے ممکن۔ محال جائز۔ ناجائز کا ادراک ہوتا ہے۔ اس سے بڑھکر ایک اور درجہ بھی ہے۔ جو عقل کی سرحد سے آگے ہے۔ اور جس طرح تمیز و عقل کے مدرکات کے لئے حواس بالکل بیکار ہیں۔ اسی طرح اس درجہ کے لئے عقل محض بیکار ہے۔ اور اس درجہ کا نام نبوت ہے بعض لوگ اس درجے اور اسکی خصوصیات سے منکر ہیں۔ لیکن یہ انکار اسی قسم کا ہو سکتا ہے جس طرح وہ شخص عقلی چیزوں کا انکار کرتا ہے۔ جس کو ابھی عقل کی قوت عطا نہیں ہوئی۔ اس تحقیق کے لحاظ سے اصطلاحی طور پر نبوت کی تعریف کرنا چاہیں۔ تو یوں کریں گے کہ نبوت وہ قوت یا ملکہ ہے جس سے ان اشیاء کا ادراک ہو سکتا ہے۔ جن کا ادراک حواس سے تمیز سے اور عقل سے قطعاً نہیں ہو سکتا۔

لفظ نبی لغۃً یا تو نبوۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنے زمین سے بلند ہونے کے ہیں۔ اور لغوی و اصطلاحی معنوں میں مناسبت اس طرح ہے۔ کہ اللہ کریم جل و علا شانہٗ نبی کو تمام مخلوق پر شرف و فضیلت عطا فرماتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے درجے مرتبے اور منزلت کو سب پر بلند فرما دیتا ہے۔ اس بنا پر وہ فعیل بمعنے مفعول ہوگا۔ اور یا نبی اَنْبِیَاءَ سے ماخوذ مانا جائے۔ تو اس کے معنی خبر کے ہوں گے۔ اس صورت میں وہ فعیل بمعنے فاعل ہوگا جس کی مناسبت اس طرح ہوگی کہ نبی اللہ تعالےٰ سے خبر پا کر بندوں کو اطلاع فرماتا ہے۔ اور شریعت میں نبی کا اطلاق اس ہستیٔ مقرب بارگاہِ الٰہی پر ہوتا ہے جس کو خداوند عالم جل مجدہٗ اپنے احکام بندوں تک پہنچانے کے لئے منتخب فرمائے

حکمار کہتے ہیں کہ نبی وہ ہے جس میں تین خواص پائے جائیں۔
اول:- اپنے جوہر نفس کی صفائی اور شدت اتصال بالمبادی العالیہ اور بغیر کسی بیرونی عمل اور سابقہ کسب وتعلیم کے غیب کی خبروں سے اطلاع دے۔
دوئم:- اس کے ہیولیٰ عنصری میں حقائق اشیار کے ادراک اور صُور الٰہیہ کے انکشاف کی قابلیت وصلاحیت ہو۔
سوئم:- ملائکہ کی صُور متخیلہ کو مشاہدہ کرے اور بذریعہ وحی کے کلام الٰہی کو سُنے۔
اس سے ثابت ہوا کہ نبوت کے تسلیم کرنے کے یہ معنے ہیں کہ نبوت ایک درجہ ہے جو عقل سے بالاتر ہے۔ اور جس میں وہ آنکھ کھل جاتی ہے جس سے وہ خالص اشیار معلوم ہو جاتی ہیں۔ جن سے عقل بالکل محروم ہے۔ اور یہی دوسرے معنوں میں اسیران عقل کے لئے علم غیب نبوت ہے۔
اب سنئے کہ علمار کرام علم غیب کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک غیب کس چیز کا نام ہے:
تفسیر کبیر جلد اول مصری ص ۱۶۹ سطر ۲۷ ان الغیب ھو الذی یکون غائبًا عن الحاسۃ"۔ یعنی غیب وہ ہے جو حاسہ سے باہر ہو یعنی حواس خمسہ دیکھنے۔ سونگھنے۔ سُننے۔ چکھنے۔ چھونے سے الگ ہو۔
تفسیر عزیزی میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جلد اول سورۂ بقرہ ص ۵۷ سطر ۲۸ میں لکھا ہے۔ غیب نام آں چیز است۔ کہ از ادراک حواس ظاہرہ و باطنہ خارج باشد۔ یعنی غیب وہ چیز ہے جو حواس ظاہری و باطنی کے ادراک سے خارج ہو اور یہی تعریف تفسیر عزیزی

جلد دوم ص ۲۰۵ سطر اول میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمائی ہے اور اسی کے ماتحت ہمیں سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ثابت کرنا ہے اور اسی کے ماتحت اہل سنت کے عقیدہ کا اظہار ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ علمائے کرام اہل سنت حضور سرورِ عالم تاجدارِ عرب وعجب علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے نہ جمیع غیوب نامتناہیہ کا علم ثابت کرتے ہیں اور نہ جملہ معلومات الٰہیہ کا۔ مقابلۃً حضور علیہ السلام کے علم کو علم الٰہی سے کوئی برابری کی نسبت نہیں دیتے۔ اور یہ بھی عقیدہ نہیں رکھتے۔ کہ ذرہ کو آفتاب سے یا قطرہ کو سمندر سے جو نسبت ہے۔ یہی خالق و مخلوق میں متصور ہوجائے۔ کیونکہ خدا اور رسول خدا میں مماثلت اور مساوات سوء ادبی باری تعالےٰ ہے۔ تمام مخلوق کے علوم علم الٰہی کے حضور میں اقل قلیل اور کوئی ہستی نہیں رکھتے۔ ہم نہ مثل اور برابری کے قائل کہ خدا اور رسول خدا کے علم غیب کو ایک کردکھائیں اور نہ عطائے الٰہی اور فضائل ایزدی کے منکر۔ کہ شان نبوی کو گھٹائیں اور خداوند عالم کے ذمہ امکان کذب کے بہتان لگائیں۔ معترضین کا یہ کہنا کہ علمائے اہل سنت خدا کے علم غیب میں برابری اور مماثلت کردیتے ہیں محض بہتان اور علمائے اہل سنت پر صریح افترا ہے۔ یہ عقیدہ ضالہ لعنہ اللہ تعالےٰ علمائے اہل سنت کے کسی ایک کا بھی نہیں۔ ہاں مخالفین کی طرح منکرِ علم غیب رسول اللہ نہیں ہیں۔ یہ ضرور مانتے ہیں کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ اور ایسی وسیع فضیلت کے لئے وسعتِ علم بھی ایسی ہی ہونی مانتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام کی روح اقدس سے عالم کی کوئی چیز عرشی ہو فرشی۔ دنیا کی ہو یا آخرت کی پردۂ حجاب میں نہیں ہے۔ حضور سب عالم ہیں۔ اور ذرہ ذرہ حضور پر ظاہر و روشن ہے۔ مگر حضور کے اس علم کو علم الٰہی سے کوئی مساوات

نہیں۔ کیونکہ وہ علم غیر متناہی ہے۔ اور حضور کا علم خواہ کتنا ہی وسیع ہو۔ متناہی ہے۔ اور متناہی کو غیر متناہی سے کوئی مساوات کا تعلق نہیں ہوتا۔

ہاں اتنی وسعت علم دیکھکر اگر مخالفین سٹ پٹا جائیں۔ کہ یہ رسول اللہ کے لئے مان لیا۔ اور خدا کے پاس اب اس کے سوا باقی کیا رہ گیا ہوگا۔ اور ان کی تنگ ظرفی علم الٰہی کو بھی محدود اور نہایت کم استعداد کا خیال کرے تو یہ ان کی اپنی کوتاہ فہمی ہے۔ کہ علم الٰہی کو عالم میں منحصر خیال کریں یا علم متناہی کے برابر تجھیں۔ اہل سنت علم الٰہی کو محدود نہیں مانتے اور نہ علم متناہی سے مماثلت کرکے علم قدیم ازلی سے جس کے معلومات لاانتہا ہیں۔ کوئی مزاحمت کرتے ہیں کیونکہ علم قدیم کے معلومات اس عالم میں منحصر نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اسرار ربوبیت و اوصاف الوہیت جو غیر متناہی ہیں۔ اس عالم ہی سے نہیں۔ ہم حضور کے علم کو عطائے الٰہی کا اقرار کرتے ہوئے اس وسعت کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔ جو حضور کو عطا فرمائی گئی ہے۔ اور علم الٰہی کو اس کی بے مثال عظمت کیساتھ ذاتی اور مخصوص بحق مانتے ہیں۔ درحقیقت یہ مغالطہ ان ہی لوگوں کو ہوتا ہے۔ جو رسول خدا کے علم کے مقابلے میں علم الٰہی کو بھی محدود اور متناہی خیال کرتے ہیں۔ اور خداوند عالم کے علم کی تنقیص کرنے میں مبتلا ہیں۔ اگر وہ لوگ اللہ جل شانہٗ کی قدرت اور علم سے واقف ہوتے تو رسول خدا کے علم کی وسعت کا انکار نہ کرتے ہوئے اہل سنت والجماعت کو مساوات کرنے کا الزام نہ لگاتے اور حقیقت میں بات یہ ہے۔ کہ مدارج نبوت اور مراتب رسالت کے کمالات کا وہی منکر ہو سکتا ہے جو خداوند عالم کی قدرت و عظمت سے بے خبر ہو۔

کتاب الدبریز کے مصنف اسی کتاب کے ص۱۴۳ میں اپنے شیخ کی

نسبت دے کر فرماتے ہیں کہ اس امتیاز میں سب سے زیادہ قوی روح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ کہ اس روح پاک سے عالم کی کوئی چیز پردہ میں نہیں یہ روح مقدس عرش اور اس کی بلندی۔ پستی دنیا و آخرت جنت و دوزخ سب پر مطلع ہے۔ کیونکہ یہ سب اسی ذات مجمع کمالات کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم آپ کی تمیز ان جملہ عالموں کی فارق ہے۔ آپ کے پاس اجرام سموات کی تمیز ہے۔ کہ کہاں سے پیدا کئے گئے۔ کیوں پیدا کئے گئے اور کیا ہو جائیں گے۔ اور آپ کے پاس ہر آسمان کے فرشتوں کی بھی تمیز ہے۔ اور اس کی بھی کہ وہ کہاں سے اور کب پیدا کئے گئے۔ اور کہاں جائیں گے۔ اور ان سے اختلاف مراتب اور منتہائے درجات کی بھی تمیز ہے۔ اور ستر پردوں اور ہر پردہ کے فرشتوں کے جملہ حالات کی بھی تمیز ہے عالم علوی کے اجرام نیرہ۔ ستاروں۔ سورج۔ چاند لوح و قلم۔ برزخ اور اس کی ارواح کی بھی ہر طرح امتیاز ہے۔ اسی طرح ساتوں زمینوں اور ہر زمین کی مخلوق خشکی اور تری کا بھی حال معلوم ہے اسی طرح تمام جنتیں اور ان کے درجات اور ان کے رہنے والوں کی گنتی اور مقامات سب خوب معلوم ہیں۔ لیکن اس علم نبوی کی علم قدیم ازلی سے کوئی نسبت نہیں۔ اس لئے کہ اس کے معلومات بے انتہا ہیں۔ اس کی وضاحت منہاج النبوت ترجمہ مدارج النبوت جلد اول ص۳۲۶ سطر ۵ میں یوں فرمائی گئی ہے فاوحی الی عبدہ ما اوحی۔ یعنی وحی کیا پروردگار نے طرف اپنے بندے کے جو کچھ وحی کیا۔ بطریق الہام کے یعنی وحی کیا سو کیا۔ خدا جانتا ہے۔ یا اس کا رسول۔ دوسرا کیا پا سکتا ہے۔ تمام علوم اور معارف وحقائق اور بشارات اشارات اور اخبار

آثار اور کرامات و کمالات اس الہام کے احاطہ میں داخل ہیں اور تمام کو یہ شامل ہے۔ اور کثرت وعظمت سے ہے جو ملہم لایا اور بیان نہ کیا۔ ان اشارات کے تئیں اور اس بات کے کہ سوائے علام الغیوب کے اور اس کے رسول محبوب کے کوئی اس پر احاطہ کرنے والا نہیں ہو سکتا۔

ان ہر دو عبارات سے رسول خدا کے علم کی نسبت معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کس قدر ہے۔ اور متقدمین اسلام اس کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ باوجود اس طرح ماننے کے علم الہٰی سے اس کی کوئی مماثلت نہیں ہوتی۔ اب اس کو دو عنوانوں میں علیحدہ علیحدہ معلوم کیجئے۔ تاکہ علم الہٰی اور علم نبوی کی مماثلت اور مساوات کا شبہ نکل جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ سلف صالحین نے علم الہٰی کے متعلق کیا عقیدہ رکھا ہے اور علم نبوی کو کس مرتبہ تک تسلیم کیا ہے۔

بیان علم اللہ تعالیٰ میں

صحیح بخاری جلد دوم ص ۶۷۴ سطر ۴ مطبوعہ مصری۔ قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وخضر علیہ السلام:۔ فلما رکبا فی السفینۃ جاء عصفور فوقع علی حرف السفینۃ فنقر فی البحر نقرۃ او نقرتین قال لہ الخضر یا موسیٰ ما نقص علمی وعلمک من علم اللہ الا مثل ما نقص ھذا العصفور بمنقارہ من البحر (الحدیث بلفظہ)

یعنی موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کشتی پر سوار ہوئے۔ تو ایک چڑیا کشتی کے کنارے پر آکر بیٹھی۔ اور اس نے اپنی چونچ کو سمندر میں ڈبو دیا۔ پس خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میرا علم اور تمہارا علم اور سارے جہانوں کا علم اللہ تعالیٰ کے

علم کے مقابلے میں آتا ہے جتنا چڑیا نے سمندر میں سے اپنی چونچ میں لیا۔ شرح عقائد علامہ تفتازانی علیہ الرحمۃ ص۲۷ میں ہے معلومات اللہ تعالیٰ اکثر من مقدوراتہ مع لا متناھیھما۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے معلومات مقدورات سے بہت زیادہ ہیں۔ باوجود اس کے کہ دونوں کی کوئی انتہا نہیں۔ (معلومات کی مقدورات کی)

شرح مواقف۔ موقف ثانی علامہ جرجانی رحمۃ اللہ علیہ میں ہے "اعلم ان معلومات اللہ تعالیٰ اکثر من مقدورات مع ان کل واحد منھما غیر متناھیۃ"۔ یعنی جان تو تحقیق اللہ تعالیٰ کے معلومات بہت زیادہ ہیں اس کے تقدیر کئے ہوئے سے باوجود اس کے کہ ہر ایک ان دونوں میں سے غیر منتہی ہے۔

حاشیہ بیضاوی میں علامہ خفاجی علیہ الرحمۃ سے ہے "ان معلومات اللہ تعالیٰ لا نھایۃ لھا وغیب السموات والارض وما یبدونہ وما یکتمونہ قطرۃ منھا" یعنی تحقیق اللہ تعالیٰ کی معلومات کی انتہا نہیں ہے۔ اور غیب آسمانوں کا اور زمینوں کا اور جو کہ ظاہر کرتے ہیں اور چھپاتے ہیں اس کو اس سے ایک قطرہ ہے۔

کیمیائے سعادت۔ امام غزالی علیہ الرحمۃ میں ہے۔ "وہیچ سلیم دل نبود کہ ایں قدر نداند۔ کہ علم فرشتگان وآدمیاں در غیب علم حق تعالیٰ ناچیز است وہمہ را گفتہ کہ" وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً۔ فرمایا کوئی سلیم دل نہیں جو اس قدر نہ جانے کہ علم فرشتوں اور آدمیوں کا علم حق تعالیٰ کے حضور میں ناچیز ہے۔ اور اس نے سب کو فرما دیا ہے۔ کہ تم علم سے بہت تھوڑا دیئے گئے ہو۔

الغرض اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ عقیدہ علمائے اسلام اہلسنت کا ہے۔ جو مشتے نمونہ از خروارے۔ دوچار کتب سے بالاختصار

نقل کر دیا ہے۔ تاکہ معترض بھائی کو یاد رہے۔ کہ ہم اس میں یعنی علم الٰہی میں کسی مساوات و مماثلت کے معتقد نہیں ہیں۔

بیانِ علمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں

علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ کہ ہمارے بعض بھائی بغیرہ لکھے سُنے اہل سنت کو طعن کرتے ہیں۔ کہ یہ لوگ اپنے مشرکانہ عقیدہ کے ماتحت مراتب علم و نعمت میں خداوند عالم جل شانہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر کر دیتے ہیں۔ اور اس قدر بڑھاتے ہیں۔ کہ تمیز ہی نہیں چھوڑتے۔ مگر یہ بات ہماری سمجھ میں آجتک نہیں آئی کہ بڑھانے گھٹانے کا معاملہ ان بھائیوں نے کہاں سے ثابت کیا ہے۔ علمائے اہل سنت تو پکار پکار کر فرما رہے ہیں کہ ہم اس سے بری الذمہ ہیں اور ہمیں اس عقیدہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ہاں عنایات ایزدی کا رسول خدا کی نسبت اقرار ضرور کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے اقرار کئے بغیر کوئی مومن مومن نہیں ہوسکتا۔

کس قدر تعجب انگیز یہ امر ہے کہ خدا کے دیئے ہوئے کی بھی نسبت کرنا یہاں کی مذہب انگیز زمین میں کفر اور شرک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو سراسر شان نبوی میں تعصب اور سُوء فہمی کے مترادف ہے۔ خدا اگر اپنے محبوب و مختار نبی (فداہ امی وابی) کو اپنے انعام سے مالا مال فرماتا ہے تو اس میں متعصبین کو چون وچرا کا کیا حق ہے؟ کیا وہ علم الٰہی کی کوئی حد مقرر کرتے ہیں۔ جس کے ساتھ برابری کا شبہ ان کو دن رات رسول خدا کی طرف سے بے چین رکھتا ہے۔ اور اگر وہ بے حد اور بے انتہا ہے تو اس برابری کی غیرت کے کیا معنی ہیں۔ ہم اس شبہ کو یہاں صاف کرتے ہیں اور ایک دو حوالاجات سے دکھاتے ہیں کہ ہمارا عقیدہ علم غیب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کس طرح ہے۔ معلوم کیجئے کہ علم غیب کی تقسیم دو طرح پہ ہے اول حقیقی یا استقلالی یا ذاتی دوسرا اضافی یا وہبی یا تعلیمی۔ پہلی قسم کا علم غیب جو بلا کسی وسیلہ یا ذریعہ کے ہے۔ بالاستقلال ذاتی ہے۔ اور وہ خاص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ اور دوسرا علم غیب جو اضافی یا وہبی یا تعلیمی ہے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کرام کو ثابت ہے جس کا ہم آگے چل کر بفضلہ تعالیٰ وضاحت سے ثبوت پیش کرینگے انشاء اللہ۔ سب سے پہلے ہم معترض صاحب کے ایک اہم عقیدہ عالم کی تحریر پیش کرتے ہیں کہ وہ اس عقیدہ میں کیا کچھ اظہار کرتے ہیں۔ دیکھو کتاب صراط مستقیم مولوی اسمٰعیل صاحب دہلوی بلفظہ صلا سطر ۲۔

(ق) وہمچنیں اصحاب ایں مراتب عالیہ و ارباب ایں مناصب رفیعہ ماذون مطلق در تصرف عالم مثال و شہادت مے باشند۔ وایں کبار اولی الابد والابصار را میرسد۔ کہ تمامی کلیات را نسبت خود نسبت نمائید۔ مثلاً ایشاں را میرسد۔ کہ بگوئید کہ عرش تا فرش سلطنت ما است الیٰ آخر۔

(ب) افادہ ا۔ برائے انکشاف حالات سموات و ملاقات ارواح و ملائکہ و جنت و نار و اطلاع بر حقائق آں مقام و دریافت امکنہ آنجا انکشاف امرے از لوح محفوظ ذکر یا حی یا قیوم است بلفظہ صلا سطر ۸۔

وہ لکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی الگ رہی صرف اولیا کرام علیہ الرحمۃ والرضوان کے یہ مراتب ہیں کہ تمام زمینوں آسمانوں کے حالات اور دوزخ و جنت کی سیر اور لوح محفوظ پر اطلاع پانا۔ ان کا ثابت ہے۔ اور یہ بھی استحقاق لکھتے ہیں۔ کہ ان کو جائز ہے وہ یہ بات بھی کہہ دیں کہ عرش سے لیکر فرش تک ہماری بادشاہی

اور سلطنت ہے۔ یہاں سے معلوم ہو گیا ہے کہ جب اولیاء کرام کا تمام جہانوں پر تصرف اور علم غیب اور لوح محفوظ پر اطلاع ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کے مقابلے میں ایک قطرے کی بھی مقدار نہیں تو پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف اور علم کا کیا اندازہ ہو گا تفسیر روح البیان کے ص ۴۰۵ ج ۳ پر ایک عبارت یوں ہے۔ قال شیخنا العلامۃ ابقاہ اللہ بالسلامۃ فی الرسالۃ الرحمانیۃ فی بیان الکلمۃ العرفانیۃ علم اولیائنا من علم الانبیاء بمنزلۃ قطرۃ من سبعۃ ابحر و علم الانبیاء من علم نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھذہ المنزلۃ و علم الحق سبحانہٗ بھذہ المنزلۃ یعنی رسالہ رحمانیہ فی بیان کلمۃ العرفان میں ہے کہ علم اولیاء اللہ کا علم انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں سات سمندروں میں سے ایک قطرہ ہے۔ اور علم تمام انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ میں علم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسا ہے جیسا سات سمندروں سے ایک قطرہ۔ اور علم سرور عالم۔ فخر موجودات۔ مختار شش جہات صلی اللہ علیہ وسلم کا علم الٰہی سبحانہٗ وتعالیٰ کے مقابلہ میں ایسا ہی ہے۔ جیسے ایک قطرہ۔ زرقانی شرح مواہب اللدنیہ میں حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ نبوت اس چیز سے عبارت ہے جس کے ساتھ نبی مختص ہے۔ اور غیروں سے ممتاز ہے۔ ایک یہ کہ جو امور اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات اور فرشتوں اور آخرت کے ساتھ متعلق ہیں۔ نبی انکے حقائق کا عارف ہوتا ہے۔ اور دوسروں کو کثرت معلومات اور زیادتی کشف و تحقیق میں اس سے کچھ نسبت نہیں دوم یہ کہ انکی ذات میں ایک ایسا وصف ہے جس سے افعال خارقہ عادت تمام ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ ہمیں ایک وصف قدرت کا حاصل ہے۔ کہ جس سے ہمارے حرکات ارادیہ پورے ہوتے ہیں۔ سوم یہ کہ نبی کو ایک ایسا وصف حاصل ہے جس سے ملائکہ کو دیکھتا ہے۔ اور ان کا مشاہدہ کرتا ہے جس طرح کہ بینا کو ایک وصف حاصل ہے جس کے باعث وہ نابینا سے

ممتاز ہے۔ چہارم یہ کہ نبی کو ایک ایسا وصف حاصل ہے۔ جس سے وہ غیب کی آئندہ باتوں کو ادراک کرلیتا ہے۔

اس عبارت امام غزالی علیہ الرحمتہ سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ جل شانہٗ نے انبیا علیہم السلام کو حقائق امور کا علم عطا فرمایا۔ اور کثرت معلومات زیادتی کشف و تحقیق میں اور سب سے ممتاز فرمایا ہے۔ افعال خارقہ کی ایسی صفت عطا فرمائی ہے۔ جیسے ہم کو حرکات ارادیہ کی کہ ہم جب چاہیں حرکت کریں۔ ایسے ہی وہ جب چاہیں۔ افعال خارقہ ظاہر فرمادیں۔ ایک صفت ایسی دی جس سے وہ ملائکہ کو اس طرح دیکھتے ہیں جسطرح بینا اندھے کے مقابلہ میں دیکھتا ہے۔ اور ایک صفت غیب کی ایسی عنایت فرمائی جس سے غائب کی آئندہ باتیں وہ جانتے ہیں۔ جس سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام علیہ الرحمتہ و الرضوان کا علیٰ قدر مراتب مطلع از غیب ہونا ثابت ہو جائیگا۔ اس کے بعد مخالف و مطابق کو حق کے قبول کرنے میں اختیار ہوگا۔ وما علینا الا البلاغ۔

وہ حوالہ جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے یہ ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ملا علی قاری رحمتہ اللہ علیہ مرقاۃ المفاتیح جلد ا صـ۴۲ میں تحریر فرماتے ہیں

ان الغیب مبادی ولواحق فمبادیہا لا یطلع علیہا ملک مقرب ولا نبی واما اللواحق فھو ما اظھرہ اللہ تعالیٰ علیٰ بعض احبابہ لوحۃ علمہ و خرج بذالک عن الغیب المطلق وصار غیبا اضیا فیا وذالک اذا تنورت الغس سیہ وازداد نورہا منتھا واشراقہا بالاعراض عن ظلمۃ عالم

ظلمۃ
الحس و تجلیۃ القلب عن صداء الطبیعۃ والموا
ظبۃ علی العلم والعمل و فیضان الانوار الالٰہیۃ حتی
یقوی النور و ینبسط فی فضاء قلبہ و تنعکس فیہ
النقوش المرتسمۃ فی اللوح المحفوظ و یطلع علی
المغیبات و یتصرف فی عالم السفلی بل یتجلی حینئذٍ
الفیاض الاقدس بمعرفتہ التی ھی اشرف العطایا
فکیف بغیرہ؟

خلاصہ یہ کہ غیب کے مبادی پر کوئی ملک مقرب و نبی مرسل مطلع نہیں۔ البتہ غیب کے نور حق پر اللہ تعالےٰ نے اپنے بعض احباب کو مطلع فرمایا ہے۔ جس کے علوم میں سے ایک لوح کا علم بھی ہے اور یہ غیب اضافی ہے۔ اور یہ جب ہے کہ جب روح قدسیہ منور ہوتی ہے۔ اور عالم حس کی ظلمت اور تاریکی سے اعراض کرنے دل صاف ہونے علم و عمل پہ مواظبت کرنے اور انوار الٰہیہ کے فیضان کے باعث اس کی نورانیت اور اشراک زیادہ ہو جاتا ہے اور لوح محفوظ کے نقوش اس میں منعکس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ مغیبات پر مطلع ہوتا ہے اور عالم سفلی میں تصرف کرتا ہے۔ بلکہ اس وقت خود فیاض اقدس جل شانہٗ اپنی معرفت کے ساتھ تجلّی فرماتا ہے۔ اور یہی بڑا عطیہ ہے جب یہی حاصل ہو تو اور کیا رہ جائیگا۔ اس عبارت سے پورے طور پر واضح ہو گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے احباب کے دل میں ایسا روشن نور عطا فرماتا ہے جس میں لوح محفوظ اس طرح منعکس ہو جاتی ہے جیسے آئینہ میں صورت۔ اس نور پاک سے اللہ تعالےٰ کے احباب غیبوں پر مطلع ہوتے ہیں۔ عالم میں تصرّف کرتے ہیں بلکہ خود اللہ کریم ان کے دلوں میں تجلّی فرماتا ہے۔

اور سنئے کتاب الدبریز شریف کے صـ۲۶۲ پر ایک عبارت آتی ہے جس کا خلاصہ ترجمہ فقیر یہاں درج کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ تحقیق اگر زندہ رہیں جبریل علیہ السلام یک لاکھ برس سے دوسرے لاکھ برس تک یا اس قدر زندہ رہیں۔ کہ جس کی کوئی حد نہیں تو بھی معرفت سرور عالم سے اور اُنکے علم سے جو ان کو اُن کے رب جل مجدہٗ نے عطا فرمایا ہے چوتھا حصّہ بھی نہیں پائیں گے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سیدنا جبریل علیہ السلام زیادہ علم والے ہوں۔ سرور دوجہان صلی اللہ علیہ وسلم سے حالانکہ جبرائیل علیہ السلام ان ہی کے نور سے پیدا کئے گئے ہیں۔ دُررُ الغواص عن فتوے علی الخواص حضرت علامہ اجل امام وہاب الدین شعرانی رحمتہ اللہ علیہ صـ۸۵ میں ہے:۔

قال ولما لقن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ وخلع علیہ ذالك صار یقول عندی من العلم الذی اسرہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مالیس عند جبرئیل ولا میکائیل فقال لہ ابن عباس کیف ذالك یا امیر المؤمنین فقال ان جبرائیل علیہ السلام تخلف عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ الاسراء وقال ومامنا الا لہ مقام معلوم فلا یدری ما وقع بعد ذالك الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یعنی کہا اور جب تعلیم کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یعنی حضرت علی پر اس تلقین کو پیش کیا تو حضرت علی فرمانے لگے۔ میرے پاس اس علم میں سے جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا۔ وہ علم بھی ہے جو جبرائیل

و میکائیل جیسے فرشتوں کے پاس بھی نہیں ہے۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے سوال کیا کس طرح ہے یہ یعنی اس کا مطلب کیا ہے اے امیر المومنین! پس جواب دیا حضرت علی کرم اللہ وجہ نے تحقیق جبرائیل علیہ السلام پیچھے رہ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں اور کہا جبرائیل علیہ السلام نے کہ ہم میں کوئی ایسا فرشتہ نہیں ہے۔ جس کے لئے ایک خاص حد نہ ہو۔ بلکہ ہر ایک کے لئے ایک مقام ہے جو امین و مقرر ہے۔ کہ اس سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ پس نہیں جانتے جبرائیل علیہ السلام جو کچھ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر واقع ہوا جب وہ الگ ہو گئے اور یہ اپنے مقام پر رہ گئے تھے۔

کیا میرے اشرف المخلوقات دوستوں کو اب بھی اپنی فضیلت اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و اختیار کا احساس نہ ہو گا۔ جب اپنے علم کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے معلومات بڑھنے پر جبرائیل علیہ السلام پر فوقیت ظاہر فرماتے ہیں۔ سرکار دو عالم تاجدار کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی کیفیت تو ان اقوال سے کہیں بالاتر ہے۔

اب یہ عبارت اور کلام تو کسی معمولی شخصیت کا نہیں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ ہیں جن کی نسبت فرمایا گیا ہے۔ کہ انا مدینۃ العلم و علی بابھا۔ فرمایا حضور نے میں علم کا شہر ہوں اور علی کرم اللہ وجہٗ اس کے دروازے ہیں۔ حضرت علی کی اس سند پر بھی منکرین کو اگر سمجھ نہ آئے تو پھر ان سے خدا سمجھے۔

افضل الرسل کے علم غیب کے متعلق آیاتِ قرآنی

اس سے پہلے کہ علمِ غیب کے متعلق آیاتِ قرآنی درج کروں متشککین کو یہ واضح طور پر بیان کردینا ضروری جانتا ہوں۔ تاکہ بصیرت سے کام لے کر سمجھیں۔ کہ علم الٰہی ذاتی ہے۔ اور علم نبوی اور تمام مخلوق کا علم عطائی وہ واجب ہے۔ یہ ممکن۔ وہ قدیم یہ حادث۔ وہ نامخلوق یہ مخلوق۔ وہ نامقدور یہ مقدور۔ وہ ضروری البقا، یہ جائز الفنا۔ وہ ممتنع التغیر یہ ممکن التبدل ہے۔ ان عظیم تفرقوں کے بعد کیسے مماثلت ہوتی ہے۔ اور کیونکر شرک ہو سکتا ہے اس واضح عقیدہ پر بھی اگر احتمال شرک ہوگا۔ تو اس کا اہل کوئی دیوانہ ہو سکتا ہے کسی عاقل کے نزدیک تو علم الٰہی سے مساوات کا ہونا بھی ممکن نہیں۔ یہ ہے عقیدہ جماعت سلف صالحین اور علمائے اہل سنت والجماعت کا۔ جس پر مندرجہ ذیل آیات اسی مفہوم میں شاہد ہیں جن کو فقیر خوفِ طوالت سے بالاختصار پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

(آیت ۱) وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطْلِعَکُمْ عَلَی الْغَیْبِ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِہٖ مَنْ یَّشَاءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَکُمْ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (سورہ آل عمران مدنی)

ترجمہ:- ارشاد ہوا اور اللہ جل شانہٗ یوں نہیں کہ تم کو مطلع کردے غیب پر اور لیکن اللہ جل شانہٗ چھانٹ لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے۔ پس ایمان لاؤ تم اللہ اور اس کے رسولوں پر اگر ایمان پر رہو تم اور پرہیزگاری پر تو تم کو بڑا ثواب ہے۔

تشریح :- اس آیت سے خوب طور پر ظاہر ہوا ہے کہ اللہ جل شانہٗ اپنے مجتبیٰ و مرتضیٰ رسولوں کو غیب پر مطلع فرما دیتا ہے۔ پھر یہ کہنا کیونکر صحیح ہو گا۔ کہ یہ علم تعلیم الٰہی سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ ضروری مطلب یہ ہو گا۔ کہ خود بخود اپنی ذات اور اٹکل سے کوئی غیب کو نہیں جانتا البتہ تعلیم الٰہی سے انبیاء علیہ السلام جانتے ہیں۔ کیا اس آیت کو سننے پڑھنے کے بعد کوئی منکر غیب بتا سکتا ہے۔ کہ انبیاء کو غیب بتایا جاتا ہے یا نہیں۔ یا ضد اور تعصب کے جوش میں قرآن پاک کا بھی خلاف کرتے جانا مومن کی شان ایمانی میں داخل ہے۔ اب بھی اگر یہ کہا جائے کہ حق سبحانہٗ نے کسی کو اس پر مطلع نہیں کیا۔ تو کس حد تک بطالت اور جمہور مفسرین کے خلاف عقیدہ ہے۔ کیا منکرین کے نزدیک خداوند عالم غیب کی تعلیم پر قادر نہیں ہے۔ حالانکہ ان کے نزدیک جھوٹ بولنے پر بھی قادر ہے۔ پھر اس میں قدرت پر کیا کمزوری وارد ہوتی ہے۔

(آیت) ۲- عالم الغیب فلا یظھر علیٰ غیبہٖ احدًا الا من ارتضیٰ من رسول الآیہ (سورہ جن مکیہ)

ترجمہ :- اللہ جل جلالہٗ عالم الغیب ہے۔ پس کسی کو اپنے غیب پر مطلع نہیں کرتا۔ مگر جس کو کہ چن لے رسولوں میں سے۔ تشریح۔ اس آیت میں یہ لطیف اشارہ سمجھنے کے قابل ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے لایظھر غیبہٖ علیٰ احدًا۔ نہیں فرمایا کیونکہ اس کے معنی ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اپنے غیب کسی پر ظاہر نہیں فرماتا۔ اور حالانکہ غیب کا اظہار اولیاء پر بھی ہوتا ہے۔ اور انبیاء پر بھی۔ اور بذریعہ انبیاء و اولیاء بعض صالحین پر بھی تو اس میں غیب کی کلی نفی ہو جاتی تھی۔ بلکہ فرمایا لا یظھر علیٰ غیبہٖ احد یعنی اپنے علم غیب خاص پر کسی کو ظاہر و غالب اور مسلط نہیں فرماتا مگر رسولوں کو۔ اس عجیب بیان سے کیسا مرتبہ قرآن پاک نے انبیاء علیہم السلام کے

لئے ثابت فرمایا ہے۔ تفسیر روح البیان جلد چوتھی ص۲۹۶ میں اسی آیت کی تفسیر میں ہے۔ ابن شیخ نے فرمایا۔ کہ اللہ کریم اپنے غیب خاص پر جو اس کے ساتھ مختص ہے۔ رسول مرتضیٰ کے سوا کسی کو مطلع نہیں فرماتا اور جو غیب اس کے ساتھ خاص نہیں اس پر دوسرے غیر رسول کو بھی مطلع فرما دیتا ہے۔ اب تو کوئی شک نہیں رہا۔ کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا غیب ماننا بھی جائز ہے یا نہیں۔

آیت (۳) وما ھو علی الغیب بضنین (الایۃ) (سورۂ تکویر رکیہ)

ترجمہ:۔ اور نہیں وہ غیب پر بتانے میں بخیل تشریح۔ ھو کا مرجع بعض نے اللہ جل شانہٗ فرمایا ہے۔ اور بعض نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض نے قرآن کریم بہر حال ہمارا مدعا حاصل ہے۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ وہ غیب کی باتیں چھپا نہیں رکھتا۔ یا بتلانے میں بخل نہیں کرتا۔

تفسیر جامع البیان برحاشیہ تفسیر جلالین ص۴۹۰ میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیب کی خبروں کو جو ان کو اطلاع ہوتی ہے۔ بتلانے میں متہم نہیں۔ اور حرف ضاد کی قرات میں اس کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیب کی تمام باتوں کو بتلانے میں بخیل نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کو سکھلا دیتے اور بخشش کر دیتے ہیں۔ یہی مطلب تفسیر جلالین ص۴۹۰ میں مذکور ہے۔ جہاں اس آیت شریف کی تفسیر کی گئی ہے۔ اور تفسیر جمل برحاشیہ تفسیر جلالین شریف زیر آیت مبارکہ عالم الغیب فلا یظہر الخ ترجمہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کسی جگہ علم غیب کی نفی اپنے نفس شریف سے فرمائی ہے۔ تو یہ حق تعالیٰ سے تواضع ہے اور اپنی عبودیت کا اقرار ہے۔ اور معنی آیت کے یہ ہیں۔ کہ میں خود بخود غیب نہیں جانتا۔ مگر حق تعالیٰ مجھے غیب پر مطلع فرما دیتا ہے۔

آیت (۴) وعلمک ما لم تکن تعلم وکان فضل اللہ علیک عظیما

(سورۃ نساء مدنی) ترجمہ :- اور اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تمام علوم تمکو سکھا دیئے جو آپ نہیں جانتے تھے۔ اور آپ پر اللہ کا فضل عظیم ہے۔

تشریح :- اس آیت کے متعلق مفسرین متفق ہیں۔ کہ تجھے اے نبی وہ باتیں سکھلائیں۔ جن کو تو نہیں جانتا تھا) اس عبارت کا مفہوم احکام شرعی اور امور غیبی ہیں۔

تفسیر مواہب الرحمٰن میں ہے کہ فرمایا حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہ اللہ تعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان دُنیا و آخرت۔ عرش و فرش۔ آسمان و زمین۔ تمام کائنات۔ اجرام فلکی کا علم اور حلال و حرام سکھلا کر اپنی مخلوق پر حجت کیا۔

صاحب تفسیر خازن اسی آیت کے تحت میں لکھتے ہیں۔ فرمایا اللہ تعالےٰ نے کہ وہ سب کچھ تم کو سکھا دیا جو آپ نہیں جانتے تھے یعنی احکام شرع و امور دین و امور غیبیہ اور یہ بھی قول ہے۔ کہ عَلَّمَکَ سے علم غیب ہی مراد ہے۔ جو حضور نہیں جانتے تھے۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے معنی ہیں۔ کہ تمام خفیہ اور مخفی باتیں سکھلادیں اور خبردار کر دیا۔ تمام لوگوں نے دلوں کی مخفیہ باتوں پر۔ اور تمام منافقین کے حالات اور ان کے مکروں پر آگاہ کر دیا۔ جو آپ نہیں جانتے تھے۔ اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمیشہ سے ہے۔ اور آپ پر فضل اللہ تعالیٰ کا عظیم کہ آپ کو علم غیب عطا ہوا۔

تفسیر روح البیان جلد ششم صـ۲۴ جس کی عربی عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ آپ کا (صلی اللہ علیہ وسلم) علم جمیع معلومات غیبیہ ملکوتیہ کو محیط ہو گیا۔ جیسا کہ حدیث بحث ملائکہ میں آیا ہے۔ کہ آپ نے فرمایا۔ حق تعالےٰ نے اپنا دستِ قدرت میرے شانوں پر رکھا۔ بس اسکی

خنکی میری چھاتیوں میں پہنچی پس جان لیا میں نے علم اولین و آخرین کا اور دوسری روایت میں فرمایا علم اس چیز کا جو ہو چکی ہے اور اس کا جو آئندہ ہو گی۔

تفسیر کبیر مصری جلد سوم ص ۳۱۰ میں ہے۔ اسی آیت کے ماتحت یوں لکھا ہے۔ یعنی یہ بزرگ تر دلائل سے ہے۔ علم کے اشرف فضائل اور مناقب ہوتے پر بدیں وجہ کہ اللہ تعالے نے فرمایا۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ یعنی مخلوق کو تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔ اور ایک برگزیدہ ہستی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوق کے علوم سے جو حصہ ملا وہ بھی تھوڑا ہی ہے۔ پس اس تھوڑے کو اللہ تعالیٰ نے بہت فرمایا۔ اور اس قدر بڑھایا کہ اس کے علم میں ساری دنیا کا نام بھی تھوڑا ہی فرمایا۔

تفسیر عزیزی سورۃ بقر ص ۱۱۷ سطر ۱۴ میں ہے۔ کہ اللہ تعالے نے انبیاء میں سے سات نبیوں کو سات علم صراحتاً فضیلت فرمائے ہیں حضرت آدم کو علم لغت جیسے فرمایا وعلم آدم الاسماء کلها۔ حضرت خضرؑ کو علم فراست۔ وعلمناہ من لدنا علماً۔ حضرت یوسفؑ کو علم تعبیر۔ وعلمتنی من تاویل الاحادیث۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو علم صنعت وعلمناہ صنعۃ لبوس لکم۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو علم منطق الطیر۔ یعنی جانوروں کی بولی جاننا۔ علمناہ منطق الطیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو علم تورات و انجیل اور اس کی حکمت جیسے فرمایا۔ ویعلمہ الکتب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل۔ اور حضرت سید عالم محبوب مکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم اسرار غیب جیسے فرمایا۔ علمك مالم تکن تعلم (بلفظہ)

تفسیر جلالین ص ۸۵ سطر ۴ زیر آیت علمك مالم تکن تعلم

فرمایا گیا ہے۔ کہ من الاحکام الغیب ۔یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمانا ۔کہ اے رسول سکھلا دیا تم کو جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے ۔ وہ تمام احکام و امر و نواہی اور غیب کے علوم ہیں ۔تفسیر جامع البیان میں اسی آیت کے ماتحت یوں ارشاد ہے کہ یہ آیت شریفہ مخفی امور کی تعلیم کے متعلق ہے ۔ اسی آیت شریفہ کے ماتحت تفسیر مدارک کی یوں عبارت ہے علمك مالم تكن تعلم من امور الدين والشرائع ومن خفيات الامور وضمائر القلوب یعنی یہ آیت شریف کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب کچھ سکھلا دیا ۔جس کو آپ نہیں جانتے تھے ۔ وہ تمام امور دین کے اور شریعت کے اور تمام غیب کی باتیں اور تمام لوگوں کے دلوں کے بھید اور اندرونی حالات ہیں ۔

آیت ۵ وانبئكم بما تاكلون وما تدخرون فی بیوتكم ان فی ذالك لآية لكم ان كنتم مومنين (آل عمران) ترجمہ اور میں بتا دیتا ہوں تم کو جو کچھ کھا کر آؤ تم اور رکھ آؤ تم بیچ گھروں اپنے کے اس میں تم کو بڑی نشانی ہے ۔ اگر تم یقین رکھتے ہو ۔

تشریح ۔ اس آیت شریفہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے لوگوں میں پانچ معجزات پیش کئے تھے ۔ اول مٹی کے پرندگی صورت بنایا اور اسکو باذن اللہ پھونک دیکر صحیح جاندار پرند کی طرح اُڑا دینا ۔ دوسرا مادر زاد اندھے کو بینا کر دینا تیسرا کوڑھی کو اچھا کرنا ۔ چوتھا مردے کو زندہ کرنا پانچواں علم غیب کے ذریعے یہ بتانا کہ بنی اسرائیل کیا کھا کر حضرت کے پاس آئے ہیں اور اُن کے گھروں میں کیا پونجی پڑی ہے ۔ اور ضرورت اس پانچویں معجزے کی اس لئے ہوئی کہ بنی اسرائیل کے کم بختوں نے کہا کہ مردے

زندہ کرنا تو جادو ہے۔ کوئی ایسی نشانی غیب دانی کی ہم کو بتاؤ جس سے ہم کو تمہاری نبوت کا یقین ہو جائے۔ تو عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو اس طرح بتانا شروع کیا۔ اور یہی کمالین میں لکھا ہے۔ اور روایت حضرت عمار ابن یاسر کی بھی آئی ہے۔ جس میں یوں ذکر ہے۔ کہ بنی اسرائیل نے درخواست کی تھی۔ کہ پروردگار ہمارے واسطے آپ کی دعا سے آسمان سے دستر خوان کھانے کا نازل فرمایا کرے۔ تو آپ نے عہد لیا تھا۔ کہ کھایا کرو مگر ذخیرہ نہ کرنا۔ اور باسی جمع نہ کرنا چنانچہ انہوں نے اقرار کیا پھر کھاتے اور رکھ بھی چھوڑتے۔ اور پوشیدہ طور پر بدعہدی بھی کرتے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے انکو بتلانا شروع کر دیا۔ کہ اے فلانے تو نے یہ کھایا۔ اور یہ جمع کر دیا ہے۔ تا آنکہ اللہ نے انکو خنزیر کر دیا۔ معالم میں سدی سے روایت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مکتب میں لڑکوں کو بتلا دیا کرتے تھے۔ کہ تیرے والدین نے یہ کھایا اور یہ تیرے لئے رکھ چھوڑا وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال روایات مختلف ہوں یا کچھ شانِ نزول یا وجہ اشاعت کوئی ہو۔ ہمارا مطلب حاصل ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام غیب جانتے تھے۔ اور قرآن کریم بیان فرماتا ہے۔ کہ لوگوں کو بتلایا بھی کرتے تھے۔ جس سے لوگوں کے ایمان درست ہوتے اور وہ عیسیٰؑ کی نبوت کی تصدیق کرتے تھے۔ ہم نے تمہید میں عرض کیا تھا۔ کہ قرآن کریم نے بعض انبیاء علیہم السلام کا غیب بیان فرمایا ہے۔ جو حضور سرور کائناتؐ سے پہلے تھے۔ اور حضور علیہ السلام کے مقابلہ میں مدارج نبوت میں کم درجہ رکھتے ہیں۔ پھر جب ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام اپنے مولا و آقا تاجدار کونین کو جمیع انبیاء سے افضل اور تمام مرسلین کا سردار مانتا ہے۔ تو کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے

انبیاء کے مقابلہ میں رسول اکرم محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمی مرتبت کو جائز رکھے اور یہ کہے کہ عیسےٰ علیہ السلام تو غیب جانتے تھے۔ یعقوب علیہ السلام غیب جانتے تھے۔ خضر اور موسیٰ علیہ السلام غیب جانتے تھے نوح علیہ السلام غیب جانتے تھے۔ یوسف علیہ السلام غیب جانتے تھے۔ مگر افضل الرسل محمد رسول اللہ نہیں جانتے تھے تمام انبیاء کو جو نعمت حضور علیہ السلام کے طفیل ملی وہ تو سب اس کے حامل ہیں۔ مگر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے محروم سمجھے جائیں؟

برین عقل و دانش بباید گریست

اللہ تعالےٰ ایسے کم فہم لوگوں کو توفیق عطا فرمائے۔ کہ مراتب سرکار دوجہاں کی معرفت اور تمیز کر سکیں۔

آیت ولا یحیطون بشیٍٔ من علمہ الا بما شآءَ (بقرہ)

ترجمہ اور وہ موجودات اس کے معلومات سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لا سکتے مگر وہ جس قدر جس کو دینا چاہے۔

تشریح:- اس آیت شریف سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ معلومات الٰہی کا احاطہ موجودات دنیا سے کوئی ہستی نہیں کر سکتی۔ مگر وہ خود جس کو جس قدر عطا فرماوے۔ تو گویا کل یا بعض علم کا احاطہ علم الٰہی سے کرنا اپنی اٹکل اور قدرت سے بدوں عطائے ایزدی محال ہے۔ اور جن کو عطائے الٰہی سے ہو جائے اس کا انکار صریح کج فہمی اور بلاعلمی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ نعمت کفران نعمت ہے اگر اظہار نعمت نہ کیا جائے۔ اور اسی رنگ میں کسی پر عطیہ کا انکار بھی جہالت ہے۔ یہ بھی عطائے الٰہی سے انحراف ہے۔ کیا اس آیت میں صاف مفہوم نہیں کہ علم الٰہی سے کسی کو حصہ ملنا اور بالخصوص انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام علیہم الرحمتہ والرضوان جو محبان خدا ہیں

ممکنات سے ہے۔ اور اگر اس آیت سے علم غیب کی نفی ہے۔ تو اس کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس کا مطلب ظاہری علم سے لیا جائے گا۔ تو ظاہری علم کا انکشاف تو اس کے نزول سے پہلے ہی ثابت ہے۔ اس جملہ سے ماقبل جملہ کا مطلب شفاعت کے متعلق تھا جیسے وہاں سے مخلوق کا شافع ہونا مراد ہے۔ خواہ وہ انبیاء۔ اولیاء صلحا۔ علما۔ شہدا ہوں۔ ایسے ہی علم کی بعض کے لئے مستثنٰے ہو کر دلیل ہے۔ کہ امر الٰہی سے علم غیب کا عطیہ ہو سکتا ہے۔ اور اس کا انکار شیطانی وسواس سے ہے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ وہ علم ربوبیت حق اور اس کے جلال کا ہے۔ بحر الحقائق میں لکھا ہے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کا علم ہے۔ کہ حق سبحانہٗ تعالےٰ نے شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا اور جو کچھ ہونیوالا ہے۔ جیسا کہ معراج کی حدیثوں میں وارد ہے۔ تفسیر معالم التنزیل میں ہے۔ کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میرے روبرو میری امت پیش کی گئی اپنی اصلی صورتوں میں جو مٹی میں تھی۔ جیسے کہ تمام اولاد حضرت آدم کے روبرو پیش کی گئی تھی۔ تب میں نے جان لیا ہر شخص کو جو مجھ پر ایمان لائے گا۔ اور جو ایمان نہ لا کر کافر رہے گا پس یہ بات جب منافقین کو پہنچی تو انہوں نے مسخری سے کہا کہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دعوے کرتے ہیں کہ میں جانتا ہوں اس شخص کو جو مجھ پہ ایمان لائے گا۔ اور جو کافر رہیگا۔ اگرچہ وہ ابتک پیدا بھی نہیں ہوا۔ حالانکہ ہم اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور وہ ہم کو بھی نہیں پہچان سکتے۔ اور نہ اب تک انہوں نے ہم کو جانا ہے۔ پس منافقین کی اس گفتگو سے اطلاع پاکر حضور فوراً منبر پہ تشریف فرما ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کر کے فرمایا۔ کہ جو میرے علم (غیب) پر طعن کرتے ہیں وہ قیامت

تک کے حالات مجھ سے پوچھیں میں ان سب کو بتلاؤں۔ بس کھڑا ہوا عبداللہ ابن حذیفہ جس کے باپ کے بارے میں لوگ شک کرتے تھے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرمائیے۔ میرا باپ کون ہے تو جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرا باپ حذافہ ہے۔ اسی وقت حضرت عمر رضی اللہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہم اللہ تعالےٰ سے راضی ہیں جو ہمارا رب ہے اور اسلام سے جو ہمارا دین ہے۔ اور قرآن سے جو ہمارا امام ہے اور حضور سے کہ ہمارے نبی اور رسول ہیں۔ بس معاف فرمائیے ہمیں اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔ تب فرمایا حضور نے کہ کیا تم نہیں پوچھتے اور تم نے پوچھنے سے بس کر دی۔ اس وقت حضور منبر سے اتر آئے کیا یہ دعوئے غیب نہیں تو اور کیا تھا۔ اسی قسم کی دوسری انتیس[۲۹] آیات ہمارے پیش نظر اور ہیں۔ جن کو ہم اس لئے درج نہیں کرتے کہ مختصر تحریر طول پکڑ جائیگی۔ جسے ضرورت ہو فقیر کا رسالہ علم غیب اور کتاب کلمۃ العلیا حضرت مراد آبادی دیکھئے۔

احادیث نبویہ فی علوم غیبیہ

حدیث (۱) عن طارق بن شہاب قال سمعت عمر رضی اللہ عنہ یقول قام فینا النبی صلی اللہ علیہ وسلم مقامًا فاخبرنا عن بدأ الخلق حتی دخل اهل الجنۃ منازلهم خفظ ذالك من حفظہ ونسیہ من نسیہ (صحیح بخاری جلد دوم کتاب بدء الخلق ص ۴۲۹ سطر ۲۵) ترجمہ:۔ طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سنا فرماتے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے میں (صحابہ میں) ایک مقام پر کھڑے ہوئے اور ہم کو خبر دیدی تمام ابتدائے دنیا سے لیکر قیامت تک کی باتوں کی

یہانتک کہ بہشتی اپنی جگہوں میں داخل ہوں۔ اور دوزخی اپنی جگہوں میں۔ یاد رکھا اس بات کو جس نے یاد رکھا۔ اور جو بھول گیا سو بھول گیا یہی حدیث مشکوۃ شریف صـ۵۰٦ سطر ٦ مطبع مجتبائی میں درج ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تعالےٰ سے مروی ہے۔ کہ رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہماری مجلس میں قیام فرما کر ابتدائے آفرینش سے لیکر جنتیوں اور دوزخیوں کے اپنی اپنی منزلوں میں داخل ہونے تک کی خبر دیدی۔ اور یاد رکھا اس کو جس نے یاد رکھا اور بھلا دیا جس نے بھلا دیا۔

حدیث (۲) عن انس رضی اللہ عنہ قال سئالوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم حتی احفرہ بالمسئلۃ مصعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم المنبر فقال لا تسئلونی عن شیئ الابینت لکم فجعلت النظر یمینًا وشمالاً فاذا کل رجل راسہ فی ثوبہ یبکی فانشاء رجل اذا لاحی یدعی الی غیر ابیہ فقال یا نبی اللہ من ابی فقال ابوک حذافہ ثم انشا عمر فقال رضینا باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد رسولاً۔ نعوذ باللہ من سوء الخاق فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما رایت فی الخیر والشر کالیوم قط انہ صورت لی الجنۃ والنار حتی رایتھما دون الحائط۔ صحیح بخاری۔ جلد چہارم کتاب الفتن صـ۱٦۱ سطر ۳۵ مطبوعہ مصری، ترجمہ:۔ یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے علم غیب کی بابت پوچھا۔ اور سوال کرنے میں بہت اصرار کیا۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا پوچھو جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ تاکہ میں بیان کروں۔ ادھر ادھر دائیں بائیں میں نے نظر

کی تو معلوم ہوا کہ ہر ایک شخص اپنے منہ پر کپڑا ڈالے رو رہا ہے۔ اتنے میں کھڑا ہوا ایک آدمی جس کو جھگڑے کے وقت اس کے باپ کے سوا اور کسی کی نسبت کرتے تھے۔ اُس نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیے۔ میرا باپ کون ہے۔ اس وقت حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرا باپ حذافہ ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوراً کھڑے ہو گئے۔ اور عرض کی یا رسول اللہ ہم راضی ہوئے اللہ پر جو ہمارا رب ہے۔ اور اسلام پر جو ہمارا دین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ہمارا رسول ہے۔ ہم خلق کی برائی سے پناہ مانگتے ہیں۔ پس حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے آج کے دن کا سا خیر اور شر نہیں دیکھا۔ تحقیق وہ متشکل دکھائی دیئے بہشت اور دوزخ یہانتک کہ میں نے دونوں کو اس دیوار کے ادھر دیکھا۔

تمام احادیث کا عربی متن چونکہ کتاب کا حجم زیادہ کر دیگا۔ لہذا سب کا ترجمہ بہ تفصیل حوالہ لکھا جاتا ہے۔ جو دیکھنا چاہے۔ شک نکال لے۔ حدیث (۳) مشکواۃ شریف صـ۵۴۳ سطر ۱ باب المعجزات ہاکا ترجمہ عمرو بن اخطب انصاری سے روایت ہے۔ کہا نماز پڑھائی ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فجر کی۔ اور منبر پر چڑھے پس ہمارے لئے خطبہ فرمایا۔ کہ یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔ پھر اترے منبر سے اور ظہر کی نماز پڑھی پھر منبر پر چڑھے۔ اور خطبہ فرمایا۔ یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت آگیا پھر اترے اور نماز عصر ادا کی۔ پھر منبر پر چڑھے اور ہمارے لئے خطبہ فرمایا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوا۔ یعنی تمام روز وعظ ہی میں گذرا پس خبر دی ہم کو ساتھ اس چیز کے کہ ہونیوالی ہے۔ قیامت تک یعنی وقائع اور حوادث اور عجائبات قیامت تک کے بیان فرمائے پس اسمیں بہت سے معجزے ہوئے کہا عمرو نے پس دانا تریں ہمارا ہے (یعنی اب) بہت یاد رکھنے والا اس دن کو

(از مظاہر الحق مطبوعہ نول کشور ربع چہارم ص۶۱۳) اور یہی حدیث (حدثنی ابو زید) سے شروع ہوتی ہے۔ صحیح مسلم جلد دوم ص۳۹۰ سطر ۲۷ میں۔ جو عمرو بن اخطب سے روایت کی گئی ہے لیکن بعض کی تقدیم و تاخیر ہے۔ حدیث (۴) مشکوٰۃ شریف کتاب الفتن فصل اول ص۶۱۴ سطر ۸ کا ترجمہ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کھڑے ہوئے ہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہونا یعنی خطبہ پڑھا اور وعظ فرمایا۔ اور خبر دی ان فتنوں کی جو ظاہر ہوں گے نہیں چھوڑی کوئی چیز کہ واقع ہونے والی تھی اس مقام میں قیامت تک۔ مگر کہ بیان فرمایا اس کو یاد رکھا اس شخص نے جس نے یاد رکھا اور بھول گیا اس کو جو شخص اس کو بھول گیا۔ یعنی بعضوں نے یاد رکھا اور بعضوں نے بھلا دیا۔ کہا حذیفہ نے کہ تحقیق جانتا ہے اس قصہ کو میرے ان یاروں نے۔ یعنی جو موجود تھے صحابہ رضوان اللہ علیہم سے اور بعض نہیں جانتے ہیں۔ اس کو مفصل اس لئے کہ واقع ہوا ہے۔ ان کو کچھ نسیان جو خواص انسان سے ہے۔ اور میں بھی انہیں میں سے ہوں کہ جو کچھ بھول گئے ہیں۔ جیسے کہ بیان کیا اپنے حال کو اور تحقیق شان یہ ہے کہ البتہ واقع ہوئیں ان چیزوں میں کہ خبر دی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ وہ چیز کہ تحقیق بھول گیا ہوں میں اس کو۔ پس دیکھتا ہوں میں اس چیز کو پس یاد میں لاتا ہوں میں اس کو جیسے کہ یاد دلاتا ہے شخص چہرہ شخص کا یعنی بطریق اجمال و الہام کے جبکہ غائب ہوتا ہے۔ اس سے اور فراموش کرتا ہے۔ اس کو ساتھ تفصیل و تشخیص کے پھر جبکہ دیکھتا ہے۔ اس کو پہچان لیتا ہے۔ اس کو شخص یعنی ایسے ہی میں وہ باتیں بھولا ہوا ہوں، لیکن جبکہ کوئی بات ان سے واقع ہوتی ہے۔ تو پہچان لیتا ہوں۔ کہ یہ وہی ہے کہ جس کی خبر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔

نقل کیا اس کو بخاری اور مسلم نے۔ اور اسی طرح یہ حدیث کتاب مظاہرالحق صـ۳۱۳ سطر ۱۳ میں درج پائی گئی ہے۔ اور کچھ الفاظ کی کمی سے اس مضمون کی حدیث حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحیح مسلم جلد دوم صـ۳۹۰ سطر ۱۸ میں ہے۔ اور کتاب اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی جلد چہارم صـ۲۹۶ سطر ۱۰ میں بھی یوں ہی ہے۔ اور اس کی فارسی شرح کی عبارت یوں ہے۔ روایت از حذیفہ است کہ گفت ایستاد در ما آنحضرت یعنی خطبہ خواند و وعظ گفت۔ ایستادنی نگذاشت۔ چیزے کہ باشد۔ وقوع یابد۔ درآں مقامے کہ ایستادہ بود تا روز قیامت نگذاشت دریں مقام چیزے از ما وقائع کہ شدنی است تا روز قیامت۔

حدیث (۵) کتاب صحیح بخاری جلد چہارم باب الاعتصام بالکتب والسنتہ صـ۱۸۵ سطر ۱۹ کا ترجمہ:۔ حضرت ظہری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ مجھ کو خبر دی انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تحقیق حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت سورج ڈھلا۔ اپنے گھر سے باہر تشریف لائے اور نماز ظہر پڑھی۔ اور منبر پر تشریف فرما ہوئے اور قیامت کے آنے کا حال بیان فرمایا۔ اور فرمایا کہ اس سے پہلے بڑے بڑے اہم امور ہونے والے ہیں۔ پھر فرمایا کوئی شخص ہے کہ مجھ سے کسی چیز کا سوال کرے۔ پس پوچھ لے مجھ سے قسم ہے اللہ کی جو کچھ خبر بھی پوچھو گے۔ میں بتاؤں گا۔ جب تک میں یہاں کھڑا ہوں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ لوگ بہت روئے۔ اور بہت دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوال کرو مجھ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ

فرماتے ہیں کہ ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوا
اس نے پوچھا میرے داخل ہونے کی جگہ کہاں ہے۔ فرمایا حضور نے
کہ تیری جگہ دوزخ میں ہے۔ پھر اٹھا عبداللہ بن حذافہ اور سوال کیا۔ کہ یا رسول
اللہ میرا باپ کون ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تیرا باپ حذافہ ہے
پھر فرمایا۔ کہ اور پوچھو مجھ سے آخر حدیث تک ..... فقط

حدیث (۶) مشکوۃ شریف باب المساجد ص۶۹ سطر ۷ کا
ترجمہ عبدالرحمن بن عائش سے مروی ہے۔ کہ انہوں نے کہا۔ کہ
فرمایا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے اپنے رب عزو
جل کو اچھی صورت میں دیکھا۔ فرمایا۔ رب نے کہ ملائکہ کسی بات
میں جھگڑا کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ تو ہی خوب جانتا ہے۔ فرمایا
سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ پھر میرے رب عزوجل نے
اپنی رحمت کا ہاتھ میرے شانوں کے درمیان رکھا میں نے اسکے وصول فیض کی
سردی اپنی دونوں چھاتیوں کے درمیان پائی پس جان لیا میں نے جو کچھ کہ آسمانوں
اور زمینوں میں ہے اور حضرت صلی اللہ علیہ سلم نے حال کے مطابق یہ آیت
تلاوت فرمائی: وکذالک الآیۃ یعنی دکھائے ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو
ملک آسمانوں کے اور زمینوں۔ کے تاکہ وہ یقین کرنیوالوں میں سے ہو جائیں
اس عبارت میں وضع کف مزید فضل اور نہایت تحقیق اور ایصال فیض اور عنایت
وکرم اور تائید و انعام سے کنایہ ہے۔ اور سردی پانا دونوں چھاتیوں
میں وصول اثر فیض اور حصول علوم سے کنایہ ہے۔ اس حدیث شریف
سے آفتاب کی طرح روشن ہو گیا۔ کہ ہمارے مولا و آقا صلی اللہ
علیہ وسلم کو ہر چیز کا علم مرحمت ہوا۔

حدیث (۷) صحیح بخاری مصری جلد چہارم کتاب الفتن ص۱۶۲
سطر ۱۴ کا ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ نے فرمایا۔ کہ فرمایا رسول

خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ یا اللہ ہمارے ملک شام میں برکت فرما اور اے اللہ ہمارے ملک یمن میں برکت دے۔ اور کہا نجد والوں نے کہ ہمارے ملک نجد کے واسطے بھی برکت کی دعا فرمایئے پھر دوبارہ فرمایا حضور علیہ السلام نے کہ یا اللہ ہمارے ملک شام میں برکت عطا فرما۔ اور ہمارے ملک یمن میں برکت دے پھر نجدی بولے کہ ہمارے ملک نجد میں بھی برکت ہو۔ پس راوی کا گمان ہے۔ کہ یہ دعا تین دفعہ مانگی گئی۔ اور نجد والوں کے حق میں فرمایا۔ کہ وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے۔ اور وہاں ایک شیطان کا سینگ نکلے گا۔ یہ حدیث شریف بطور پیشین گوئی کے ہے جس پر علمائے محدثین متفق ہیں۔ کہ اس کا ظہور ۱۲ھ میں ہو چکا ہے۔ تفصیل واقعہ کے لئے دیکھو کتاب رد المختار شامی کے باب النجات میں اس کی مکمل تشریح ہے۔

حدیث (۸) مواہب اللدنیہ میں طبرانی سے بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہ مروی ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ جلشانہ نے میرے لئے دنیا کو ظاہر فرما دیا۔ پس میں دنیا کی طرف اور جو کچھ اس میں تا قیامت ہونے والا ہے۔ سب کی طرف اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے اپنی اس ہتھیلی کی طرف

علامہ زرقانی شرح مواہب قسطلانی جلد ۷ صفحہ ۲۳۴ میں لکھتے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دنیا ظاہر فرمائی۔ حضور علیہ السلام نے تمام اس میں کے حالات و حقائق کا احاطہ فرما لیا۔ اور یہ ارشاد کرنا کہ میں اس کو اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے۔ سب کو مثل اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کے دیکھ رہا ہوں۔ اور ملاحظہ فرما رہا ہوں۔ اس سے حقیقتاً دیکھنا

آنکھ کا مراد ہے۔ نہ کہ نظر کے مجازی معنی فرمائے گئے ہیں۔

الغرض احادیث کی تعداد اس حد تک ہے۔ کہ اگر ان سب کو یہاں ذکر کیا جائے۔ تو ایک ضخیم کتاب علیحدہ تیار ہو جائے۔ اصلاح عقیدہ اور درستیٔ ایمان کے لئے جو نقل کر دی ہیں یہی کافی ہیں اور خدا کے فضل سے ہمارے مفہوم کی پوری پوری وضاحت فرماتی ہیں۔ اور ان سے یہ ثابت ہو گیا ہے۔ کہ احادیث مندرجہ کے تمام ارشادات و ملفوظات میں حضور علیہ السلام والتحیۃ کا آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے جان لینے کا ارشاد و تمام علوم جزوی و کلی کے حاصل ہونے اور احاطہ کرنے کا بیّن ثبوت ہے اور یہ کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم گذشتہ اور آئندہ تم سے پہلوں اور تم سے بعد والوں۔ دنیا اور عقبیٰ کے جمیع احوال کی آسمانوں اور زمینوں کے مغیبات کی خبر دیتے ہیں۔ مگر اس سے جلشانہٗ کے علم سے کوئی برابری نہیں۔ اور نہ ہی اہل سنت اس کے قائل ہیں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ نبی کریم صلوٰۃ اللہ علیہ نے ہم سے ایسے وقت میں مفارقت فرمائی کہ کوئی پرندہ ایسا نہیں۔ کہ اپنے بازوؤں کو ہلائے۔ مگر حضور علیہ السلام نے ہم سے اس کا بھی بیان فرما دیا ہے۔ شعر

وہ اندھے ہیں جو ہیں منکر نبی کی غیب دانی کے
اندھیرے میں ہیں ابتک شمع کافوری کے پروانے

پیشینگوئیاں (معجزات علم غیب)

ذَالِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

اگر آغاز عالم سے یہ مقدس سلسلۂ فیوض نہ ہوتا اور نبوت و رسالت انسان کی دستگیری اور رہنمائی نہ فرماتی تو یقیناً یہ انسان حیوانوں سے بدتر ہوتا۔ اس کی علمی اور عملی قوتیں درختوں، پتھروں اور طاقتور حیوانوں کی پرستش کے لئے وقف ہو جائیں آج کی ترقی یافتہ دنیا کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ اور انسان باوجود عقل رکھنے کے بھی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا۔ اُس کو ربانی امانت کا تفویض ہوتا خلافت کا منصب عطا کیا جانا۔ ظاہری و باطنی محاسن سے نوازا جانا۔ اس کے اندر جسمانی ہی نہیں بلکہ دماغی اور روحانی قوتیں بھی مرکوز ہونا اور اشرف المخلوقات کے خطاب سے ممتاز فرمایا جانا اس امر کا مقتضی تھا۔ کہ قدرت کی طرف سے اس کی اصلاح و ترقی کے اسباب بھی فراہم کئے جاتے اس لئے یہ انتظام ملحوظ رکھا گیا۔ کہ اس کی اصلاح و تعلیم کے لئے روحانی معلم یعنی انبیاء و مرسلین کرام علیہم السلام وقتاً فوقتاً مبعوث ہوتے رہے تاکہ عرفان نفس۔ عرفان رسالت اور عرفان رب العزت جل شانہٗ کی جو طاقتیں انسان اپنے ساتھ لیکر دنیا میں آیا ہے انکی نشو و ارتقاء اور تعلیم و تربیت کا ظہور ہو۔ اور انسان محض مادیات کی نظر فریبیوں اور سرور و نشاط کی رنگ آفرینیوں میں مدہوش ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو فراموش نہ کردے۔ اور اپنی

حقیقت انسانیہ کو نہ بھول کر اپنے مقصد حیات اور منتہائے کمال کو ہروقت اپنے سامنے رکھے۔ کیونکہ رسالت کی علت غائی یہی تھی کہ کفرو ضلالت میں پھنسے ہوئے انسان کو اس کے خالق و معبود سے شناسا کرادے۔ اور اس کی نعمتوں سے صحیح طور پر متمتع ہونے کا ڈھنگ سکھادے۔ اگر عبد و معبود کے درمیان رسالت کا واسطہ نہ ہوتا تو کائنات عالم کے اجتماعی نظام کو وہ تباہی خیز نقصان پہنچتا۔ کہ یہ کارخانۂ دنیا برباد ہوکر رہ جاتا۔ اور تخلیق عالم ایک فعل عبث ثابت ہوتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبوت و رسالت کا وجود یقینی ہے اور افراد انسانی میں پائی جاسکتی ہے۔ اب اگر کسی خاص شخص کے متعلق بحث ہو کہ وہ نبی ہے۔ یا نہیں تو نبوت و رسالت کی شناخت کے لئے معجزہ کو دلیل قرار دیا گیا ہے۔ یعنی جس شخص سے معجزہ صادر ہو اسکی نسبت یقین کیا جائے گا۔ کہ خداوند عالم جل و علا شانہٗ نے اس سے خطاب کیا ہے۔ اور وہ اصلاح عالم کے لئے خداوند عالم کا فرستادہ ہے۔ لہٰذا ظہور معجزہ کی وجہ یہ ہی معلوم ہوئی ہے، کہ جس طرح ایک مذہب کے لئے صرف عقلی طور پر اپنی عمدگی دکھلانا کافی نہیں ہے۔ ایسا ہی ایک ظاہری راستباز کے لئے صرف یہ دعویٰ کافی نہیں ہے کہ وہ خدا کا فرستادہ ہے۔ اس کے لئے ایک امتیازی نشان اور مخالفین کے لئے ایک معقول اور زبردست دلیل ہونی چاہیئے جو اس کی سچائی پر گواہ ہو اور مکاروں اور راستبازوں میں روز روشن کی طرح فرق بتلادے۔ اور وہ نشان

ممکن معجزہ ہے جسکی سات شرطیں ہیں۔
۱ خدا کا فعل ہو ۲ خارق عادت ہو ۳ اس کا معارضہ نا ہو ۴ مدعی نبوت سے ظاہر ہو ۵ دعوے کے موافق ہونا ۶ نبی کا مکذب نہ ہو ۷ دعوے پر مقدم ہو۔
لفظ معجزہ لغت عرب میں اعجاز سے نکلا ہے۔ جس کے معنی مقابل کو عاجز و بے طاقت کر دینے کے ہیں۔ یعنی کسی شخص کو اس کی مثل لانے سے عاجز کر دینا۔ اور اصلاح میں معجزات سے مراد وہ امور خارق عادت ہیں جو انبیاء علیہم السلام سے بطور اظہار اثبات نبوت صادر ہوں اور رسالت کے جھٹلانے والوں کو اس کی نظیر لانے سے عاجز کردیں۔ اور جن سے ان کی نبوت پر استدلال کیا جا سکے۔ معجزہ کی بحث شروع سے علم کلام کا ایک معرکتہ الآراء مسئلہ رہا ہے۔ اور اب تو جس قدر زیادہ انسان حقائق اشیاء سے واقفیت بہم پہنچاتا جا رہا ہے۔ اور طبیعتوں میں حقیقت طلبی اور غور و فکر کا مادہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اور بھی طرح طرح کے اعتراضات اس پر بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس مسئلہ کے مشکل ہونے کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ موجودہ زمانہ تو الگ رہا۔
حضرت امام رازی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ کے متعلق لکھا ہے۔ کہ انقلاب عادت کا قائل ہونا صعب اور مشکل ہے اور ارباب عقل و فہم اس سے مضطرب ہیں۔ خود مسلمانوں میں ایک فرقہ نیچری ہے۔ جس کو معجزات سے انکار ہے اور وہ کسی امر خارق عادت کے محال ہونے کے قائل ہیں اور جمہور اہل اسلام سے اس مسئلہ میں سخت اختلاف رکھتے ہیں۔ لہذا ضروری ہوا کہ معجزات پر جس قدر اعتراضات ہوتے ہیں ان پر مختصر مگر

مدلل بحث کر کے ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔(نعوذ منہ تعالیٰ)
جو لوگ امر خارق عادت کے منکر ہیں۔ ان کے خیال فاسد
کی بنیاد محض اس یقین پر ہے۔ کہ عالم (جہان) میں
جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ علت و معلول سبب و مسبب شرط و مشروط
اور مؤثر و مؤثر کے سلسلہ کے بغیر نہیں ہوتا۔ اسی سلسلہ اور نظام کا نام فطرت
اور قانون قدرت ہے۔ اور اس کی طرف قرآن کریم کی اس آیت
میں اشارہ ہے۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ۔ یعنی خدا کی خلقت میں
تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء میں جو خواص
وتاثیرات رکھ دیئے ہیں۔ وہ ان سے کبھی بھی منفک نہیں ہو سکتے
جیسے آگ کا کام جلانا ہے۔ لہذا آگ اپنی اس تاثیر اور خاصیت
کو کھو نہیں سکتی بلکہ (نعوذ باللہ) خود خداوند عالم بھی تبدیلی خاصیت
نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر نیچر کے دلدادہ جس بات کو اپنے علم وعقل
سے خارج سمجھتے میں فوراً اس کے متعلق حکم لگا دیتے ہیں کہ یہ ناممکن
ہے۔ اور قانون قدرت کے خلاف ہے مگر وہ قانون قدرت کی
حقیقت کو نہیں جانتے۔

دنیا میں جس قدر بڑے بڑے فلاسفر اور دانا گذرے ہیں
انہوں نے صدق دل سے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ کہ خداوند
عالم کے علم و قدرت کے سامنے انسان کا علم ایک ذرہ کے
برابر بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ دنیائے سائنس کا شہرۂ آفاق
شاہسوار جو ان فلاسفروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جن کے اقوال
کو خود باختہ نیچری نعوذ باللہ وحی الہٰی سے زیادہ درجہ دیتے ہیں
خدا کے علم و قدرت کے متعلق لکھتا ہے۔

خدا کی کمف علم ہے۔ لیکن اس کا علم کیا ہے۔ انسان

کا علم تو اسکی قوت تفکر میں ہے لیکن علم اقدس کسی تفکر و تامل کا محتاج نہیں۔ باقی رہی قدرت الٰہی تو قدرت الٰہی کا یہ حال ہے۔ کہ انسان کو اپنی قوت عمل کے لیئے وسائل عمل کی ضرورت ہوتی ہے لیکن خداوند کائنات کو کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں اور قوت الٰہی خود اپنی قوت سے عمل کرتی ہے۔ خداوند عالم قادر ہے کیونکہ وہ ارادہ رکھتا ہے اور اس کا ارادہ ہی اس کی قدرت ہے

یہ کوئی معمولی شخص کا اعتراف عجز نہیں اور یہ رائے عاجزانہ صرف ڈوشو ہی نہیں رکھتا۔ بلکہ تمام تر فلاسفر یہی کہتے ہیں کہ ہمارے علم و عقل کی حقیقت یہ ہے کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور ہمارے علم و عقل کو خدا کے علم و قدرت کے مقابلہ میں اس قدر بھی وقعت نہیں جیسے زمین و آسمان کے مقابلہ میں ایک ذرہ کی ہو۔ نیز فلاسفروں کا ہی قول ہے۔ کہ چونکہ انسان کا علم و عقل نہایت محدود اور ناقص ہے۔ اس لئے وہ قانون الٰہی کی حد بندی بھی نہیں کرسکتا۔ اور کسی امر کی نسبت حد لگا دینا دو متناقض اقراروں کو اپنے کلام میں جمع کرنا اور خدائے قدوس کے لامحدود علم و قدرت کو اپنی عقل کے دو انچی گز سے ناپ لینے کا مضحکہ انگیز دعوٰے کرنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علوم انسانی عقل کے ماتحت ہیں۔ اور عقل حواس ظاہری اور باطنی کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہ آلہ قوانین قدرت کی شناخت کا خود محدود ہے۔ ہمارے معلومات بیشتر وہ ہیں۔ جو خود ہمارے حواس نے اپنی کوشش سے ہمارے لئے وضع اور جمع کئے ہیں۔ مگر ان

آیات حواس میں پروردگار عالم نے اسی قدر قوت اور تیزی عنایت فرمائی ہے۔ جو اس حکیم مطلق نے ہمارے لئے ضروری اور مناسب سمجھیں۔ لہذا عقل انسانی کا یہ منصب نہیں کہ وہ ہر ایک چیز کی حقیقت سمجھ لینے کا دعوے کر بیٹھے۔ حتیٰ کہ قوانین الہٰیہ بھی اس کے علم و عقل کے ماتحت ہو جائیں۔ پس اس لحاظ سے ہم وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ لامحدود بذریعہ محدود کے دریافت نہیں ہو سکتا۔ فلہذا جن مشاہدات و تجربات اور نوامیں الہٰیہ کو ہم معلوم شدہ اور یقینی خیال کرتے ہیں وہ بھی دراصل کامل طور پر معلوم نہیں ہوتے۔

پھر بدیہات کے متعلق انسان کے علم کی اصلیت اور بنیاد محض اتنی ہے کہ نظام قدرت میں جو چیزیں ہمیشہ ایک ہی طرح پر وقوع میں آتی رہتی ہیں۔ ان کے استقراء سے ایک علم کلی بنا لیتا ہے حالانکہ یہ بنیاد ہی غلط ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بہت سے واقعات ایسے ہوں جو ہمارے مشاہدہ میں نہ آئے ہوں۔ پھر زبردستی ہم تمام واقعات کو کیسے ایک کلی کے ماتحت لا سکتے ہیں کیا ہماری علم و عقل نے عالم کے تمام علل و اسباب کو معلوم کر لیا ہے اور کیا انہوں نے علت و معلول کے تعلق کو قطعی طور پر سمجھ لیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو وہ کس معیار پر قوانین الہٰیا کی حدبندی کر رہے ہیں۔ اور اعجاز خدا کے علم و قدرت کو اپنے علم و عقل کے دائرے میں کیونکر محصور کرتے ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ انسان کا سمجھا ہوا قانون قدرت کوئی چیز نہیں اور خواص نیچریہ قبول کرانے پر کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ محض تحکم ہی تحکم ہے۔ اور قانون قدرت کی بنا پر کسی امر خارق عادت کا انکا

کرنا کسی طرح بھی جائز اور معقولیت پر مبنی نہیں - یہ بھی واضح رہے کہ ہم خواص اشیاء کے تو منکر نہیں جیسے نیچریوں کو ان کے ثبوت پر دلائل قائم کرنے کی تکلیف گوارا کرنا پڑے بلکہ ہم خواص اشیاء کو مانتے ہوئے اس بات کے قائل ہیں کہ عقلاً یہ کوئی ضروری نہیں اور نہ ہی اس پر کوئی دلیل ہے۔ کہ خواص اشیاء کسی حال میں بھی ان سے جدا نہ ہوں - یعنی نعوذ باللہ خداوند عالم جلشانہ کو بھی یہ اختیار اور قدرت نہ ہو - کہ وہ اشیائے عالم کا موجد اور خالق ہونے کے باوجود ان کے خواص کو کسی وقت بھی سلب نہ کر سکے - لہذا عقلاً بھی یہ ممکن ہے کہ خواص اشیاء میں موجود بھی رہ سکتی ہیں - اور ان سے معدوم بھی ہو سکتی ہیں عقل نہ ان کے موجود ہونے کو محال سمجھتی ہے - اور نہ انکے معدوم ہونے پر کوئی استحالہ لازم رکھتی ہے بس خواص اشیاء خداوند عالم جل وعلاشانہ کے تحت و تصرف میں ہیں خواص اشیاء اپنے موصوفات کے لئے ضروری نہیں ہیں انکے سلب پر کسی سبب سے یا بلا سبب مولا کریم قادر ہے - اور وہ کسی چیز کا پابند نہیں -

اس کی واضح مثال یہ ہے کہ سبز جھنڈی سے ریل چلتی ہے اور سرخ جھنڈی سے رک جاتی ہے - یعنی ریلوے والوں نے ریل کے چلنے اور رکنے پر یہ قائدہ بنا لیا ہے - لیکن اگر وہ اپنی عادت اور قانون کو بدلنا چاہیں اور اس کے خلاف کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں - یہی مثال قوانین الٰہیہ کا ہے - یعنی جو قوانین قدرت اور اسباب معلوم ہوئے ہیں - وہ جھنڈی کی مانند ہیں اور انہی کے مطابق کارخانہ قدرت چل رہا ہے - اور یہ انتظام کر رکھا ہے - کہ جب کوئی طبعی سبب پایا جاتا ہے تو اپنی عادت کے موافق اس کے مسبب کو بھی موجود کر دیتا ہے - اور اگر وہ چاہے تو اس کے خلاف بھی کر سکتا ہے - اور جب قادر قیوم خدا کسی مصلحت سے اپنے مستمرہ قانون کے خلاف

کوئی امر پیدا فرما دیتا ہے۔ تو اس کو خرق عادت (معجزہ) کہتے ہیں
دراصل جو چیز عام عادت کے خلاف واقعہ ہوتی ہے۔ وہ خرقِ عادت سے تعبیر کی جاتی ہے گو وہ اصولِ قدرت کے خلاف نہیں ہوتی مگر اس کے اسباب ایسے دقیق اور مخفی ہوتے ہیں کہ منکرین معجزہ کے علم وعقل سے خارج نظر آتے ہیں۔
معجزہ طبیعت کے لئے ایک بدیہی امر ہیں جس کو ہر شخص پہلی ہی نظر میں تسلیم کرلے۔ بلکہ ایسے ہی عقلمند وراستباز۔ نیک طبنت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جو فراست وفہم۔ دوربینی و باریک نظری۔ انصاف پسندی وحقیقت پرستی۔ خدا ترسی وتقویٰ شعاری کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تفہیمات الٰہیہ میں لکھتے ہیں۔ کہ معجزات وکرامات امور اسبابی ہیں۔ لیکن ان پر گمان غالب ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے اور اسبابی امور سے ممتاز ہیں اس لئے اہل سنت جو خرق عادت کے قائل ہیں۔ اس سے ان کی مراد صرف یہ ہے۔ کہ وہ واقعہ جو عام عادت جاریہ کے خلاف وقوع میں آیا ہے۔ گو وہ بظاہر عادت جاریہ کے خلاف واقع ہوا ہے لیکن درحقیقت خلاف قانونِ قدرت نہیں۔ ہاں انسانوں کے خود ساختہ قانون قدرت کے ضرور خلاف ہے۔ اور اسکی حقیقت پیچھے ذکر ہو چکی ہے۔ پس نتیجہ کے طور پر حسب ذیل امور ثابت ہوئے۔

۱۔ معجزہ ممکن الوقوع اور خدا کا فعل ہے۔

۲۔ مدعی نبوت سے معجزات صادر ہوتے ہیں۔

۳۔ نبوت اور پیغمبری کا وجود ہے۔

۴۔ جس سے معجزہ صادر ہوتا ہے وہ نبی ہوتا ہے۔

اب یہ سمجھنا باقی ہے۔ کہ امر خارق عادت کی جو کسی شخص سے

ظاہر ہو دو قسمیں ہیں۔ یا تو اس کا ظہور شخص مذکور سے کسی دعوے کے ساتھ ہو گا۔ یا بغیر دعوے کے۔ اگر دعوے کے ساتھ ہو گا تو اس کی چار قسمیں ہیں یعنی وہ دعوے یا الوہیت کا۔ یا نبوت کا۔ یا ولایت کا۔ یا سحر کا ہو گا۔ مدعی الوہیت سے ظہور خوارق ممکن ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص اس کا معارض ہو۔ اور اسے عاجز کر دے۔ جیسا کہ نقل کیا گیا ہے۔ کہ فرعون الوہیت کا مدعی تھا۔ اور اس سے خارق عادت امور ظاہر ہوتے تھے۔ اور ایسا ہی دجال کے حق میں بھی منقول ہوا ہے۔ ایسے شخص سے ظہور خوارق اس لئے جائز ہے کہ اس کا جھوٹا ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ اس کی شکل و صورت، اور اسکی جسمیت و خلقت اس کے کذب پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس کے ہاتھ پر امر خارق عادت کے ظہور سے التباس واقع نہیں ہوتا۔

اور مدعی نبوت دو حال سے خالی نہیں یا حقیقتاً صادق ہو گا یا کاذب۔ اگر وہ واقعی صادق ہے تو اس کے ہاتھ سے ظہور خوارق واجب ہے۔ اور اگر وہ کوئی امر بھی خارق عادت نہ دکھلا سکے تو فی الحقیقت وہ نبی نہیں ہے۔ جو لوگ نبوت انبیاء کے قائل ہیں اس پر ان سب کا اتفاق ہے۔ کہ اگر وہ مدعی نبوت واقع میں کاذب ہے۔ تو اس سے ظہور خوارق جائز نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض ظاہر ہو بھی تو اس کے لئے کسی معارض کا ہونا ضرور ہے۔ جو اس کو مغلوب کر سکے اور نیچا دکھا سکے۔

مدعی ولایت سے ظہور خوارق بالاتفاق جائز ہے۔ مگر اس بارے میں اختلاف ہے۔ کہ آیا یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔ کہ وہ کرامات کا دعوے کرے۔ اور اس کے دعوے کے مطابق کرامات کا ظہور ہو۔ مدعی سحر سے اہل سنت کے نزدیک ظہور خوارق جائز ہے۔ مگر معتزلہ کے نزدیک جائز نہیں۔ اگر وہ شخص جس سے امر خرق عادت ظاہر ہو کسی امر کا مدعی

نہیں ہے۔ تو اسکی دو صورتیں ہیں یا وہ نیک کردار یا عبادت گذار ہو گا یا بدعمل گنہگار۔ اگر نیک کردار یا عبادت گذار ہے۔ تو ولی اللہ ہے اور اس سے جو امر خرق عادت ظاہر ہو گا۔ اس کو کرامت کہیں گے۔ اور اگر فاسق بدکار ہے تو اس سے جو امر خرق عادت ظاہر ہو گا وہ استدراج کہلائیگا۔

معجزہ کی اس مختصر سی بحث کے بعد اب یہ جاننا باقی ہے۔ کہ ظہور معجزات بھی دو قسم پر ہے۔ ایک وہ جو حضور علیہ السلام کے دست مبارک پر آپکی حیات طیبہ ظاہری میں ظہور پذیر ہوئے اور دوسرے وہ ہیں جو حضور علیہ السلام کے ارشادات میں آنے والے حالات و زمانہ کے متعلق بطور پیشگوئی کتب حدیث اور کتاب اللہ میں درج ہیں۔ اور ان اوراق میں وہی معجزات اہل نظر و فہم کے آگے پیش کئے جائیں گے جو بطور پیشگوئی حالات پیشین آنے والوں کے متعلق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے۔ اور وہ بعض بے شمار سو فیصدی حضور علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ اور بعض ابھی انگنت قیامت تک ظاہر ہوتے رہیں گے۔ کیونکہ حضور پرنور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا حصر و حساب ناممکن اور فہم انسانی سے بالاتر ہے اور یہی حضور علیہ السلام کے علم غیب اور کمال وسعت علم کا مظاہرہ ہے۔

چنانچہ غزوۂ ہند کی پیشینگوئی ارشاد نبوت سے تین سو ترانوے سال بعد ظہور پذیر ہوئی جو سنن نسائی اور بیہقی میں حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کی گئی ہے: قَالَ وَعَدَنَا رَسُول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم غزوۃ الھند

یعنی وعدہ فرمایا ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مسلمان ہندوستان میں غزا کریں گے۔ معلوم کیجئے کہ حضرت امام نسائی رحمۃ اللہ

علیہ کا سال ولادت ۲۱۵ھ اور وفات ۳۰۳ھ ہجری المقدس میں ہے
اور ہندوستان میں حضرت سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۳۹۳ھ
ہجری میں بہ نیت جہاد حملہ کیا۔ گویا سنن نسائی کی اشاعت کے
تقریباً ایک صدی گذرنے کے بعد حضور علیہ السلام کی پیشینگوئی غزوہ
ہند پوری ہوئی۔ اور کتب اسلامیہ میں ہند کی تصریح یہ کی گئی ہے۔ کہ جو
ممالک دریائے اٹک کے اس پار واقع ہیں وہ ہند کہے جاتے ہیں اور
دریائے سندھ سے پار رہنے والوں کو ہند کی مناسبت سے ہی
ہندو کہا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ لا تقوم الساعۃ
حتی تخرج نار من الحجاز تضئ اعناق الابل ببصرای۔ یعنی
قیامت نہیں آئے گی۔ جب تک حجاز میں ایسی آگ نمایاں نہ ہو گی۔
جو بصریٰ کے اونٹوں پر اپنی روشنی ڈالیگی۔ حضور علیہ السلام
کی اس پیشینگوئی کا اظہار یکم جمادی الثانی ۶۵۴ھ ہجری کو ہوا
اور حجاز کے پہاڑی سلسلوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔ جو مدینہ
طیبہ کے بالکل قریب تھا۔ اس سے آتش فشانی شروع ہوئی اور
۲ جمادی الثانی کو زلزلوں کے جھٹکے محسوس ہوئے۔ ۳ جمادی
الثانی کو زلزلوں کی رفتار نے زیادہ شدت اختیار کرلی۔ پھر تاریخ
کو زلزلہ کے ساتھ گرج اور گونج کی ہیبت ناک آوازیں پیدا
ہونے لگیں ۵ تاریخ کو زمین سے آسمان تک غلیظ وتاریک
دھوئیں کے بادل چھا گئے۔ اور آگ کے بے پناہ شعلے فضا میں
بلند ہونے لگے اور پہاڑ کے پتھر پگھل پگھل کر بلندی سے زمین
پر لڑھکنے لگ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرخ اور روشن شعلوں
کا ایک آبشار ہے۔ جو پہاڑ سے پانی کی طرح زمین پر پڑ رہا ہے۔

مدینہ طیبہ اور اس کے گرد و پیش کی تمام آبادیاں خوف و ہراس سے
گھروں کو چھوڑ کر مسجد نبوی علیہ السلام میں پناہ گزین ہونا شروع
ہوگئیں۔ آگ کا رخ بڑی تیزی سے مدینہ طیبہ کی جانب ہو رہا تھا
کہ تمام خدا پرستوں نے جمعہ کی رات کو باوجود ہزار ہا پریشانیوں
اور خانماں بربادیوں کے مسجد نبوی میں نہایت خشوع و خضوع کے
ساتھ نوافل و مناجات اور ذکر و فکر میں شب بیداری کی اور بارگاہ
نبوت میں روضہ اقدس کی جالی پکڑ پکڑ کر گڑگڑائے اور التجائیں پیش
کیں۔ سرکار دو عالم رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمت
میں تموج پیدا ہوا۔ اور ملائکہ رحمت نے آگ کا رخ مدینہ طیبہ کی
مخالف سمت کو دیا۔ اور اہل مدینہ نسیم بہار جنت کے ٹھنڈے
جھونکوں میں مطمئن ہو گئے۔ بہت سے مؤرخین نے اس واقعہ کی
کی عینی شہادت پر کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ چنانچہ حضرت
امام شیخ صفی الدین رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس بُصری اپنی چشم دید شہادت
دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس روز اس آتش فشاں پہاڑ کی آگ کا
ظہور حجاز میں ہوا اسی رات بُصری کے بدوی قبائل نے آگ کی روشنی
میں اپنے اونٹوں کو بُصریٰ سے دیکھا۔ اور شناخت کیا۔ اور
حضرت امام محمد بن اسمٰعیل بخاری رحمت اللہ علیہ نے ۲۵۶ھ ہجری اور
امام مسلم بن الحجاج علیہ الرحمتہ نے ۲۶۱ھ ہجری میں وصال فرمایا
بخاری شریف اور مسلم شریف کی اشاعت تمام بلاد اسلامیہ میں
ان کی مقبولیت عامہ کے باعث دونوں حضرات کی زندگیوں میں
ہی ہو چکی تھی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پیشنگوئی حضور علیہ الصلوٰۃ
والسلام کی شیخین حدیث کی وفات سے چار سو سال بعد کو پوری
ہوئی اور حضور علیہ السلام کا علم غیب ساڑھے چھ سو سال کے بعد

بعد ہونے والے واقعہ کا اظہار یوں فرمایا جا رہا ہے جیسے حضور اسکو بیان فرماتے وقت ظاہری آنکھوں مبارک سے ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

صحیحین شریفین میں ایک اور پیشینگوئی یوں درج ہوئی ہے

لا تقوم الساعة حتى تقاتلوا الترك صغار الاعين حمر الوجوه ذلف الانوف كان وجوههم المجان المطرقة یعنی قیامت قائم نہ ہوگی (پھر چند باتوں کے بعد فرمایا) یہاں تک کہ تم ان ترکوں سے جنگ نہ کرو گے جو چھوٹی آنکھوں والے اور سرخ چہروں والے اور چپٹی ناکوں والے اور ان کے چہرے ڈھال کی طرح چوڑے ہوں گے۔

حضور پر نور علیہ السلام نے اپنے وسیع علم کے ذریعے تاتاری ترکوں کا ایسا نقشہ کھینچا اور حلیہ بیان فرمایا کہ تاریخی بصیرت رکھنے والے حضرات اس عظیم ترین تاریخی واقعہ سے بخوبی واقف ہیں کہ فتنہ تاتاریہ کے بانی ہلاکو خان نے اپنے ہلاکت خیز حملوں سے دنیائے اسلام کو اس حد تک پہنچا دیا تھا جہاں سلطنت اسلامیہ کے پاش پاش ہو جانے کے امکانات مکمل نظر آتے تھے۔ خلافت بغداد اور شکوہ خراسان اسی فتنۂ عظیم کے نذر ہو گئے۔ مگر مولا کریم نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ایسا پورا فرمایا کہ تاتاری خونریزیوں کا سارا زور ایشیا نے کو چکیں شکست عظیم کھا کر ہمیشہ کے لئے فی النار والسقر ہو گیا۔

ایک اور حدیث شریف میں یوں ارشاد ہوا ہے۔ عن ثوبان مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم عصابتان من امتي احرزهما الله من النار عصابة تغزو الهند وعصابة تكون مع عيسى بن

مدینہ علیہما السلام۔ یعنی ثوبان رضی اللہ عنہ جو غلام تھے حضور علیہ السلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری امت کے دو گروہ ہوں گے۔ جن کو اللہ تعالےٰ دوزخ سے محفوظ رکھیگا ایک وہ جو ہندوستان میں جہاد کریگا۔ اور دوسرا وہ جو حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوگا۔ اس حدیث شریف سے نزول مسیح علیہ السلام کے منکروں کو سبق لینا چاہئے۔ کہ وہ کونسا گروہ ہوگا اور عیسیٰ علیہ السلام کب نازل ہوں گے۔ فاعتبروا۔

حضور علیہ السلام کے علم پاک سے ایک دوامی پیشینگوئی صحیحین میں درج ہے۔ جو بنو شیبہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جب ۲۰ رمضان المبارک ۸ھ ہجری کو مکہ معظمہ فتح ہوتا ہے۔ اور سرور کائنات مختار شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ شریف میں جلوہ افروز ہوئے۔ اعلان عام ہو چکا ہے کہ جو بیت اللہ شریف میں آجائے اس کو پناہ ہے۔ بیت اللہ العظیم کی کنجیاں حضور کے دست اقدس میں ہیں۔ اہل مکہ منتظر ہیں کہ دیکھیے شیبی خاندان نے جو اذیتیں اور تکلیفیں حضور علیہ السلام اور اصحاب حضور علیہ السلام کو پہنچائی ہیں اس کی پاداش میں سرکار رسالت سے کیا ملتا ہے۔ مگر وہ رؤف و رحیم مولا اور رحمۃ للعلمین تاجدار صلی اللہ علیہ وسلم شیبہ بن عثمان اور عثمان بن طلحہ کلید برداران کعبہ کو اپنے قریب طلب فرماتے ہیں۔ چہرۂ اقدس پر بشاشت و شادمانی۔ لب ہائے اطہر پر تبسم کی فراوانی قربان ہو رہی ہے پھر زبان حق ترجمان سے ارشاد ہوتا ہے خذھا خالدۃ تالدۃ لا ینزعنھا یا بنی طلحۃ منکم الا ظالم۔ لو یہ چابی سنبھالو

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تم سے یہ کلید کوئی بھی نہ چھینے گا۔ مگر وہی جو ظالم ہوگا۔ سبحان اللہ۔ ۸ ہجری کے بعد آج تیرہ سو پینسٹھ (۱۳۶۵) سال گذر چکے ہیں۔ اور کیا کیا انقلاب اس عرصہ میں نہ آئے۔ مگر دنیا دیکھ رہی ہے۔ کہ کلید کعبہ بنو شیبہ ہی کے پاس چلی آ رہی ہے۔ جن کو حضور علیہ السلام نے اپنے دست مبارک سے عطا فرمائی تھی۔ اور اگر اس ایک پیشنگوئی کا تجزیہ کیا جائے تو اس ایک پیشنگوئی کی تین پیشنگوئیاں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ یہ کہ خاندان شیبی (خاندان ابو طلحہ کا) قیامت تک باقی رہنا اور اس کی نسل کو بقائے دوام کی عزت حاصل ہونا۔

۲۔ کلید بیت اللہ کی حفاظت اور کلید برادری کا معاملہ ہمیشہ انہی سے متعلق رہنا۔

۳۔ شیبی خاندان سے کلید کعبہ کے چھیننے والے کا ہمیشہ کیلئے ظالم کا خطاب پانا ایسی انگنت پیشنگوئیاں ہیں۔ جو حضور علیہ السلام کے معجزات علم غیب کے سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن کو دنیا کی کوئی طاقت غلط ثابت کرنے اور جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتی اگر ذوق اور ایمان ہو۔ تو ذرا شفا شریف قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نظر مطالعہ کیجئے۔ پتہ چل جائیگا کہ اس علم نبوت کا بحر بے پایاں کس قدر وسیع اور عریض ہے۔ جس کی انتہا ہی نہیں اور نہ کوئی اس کی اتھاہ گہرائی میں غواصی کر سکتا ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ آئمہ نے بلا شک وہ باتیں بیان کی ہیں کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو بتائی ہیں۔ اور ان کا وعدہ دیا ہے۔ یعنی آپ کا اپنے دشمنوں پر غالب آنا۔ اور مکہ معظمہ و بیت المقدس۔ یمن۔ شام۔ عراق کا فتح کرنا

امن کا ظاہر ہونا حتیٰ کہ ایک عورت حیرہ سے مکہ معظمہ تک سفر کرے گی
اور اللہ تعالےٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرے گی اور مدینہ میں لڑائی ہو گی۔ اور خیبر
علیؓ کے ہاتھ پر کل فتح ہو گا۔ اور اللہ تعالےٰ آپکی امت پر دنیا فتح کریگا
اس کی نعمتیں ان کو دی جائیگی۔ کسریٰ اور قیصر کے خزانے مسلمان تقسیم
کریں گے اور ان میں فتنے۔ اختلاف اور خواہشات پیدا ہوں گی۔ اور
وہ پہلے لوگوں کے طریق اختیار کریں گے۔ وہ تہتر فرقے ہو جائیں گے
ان میں سے ناجیہ فرقہ ایک ہو گا۔ اور یہ کہ ان کے فرش نفیس ہوں گے
ان میں سے بعض ایک لباس صبح اور ایک شام بدلیں گے۔ ان کے سامنے
ایک کھانے کا برتن رکھا جائیگا۔ ایک اٹھایا جائیگا۔ اپنے گھروں پر
ایسا پردہ ڈالیں گے۔ جیسے کہ کعبہ کا پردہ ہے۔ پھر آخر حدیث میں فرمایا
کہ تم آج کے دن اس دن کی نسبت بہتر حالت پر ہو۔ اور یہ کہ جب وہ
اکثر کر چلیں گے۔ اور فارس و روم کی لڑکیاں ان کی خادمہ ہوں گی۔
تو اللہ تعالےٰ ان کی عداوت باہمی کر دیگا۔ ان کے برے لوگ ان کے
بہتر لوگوں پر غالب ہو جائیں گے۔ اور ان کی کفار ترکوں اور کفار خزر
اور کفار روم سے لڑائی ہو گی۔ کسریٰ اور فارس کا ملک تباہ ہو گا۔
حتیٰ کہ پھر کسریٰ اور فارس نہ ہوں گے۔ قیصر جاتا رہیگا۔ اس کے بعد
پھر قیصر نہ ہو گا۔ اور بیان فرمایا کہ روم کی جماعت آخر تک رہے گی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ اشراف لوگ مر جائیں گے
اور زمانہ چھوٹا ہو جائیگا۔ علم قبض ہو جائیگا۔ فتنے اور جنگ ظاہر ہونگے
اور فرمایا کہ میرے لئے تمام زمین جمع کی گئی۔ اور میں نے زمین کے
مشرق اور مغرب دیکھ لئے زمین ہند کے آخر شرق سے لیکر بحر طنجہ تک
جہاں اس کے پرے کوئی آبادی نہیں۔ اور یہ وہ مقام ہے کہ جس کی
کوئی امت پہلے مالک نہیں ہوئی۔ اور جنوب و شمال میں اس قدر

ملک (اسلامیہ) نہیں بڑھا۔ اور آپ نے فرمایا ہمیشہ مغرب کے لوگ حق پر غالب رہیں گے۔ حتیٰ کہ قیامت قائم ہو گی۔ امام امین المدینی کہتے ہیں کہ وہ عرب کے لوگ ہیں کیونکہ وہی لوگ غرب یعنی ڈول سے پلانے میں مشہور ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں ابو امامہؓ کی روایت سے ہے۔ کہ ہمیشہ میری امت حق پر غالب رہیگی۔ اپنے دشمنوں پر قاہر ہو گی۔ یہاں تک کہ خدا کا حکم آئے۔ اور وہ ایسے ہی ہوں گے۔ آپنے بنو امیہ کے ملک کی اور معاویہؓ کے حاکم ہونے کی خبر دی اس کو وصیت کی تھی۔ اور فرمایا کہ بنی امیہ مال کو دولت بنالیں گے (یعنی جہاں چاہیں گے۔ خرچ کریں گے) اور عباس کی اولاد سیاہ جھنڈے لیکر نکلے گی اور ان کا ملک بنی امیہ سے دگنا ہو گا۔ اور مہدی علیہ السلام نکلیں گے اور یہ کہ آپکی اہلبیت مقتول اور ہلاک ہوں گے۔ حضرت علیؓ شہید ہونگے اور زیادہ بدبخت وہ ہو گا۔ جو ان کی ڈاڑھی کو ان کے سر کے خون سے رنگ دیگا۔ پس حضرت علیؓ کے دشمن خارجی اور ناصبی ہوئے اور روافض کا ایک گروہ جو ان کی طرف منسوب تھا۔ انہوں نے حضرت علیؓ کو مطعون کیا (کہ کیوں خلافت چھوڑ دی) اور فرمایا کہ عثمان ایسے حال میں شہید ہوں گے۔ کہ قرآن شریف پڑھتے ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ عنقریب اس کو خلافت کا کرتہ پہنائیگا۔ اور لوگ اس کے اتارنے کا ارادہ کرینگے اور یہ کہ اس کا خون اللہ تعالیٰ کے اس قول فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ پر گریگا۔ اور یہ کہ جب تک زندہ رہیں گے فتنے ظاہر نہ ہوں گے۔ آپنے زبیرؓ اور علیؓ کی لڑائی کی خبر دی۔ اور قزمان کے بارہ میں فرمایا وہ دوزخی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کے ساتھ ملکر خوب بہادری اور صبر کے ساتھ لڑا تھا (جس سے صحابہ متعجب تھے) پھر اس نے اپنے آپ کو قتل کر ڈالا۔ اور ایک جماعت کے بارہ میں جن میں ابوہریرہؓ۔

سمرہ بن جندب اور حذیفہ رضی اللہ عنہم تھے فرمایا کہ جو تم میں سب سے آخر مریگا وہ آگ میں مریگا پھر ایک دوسرے کی بابت پوچھا کرتے اور ان میں سے سمرہؓ آخر میں مرے تھے۔ بہت بوڑھے ہو گئے تھے آگ سینکتے سینکتے اس میں گر کر مر گئے۔ اور حنظلہ کے بارہ میں جن کو فرشتوں نے غسل دیا تھا۔ فرمایا کہ اس کی بیوی سے پوچھو کیونکہ میں نے فرشتوں کو دیکھا ہے۔ کہ اس کو غسل دیتے ہیں۔ پھر لوگوں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ جنبی ہو کر نکلا تھا۔ اور موقع جنگ کی جلدی نے ان کو غسل کرنے سے باز رکھا اور جلدی شہید ہو گئے۔

اور فرمایا کہ خلافت قریش میں ہے۔ اور ہمیشہ یہ امر قریش میں رہیگا جب تک کہ دین کو قائم رکھیں گے۔ اور فرمایا کہ ثقیف میں کذاب اور ظالم قاتل ہوگا۔ اور لوگوں نے حجاج اور مختار کو دیکھا۔ اور فرمایا کہ مسیلمہ کو اللہ تعالےٰ قتل کریگا۔ اور فرمایا کہ آپکی اہلبیت میں سب سے پہلے بی بی فاطمہ رضؓ آپ سے ملیں گی اور آپنے مرتدین سے ڈرایا اور یہ کہ آپ کے بعد خلافت تیس سال تک رہیگی۔ پھر ملک ہو جائیگا۔ آپ نے اویس قرنی کا حال بیان فرمایا۔ اور امراء کی نسبت فرمایا کہ وہ وقت سے نماز میں تاخیر کریں گے۔ اور فرمایا کہ میری امت میں تیس کذاب ہوں گے۔ ان میں سے چار عورتیں ہونگی۔ دوسری حدیث میں فرمایا تیس دجال کذاب ہوں گے۔ منجملہ ان کے دجال کذاب ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک خدا تعالیٰ اور اس کے رسول پر جھوٹ بولیگا۔ فرمایا کہ تم میں میرا زمانہ بہتر ہے پھر جو اس کے قریب ہوں گے۔ پھر جو ان سے قریب ہوں گے۔

آپنے قدریہ اور رافضیہ کے نکلنے کی خبر دی۔ اور فرمایا کہ اس امت کے آخر لوگ پہلوں کو گالیاں دیں گے۔ آپنے خوارج کی حالت کی خبر دی اور ان میں ناقص خلقت (ذوالثدین) جس کا ایک بازو عورت کے پستان

کی طرح تھا کی خبر دی۔ آپ نے ؤباکی خبر دی۔ جو کہ فتح بیت المقدس کے بعد ہو گی (چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ستر ہزار مسلم طاعون سے فوت ہوئے۔ اور یہ کہ آپ کی امت کے لوگ سمندر میں لڑیں گے اور فرمایا کہ اگر دین ستاروں پر ہو گا۔ تو اس کو ابناء فارس وہاں سے بھی لے آئیں گے۔ اور آپ ایک لڑائی میں تھے۔ کہ ہوا تیز چلی تو فرمایا۔ کہ منافق کی موت کی وجہ سے ہوا تیز چلی ہے تو جب مدینہ شریف کی طرف لوٹے تو اس امر کو پا لیا۔ (یعنی ایک منافق یہود مرا ہوا پایا) اس کے ہمجلیسوں سے آپ نے فرمایا تھا کہ تمہاری ڈاڑھ دوزخ میں اور پہاڑ کے برابر ہو گی۔ آپ نے اپنی اونٹنی کی خبر دی۔ جبکہ وہ گم ہو گئی تھی۔ اور جس طرح کہ وہ ایک درخت میں مُہار کے ساتھ لٹکی تھی۔ آپ نے عمیر کے قصے کی جو صفوان کے ساتھ تھا خبر دی تھی جبکہ اس سے پوشیدہ مشورہ کیا تھا۔ اور اس سے شرط تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دے۔ اور جب عمیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ کہ آپ کو قتل کر دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے معاملہ اور بھید کی خبر دی۔ تو عمیر مسلمان ہو گیا آپ نے خبر دی کہ ابی بن خلف عنقریب مارا جائیگا۔ اور عتبہ بن ابی لہب کے بارہ میں خبر دی کہ اس کو خدا کا کتا کھائیگا۔ آپ نے اہل بدر کے بچھڑنے کی اطلاع دی اور جیسا فرمایا تھا۔ ویسا ہی ہُوا۔ اور حسن علیہ السلام کے بارہ میں فرمایا کہ میرا بیٹا سید ہے۔ عنقریب اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے دو جماعتوں میں صلح کرا دیگا۔ آپ نے نجاشی کے فوت ہونیکی جس دن کہ وہ فوت ہوا خبر دی۔ اور فیروز کو خبر دی جبکہ وہ کسریٰ کا ایلچی بن کر آیا تھا کہ کسریٰ آج مرا ہے (اس کے بیٹے شیرویہ نے اس کو مار ڈالا ہے) اور جب فیروز کو یہ حال ثابت ہُوا۔ تو وہ مسلمان ہو گیا۔ فرمایا میری

بیویوں میں سے جلد مجھ سے ملنے والی وہ بیوی ہوگی۔ جس کے ہاتھ لمبے ہوں گے۔ پس حضرت زینبؓ بوجہ کثرت صدقہ کے لمبے ہاتھ والی تھیں۔ اور آپ نے حضرت امام حسینؓ کے کربلا میں شہید ہونیکی خبر دی اور زید بن صوحان کے بارے میں فرمایا۔ کہ اس کا ایک عضو جنت کی طرف اس سے پہلے جائیگا سو جہاد میں اس کا ہاتھ قطع کیا گیا۔ سراقہ کے لئے فرمایا تیرا کیا حال ہوگا۔ جب تو کسریٰ کے کنگن پہنایا جائیگا۔ آپ نے ابوذرؓ کے نکالے جانے کو فرمایا تو ویسا ہی ہوا۔ اور فرمایا کہ یہ تنہا ہی زندہ رہیگا۔ اور تنہا ہی مرے گا۔ آپ نے اس مال کی خبر دی کہ جس کو آپکے چچا عباسؓ ام الفضلؓ کے پاس رکھ آئے تھے اور پہلے اس کو چھپایا تھا۔ تو انہوں نے کہا تھا۔ کہ اس کی خبر میرے اور اس کے سوا کسی کو نہیں تھی۔ تب وہ مسلمان ہو گئے۔ اور فرمایا کہ عنقریب اس امت میں ایک مرد ہوگا جس کو ولید کہیں گے۔ (یہ ولید بن یزید بن عبدالملک جبار تھا جو بڑا فسادی تھا) وہ اس امت کے لئے فرعون سے جو اپنی قوم کے لئے تھا بدتر ہوگا۔ اور فرمایا کہ قیامت قائم نہ ہوگی حتیٰ کہ دو گروہ لڑیں گے جن دونوں کا دعوے ایک ہی ہوگا۔ اور عمرؓ سے سہیل بن عمرو کے بارہ میں فرمایا کہ عنقریب یہ ایسے مقام کھڑا ہوگا۔ جو تم کو خوش کر دے گا۔ پس ایسا ہی ہؤا جس دن کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی خبر مکہ معظمہ میں پہنچی تو اس نے ویسا ہی خطبہ پڑھا جیسا کہ ابوبکرؓ صدیق نے پڑھا تھا۔ ان کو ثابت رکھا۔ ان کی عقلوں کو قوی کیا۔ اور آپنے جب حضرت خالدؓ کو اکیدر کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ تو اس کو نیل گائے کا شکار کرتا ہوا پائیگا۔ آپ نے اس جادو کی خبر دی جس کے ساتھ لبید بن اعصم نے آپ پر جادو کیا تھا۔ آپ نے قریش کو خبر دی کہ تمہارے کاغذ خاص نوشتہ کو)

کیڑا کھا گیا ہے۔ جس کے ساتھ وہ بنی ہاشم پر غلبہ پاتے تھے۔ اور اس کے سبب رحم کو قطع کرتے تھے۔ اور فرمایا تھا کہ اس میں جس جس مقام پر لفظ اللہ ہے۔ اس کو باقی رکھا ہے۔ آپ نے ان قافلوں کی جن پر شب معراج گزرے تھے۔ خبر دی کہ وہ قافلے فلاں فلاں وقت پہنچ جائیں گے۔ یہاں تک کہ ان حادثات کو بیان فرمایا۔ کہ جو آئندہ ہوں گے اور ابھی نہ ہوئے تھے۔ آپنے قیامت کی علامات اور اس کے آنے کے نشانات حشر و نشر۔ نیکوکاروں اور بدکاروں کی خبریں۔ جنّت و نار اور قیامت کے میدان کا ذکر فرمایا۔

پس یہ سارے امور آپکی زندگی میں اور آپ کی وفات شریف کے بعد پائے گئے یہاں تک کہ وہ باتیں بھی پوری ہوئیں۔ جن کی نسبت آپنے اپنے صحابہؓ کو ان کے اسرار اور امور ماضی کی خبر دی اور منافقین کے اسرار و کفر کی اطلاع فرمائی تھی۔ ان کے بارے میں اور مومنین کے بارے میں فرما دیا تھا۔ کہ چپ رہو۔ کیونکہ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہدیا کرتا تھا۔ کہ چپ رہو۔ کیونکہ خدا کی قسم اگر اس کے پاس کوئی خبر دینے والا نہ ہو گا تو جنگل کے پتھر بھی اس کو خبر دیدیں گے۔

مظہر اخلاق

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم

ترجمہ:۔ تحقیق تو البتہ اوپر خلق بڑے کے ہے

جس کے اخلاق و مظاہرۂ اخلاق کا ثناخوان خودخدائے قدیر ہو۔ جسکی شان میں انک علیٰ خُلُقٍ عظیم وارد ہوا ہو اور جو منصب "لِاُتَمِّمَ مکارم الاخلاق" پر فائز ہو۔ اس کے متعلق کچھ عرض کرنا انسانی حوصلہ و ہمت سے بالاتر امر ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ جل و علا شانہٗ نے مکارم اخلاق اور محاسن اعمال ہمارے حضرت رسالت پناہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات میں اس طرح جمع فرما دیئے ہیں کہ دنیا کا اور کوئی پیغمبر کائنات کا اور کوئی راہنما۔ نئی یا پرانی دنیا کا کوئی انسان اس امر میں آپ کے مدمقابل کھڑا نہیں ہوسکتا۔ حضورؐ نے اپنے اصحاب و احباب کو کوئی ایسا حکم کبھی نہیں دیا۔ جس میں پہلے اپنا عملی نمونہ ان کے سامنے پیش نہ فرمادیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دشمن سے دشمن بھی آپکے مکارم اخلاق اور محاسن خصائل کا معترف نظر آتا ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ کہ ہر اُمت و اصلاح اور تزکیہ و تعلیم کے لئے تعلیم اور نمونۂ تعلیم دونوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور جہاں کہیں تعلیم بھی بہتر ہو اور نمونۂ تعلیم بھی ساتھ تو یہ نمونہ اور تعلیم مل کر خدا جانے کیا ہو گئے ہوئے تھے۔ جس نے اسافلۂ عالم

کو اعاظم زمانہ بناکر رکھدیا۔ اور نصف صدی گذرنے سے پہلے پہلے دنیا کے بدترین انسان نہ صرف دنیا کے بہترین انسان بن گئے، بلکہ دنیا کے پیشوا اور مالک و سلطان ہو کر نکلے۔ کیونکہ ایک طرف قرآن پاک کی تعلیم رسول کریم کی جانب سے دی جارہی تھی۔ اور دوسری جانب حضور کے کامل اخلاق کا کامل نمونہ بنی نوع انسان کے سامنے پوری درخشانی سے پیش ہو رہا تھا۔ احیاء العلوم میں حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ کہ حضرت سعد بن ہشام نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی نسبت استفسار کیا تو آپ نے فرمایا! کیا تم قرآن نہیں پڑھتے سعد نے عرض کیا کہ پڑھتا ہوں تو ام المومنین نے ارشاد فرمایا قرآن کریم تمام آپ ہی کے اخلاق کریمانہ کا تذکرہ ہے۔ کَانَ خُلُقُہُ القرآن یعنے حضور علیہ السلام کا خلق تو قرآن ہی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک خلق کو یا اخلاق کے کسی ایک پہلو کو اپنی سعی سے انتہائی عروج پر پہنچا لیتا ہے۔ مگر دوسرے اخلاقی پہلوؤں سے تہی دامن ہو جاتا ہے۔ مثلاً مروت و مودت میں ترقی کر کے کمال پیدا کر لیا اور ہوشمندی۔ معاملہ فہمی اور عقل سے عاری رہا۔ اگر مروت و مودت کی وجہ سے کمزوری کی صورت اختیار کر جائے۔ تو عاجزی و انکساری کی جانب رجوع کر جاتا ہے۔ اگر عاجزی و انکساری سے قدم ہٹاتا ہے۔ تو مجسمہ رحم بن جاتا ہے۔ رحم میں بڑھا تو عدل و انصاف کے مقتضیات کھو بیٹھتا ہے۔ لیکن حضور پُرنور علیہ السلام چونکہ کامل الاخلاق تھے۔ اس لئے ہر خلق میں کامل اور اخلاق کے تمام پہلوؤں میں مکمل رہے کسی ایک خلق کے کمال سے دوسرا کوئی خلق ناقص نہ تھا۔ اسی لئے مولا کریم نے آپکو فرمایا۔ کہ آپ حالتِ اعتدال پر ہیں۔ گویا ایک ہی

ذات قدسی صفات میں بیک وقت جملہ اخلاق کا اجتماع ایک ایسی نادر چیز تھا۔ جس سے بہتر نہ دنیا والوں نے کبھی دیکھا اور نہ ہی آئندہ اس کے مشاہدہ کی توقع ہو سکتی ہے۔ اس برگزیدہ ہستی اس اشرف الانبیاء رسول کے حسن معاشرت۔ جود وکرم۔ تواضع و انکساری۔ رحم و رافت کے واقعات سے دنیا کی سب سے بڑی مقدس اور پاک کتاب یعنے قرآن حکیم شروع سے آخر تک لبریز ہے۔ اگر آپکے سوانح حیات سے آپکے مکارم اخلاق کے واقعات جمع کئے جائیں۔ تو وہ ایک لاانتہا ذخیرہ ہے جن کا عشر عشیر بھی بیان کرنا محال ہوگا۔

مثل مشہور ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ زندگی کے شباب و بہار کا موسم ہی جوانی ہوتی ہے۔ جس میں تمام آرزوئیں اور امنگیں۔ جذبات و احساسات پورے جوش پر ہوتے ہیں۔ لیکن آپکی جوانی نہ دیوانی تھی۔ نہ جذبات میں بے جا نیوالی چیز۔ کیونکہ قریش مکہ جب دیکھتے ہیں کہ تبلیغ کا کام حضور علیہ السلام نے علانیہ شروع کر دیا ہے تو طرح طرح کے لالچ دیتے اور اپنے ملک کی امارت وحکومت پیش کرتے ہیں۔ کبھی خزانوں پر متمکن کرنے کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ تو کبھی عرب کی خوبصورت اور حسین ترین لڑکیاں نکاح میں دینے کا طمع دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ شہنشاہ لولاک۔ وہ دھن کا پکا ارادہ کا مضبوط۔ ہمت کا دھنی الوالعزم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کوئی اثر قبول نہیں فرماتا۔ نہ اس کو شادی کی پرواہ ہے نہ دولت کی ہوس۔ تجارت میں قدم اٹھایا۔ تو محض شفیق چچا کی مالی حالت خراب دیکھکر اور شادی پر متوجہ ہوئے تو ایک چہل سالہ خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے پیغام پر۔ نہ قریش کی سرداری کا تاج قبول فرمایا۔ اور نہ امیر ترین گھرانوں کی حسین لڑکیاں نکاح میں لینے پر آمادہ ہوئے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک وہ دَور جس میں سارے عرب کی

فرمانروائی حاصل تھی آنے پر بھی آن بان وہی رہی - جو پہلے دَور کی خزان میں تھی - ہزاروں ابتلاؤ آزمائش کے پہاڑ سامنے آئے - مگر آپ نے اپنے فرضِ رسالت کو ایسا نبا ہا - جسکی مثال پوری دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے - تفصیل میں کہاں تک جایا جائے - وہ کونسا ایذا دہی یا لالچ کا پہلو ہے - جو دشمنوں نے اختیار نہیں کیا - نماز سے منع کیا جاتا ہے - نماز پڑھتے ہوئے پشت مبارک پر گوبر کی بھری ہوئی اونٹ کی اوجھریاں رکھی جاتی ہیں - راستہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں - کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے مدات کو استراحت کے وقت مکان پر پتھر مارے جاتے ہیں - ساحر کاہن دیوانہ کا خطاب دیا جاتا ہے مگر آپ ہیں کہ فرائض نبوت سے باز نہیں آتے - عام مسلمانوں پر مظالم کی انتہا نہیں کئی لوگ حبشہ کو ہجرت کر رہے ہیں - تو کئی مدینہ کی جانب روانگی کا قصد رکھتے ہیں - خود حضور تین ۳ سال کے لئے مکہ سے باہر تشریف لیگئے - اور شعب ابو طالب میں محصور کر دیئے گئے اور آپکی وجہ سے تمام بنی عبد المطلب سے عدم تعاون کر دیا گیا - اور کھانے کی چیزیں اور پینے کا پانی بھی درّہ میں جانے سے روک دیا جاتا ہے اور وہ ناقابل برداشت اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں - جس کے تصور سے بھی انسانی روح کانپتی ہے - مگر نبوت کی ذمہ داریاں ایک وہ فریضہ ہے - جس کے نباہنے کے لئے حضور ایک لاجنب چٹان کی طرح مستقیم ہیں - اور پائے ثبات میں ذرہ بھر بھی لغزش نہیں ہوتی - ہجرت کا واقعہ آپکی زندگی میں سب سے اہم اور کٹھن واقعہ ہے جب کہ آپ کے قتل کا فیصلہ کر کے دشمنان الٰہی نے آپکے مکان کا محاصرہ کر لیا اور یہ فیصلہ ہو گیا کہ آج آپ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے - مگر اعجاز نبوت نے انکی آنکھوں میں مٹی ڈالی - اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم غار ثور میں تشریف لے گئے - جو سانپوں اور بچھوؤں کا مسکن تھا - مگر محافظ حقیقی نے آپ کو ہر دشمن سے محفوظ فرما کر مدینہ طیبہ پہنچا دیا

یہ تھا وہ تاریک پہلو جسپر دشمنوں اور دنیا والوں کی فطرت متحرک ہوئی۔ اب نبوت محمدیہ علیہ السلام کا اخلاقانہ درخشندہ اور روشن پہلو دیکھئے۔ جب کہ حضور علیہ الصلوٰت والسلام اس سانحۂ جان گداز کے آٹھ سال بعد رمضان شریف میں فاتحانہ انداز کے ساتھ مکہ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں۔ تو ان دشمنوں کے ساتھ جنہوں نے بیس سال تک آپ پر عرصۂ حیات تنگ کئے رکھا۔ اور کسی امکانی اذیت و اہانت میں باک نہ کیا تھا۔ کیا سلوک روا فرمایا۔ وہ جس کی مثال دنیا پیش نہیں کرسکتی چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ تمام ناروا سلوک کے عوض میں مکہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی۔ اور اس کے مکینوں کے خون سے کوچہ و بازار رنگین کر دیئے جاتے۔ دشمنوں کا خون ندیوں کی طرح بہتا۔ اور بچے بوڑھے جوان تلوار کے گھاٹ اتار دیئے ہوتے۔ مگر واہ رے رحمت اللعلمین کی شانِ رحمت کیسی باز پرس اور کہاں کی سزا۔ کسی کو ملامت بھی تو نہیں کی جاتی۔ حالانکہ یہ ابھی تک اپنے کفر پر قائم ہیں۔ اور ان میں قاتل، سازشی، خون کے پیاسے، حملہ آور۔ سب موجود ہیں ان میں قریش کے وہ جابر و ستمگران نوجوان بھی کھڑے ہیں۔ جو اسلام اور بانئے اسلام کی ہستی مٹانا اپنی زندگی کا مقصد وحید سمجھتے تھے وہ بھی تھے جو نماز کے وقت سجدہ کی حالت میں ناگفتہ بہ گستاخیاں کر چکے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی زبانیں آپ کی ہجو اور آپکے خلاف بدکلامی میں ناپاک ہو چکی تھیں۔ وہ بھی تھے جنہوں نے اس پیکر قدوسی کو شعب ابوطالب میں محصور کرکے اپنی سفاکی کی بے انتہائی حرکات کا ثبوت دیا تھا۔ وہ بھی تھے۔ جنکی تلواروں اور نیزوں کی پیاس خون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی چیز سے نہ بجھتی تھی۔ وہ بھی تھے جنہوں نے مہاجرین دمہاجرات پر ظلم ڈھائے۔ اور صاحبزادی زینب رضی اللہ

عنہا کو نیزے سے موت کے گھاٹ اتارا۔ وہ بھی تھے جو رات کو دولت کدۂ نبوت پر پتھر پھینکا کرتے وہ بھی تھے جو ایمان لانے والوں کو تپتی ریت اور سلگتے ہوئے انگاروں پر لٹاتے اور ان کے سینوں پر جلتے ہوئے پتھر رکھ کر انکی زندگیاں تمام کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھی تھے جنہوں نے ہجرت کی رات تلواریں سونت سونت کر بڑی بے جگری سے قتل کی ٹھان لی تھی۔ تاکہ رسول خیر الانام کا خاتمہ کر دیں۔ وہ بھی تھے جنہوں نے ہجرت کے بعد آپکی تلاش میں بڑے ارادوں سے مکہ کے قرب وجوار کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ وہ بھی تھے جو نادار مسلمانوں کو چٹائیوں میں لپیٹ کر ان کے ناک میں دھواں دیتے تھے۔ وہ بھی تھے جو کسی سے اللہ کا نام سن پاتے تو مار مار کر بیہوش کر ڈالتے۔ وہ بھی تھے جو کلمہ گوؤں کو لوہے کی زرہ پہنا کر آگ میں ڈال دیتے تھے غرضیکہ شرمساری کے عالم میں مجرمانہ انداز سے گردنیں جھکائے ہوئے تمام ستم کیش امراء اور ظالم و بے رحم سردار اور شقی و بے درد عوام حاضر تھے۔ سرکار دو عالم رحمت مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انکو پابند سلاسل دیکھا تو یوں ارشاد فرمایا۔ اے معشر قریش بتاؤ تم آج مجھ سے کس سلوک کی امید رکھتے ہو۔

وہ لوگ دشمن تھے۔ ایذا رساں اور بد باطن تھے۔ مگر نبوت کے اداشناس ضرور تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارا قصور ایسا نہیں جو معاف ہو سکے۔ ہم کشتنی و گردن زدنی ہیں۔ مگر پھر کیفر کردار کا یہ انجام نہ ہوگا۔ جو ایک ظالم و جاہل دشمن کا ہوتا ہے۔ سب انتہائی شرم سے سر جھکا کر عرض کرتے ہیں کہ تو کریم ابن کریم ہے۔ ہمیں تجھ سے اس بہتر سلوک کی توقع ہے۔ جو حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں اپنے بھائیوں سے کیا تھا یہ سنکر رحمت اللعٰلمین نے کمال رحمت

سے فرمایا۔ لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا وانتم الطلقا یعنی آج تم پر کوئی جرم نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔ یہی نہیں بلکہ ان مہاجرین کو جن کے مکانات پر کفار مکہ نے قبضہ کر رکھا تھا۔ فرمایا کہ تم لوگ اپنے اپنے آبائی حقوق جائداد سے دست بردار ہو جاؤ حالانکہ تقاضائے وقت یہ تھا۔ کہ ان کی املاک و جائدادوں کا قبضہ ان کو واپس دلا دیا جاتا۔

کیا دنیا کی کوئی تاریخ۔ کسی مذہب کا کوئی راہنما۔ نیا یا پرانا مہاتما دوست و دشمن کے مقابلہ میں ایسا خلق وعفو اور رحمت و کرم فرمائی کا فقید المثال نمونہ پیش کر سکتا ہے۔ بعض دفعہ بڑے بڑے پیدا ہونے والے فتنے آپ کے حسن۔ اخلاق و شیریں کلامی سے آن کی آن میں مٹ جاتے تھے۔ غزوہ حنین میں چھ ہزار قیدی چوبیس ہزار اونٹ چوالیس ہزار سے زائد بھیڑ بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی مال غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ حضورؐ نے مقام جعرانہ پر یہ سب مال غنیمت تقسیم فرمایا۔ اور جدید الاسلام قریش مکہ کو جو مؤلفۃ القلوب تھے۔ اس مال سے بہت زیادہ حصہ دیا اور بعض کو تو ان کے حصہ سے بھی بڑھ چڑھ کر عطا ہوئی۔ مثلاً صرف ابوسفیان اور ان کے بچوں کو تین تین سو اونٹ اور ایک سو بیس اوقیہ چاندی ملی۔ منافق لوگ جو فتنہ پیدا کرنے کے لئے ایسے مواقع تلاش کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے انصار اور مہاجرین میں تفرقہ ڈالنے کے لئے اکسانا شروع کر دیا۔ انصار کو انکی باتیں سنکر اس تقسیم سے رنج ہوا۔ اور خفیہ خفیہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ یہ آواز سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمع مبارک تک جا پہنچی۔ تو ایک خیمہ نصب کرایا اور انصار کو اس میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب سب انصار جمع ہو گئے تو حضور

نے اس افواہ کے متعلق ان سے دریافت فرمایا۔ جواب میں عرض کیا گیا کہ ہاں ہمیں سے بعض سادہ لوح نوجوانوں نے یہ باتیں کسی وجہ سے کی ہیں۔ مگر کسی ذمہ دار اور پختہ مغز دانا نے نہیں کیں اور نہ ہمیں اس قسم کی بدگمانی ہوسکتی ہے۔ یہ سن کر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

اے گروہ انصار کیا یہ صحیح نہیں کہ تم لوگ گمراہ تھے اللہ تعالےٰ نے میری بدولت تمہیں ہدائت بخشی۔ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ مولا رحیم نے میری وجہ سے تم کو غنی فرمادیا۔ اس کے جواب میں سب انصار نے عرض کی کہ بیشک ہم پر اللہ اور اس کے رسول امام علیہ السلام کا بہت احسان ہے۔

پھر فرمایا کہ تم مجھ کو یہ جواب کیوں نہیں دیتے کہ جب ساری دنیا نے آپکی تکذیب کی تو ہم نے تصدیق کی جب، لوگوں نے تجھ کو چھوڑ دیا۔ تو ہم نے پناہ میں لیا جب تو محتاج ہمارے پاس آیا۔ تو ہم نے مال وجان سے تیری امداد کی۔ اے انصار اگر تم یہ کلمات کہتے جاؤ تو میں کہوں گا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن جانو کہ کیا تم کو یہ بات ناپسند ہے کہ اور لوگ اونٹ اور بکریاں لیکر گھروں کو واپس جائیں اور تم محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمراہ لیکر گھروں میں داخل ہو۔ یہ تقریر سنکر انصار فرط محبت سے اس قدر روئے کہ ڈاڑھیاں تر ہوگئیں۔ اور بے اختیار پکار اٹھے کہ ہم تو صرف محمدؐ کی ضرورت ہے۔ ہم اونٹ بکریاں نہیں چاہتے۔ اس کے بعد آپ نے انصار کو تسکین دی۔ اور سمجھایا کہ اہل مکہ جدید الاسلام ہیں اس لئے میں نے ان کو تالیف قلوب کے خیال سے زیادہ مال عطا کیا ہے۔ یہ نہیں کہ تم لوگوں کی نسبت ان کا حق زیادہ ہے۔ ہجرت، اگر من جانب اللہ مقدر نہ ہوتی تو میں بھی انصار میں شامل ہوتا۔ اگر انصار

ایک راستہ پر چلیں اور لوگ دوسرے راستہ پر تو میں ضرور انصار کا راستہ اختیار کروں گا۔ پھر دعا فرمائی یا الہٰی تو انصار اور ان کی اولاد پر رحم فرما۔

آپ کی اس تقریر سے انصار ایسے مسرور و مطمئن ہوئے۔ کہ منافقین کا پیدا کردہ فتنہ آن واحد میں فرو ہو گیا۔

مخالفین اسلام کہتے ہیں کہ مکہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی فقر و فاقہ سے گذر ہوتی تھی۔ مگر جب مدینہ میں آئے تو ایک وسیع سلطنت کے مالک بن گئے۔ اور عسرت وسعت سے بدل گئی مگر تاریخ اس کے خلاف بتاتی ہے۔ سارا عرب جب آپ کا مطیع و منقاد ہو گیا۔ تو بھی فاقہ سے آپ کا وہی حال تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بارہا حضور علیہ السلام کو بھوک کی کمزوری سے پشت مبارک کو سہارا دیتے دیکھا ہے۔ متواتر دو دو مہینے تک کاشانہ نبوت میں آگ نہیں جلتی تھی۔ کبھی پانی کے دو گھونٹ اور کھجوروں پر اور کبھی بکری کے تھوڑے سے دودھ پر گذر اوقات ہو جاتی۔ اکثر اوقات رات کا کھانا میسر نہ آتا۔ اور بھوک سے آواز بھی پست ہو جاتی۔ کبھی صبح کو پیٹ بھر کے تناول فرما لیتے تو رات کو کھانا نہ کھاتے۔ اسلام کی تکمیل اور کائنات پر پورے قبضے کے باوجود آخری ایام عمر میں جن کپڑوں میں دنیا چھوڑی انکو پیوند پر پیوند لگے ہوئے تھے۔ اور انتقال کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن تھی۔ قیام مدینہ میں ہجرت سے وفات تک جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ حضور نے کبھی دو وقت سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا حالانکہ اس وقت خدا کی اکثر خدائی آپ کے زیر نگین تھی۔ انتقال سے ایک ماہ قبل آپ نے حضرت صدیقہ سے فرمایا۔ کہ مجھے دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھ سے پہلے

جتنے اولوالعزم رسول ہو چکے ہیں انہوں نے بہت زیادہ مصائب اٹھائے اور صبر کیا پھر اسی حال میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالےٰ نے ان کے مراتب بلند کئے۔ اور ثواب عظیم سے انکو نوازا۔ اس لئے میں بھی معیشت میں فراخی طلب کرنے سے ڈرتا ہوں حضرت امام حسن علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے گذارہ کی تنگی کا حال بطور شکوہ بیان نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کے اظہار سے امت کی تسلی و تشفی مقصود ہوتی تھی۔ تاکہ وہ بوقت تکلیف اضطراب اور گھبراہٹ کو اپنے قریب نہ آنے دیں۔

الغرض آپ حسن معاملہ۔ حسن خلق۔ استقامت۔ ایثار۔ سخاوت شفقت رحم۔ ہر صفت میں کامل و مکمل اور تحمل و برداشت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔

وصلے اللہ علیٰ حبیبہٖ محمد و آلہٖ واصحابہٖ وسلم

علانیہ تبلیغ

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ فَاِنۡ لَّمۡ
تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ

کسی گذشتہ باب میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ کہ خفیہ تبلیغ کی رو سے فرزندانِ توحید کی جمعیت چالیس پچاس افراد تک پہنچ گئی تو حضور علیہ السلام کو علانیہ تبلیغ کا ارشاد صادر ہوا۔ اور وحی الٰہی نازل ہوئی۔ کہ آپکو جو حکم دیا گیا ہے۔ اس کی اب علانیہ تعمیل کرو۔ اور اپنے اقربا کو بھی خوفِ الٰہی سے ڈراؤ۔ چنانچہ جب آپ نے حرم محترم میں اسکی تعمیل کی۔ تو لوگ مشتعل ہو گئے۔ اور دفعتہً ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ لوگ وحشیانہ طور سے آپ پر حملہ آور ہوئے۔ اس وقت آپکو حفاظت میں لینے کے لئے آپکے ربیب ہالہ بن حضرت ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا آڑے آئے۔ جن پر اتنی تلواریں پڑیں کہ وہ شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا۔

اس ہنگامہ و قتل نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کفارانِ مکہ کے قلوب قاسیہ میں خدا کا تصور رچانا اور تبلیغ احکام الٰہی کرنا گویا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ مگر سرکار انبیاء رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے۔ اور آپ کا اولیں فریضہ عمل دعوت اسلام تھا۔ اور مکی زندگی کا تیرہ سالہ دور۔ اسی فریضہ کی ادائیگی میں گذرا۔ اس کے بعد ہجرت اور مدینہ منورہ کا پنجسالہ زمانہ بڑی مصروفیت و انہماک کا زمانہ تھا۔ ایک لمحہ اور ایک ثانیہ بھی یہاں ایسا نہ گذرا کہ حضور علیہ السلام

کبھی سکون خاطر حاصل کر سکے ہوں۔ ہر طرف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے جال بچھے ہوئے تھے اور قریش و یہود کے اتحاد نے آپکی تمام تر توجہات اپنی طرف مبذول کرا رکھی تھیں۔ تاہم جب کبھی ان ہجوم و انکار میں فرصت کے چند لمحے نصیب ہوئے۔ آپنے انہیں تبلیغ وارشاد کے لئے وقف کر دیا اور رب العزت جل و علا شانہٗ کی مہربانی سے صلح حدیبیہ کی تکمیل کے بعد آپ کو گونہ مہلت ملی۔ اور یہ سب سے بڑے دشمن اسلام کی طرف سے کسی قدر اطمینان حاصل ہوا۔ اس طمانیت کا ہاتھ آنا تھا۔ کہ حضور علیہ السلام من کل الوجوہ اور ہمہ تن تبلیغ وارشاد میں مصروف ہو گئے۔ اور یہ حقیقت ہے۔ کہ جس قدر اسلام پہلے بجسالہ دور میں نہ پھیلا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اس فراغت و مہلت کے ایام میں پھیلا۔ اس فرصت مغتنم میں سب سے بڑا فائدہ جو اٹھایا گیا۔ وہ یہ تھا کہ آپ نے سلاطین عالم کے نام دعوت نامے ارسال فرمائے جنہوں نے اسلام کو اپنی عزت و آبرو اور اپنے ملک و وطن کے لئے ایک خطرۂ عظیم سمجھ رکھا تھا۔ کیونکہ ان کے کانوں میں یہ الفاظ پہنچ رہے تھے۔ کہ اسلام بتوں اور بت پرستی کے لئے ایک تباہی کا پیغام ہے۔ اور ہماری یہ بت پرستی اور صنم آرائی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔

آپنے ایک روز تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جمع کیا اور انکو ایک مہتم بالشان خطبہ دیکر فرمایا۔ مجھے اللہ تعالےٰ نے نہ صرف پیغمبر بلکہ رحمتِ عالم بنا کر بھیجا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی حضرت مسیح کے حواریوں کی طرح اختلاف کے دریا میں غوطے کھانے لگ جاؤ۔ اٹھو اور میری طرف سے پیغامِ حق دنیا کو پہنچاؤ۔ اتنا فرما کر آپنے کاتب کو بلوایا۔ اور سلاطین زمانہ کے لئے دعوت اسلام کے مکاتیب لکھوا کر قاصدوں کے ہاتھ ارسال فرمائے۔ اور جو جو حضرات یہ فرامین لیکر

مختلف اطراف و جوانب میں روانہ ہوئے۔ اور جن جن کے نام وہ دعوت نامے لکھے گئے انکی مختصر سی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو۔ ہرقل شاہ روم کیطرف بھیجا گیا۔
حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضؓ کو۔ شہنشاہ خسرو پرویز والئے ایران کیطرف
حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو۔ نجاشی شاہ حبش کی طرف۔
حضرت سبط بن عمرو بن عبد شمس رضؓ کو۔ رؤسائے یمامہ کی طرف۔
حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضؓ کو۔ عزیز والئے مصر کی طرف۔
حضرت شجاع بن وہب الاسدی کو۔ رئیس حدود شام حارث غسانی کیطرف

مکہ والوں کو اس بنا پر کہ شاہ حبش کے گورنر یمن ابرہہ نے جو مذہباً عیسائی تھا۔ بیت اللہ شریف پر چڑھائی کی تھی عیسائیوں سے ایک قلبی عداوت اور گونہ پرخاش ہوگئی تھی۔ اور وہ ان کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لئے جب ایران کے مجوسیوں نے ہرقل شاہ روم کو جو عیسائی تھا شکست دی تو قریش نے بڑی خوشیاں منائیں۔ اور حضور علیہ السلام کو طعنہ دیا کہ دیکھ لیجئے خسرو پرویز ایک بت پرست نے ہرقل عیسائی جو خدا کا پرستار ہے کو کیسی زبردست شکست دی ہے۔ اس طعنہ کا مطلب یہ تھا۔ کہ قریش میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ شائد حضور علیہ السلام عیسائیت کے قیام کی حمایت میں ہیں۔ چنانچہ اسی غلط فہمی کے زمانہ میں سورۂ روم کا نزول ہوا جس میں مولا کریم کیطرف سے یہ ایک پیشین گوئی ارشاد فرمائی گئی تھی کہ چند سالوں کے اندر ہی اندر اہل روم بت پرست ایرانیوں پر غلبہ حاصل کرلیں گے۔ یہ ارشاد باری حرف بحرف پورا ہوا۔ اور ہرقل شاہ روم نے تھوڑے عرصہ کے بعد خسرو پرویز کو وہ انتقامی شکست دی کہ تاریخ آج تک اسپر قرآنی صداقت کی گواہ ہے۔ شاہ ہرقل اسی کامیابی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے حمص

سے بیت المقدس آیا۔ اور بڑے شان و طمطراق سے آیا۔ اور یہیں حضرت دحیہ کلبی نے وہ نامۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاہ ہرقل کے دربار میں پیش کیا۔ قیصر روم نے خط پڑھتے ہی کہا کہ یہاں کوئی عربی شخص موجود ہو تو اس کو بلاؤ۔ تاکہ اس خط کے متعلق بعض ضروری امور معلوم کئے جا سکیں اس آواز پر اتفاق کی بات ہے۔ کہ تلاش میں ابوسفیان مل گیا۔ جو بسلسلۂ تجارت شام میں آیا ہوا تھا۔ اور مقام غزہ میں مقیم تھا۔ لوگوں نے اسے پیغام دیا کہ تم کو قیصر روم نے طلب فرمایا ہے۔ اور اس کو ساتھ لیکر حاضر دربار کر دیا۔ قیصر روم اپنے پورے شاہانہ ٹھاٹھ میں دربار آراستہ کئے بیٹھا تھا۔ اور تخت حکومت کے ارد گرد رہبان و قسیسین کی صفیں قائم تھیں۔ قیصر نے عرب والوں کی جانب جو تاجرانہ حیثیت سے وہاں مع ابوسفیان کے حاضر تھے۔ خطاب کیا کہ کیا تم لوگوں میں اس مدعی نبوت کا کوئی عزیز یا رشتہ دار ہے جس کی جانب سے ہمکو یہ خط ملا ہے۔ اور اس کا نام نامی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ یہ سنتے ہی ابوسفیان عرض گذار ہوا۔ کہ جہاں پناہ میں اس مدعی نبوت کا عزیز ہوں۔ جو ارشاد ہو بندہ بغیر کسی لگی لپٹی اور کینہ و حسد کے صاف صاف گذارش کر دیگا۔

اس پر شاہ روم اور ابوسفیان میں مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا۔

قیصر روم :۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس مدعی نبوت کی خاندانی حیثیت کیسی ہے؟

ابوسفیان :۔ جہان پناہ۔ خاندانی حیثیت سے وہ نہایت شریف النسب اور معزز ہے۔

قیصر روم :۔ کیا اس خاندان سے اس سے قبل بھی کبھی کسی نے دعویٰ نبوت کیا ہے؟

ابوسفیان :۔ جہان پناہ دعوائے نبوت تو درکنار کسی کو کبھی نبوت

کا تصور بھی نہیں آیا۔

قیصر روم :- کیا اس کے خاندان میں پہلے کوئی بادشاہ بھی ہوا ہے؟

ابوسفیان :- کوئی نہیں۔

قیصر روم :- جن لوگوں نے اس جدید مذہب کو قبول کیا ہے۔ وہ کچھ صاحب اثر اہل عالی قدر ہیں یا کمزور؟

ابوسفیان :- عالیجاہ نہایت کمزور۔ غلام اور ادنےٰ درجے کے لوگ ہیں۔

قیصر روم :- کیا دن بدن اس کے حلقہ بگوشوں اور پیروؤں میں زیادتی ہوتی جاتی ہے یا کمی؟

ابوسفیان :- ان کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔

قیصر روم :- کیا تم لوگوں کو اس کے کذب اور جھوٹ کے متعلق بھی کبھی تجربہ ہوا ہے؟

ابوسفیان :- نہیں کبھی نہیں۔

قیصر روم :- کیا تم بتا سکتے ہو کہ کبھی اس نے اپنے عہد و اقرار کی ہی خلاف ورزی کی ہو؟

ابوسفیان :- ابھی تک ہمیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ البتہ اسی سال اس سے ہمارا ایک نیا اور جدید معاہدہ ہوا ہے۔ اس سے پتہ چل جائیگا۔ کہ وہ اپنے عہد پہ قائم رہتا ہے یا نہیں؟

قیصر روم :- کبھی تمہاری اور اس کی آپس میں لڑائی بھی ہوئی ہے؟

ابوسفیان :- ہاں کئی جنگیں ہوئی ہیں۔

قیصر روم :- ان جنگوں میں نتیجۂ جنگ عموماً کیا رہتا رہا؟

ابوسفیان :- یہی کہ کبھی ہم غالب رہے اور کبھی وہ

قیصر روم :- یہ بتاؤ کہ وہ کیا کہتا۔ کیا سکھاتا ہے۔ اور کیا تعلیم دیتا ہے؟

ابوسفیان ۔ حضور وہ یہ کہتا ہے۔ کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی اللہ کو اس کا شریک نہ ٹھیراؤ۔ نماز پڑھو۔ پاکدامنی اختیار کرو صلہ رحم کرو۔ اور سچ بولو۔

ان تمام سوالوں کے جواب سنکر قیصر روم نے ابوسفیان سے کہا۔ کہ تم نے اسے شریف النسب بتایا ہے۔ اور پیغمبر ہمیشہ پاکیزہ نسب اور بلند خاندان ہی ہوا کرتے ہیں۔ اور تم نے یہ بھی بتایا ہے۔ کہ اس کے خاندان میں سے کبھی اور کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور نہ ہی کوئی بادشاہ ہوا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ پہلا ہی خاندانی اثر ہے۔ یا بادشاہت کی تمنا نے اس کو اس دعوےٰ پر آمادہ کیا ہے تم نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اس نے کبھی لغو بیانی سے کام نہیں لیا۔ اور نہ دروغ بافی سے کبھی سروکار رکھا ہے۔ بھلا جو شخص خود کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو۔ وہ خدائے قدوس پر کیونکر جھوٹ بول سکتا ہے۔ اور تم نے یہ بھی مانا ہے۔ کہ اس کے پیرو اکثر نادار اور کمزور ہیں۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام انبیاء کے پیرو ابتدا میں اکثر غریب اور ادنےٰ درجہ کے لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ اور تم یہ بھی بیان کر چکے ہو۔ کہ یوماً فیوماً اس کا مذہب ترقی کر رہا ہے۔ اور یہی اس کی صداقت و سچائی کی دلیل ہے۔ تمنے ابھی کہا ہے۔ کہ وہ تقوے۔ نماز۔ اور عفاف کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ جو تم نے بیان کیا ہے سچ ہے تو یاد رکھو اس جگہ تک جہاں میرے قدم ہیں اس کا قبضہ ہو جائیگا۔ مجھکو بھی یہ خیال تھا کہ عنقریب ایک پیغمبر مبعوث ہونے والا ہے لیکن یہ خیال نہیں تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ اگر میرے لئے ممکن ہوتا۔ اور میں وہاں تک جاسکتا تو اس کے قدم پکڑتا۔ اور اطاعت کرتا۔

اس کے بعد قیصر روم نے حکم دیا۔ کہ یہ نامہ رسول (صلی اللہ علیہ

وسلم) بلند آواز سے دربار میں پڑھکر سنایا جائے۔ چنانچہ بحکم قیصر پڑھا گیا جس کا مضمون یہ تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے جو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔ یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے۔ اُسے سلامتی ہو۔ جو ہدایت کا پیرو ہے۔ اس کے بعد میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں اسلام لا تو سلامت رہیگا خدا تجھے دگنا اجر دیگا۔ اور اگر تو نہ مانا اور اسلام قبول نہ کیا۔ تو اہل ملک کا گناہ بھی تیرے اوپر ہوگا۔ اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں۔ اور ہم میں سے کوئی خدا کے سوا کسی کو خدا نہ بنائے اور تم نہیں مانتے تو تم گواہ رہو کہ ہم مانتے نہیں"

ابوسفیان کے ساتھ قیصر کی جو گفتگو ہوئی تھی اس سے تمام درباری امرا اور بطارقہ سخت ناراض ہو چکے تھے۔ پھر حضور علیہ السلام کے خط مبارک کو سنکر وہ اور بھی برہم ہوئے۔ اور غصہ سے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگے۔ قیصر روم ان کے چہروں کو دیکھ کر ان کی قلبی کیفیتوں کا اندازہ لگا گیا۔ اور دربار کو برخاست کرنے کا حکم دیدیا قیصر روم گو بہت مقتدر اور ایک ذیشان انسان تھا۔ مگر زمانہ کے حالات نے بطارقہ اور پوپوں کا اثر تمام یورپ پر مستولی کر رکھا تھا۔ قیصر جانتا تھا کہ اگر میں نے ان لوگوں کی خلاف ذرہ بھر بھی قدم اٹھایا۔ تو یہ میری جان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان سے عزت بچانا مشکل ہو جائیگا۔ نامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ اور سنکر اس کے قلب میں نور اسلام کی روشنی تو پیدا ہوئی۔ لیکن تاج و تخت کے ہاتھ سے

نکل جانے کے بھیانک تصور نے اس کو ہوس کی تاریکی میں گم کر دیا۔

ایسا ہی ایک فرمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہنشاہ ایران خسرو پرویز کو لکھا۔ اور حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی کو دیکر روانہ فرمایا خسرو پرویز کی جلالت و دبدبہ اور پندار حکومت اس زمانہ میں ایک مسلّم چیز تھی۔ اور وہ اپنے وقت کا ایک مہتم بالشان بادشاہ تھا۔ پایہ تخت اس کا مدائن تھا۔ جس میں خزائن و دفائن کی کوئی حد نہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی سے نامۂ نبوت اس نے لیا اور پڑھا۔ چونکہ اس کے دربار کی عظمت اور سطوت اپنے زمانہ میں یکتائی کا رنگ رکھتی تھی۔ اس لئے عجم میں یہ دستور ہو گیا تھا کہ سلاطین کو جو خطوط و مکاتیب لکھے جاتے تھے۔ اُن میں ادباً پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا۔ اور حضور علیہ السلام نے عرب کے طریق پر پہلے اپنا نام لکھا تھا۔ خسرو پرویز نے اس کو اپنی توہین و توقیر پر محمول کیا۔ اور متکبرانہ غیظ و غضب میں آکر یہ کہا۔ کہ مجھکو اس طرح لکھتا ہے اور نامۂ مبارک کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیا جس کا مضمون یہ تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد پیغمبر خدا کی طرف سے کسریٰ رئیس فارس کے نام سلام ہے اس پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے۔ کہ خدا ایک ہے اور یہ کہ خدا نے مجھکو تمام کائنات کا پیغمبر مبعوث فرما کر بھیجا ہے۔ تاکہ میں ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلاؤں۔ اسلام قبول کر۔ تو سلامت رہیگا۔ ورنہ تمام مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔

اس کے بعد خسرو پرویز نے یہ نامۂ نبوت پھاڑ کر پھینکدیا بازان

گورنر یمن کے نام حکم صادر کیا۔ کہ تم فوراً حجاز سے اُس مدعی نبوت کو گرفتار کرکے میرے دربار میں حاضر کرو جس نے مجھے اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ باذان نے فرمان خسروی کی تعمیل میں کاخرخسرہ اور بابویہ نامی دو اشخاص کو دربار نبوت میں مدینہ بھیجا تاکہ وہ آپکو گرفتار کرکے خسرو پرویز کے حضور میں پیش کردیں۔ یہ دو نو شخص پیغام لے کر حضور کی خدمت میں پہنچے۔ اور عرض کیا کہ آپکو شہنشاہ خسرو پرویز نے مدائن بلا بھیجا ہے۔ اگر اس حکم کی تعمیل نہ کروگے۔ تو وہ تم کو اور تمہارے ملک کو برباد کردیگا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ آج رات خسرو پرویز اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھ سے مارا گیا ہے۔ تم کس خسرو پرویز کا یہ تحکمانہ پیغام دے رہے ہو۔ تم واپس جاؤ اور ان کو کہدو کہ اسلام کی روشنی اور حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچ جائیگی۔ چنانچہ وہ سخت حیران ہوئے اور واپس چلے گئے۔

حضور علیہ السلام کا تیسرا مکتوب شاہ مصر کے نام تھا۔ جو حاطب ابن ابی بلتعہ لیکر گئے۔ اور آپ نے شاہ مقوقس والئے مصر کے سامنے پیش فرمایا۔ جس نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے پڑھا۔ اور بہت متاثر ہوا۔ اور اس کے جواب میں گذارش کی کہ

محمدؐ بن عبد اللہ کے نام مقوقس رئیس قبط کی طرف سے سلام علیک کے بعد۔ میں نے آپ کا مکتوب گرامی پڑھا۔ اور اس کا مضمون و مطلب سمجھا۔ مجھے اتنا تو معلوم تھا کہ عنقریب ایک پیغمبر مبعوث ہونے والے ہیں۔ مگر خیال تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے۔ میں نے آپکے قاصد کی عزت کی۔ اور دو لڑکیاں بھیجتا ہوں۔ جن کی مصر کی قوم قبطیوں میں بڑی عزت کی جاتی ہے اور ساتھ ہی میں آپکے لئے کچھ کپڑا اور سواری کے کیلئے ایک

خچر بھی بھیج رہا ہوں۔

شاہ مصر نے جو دو لڑکیاں خدمت اقدس میں بھیجی تھیں ان میں سے ایک حضرت ماریہ قبطیہ تھیں جو حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوئیں اور دوسری سیرین تھیں جن کا نکاح حضرت حسان نعت خوانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ خچر آپکی سواری میں آیا۔ اور دُلدُل کے نام سے مشہور رہا۔ غزوہ حنین میں آپ اسی پر سوار تھے۔

تبلیغی سلسلہ میں محبوب خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چوتھا مکتوب مبارک نجاشی بادشاہ حبش کے نام تھا۔ شاہ نجاشی نے اس کو نہائیت قدر و احترام سے وصول کیا اور پڑھا جس کے جواب میں یوں عرض پرداز ہوا۔ کہ میں نے آپکی دعوت قبول کی اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے سچے پیغمبر ہیں۔ اس زمانہ میں حضرت جعفر طیار بھی حبش ہی میں موجود تھے۔ نجاشی بادشاہ نامۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھکر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوگیا۔ اور اس نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ دربار رسالت میں حاضری کے لئے بھیجا۔ مگر قدرت خداوندی بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے جہاز سمندر میں غرق ہوگیا۔ حبش میں بہت سے مسلمان موجود تھے جو ہجرت کر کے گئے ہوئے تھے۔ انہی میں رئیس اعظم قریش ابوسفیان کی صاحبزادی ام حبیبہ بھی تھیں۔ چونکہ ان کے شوہر کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس لئے حضور علیہ السلام نے نجاشی کو لکھا کہ آپ ام حبیبہ کو شادی کا پیغام پہنچا کر میرے پاس روانہ کر دیجئے۔ چنانچہ نجاشی نے نامہ مبارک موصول ہونے پر حضرت خالد بن العاص کو اس خدمت پر مامور کیا انہوں نے خود حضور علیہ السلام کی طرف سے ایجاب و قبول کے فرائض سر انجام دیئے اور نجاشی نے اپنی طرف سے مہر ادا کیا۔ جو چار سو اشرفیوں پر

مشتمل تھا۔

تکمیل نکاح کے بعد حضرت ام حبیبہ جہاز میں سوار ہو گئیں۔ حضور علیہ السلام اس دوران میں خیبر تشریف لیجا چکے تھے۔ آپ تشریف لائیں اور حرم سرائے نبوت میں قیام پذیر ہو گئیں۔ حضور علیہ السلام اکثر دفعہ حضرت ام حبیبہ سے نجاشی کے حالات دریافت فرمایا کرتے تھے۔ سرکار دو عالم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پانچواں دعوت نامہ ہوذہ بن علی رئیس یمامہ کو پہنچا جس میں وہی توحید ورسالت پیش کیگئی تھی۔ رئیس یمامہ نے حضور کے مکتوب گرامی کے جواب میں لکھا۔ کہ آپ نے جو باتیں تحریر فرمائی ہیں وہ بہت اچھی ہیں۔ لیکن آپ اگر مجھے پانے والی حکومت میں شریک فرمائیں اور اس سے کچھ حصہ دینے پر آمادہ ہوں تو میں اسلام قبول کرنے کو تیار ہوں۔ آپ نے یہ بیہودہ اور لغو سا جواب سنکر فرمایا۔ کہ اس طرح مانگنے والے کو اگر ایک ٹکڑہ زمین بھی میرے پاس ہو تو میں اس میں کبھی کسی کو بھی شریک نہ کروں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے چھٹا تبلیغ نامہ حضرت شجاع بن وہب الاسدی کے ہاتھ رئیس حدود شام حارث غسانی کو روانہ فرمایا جو ایک جلیل القدر امیر تھا۔ گو اس کی مختصر سی سلطنت اتنی خود مختار نہ تھی اور رومیوں کا باجگزار تھا تاہم حدود شام میں اطراف کے عربوں پر اسی کی فرمانروائی تھی۔ اور وہ اپنی حدود میں پوری آزادی کا مالک تھا حضور علیہ السلام کے دعوت نامے کو پڑھکر نہایت سیخ پا ہوا۔ اور غضبناک ہو کر اپنی افواج کو مدینہ منورہ پر فوراً حملہ کا حکم دیدیا۔ یہ اطلاع کسی سبب سے مدینہ طیبہ میں بھی پہنچگئی۔ اور اس کے حملہ کا اندیشہ محسوس ہونے لگا اور مسلمان اس کے حملہ کا شور سنکر ہر وقت انتظار میں رہنے لگے۔ مگر حکمت الہی ہے۔ کہ جہاں حارث غسانی کے حملہ کا خطرہ لگ رہا تھا وہاں

ملوک مناوذہ جو حیرہ کے فرمانروا تھے ۔حضور علیہ السلام کا خط پڑھتے ہی مشرف باسلام ہو گئے۔ اور باذان جو یمن کا گورنر تھا۔ اس نے بدیں وجہ اسلام قبول کر لیا ۔کہ خسرو پرویز کے متعلق جو حضور نے فرمایا تھا۔ وہ سو فیصدی صحیح نکلا۔ اور یہی آپکی صداقت کی دلیل ہے ۔ پھر باذان کا ایمان لانا تنہا نہ تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ بڑے بڑے عجمی عمائد و شرفاء بھی مشرف بہ اسلام ہو گئے ۔ انہی دنوں قریش کے دو بڑے سردار بھی نو ر اسلام سے منور ہوئے۔ جن میں سے ایک خالد بن ولید اور دوسرے عمرو بن العاص تھے ۔ دونوں خاندانی رئیس اور رئیس زادے تھے ۔جنہوں نے اسلام لانے کے بعد وہ نمایاں خدمات انجام دیں جو تاریخ میں ہمیشہ انکی اولوالعزمی اور بلند ہمتی پر گواہ رہینگی یعنی خالد بن ولید نے قیصر روم کا ملک فتح کیا ۔ اور عمرو بن العاص فاتح مصر کہلاتے ۔ اسلامی تاریخ کا جاننے والا ہر طالب علم جانتا ہے ۔کہ فن سپہگری اور قیادت خالد کا ایک ذاتی جوہر تھا ۔ اور تدبر و سیاست میں عمرو بن العاص یگانہ تھے ۔ ان دونوں کا اسلام لانا تھا کہ قریش میں ہلچل مچ گئی اور انہوں نے یقین کر لیا کہ ہمارے کفر و شرک کے عقیدے کچھ دنوں کے مہمان ہیں ۔ اور ہماری تلواریں اب زیادہ دیر تک اسلام کے خلاف نہیں جھک سکتیں ۔بلکہ جو لوگ ظہور نبوت سے پیشتر بت پرستی سے متنفر ہو کر دین ابراہیمی اختیار کر چکے تھے ان میں سے اکثر نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا ۔جن میں سے قبیلہ اوس اور قبیلہ دوس خاص طور پہ قابل ذکر ہیں ۔ اسی قبیلۂ دوس کا ایک مشہور شاعر جس کو اہل قبیلہ نے ہزار بار روکا جس کا نام طفیل بن عمرو دوسی تھا آخر مسلمان ہو ہی گیا ۔ ضماد بن ثعلبہ جو ایک دوسرے قبیلہ سے متعلق

تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پرانے دوست تھے یہ سنکر کہ آپکو نعوذ باللہ جنون ہو گیا ہے علاج کے لئے حاضر ہوئے۔ کیونکہ ان کو علاج معالجہ میں کافی مہارت تھی۔ آپ نے ان کے سامنے توحید کے متعلق چند جملے تلاوت فرمائے۔ ضماد بن ثعلبہ سنتے ہی مسحور ہو گیا۔ اور عرض کرنے لگا۔ کہ یہ نہ جادوگروں اور نہ کاہنوں کا کلام ہے۔ یہ تو سمندر کی تہ تک اتر جانے والی بات ہے۔ اور مع اپنے قبیلہ کے مسلمان ہو گیا۔ ایسے ہی حضرت ابوذر غفاریؓ اور ان کا قبیلہ اور قبیلہ اوس و خزرج کے بیشمار لوگ ایمان لے آئے جو گھروں سے تحقیق حال کے لئے حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔

غزوۂ احزاب تبلیغ اسلام کے خلاف ایک وہ خوفناک جنگ ہے جس میں مسلمانوں کے لئے توگونہ خدشات پیدا ہو ہی چکے تھے۔ مگر اس کے نتیجے نے کفار قریش کی کمر توڑ دی۔ اور جو قبائل قریش کے خوف سے مرعوب ہو کر اسلام قبول کرنے میں متامل تھے جنگ احزاب کے بعد انہوں نے بھی حضور علیہ السلام کی خدمت میں خود وفد بھیجنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ سب سے پہلا وفد قریش کے رعب سے نکلکر جو حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا وہ چار سو افراد پر مشتمل قبیلہ مزینہ کے لوگ تھے۔ طبقات ابن سعد میں اس کی پوری تشریح یوں موجود ہے کہ یہ سارے کا سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اسی طرح قبیلۂ اشجع کا ایک وفد حاضر حضور ہوا جس کے تین سو افراد بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر پہلے معاہدۂ مصالحت مکمل کرتے ہیں اور کافرانہ رنگ میں ہی تکمیل معاہدہ کر کے واپس ہوتے ہیں مگر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت کی یہ اعجاز فرمائی تھی۔ کہ وطن مالوف تک پہنچتے پہنچتے ہی مسلمان ہو گئے۔ قبیلۂ جہنیہ کے

لوگ پورے ایک ہزار کی تعداد میں بصورت وفد حاضر دربار ہوئے۔ اسلام قبول کیا۔ اور حبشہ کے لئے غزوات اسلامیہ میں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ صلح حدیبیہ نے اشاعت اسلام کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ اور جس کثرت سے اس کے بعد اسلام پھیلا۔ اس سے پہلے اس قدر اس کا ظہور نہ کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا۔ کہ صلح حدیبیہ کے بعد مکہ اور مدینہ میں علانیہ آمد و رفت شروع ہو گئی اور میل جول پیدا ہونے سے کفار کو مسلمانوں کے ساتھ آزادانہ ملنے جلنے اور ان کے اخلاق وعمل کی پاکیزگیوں کے مشاہدہ کرنے کا موقعہ ملا۔ مذہبی تعصب کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔ اور ان کے قلوب قاسیہ بھی نور نبوت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

اس سے اندازہ لگتا ہے کہ جب حضور عمرہ کرنے کے ارادہ پر مدینہ منورہ سے نکلے ہیں تو آپ کے ساتھ صرف تیرہ سو ۱۳۰۰ اصحاب تھے۔ اور اس کے بعد دو برس کے اندر اندر فتح مکہ میں دس ہزار جان نثاران اسلام ہمرکاب نظر آتے ہیں۔ عمر بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت صحیح بخاری میں مرقوم ہے کہ عام عرب قریش مکہ کے اسلام کا منتظر تھا۔ اور لوگ یہ نظریہ قائم کئے ہوئے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر ان کی قوم اللہ کا رسول مان گئی تو وہ بلا شبہ سچے پیغمبر ہیں۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہو گیا۔ اور ہر قبیلہ نے اسلام کی طرف پیشقدمی کی تو یہ امر واضح ہو گیا کہ عرب کے اندر فروغ اسلام میں جو دیر لگی وہ قومی و خاندانی مخالفتوں کے سبب تھی۔ اس پتھر کے ہٹتے ہی حق کا آگے بڑھنا یقینی ہو گیا۔ اور حضور علیہ السلام نے فتح مکہ کے بعد منظم طور پر مبلغین اسلام بیرونجات میں روانہ فرمائے۔ جن کے ذریعے یمن۔ عدن۔ ذوالکلاع

بحرین۔ اور حضر موت میں اسلام پھیلا۔ مگر بعض مقامات پر مسلمان خود بخود ہی فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی کو اپنا حق سمجھکر انجام دیتے رہتے۔ جن کی انفرادی مساعی سے بھی اشاعت اسلام میں کافی ترقی ہوئی۔ اور عرب کے ہر کونے میں نور اسلام کی شعاعیں جگمگانے لگیں ۸ھ ہجری میں اسلام اگر ایک طرف سے عراق اور شام کی حدود پار کرچکا تھا تو دوسری جانب یمامہ وعمان تک اس کی وسعت پاؤں پھیلا چکی تھی۔ حضور علیہ السلام نے ایرانی امراء کے لئے ۱۰ھ ہجری میں وبر بن یحنیس کو حکم دیا کہ وہ ان میں تبلیغ اسلام کریں۔ چنانچہ اس کی سعی اتنی کامیاب ہوئی۔ کہ فیروز دیلمی۔ مرکبود اور وہب بن منبہ سب کے سب مع اپنے اعزو اقارب کے مسلمان ہوگئے۔ اور تمام مسلمانوں سے سب سے پہلے جن بزرگوں نے قرآن حفظ کیا۔ وہ یہی دو بزرگ وہب بن منبہ اور مرکبود رضی اللہ عنہما تھے۔ اسلام کی نورانیت نے بھی عجیب عجیب رنگ میں کام کیا ہے۔ بحرین کا ایک مختصر سا قافلہ تجارت کے لئے شام کو جاتا ہوا رستہ میں مدینہ منورہ ٹھیرتا ہے۔ ان میں سب سے باثر اور مشہور قبائل تمیم۔ بکر بن وائل اور عبدالقیس کے افراد تھے۔ موخرالذکر قبیلے کا ایک اولوالعزم فرزند منقذ بن حبان تھا حضور علیہ السلام ان سب کے پاس خود تشریف لے گئے اور دعوت اسلام دی جسپر یہ سارے افراد اسی وقت مسلمان ہوگئے۔ اور ان کے قبائل نے بھی فوراً اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام نے حضرت علا حضرمی کو بحرین میں تبلیغ اسلام کی خدمت پر مامور فرمایا اور انکی دعوت پر منذر بن ساوی بھی مسلمان ہوگئے۔ جو حکومت ایران کی طرف سے اس علاقہ کے گورنر تھے۔ اسی صوبہ میں ایک مشہور جگہ ہجر ہے۔ جہاں والئے ایران کی جانب سے ایک شخص سی بخت نامی

حکومت کرتا تھا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نام بھی دعوت نامہ ارسال فرمایا۔ اور وہ اس کو پڑھتے ہی شرف اسلام سے مشرف ہو گیا۔ یہی حال حدود شام میں فردہ بن عمر کا ہوا جس کو معان میں سلطان روم کی طرف سے گورنری کا عہدہ حاصل تھا۔ توفیق ربانی سے نور اسلام اس کے قلب میں خود بخود چمکا۔ اور تعلیمات اسلامی سے واقفیت پیدا کر کے یہ خود بخود مسلمان ہو گیا۔ رومیوں کو اس کے مشرف باسلام ہونے کی جب اطلاع پہنچی۔ تو سخت برہم ہوئے۔ اور اس کو واپس بلا کر پھانسی دیدی۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ جس وقت یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق پھانسی پر چڑھا ہے۔ اس وقت بھی اس کی زبان پر حمدِ خدا جاری تھی۔ ایسے ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین و دعوت نامے دیگر علاقہ جات میں بھی پہنچے۔ اور شام و عرب کے درمیانی آباد قبائل مشرف باسلام ہوتے چلے گئے۔ نجران کا علاقہ جو اس وقت عیسائیت کا مرکز تھا بھی اس برکت سے محروم نہ رہا۔ اور حضور علیہ السلام کے دعوت نامے کو پڑھ کر وہاں کے گرجا کا مسیحی محافظ مع مذہبی ساٹھ اماموں کے مدینہ منورہ میں آئے۔ اور مسجد نبوی میں قیام پذیر ہوئے۔ اور وہیں انہوں نے مشرق کی جانب منہ کر کے اپنی مذہبی عبادت ادا کی اس کے بعد کچھ حضور علیہ السلام سے مناظرہ کیا پھر مباہلہ پر تیار ہوئے مگر حوصلہ نہ پڑا اور سالانہ خراج دیتے رہنے کی شرط پر صلح کر کے واپس ہو گئے۔ سنہ ۱۰ھ میں حضور علیہ السلام نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو وہاں بھیجا جنکی تین دن کی تبلیغ سے قبیلہ بنو حارث جو ایک مشرک قبیلہ تھا۔ اسلام لے آیا۔ اور حضرت خالد چند یوم قیام کر کے واپس آ گئے

الغرض وہ قبائل عرب و شام جو مکہ والوں کے فیصلہ کا انتظار کر رہے

تھے۔ فتح مکہ و خیبر کے بعد قریش و یہود کی طاقتیں پاش پاش ہوتے
دیکھ کر سمجھ گئے کہ اب نہ سرکشی کام دیتی ہے اور نہ انتظار کا یارا ہے
لہذا سفارتوں کے ذریعے اس مسئلے کو حل کیا جائے۔ کیونکہ وہ یہ بھی
جان چکے تھے۔ کہ بہت دیر انتظار کر کے بھی اسلام اختیار کرنا ہی ہوگا
ہم اسلام لائیں تو ہمارے ہی لئے بہتر ہے اور اگر نہ بھی لائیں اور ہمیں
مجبور بھی نہ کیا جائے تو بھی زیر اقتدار تو آنا ہی پڑے گا۔ چنانچہ ہر گوشۂ عرب سے
سفارتیں آنا شروع ہو گئیں۔ چند سفارتوں کے سوا جو حضور سے معاہدہ کر کے
واپس گئیں باقی سب نور ایمان سے مستفیض ہوئیں۔ بنو تمیم کے قبیلے کی
سفارت کا تذکرہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جو بڑی شان و شوکت کے
ساتھ آئی اور عربی فخر و غرور کے ساتھ دربار نبوت میں پہنچی۔ بڑے بڑے
خطیب و شعراء جو دربار ایران سے انعامیہ خلعتیں حاصل کر چکے تھے اس میں
شامل تھے۔ انہوں نے حضور علیہ السلام سے خطابت و شاعری میں نہایت
رعب و داب اور شکوہ و جلالت سے مناظرہ کیا۔ لیکن بالآخر اعتراف عجز
کے ساتھ اسلام قبول کر گئے۔

ان مختصر واقعات پر ایک ہی طائرانہ نظر واضح کر دیتی ہے کہ عرب کی نطرت
وہ نہ تھی جس پر کوئی ترغیب و ترہیب اثر انداز ہو سکتی وہ ہر معقول بات کا جواب
بھی کلام سے نہیں بلکہ تلوار سے دیتے تھے۔ اگر اسلامی تعلیم کی سادگی اور سچائی
حضور علیہ السلام کی پر انوار زندگی کی کشش اور تائید رب قدیر نہ ہوتی۔ تو
ایک قلیل مدت میں اسلام تمام عرب پر کیونکر چھا جاتا اور بڑے بڑے فرعونوں
کے سر اس کے سامنے کس طرح جھک جاتے۔ یہی وہ چیز ہے۔ کہ مخالفین
بھی پکار اٹھے ہیں۔ کہ اشاعت اسلام تلوار کی رہین منت نہیں۔ والسلام

ہجرت اور اسکی حقیقت

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اَلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَّاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (سورۂ زمر رکوع ۲)

ترجمہ:۔ اے میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے۔ کہ اے میرے مومن بندو تم اپنے رب سے ڈرتے رہو۔ وہ لوگ جو اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں۔ ان کے لئے آرام ہے۔ اور اللہ کی زمین بہت کشادہ ہے۔ صابروں کو بے شمار اجر ملیگا۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ مومن جو کفار کے عذاب کو مشقت سے برداشت کریں۔ اور دوسرے ملکوں میں ہجرت کر جائیں۔ جنکی جانیں ان کے اپنے وطن میں بوجھ ہو گئی ہیں۔ تو خدا کی زمین وسیع وکشادہ ہے۔ اور صبر کرنے والوں کے لئے بیحساب اجر ہے۔

ہجرت کی علت انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سبب ہر زمانہ میں یہ ہوا ہے۔ کہ وہ خدا کی ناشناس اور بھٹکی ہوئی ہوئی مخلوق کو خدا کے حضور وتصور کی ایسی صحیح راہنمائی فرمائیں جس سے خالق ومخلوق کا قطع شدہ رشتہ از سر نو قائم ہو جائے۔ یہ راہنمائی گو نہایت پاکیزگی اخلاق اور سنجیدگی مذاق۔ رافت ورحمت اور محبت وموانست سے ہوا کرتی۔ مگر خدا کی آواز سے ناآشنا کان اور اس کے نظارے سے نابینا چشمی نے اس راہنمائی کو اپنی آبائی اجدادی مذہبیت اور اپنی من گھڑت

روحانیت کے منافی خیال کرکے ہمیشہ مخالفت پہ آمادہ ہوئے۔ اور نبی کی تعلیم کو ہر لحظہ انہوں نے اپنی ذاتی شہرت و قابلیت کے لئے مضر و مہلک تصور کیا۔ جس کا نتیجہ یہ رہا۔ کہ اس دعوت حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دیتی رہیں۔ اور یہ قائدہ ہے۔ کہ انسان جب حق و باطل۔ نور و ظلمت اور ایمان و کفر کے مجادلہ میں گھر جائے اور حق کے مقابلہ میں اسکی بطالت کوئی مدلل جواب نہ پیش کر سکے۔ نور کی ضیا پاشی میں اسکی ظلمت بھاگتی ہوئی نظر آئے۔ اور ایمان کے سامنے اس کا کفر صداقت کے دلائل سے عاری ہو جائے تو پھر وہ کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے کی صورت اختیار کیا کرتا ہے۔ اور اپنی کمزوری کے ساتھ مدمقابل کو خاموش کرانے کے لئے تلوار کی مدد طلب کرتا ہے۔ اور پھر ایسے ماحول جس میں اس کی تلوار کو روک بھی کوئی نہ سکے۔ جس میں نہ کوئی قانون ہو نہ ضابطہ بے آئینی کی دور دورہ جسکی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون۔ خود کسی کے دس آدمیوں کو بھی قتل کردیں۔ تو پرواہ نہیں۔ مگر دوسرے کی محض زبان سے ہی اپنی مرضی کے خلاف ایک کلمہ بھی سنیں تو گوارا نہیں۔ اور اپنے کسی ایک فرد کی نکسیر بھی پھوٹے تو قیامت برپا کرلیں۔ چوری ڈکیتی۔ جھوٹ۔ فریب قتل زنا۔ بلوہ۔ فساد۔ مار پیٹ۔ قمار بازی۔ قتل اولاد جس قوم میں جرم نہ ہو۔ بلکہ یہی جرائم ہی فطرت ثانیہ بن گئے ہوں۔ اس کے اخلاق کا مظاہرہ تلوار سے نہ ہو تو اور اس کے پاس رہ ہی کیا گیا ہوتا ہے جس سے وہ دعوت حق پہ کان دھرے۔ اور آواز نبوت کو اپنا سکے۔ کسی عدالت و آئین کا نہ ہونا اور چاروں طرف سے تاریکی میں گھر کر زندگی گذارنا۔ ایسے افراد کو بیہودگی و بے راہ روی پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہوتی ہے۔ کہ یہ لوگ دل رکھنے کے باوجود فقاہت سے دور۔ آنکھیں رکھتے ہوئے معرفت سے معذور اور کان رکھتے ہوئے سماعت سے مجبور ہوتے ہیں۔

یہی حالت اس وقت بھی نظر آتی ہے۔ جب سرکارِ انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوتے ہیں۔ اور تمام عرب ایک جہالت کدہ بنا ہوا ہے تمام انسانوں پر ایک بے راہروی اور بے آئینی کی تاریکی مسلط ہے نہ کوئی عدالت ہے نہ قانون۔ نہ کوئی اصول ہے نہ آئین۔ جرائم و زنائم اُن کے جزو طبیعت بن گئے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک دنیا میں گناہ کی حیثیت ہی کوئی نہیں اور ایک عرب پر ہی کیا موقوف تھا۔ ایران و روم اور ہندوستان کی بھی (جو مہذب و متمدن سلطنتیں کہلاتی تھیں) یہی حالت تھی۔ کہ نہ کوئی ضابطہ تھا نہ قانون۔ فرمانرواؤں اور امیروں کی زبان ہی تعزیرات ہند کا کام کرتی تھی۔

روم میں ضروری آئین سازی و جمہوریت کی مشق کی گئی لیکن برائے نام جو آج وضع ہوا وہ کل منسوخ ہو گیا۔ امراء و رؤسا کی جماعت ہر زمانہ میں با قتدار رہی۔ اور اس نے کبھی بھی عام انسانی حقوق کے احترام کو ضروری نہ سمجھا۔ عورتوں۔ غلاموں اور زیر دستوں پر نہ صرف قہر کی بجلیاں ہی گرتی رہیں۔ بلکہ ان کا قتل۔ انکی فروخت۔ ان پر ظلم۔ کبھی کوئی گناہ ہی نہیں خیال کیا گیا مزارعین۔ صناعوں اور مزدوروں کے لئے قطعاً کوئی اصول نہ تھا۔ ان کے مالک و آقا اور ان کے گاؤں کے متمول لوگ ہی انکے بادشاہ تھے۔ جہاں بیرونی تمام ممالک میں انسانیت اس بیچارگی میں مبتلا تھی وہاں ہندوستان کے اچھوتوں کی جان بھی برہمنوں کے ہاتھوں غیر انسانی سلوک سے ذبح ہو رہی تھی۔ عرب میں اسی بے آئینی و بے ضابطگی اور رعونت و خود پسندی کا اثر خود حضور علیہ السلام کی ذات گرامی تک بھی پہنچنے سے نہ رُکا۔ اور اسی بیہودہ روش کے ماتحت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی قہر کی بجلیاں گرائی گئیں۔ اور آپکو بھی قصّابانہ مظالم اور جلّادانہ سفاکی

وشقاوت کا ہدف بنایا گیا۔ ہر قسم کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ اور ہر نوع کے مظالم روا رکھے گئے۔ کوڑے کرکٹ پھینکے گئے۔ راہ میں کانٹے بچھائے گئے پتھر مارے گئے۔ اور سب وشتم کیا گیا۔ مذاق اڑائے اور آوازے کسے، لونڈوں سے کلوخ اندازی کرائی گئی۔ اور دیوانہ مشہور کیا گیا۔ لفنگو اور گستاخوں کی پارٹیاں ہر وقت تاک میں رہتیں۔ اور بسا اوقات گھر سے نکلنا دوبھر کر دیتیں۔ ہر شخص خون کا پیاسا ہو کر آپکی قتل کے منصوبے سوچ رہا تھا۔ بلکہ حضور کے علاوہ عام فرزندان توحید پر بھی اس قدر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ کہ ہر ابن جہل جان کا لاگو بنا ہوا تھا۔

ایسی حالت میں جب مظالم وشدائد کا سیلاب سر سے گذرنے لگا حق کی پر امن آواز تیغوں کی جھنکاروں میں ملا کر فنا کرنے کا فیصلہ ہو گیا اور صورت حالات نے انتہائی طور پر نازک صورت اختیار کر لی تو حافظ اسلام نے مسلمانوں کو دار الامان مدینہ کی طرف رخ کرنے کا حکم بھیجدیا اور فرمایا اے میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم ایمان والوں کو کہ وہ ان لوگوں سے درگذر کرتے ہیں۔ جو اللہ کریم کے نعم ونقم کی امید نہیں رکھتے فرمائیے کہ تم اپنے رب سے ڈرتے رہو۔ وہ لوگ جو اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں۔ ان کے لئے سکھ ہے۔ اور اللہ کی زمین کشادہ ہے اور صبر کرنے والوں کو بیشمار اجر دیا جائیگا۔ گویا مومنین کفار کی اذیتوں کو صبر سے برداشت کرتے ہوئے ہجرت کر جائیں۔

یہ حکم پہنچتے ہی حضور نے تراسی فرزندان توحید کی ہجرت کا حکم فرمایا جن میں حضرت عثمان غنی اور ان کی اہلیہ محترمہ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی بھی شامل تھیں۔ لیکن خود حضور اقدس جو ان ستمگاران مکہ کے حقیقی ہدف تھے۔ اپنے لئے ہجرت کے متعلق حکم خدا کے ابھی منتظر تھے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ بقول معاندین اگر

خدانخواستہ جان بچانے کے لئے کفار سے فرار مقصود ہوتا۔ تو دیگر مہاجرین اسلام سے پہلے خود حضور ہجرت کر کے اپنی جان بچاتے۔ مگر یہ نہیں ہوا۔ بلکہ تمام تر فرزندان اسلام کو ہجرت کے لئے حکم سنانے اور بھیج دینے کے باوجود بھی حضور خود مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے تاکہ مشیت ایزدی کے حکم ثانی کی تعمیل کی جائے۔ تبلیغ و جہاد سے راہ فرار اختیار کرنا نبوت کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر نبی اللہ ہی راہ فرار اختیار کرلے تو وہ تبلیغی مشکلات کی برداشت کا سبق کیونکر دے سکتا ہے۔ بھلا جو دنیا میں قوانین الٰہی کے نفوذ اور آئین الٰہی کے ماتحت نہ چلنے والی دنیا کو زیر و زبر کرنے کے لئے تشریف لائے۔ وہ جان بچانے اور بھاگنے کے لئے ہی آیا کرتا ہے! اس کی ہستی تو وہ ہوتی ہے۔ جس کی ذات۔ صفات۔ کلام دین دنیا۔ ہر شئے کا محافظ اس کا مبعوث فرمانے والا ہوتا ہے واللہ یعصمک من الناس کی ہزاروں تسلیاں اور انا لہ لحافظون کی بیشمار ضمانتیں ہر لحظہ اس پر سایہ افگن رہتی ہیں۔ وہ چلتا ہے۔ تو رب العزت کے چلائے میں اور بولتا ہے۔ تو اسی کے بتائے سے۔ اس کی حرکات و سکنات۔ اس کا قیام و سفر۔ اس کا جہاد و آباد۔ اس کی سکونت و ہجرت سب کچھ خدا کا ہوتا ہے۔ اس کے قلب اطہر میں اسرار اور اس کے سینہ منور کے انوار۔ اس کے رخ انور کی تابانی اور اسکی حیات جاودانی۔ سب کچھ اسی کا ہوتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے۔ کہ مولا کریم نے انکی گفتگو کو اپنی گفتگو اور اس کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ اور اس کی ذات کو اپنی رحمت فرما کر اس کے وجود مقدس کو سر تا پا برہان اور اس کا بال بال اپنی خدائی کا نشان بنا لیا ہے۔ لاتعداد خفیہ حفاظتی اسباب اور بیشمار ملائکہ مرتاب اس کی جلو میں چلتے ہیں۔ وہ میدان جنگ میں بھی اپنے خدا کی حفاظت پہ اتنا ہی مطمئن ہوتا ہے جتنا گھر کی چار دیواری میں۔ وہ میدان بدر کو بھی

اسی مسرت سے دیکھتا ہے۔ جس سے غار حرا کو وہ مکہ سے ہجرت کرتے ہوئے بھی ویسی ہی طمانیت قلب رکھتا ہے۔ جیسی مدینے پہنچکر۔ یہی سبب ہے کہ ہجرت ایک مظلوم امت کو اسکے مستقبل کی تسکین کا سبق ہے نہ کہ نبی اللہ کے خوف و ہراس کا نقشہ۔ نبی تو صدائے حق کی وہ لاجنب چٹان ہوتا ہے۔ جس کو باطل ہلا نہیں سکتا۔ اور جس میں زمین و آسمان کو تہ و بالا کرنے کی قوت اور اس جہان آب و گل کو درہم برہم کرنے کی مکمل طاقت و وسعت ہوتی ہے۔

ہجرت کا حکم

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ان قوائے و تصرفات کے باوجود نبی علیہ السلام کو ہجرت کا حکم کیوں ہوا۔ اس کا جواب کسی گذشتہ بحث میں گذر چکا ہے۔ کہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل خدا کا قول و فعل ہوتا ہے۔ اور وہ دنیا میں اپنی نجات کے لئے مبعوث نہیں فرمایا جاتا بلکہ اہل دنیا کو نجات کے طریق سمجھانے کے لئے آتا ہے۔ اس کا تمام عمل اس کی اپنی ذات کے لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ دنیا کو اپنے مالک الملک کے وضع کردہ قالب میں ڈھالنے کے لئے مبعوث فرمایا جاتا ہے۔ اگر وہ پانی ہے۔ تو خود بخود اس قالب میں ڈھل جائیگی اور اگر لوہا ہے تو اُسے یہ اپنے جلال کی آتش سوزاں میں ایسا پگھلائیگا کہ وہ سیال ہوکر اس کے قالب میں ڈھل جائے۔ چونکہ نبی اللہ دنیا میں قانون الٰہی کا نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر شریف النفس اور سلیم الفطرت انسان اس کو نرمی اور محبت سے مان لیں۔ تو اس سے بڑھکر مہربان کوئی نہ ہوگا۔ اور اگر سرکش اور ضدی انسان اس قانون سے بغاوت کرنے پر تل جائیں۔ تو پھر اس جیسا کوئی دوسرا سخت گیر بھی نہیں ہوسکتا۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عفو و کرم کا نمونہ اپنی حیات مقدسہ میں پیش فرمایا ہے۔ اس کی نظیر دنیا کے کسی

بڑے سے بڑے مدعیٔ امن وصلح کے ہاں نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب قوت و طاقت کی ضرورت پڑی تو کم وبیش ستر جنگوں میں بنفس نفیس شمشیر بکف شریک ہوئے یا اُن تند وسیوں کی جماعت کو روانہ فرمایا جو دنیا میں انسانیت کی معراج کبریٰ کے مظہر اتم تھی۔ اس کا حکم اطاعت الٰہی کے باب میں اپنے پرائے کیلئے یکساں ہوتا ہے۔ نہ وہ غیر پر ظلم روا رکھے اور نہ اپنوں کو رعائیتیں دے۔ کیا تاریخ دان حضرات کو معلوم نہیں۔ کہ کچھ لوگ جو اسلام کا اقرار کر چکے تھے۔ اور کفار قریش کے خوف سے علانیہ اظہار نہ کرتے تھے۔ جب انہیں بہت ہی تنگ ہونا پڑا تو حکم ہوا کہ جو مسلمان غیر اسلامی ماحول کو بشرط استطاعت نہ بدلے یا فقدان استطاعت کی صورت میں وہاں سے ہجرت نہ کر جائے۔ یعنی اپنی متاع ایمانی کی حفاظت کے لئے وطن و دیگر محبوبات وطنیہ کو قربان نہ کردے۔ اللہ تعالےٰ کے نزدیک اس کے ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اور یہی حکم ہجرت کی علت تھی۔ جس نے ہر کمزور مسلمان پر راحت ورحمت اور امن وسلامتی کے بیشمار دروازے کھولدئے تھے تاکہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گونج اور ایمان باللہ کی حفاظت کے لئے اگر فضا تنگ پائے تو وطنیت پرستی کے بتخانہ سے باہر ہو جائے کیونکہ ایک توحید پرست اور اسلام پسند انسان کے لئے ایمان کو خطرے میں ڈالکر وطن کا راگ الاپنا بالکل بعید از فہمید چیز ہے۔

واقعہ ہجرت یہ واقعہ وہ ہے۔ جو تمام اسلامی دنیا یا تاریخ اسلام کا بنیادی پتھر ہے۔ جس کی یاد ہر سال کے اختتام و آغاز میں مخفی ہے۔ یہ دنیا کی تمام قومی یادگاروں کی طرح قوت کی کامرانیوں کی یادگار نہیں۔ بلکہ کمزوری کی تنخمندیوں کی یادگار ہے۔ یہ طاقت اور حکومت کی یادگار نہیں بلکہ محکومی و بیچارگی کی یادگار ہے۔ یہ اسباب

و وسائل کی فراوانیوں کی یادگار نہیں بلکہ بے سروسامانیوں میں کامیابیوں کی یادگار ہے۔ یہ فتح مکہ کی یادگار نہیں جسے دس ہزار تلواروں نے فتح کیا تھا۔ بلکہ یہ فتح مدینہ کی یادگار ہے۔ جس کو ایک آوارہ غربت اور بے سروسامان ہستی کی روح (ہجرت) نے فتح کیا۔ مگر افسوس کہ مسلمان بدر کی جنگی فتح اور مکہ کے مسلح فاتحانہ داخلہ کو تو مدنظر رکھتا ہے۔ مگر اس نے مدینہ کی غیر مسلح درویشانہ فتح کو فراموش کر دیا ہے۔ حالانکہ تاریخ اسلام میں مذکورہ ساری فتحمندیاں اسی ایک اولیں فتح کی برگ و شاخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ظاہری فتحمندیوں کے اعلان کا وقت آیا۔ تو اس وقت سب سے پہلے اسی معنوی فتحمندی کی یاد لوگوں کو دلائی گئی۔ ثانی اثنین اذھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا۔ فانزل اللہ سکینتہ علیہ وایدہ بجنود لم تروھا وجعل کلمۃ الذین کفروا السفلی وکلمۃ اللہ ھی العلیا واللہ عزیز حکیم ٥

کیونکہ واقعہ ہجرت ایک ہی واقعہ نہ تھا۔ بلکہ بیشمار اعمال و وقائع کا مجموعہ تھا۔

اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی عہدوں میں منقسم ہے۔ ایک عہد مکہ معظمہ کی زندگی اور اعمال کا ہے۔ دوسرا مدینہ منورہ کے قیام و اعمال کا۔ پہلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اسکی ابتدا غار حرا کے اعتکاف سے اور انتہا غار ثور کے انزوا پر ہوتی ہے۔ دوسرا ہجرت سے شروع ہو کر حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا مدینہ کی فتح سے ہوئی اور تکمیل مکہ کی فتح پر۔

دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور و اقبال کا اصلی دور دوسرا دور تھا۔ کیونکہ اسی دور میں اسلام کی پہلی عزت ختم ہوئی۔ اور ظاہری طاقت

وحشمت کا سروسامان شروع ہوا۔ بدر کی جنگی فتح ہتھیاروں کی پہلی فتح تھی۔ مکہ کی فتح عرب کی فتح کا اعلان عام تھا۔ لیکن خود اسلام کی نظروں میں اس کی زندگی کا اصلی دَور دوسرا نہیں پہلا تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ اسکی ساری توتوں کی بنیادیں دوسرے میں نہیں پہلے دور میں استوار ہوئی ہیں بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے اپنی غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کردیا لیکن جوہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے۔ ان کی طاقتیں کس میدان میں تیار ہوئی تھیں۔ بلاشبہ مکہ کی فتح عرب کی فیصلہ کن فتح تھی لیکن اگر مدینہ کی فتح ظہور میں نہ آتی تو مکہ کی فتح کی راہ کیونکر کھلتی۔ یہ سچ ہے۔ کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا۔ لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت اور اس کے دَور کے اعمال سے فتح ہوا تھا۔ پس دوسرے دور میں جسم کتنا ہی طاقتور ہوگیا ہو۔ لیکن اس کی روح پہلے ہی دَور ڈھونڈنی چاہیئے۔

پہلا دور ختم تھا دوسرا اس کے برگ وبار تھے۔ پہلا دور بنیاد تھی دوسرا استون و محراب تھا۔ پہلا نشوونما کا عہد تھا دوسرا ظہور دانفعال کا۔ پہلا معنے وحقیقت تھا۔ دوسرا صورت و اظہار۔ پہلا روح تھا دوسرا جسم۔ پہلے نے پیدا کیا۔ درست کیا۔ اور مستعد کردیا۔ دوسرے نے قدم اٹھایا۔ آگے بڑھا اور فتح وتسخیر کا اعلان کردیا۔ دوسرے کا ظہور کتنا ہی شاندار ہو۔ لیکن اولیں بنیاد و استعداد کی عظمت پہلے ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

سنہ ہجری کی ابتداء

قومی زندگی کی بنیادی مقومات میں سے ایک نہایت اہم چیز سنہ اور تاریخ ہے جو قوم اپنا قومی سنہ نہیں رکھتی۔ وہ گویا اپنی بنیاد کی ایک اینٹ نہیں رکھتی۔ قوم کا سنہ اس کی پیدائیش اور ظہور کی تاریخ ہوتا

ہے۔ یہ اس کی قومی زندگی کی روایات قائم رکھتاہے۔ اور صفحہ عالم پر اس کے اقبال وعروج کا عنوان ثبت کردیتاہے۔ گویا یہ قومی زندگی کے ظہور وعروج کی ایک جاری وقائم یادگار ہے۔ ہر طرح کی یادگاریں مٹ جا سکتی ہیں۔ لیکن یہ نہیں مٹ سکتی۔ کیونکہ سورج کے طلوع وغروب اور چاند کی غیر متغیر گردش سے اس کا دامن بندھ جاتاہے۔ اور دنیا کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی عمر بھی بڑھتی رہتی ہے۔ آج آگسٹس اور بکرماجیت۔ جلال الدین ملک شاہ۔ اور اکبر اعظم کے نام ان کے سنین کے ذریعہ سے زندہ ہیں۔ اور ہمارا حافظہ اُن سے گردن نہیں موڑ سکتا۔ نیز یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ کہ اسلام کے ظہور سے قبل دنیا کی متمدن اقوام میں متعدد سنہ جاری تھے۔ ان میں سے زیادہ مشہور یہودی رومی اور ایرانی سنین تھے۔ عرب جاہلیت کی اندرونی زندگی اس قدر متمدن نہیں تھی۔ کہ حساب و کتاب کی کسی وسیع پیمانہ پر ضرورت ہوتی۔ اوقات ومواسم کی حفاظت اور یادداشت کے لئے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لیلیتے اور اسی سے وقت کا اندازہ لگا لیتے۔ منجملہ سنین جاہلیت کے ایک عام الفیل تھا۔ یعنے شاہ حبش کے حجاز پر حملہ آور ایک واقعہ عرب کے حساب وکتاب میں بطور سن کے مستعمل رہا۔ ظہور اسلام کے بعد یہ اہمیت خود عہد اسلام کے واقعات نے لے لی۔ اور صحابہ کرام کا قاعدہ ہوگیا۔ کہ عہد اسلامی کے واقعات میں سے کوئی ایک اہم واقعہ لے لیتے۔ اور اسی سے حساب لگا لیتے۔ ہجرت مدینہ کے بعد ہی سورہ حج کی وہ آیت نازل ہوئی تھی جس میں قتال کی اجازت دی گئی تھی۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم۔

لقدیر۔ اس لئے کچھ دنوں تک یہی واقعہ بطور ایک سنہ کے کام دیتا رہا۔ لوگ اسکو سنہ اذن سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ اور یہ تعبیر وقت

کے ایک خاص عدد کی طرح یادداشت میں کام دیا کرتی۔ اسی طرح سورہ برأۃ کے نزول کے بعد سنہ برأت کا بھی بول چال میں رواج رہا۔ عہد نبوی علیہ السلام کا آخری سنہ سنۃ الوداع تھا۔ یعنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حج شریف کا واقعہ جو حجت الوداع کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ اور ہجرت کے دسویں سال پیش آیا تھا۔ اور بعض روایات سے تو اسی قسم کے بےشمار سنوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً سنۃ التمحیص سنۃ التوفئۃ۔ سنۃ الزلزال۔ سنۃ الاستناسی علامہ بیرونی نے آثار الباقیہ میں اسی طرح کے دس سنوں کا اور بھی ذکر لیا ہے۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک یہی حالت جاری رہی۔ لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا عہد شروع ہوا تو ممالک مفتوحہ کی وسعت اور دفاتر حکومت کے قیام سے حساب وکتاب کے معاملات زیادہ وسیع ہوئے اور ضرورت پیش آئی کہ سرکاری طور پر کوئی ایک سنہ قرار دے لیا جانا چاہئے۔ چنانچہ اس مسئلہ پر غور کیا گیا۔ تو سنہ ہجری عمل میں لائے جانے کا فیصلہ ہوا۔ اس وقت تک واقعہ ہجرت پر سولہ برس گذر چکے تھے۔

احساس ضرورت اور مشورِ صحابہ

سنہ ہجری کا تقرر کیونکر عمل میں آیا۔ کیوں تمام صحابہ کرام اور حضرت عمر رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ذہن اسطرف گیا کہ اسلامی سنہ کی ابتدا واقعہ ہجرت سے کی جائے۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک ضروری اور نتیجہ خیز مبحث ہے۔ اور اس بارے میں متعدد روائتیں منقول ہیں۔ جن میں سے سب سے زیادہ مشہور روایت میمون بن مہران کی ہے جسکو تمام مؤرخین نے نقل کیا ہے۔ اور خلاصہ اس کا یہ ہے۔ کہ ایک مرتبہ ایک کاغذ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا جس میں شعبان

کا مہینہ درج تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا۔ کہ اس مندرج شعبان سے کونسا شعبان مراد ہے۔ اس سال کا یا آئندہ سال کا۔ پھر آپ نے سربرآوردہ صحابہ کرام کو جمع فرمایا۔ اور کہا کہ اب حکومت اسلامی کے مالی وسائل بہت زیادہ وسیع ہو گئے ہیں۔ اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ حساب کتاب کے لئے کوئی ایسا طریق اختیار کیا جائے۔ کہ اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہو سکیں۔ اس پر بہت سے حاضرین دربار نے کہا کہ اس معاملہ میں ایرانیوں سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ کہ ان کے ہاں اس کے طریقے کیا تھے۔ چنانچہ حضرت عمر نے ہرمزان کو بلایا۔ اور اس کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ ہرمزان نے جواب میں عرض کیا۔ کہ ہمارے ہاں ایک حساب موجود ہے جس کو ماہ روز کہتے ہیں اسی ماہ روز کو عربی میں مورخ بنا لیا جائے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی حکومت کی تاریخ کیلئے جو سنہ اختیار کیا جائے۔ اس کی ابتدا کب سے ہو۔ چنانچہ اس پر متفقہ طور سے فیصلہ ہو گیا۔ کہ ہجرت کے برس سے کی جائے۔ چنانچہ حساب وکتاب اور دفتری کاروبار کے لئے سنہ ہجری قرار پائی۔ (از تاریخ کبیر ذہبی و تاریخ مصر مقریزی)

ایک دوسری روایت ابن حبان نے قرہ بن خالد سے بھی نقل کی ہے جس میں ایک دوسرے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر کے پاس یمن سے ایک عامل آیا۔ اس نے عرض کیا کہ لکھنے پڑھنے میں آپ لوگ تاریخ نہیں لکھتے۔ کہ فلاں بات فلاں سنہ میں اور اس سنہ کے فلاں مہینے میں ہوئی۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اور لوگوں کو بھی اس کا خیال ہوا۔ اور اس کے متعلق ضروری ضروری امور پر غور کیا جانے لگا۔ پہلے سب نے ارادہ کیا کہ سنہ کا حساب حضور پرنور شافع یوم نشور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے وقت سے

شروع کریں۔ پھر خیال ہوا کہ آپ کی وفات سے شروع کیا جائے لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ اسلامی سنہ کا تقرر ہجرت سے ہو۔

ان روایات کی مزید تشریح امام شعبی کے بیانات وروایات سے ہوتی ہے۔ جو محب طبری نے نقل کئے ہیں۔ یعنے ابوموسےٰ اشعری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا۔ کہ آپکی جانب سے ہمارے نام خطوط آتے ہیں مگر ان پر کوئی تاریخ درج نہیں ہوتی۔ اور یہ وقت وہ تھا۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکومت کے مختلف دفاتر قائم کردیئے تھے۔ اور خراج کے اصول وقواعد طے پا گئے تھے۔ اس لئے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ ضبط اوقات کے لئے ایک خاص تاریخ قرار پا جائے۔ پرانی تاریخیں موجود تھیں۔ لیکن وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ انہیں اختیار کیا جائے۔ اب جو موسےٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے لکھا۔ تو وہ لکھنا ان کی مزید توجہ کا باعث بن گیا حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ اس مجلس شوریٰ میں سب کی رائے یہی قرار پائی کہ ہجرت کا واقعہ بنیاد ٹھیرا کر سنہ ہجری کی ابتدا کی جائے اور اختیار کرنے میں یہی پسندیدہ بھی ہے (ریاض النضرۃ)

ابوہلال عسکری نے الاوائل میں اور مقریزی نے تاریخ میں حضرت سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے۔ کہ واقعہ ہجرت سے سنہ شروع کرنے کی رائے حضرت علی علیہ السلام نے دی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ کہ کس دن سے تاریخ کا حساب شروع کیا جائے۔ تو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا۔ اس دن سے جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لائے۔

یعقوبی نے بھی اسے منجملہ ان امور کے قرار دیا ہے۔ جو حضرت علی علیہ السلام کی رائے سے انجام پائے۔ چنانچہ ۱۶ھ کے واقعات میں

لکھتا ہے۔ کہ اسی زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ ضبط کتابت کے لئے ایک تاریخ قرار دے دی جائے۔ پہلے ان کو خیال ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے شروع کریں۔ پھر خیال کیا۔ کہ آپکی بعثت کے واقعہ سے ابتدا کی جائے۔ لیکن حضرت علی علیہ السلام نے رائے دی کہ واقعہ ہجرت سے کرنا چاہئے۔

قومی سنہ کی ضرورت کا کیوں احساس ہوا

یہاں دو باتیں نہایت غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ نے قومی سنہ کی ضرورت کو کیوں محسوس کیا؟ دوسرے یہ کہ اس کی ابتدا واقعہ ہجرت سے کیوں قرار پائی؟ چنانچہ اس کا جواب شعبی کی روایت سے ملتا ہے۔ کہ حضرت عمرؓ تاریخ کے تعین و تقرر کی ضرورت تو محسوس فرما رہے تھے۔ لیکن یہ پسند نہیں فرماتے تھے۔ کہ دوسری اقوام کی تاریخ اختیار کریں۔ پہلی صورت میں جس ہرمزان کو بلانے اور مشورہ کرنے کا ذکر ہے۔ یہ ہرمزان خورستان کا بادشاہ تھا۔ اور حلقہ بگوش اسلام ہو کر مدینہ منورہ میں مقیم ہو گیا تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجالس شوریٰ میں اس کا ذکر بار بار اور کثرت سے آتا ہے۔ (بلاذری و طبری وغیرہما)

بیرونی لکھتا ہے۔ کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے مشورہ کیا تو اس نے نہ صرف ایرانیوں کا طریقہ ہی عرض کیا۔ بلکہ رومیوں کے طریقہ کی بھی تشریح کی تھی۔ اس وقت ایرانیوں کا مروجہ اور آخری سنہ یزدگرد کا سنہ تھا۔ اور رومیوں کا مشہور سنہ سکندر کی پیدائش سے شروع ہوتا تھا۔ یہ معلوم کر کے بعض صحابہ کو خیال ہوا کہ انہی دونوں میں سے (ایرانیوں و رومیوں) کے کسی ایک کو اختیار کر لیا جائے۔ لیکن خود حضرت عمرؓ اور سابق مسلمانوں کی اکثریت اس کے خلاف رہی۔ اور متفق نہ ہوئے۔ اس سے معلوم

ہوا کہ ایرانیوں اور رومیوں کے سنین مجمع اصحابہ کرام میں زیر بحث ضرور رہے ہیں۔ اور بعضوں نے ان کے اختیار کر لینے کا مشورہ بھی دیا۔ لیکن عام رجحان اس طرف تھا۔ کہ نیا سنہ مقرر کرنا چاہیے۔

مسئلہ ہجرت تزکیہ نفس کی اساس ہے

اسلام کی تربیت اور بانیٔ اسلام علیہ السلام کی پرورش نے صحابہ کرام کے دل و دماغ میں قومی شرف و خودداری کی وہ روح پھونک دی تھی۔ جو کسی میدان میں بھی اغیار کے طریق کار کو اپنانا گناہ سمجھتی تھی۔ اس کا ایک ہی سے لگاؤ اور ایک ہی سے جوڑ ہر طرف سے اسکے منہ کو موڑے ہوئے تھا۔ اور وہ ہر شئے کو اس ایک آئینہ انوار الٰہی میں دیکھنا چاہتی تھی۔ قومی زندگی کی بنیادیں جن اینٹوں پر استوار ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک اینٹ کے لئے من کل الوجوہ اس کے اندر لگاؤ اور تمیز موجود تھی۔ اگرچہ وہ لفظوں اور تعبیروں میں انہیں بیان نہ کر سکے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے جب سنہ اور تاریخ کی ضرورت کا احساس فرمایا۔ تو اگرچہ متمدن اقوام کے سنین ان کے سامنے رائج اور مستعمل تھے۔ لیکن ان کے نور نبوت میں بھیگی ہوئی طبیعت انکی جانب مائل نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ ایسا کرنا انکے لئے نہ صرف قومی شرف و خودداری کے خلاف تھا۔ بلکہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ کھو دینے کے مرادف بھی تھا۔

الغرض حقیقت پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ اسلام کی تعلیم و تربیت نے مسلمانوں کے دماغوں کو جس سانچے میں ڈھال دیا تھا وہ ایسا سانچا تھا جس میں کوئی دوسرے درجے کا خیال ڈھل ہی نہیں سکتا تھا۔ اور وہ سانچا صرف اول درجہ کے خیالات کے لئے ہی تھا۔ بہت ممکن ہے کہ دنیا کے تمدنی علوم و فنون کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی بات علمی طریقوں اور مصطلحہ لفظوں میں نہ ادا کر سکتے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ بعض اوقات وہ ایک

بات کی علت اس شکل وصورت میں نہ دیکھتے ہوں جس صورت میں آج دنیا دیکھ رہی ہے۔ لیکن انکی طبائع کی افتاد اور ذہنیتوں کی روش کچھ اس طرح کی بنگئی تھی۔ کہ وہ جب کسی معاملہ پر سوچ بچار کرتے تھے۔ تو خواہ وہ اس کی علت وموجب کو سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں۔ لیکن دماغ جاتا اسی طرف تھا جو علم وحکمت کے بہتر سے بہتر اور بلند سے بلند پہلو ہو سکتے تھے۔ اور یہی معنے ہیں انبیاء علیہ السلام کے مقام تزکیہ کے (ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ) یعنے دل ودماغ کی اس طرح تربیت کردی جاتی ہے۔ کہ ایک موزون اور مستقیم سانچا ڈھل جاتا ہے۔ پھر جب کبھی اس میں کوئی ٹیڑھی بُری چیز رکھی جائیگی وہ قبول ہی نہیں کریگا۔ صرف سیدھی، بہتر اور موزون اشیاء ہی اس میں جگہ پکڑ سکتی ہیں..... چونکہ قومی سنہ کا مسئلہ ایک وہ مسئلہ تھا۔ جس کے لئے غلط فیصلہ کا ہو جانا گویا قیامت تک تمام قوم کو بے راہ روی کی دعوت دینے اور غلط راستہ پر چلانے کے مرادف تھا۔ اس لئے ممکن نہ تھا۔ کہ قومی زندگی کا ایک ایسا اہم معاملہ خلیفۃ المسلمین اور کا عام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے آتا۔ اور ان کا دماغ اس کا صحیح فیصلہ نہ کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ فیصلہ ہی غلط نہ کہلاتا۔ بلکہ اسلام کی دماغی تربیت پر دھبہ لگتا۔ یہ کچھ ضروری نہیں۔ کہ انہوں نے اپنے اس احساس کی کوئی توجیہ وتعلیل بھی کی ہو۔ کیونکہ نتائج تعبیر وتعلیل سے نہیں بلکہ فعل صحیح سے پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اور اس کے خلاف میلان نہ پیدا کر سکے۔ وہ باوجود غیر اقوام کی ہر طرح علمی وتمدنی چیزیں قبول کر لینے کے بھی ان کا سنہ قبول نہ کر سکے۔ اور خود بخود انکی طبیعت کا فیصلہ یہی ہوا۔ کہ قومی سنہ سب سے الگ اور ایسا ہونا چاہئے۔ جسکا بنیاد اپنی تاریخ کے کسی قومی واقعہ پر ہو۔ گو انہوں نے اپنے دفاتر کیلئے ایرانیوں اور رومیوں کی زبان لے لی۔ ان کے حساب وکتاب کے قواعد قبول

کرلئے۔ ان کے حساب کی مصطلحات و اشارات سے بھی انکار نہیں کیا۔ لیکن ان کا سنہ اور تاریخ لینے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ کیونکہ یہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ تھی جس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی ہی ہو اور اپنے ہی ہاتھ سے رکھی جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور اسلام نے جو ذہنیت انکی پیدا کردی تھی۔ اُسے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔

اب رہی یہ بات کہ قومی سنہ کا تقرر تو بہترین فیصلہ کا حامل ہو گیا کہ سنہ اور تاریخ اپنے ہی ہوں۔ مگر سوال یہ باقی رہ جاتا ہے۔ کہ سنہ کی ابتدا قرار دینے میں جس قدر بھی سامنے کی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ سب کو چھوڑ کر ہجرت نبوی علیہ السلام کا واقعہ جو آغاز اسلام کی بے سروسامانیوں اور درماندگیوں کی یاد تازہ کرتا تھا۔ کیوں اختیار کیا گیا۔ اور اسکی علت کیا تھی؟

واقعہ ہجرت کا اختصاص

مسلمانوں کا قومی سنہ قرار دینے کے لئے قدرتی طور پر جو دوسری چیزیں سامنے کی تھیں۔ وہ اسلام کا ظہور تھا۔ داعئ اسلام کی پیدائش تھی نزول وحی کی ابتدا تھی بدر کی تاریخی فتح تھی۔ مکہ کا فتحمندانہ داخلہ تھا۔ حجۃ الوداع کا بے پناہ اجتماع تھا۔ جو اسلام کی ظاہری اور معنوی تکمیل و فتح کا آخری اعلان تھا۔ لیکن ان تمام واقعات میں سے کوئی ایک واقعہ بھی سنہ کی تخصیص میں اختیار نہیں کیا گیا۔ ہجرت مدینہ کی جانب نظریں گئیں۔ جو نہ تو کسی پیدائش کا جشن ہے۔ نہ کسی شوکت کا ظہور۔ نہ کسی جنگ کی فتح ہے نہ کسی غلبہ کا شادیانہ۔ بلکہ اس زمانہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جبکہ داعئ اسلام کے لئے اپنے وطن میں پر امن زندگی بسر کرنا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ اور بیچارگی و مظلومیت کی یہ حد تھی۔ کہ اپنا وطن۔ اپنا گھر۔ اپنے خویش و اقارب چھوڑ چھاڑ کر صرف ایک رفیق غمگسار و یار غار کے ساتھ رات کی تاریکی میں

رہا ہے یادِ دشتِ غربت ہوا تھا۔

قومی سنہ در اصل قوم کی پیدائش اور عروج و اقبال کی تاریخ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے قومیں اپنی تاریخ کا سب سے زیادہ اہم اور بنیادی واقعہ یاد رکھنا چاہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جس قدر سنہ رائج ہوئے سب کی بنیاد۔ بانیان حکومت و مذہب کی پیدائش۔ بادشاہوں کی تخت نشینی انبیاء کی بعثت۔ ملکوں کی فتح و تسخیر کے انقلاب و انتقال۔ اور حوادث عظیمہ ارضیہ سے ہوئی۔ مگر یہاں کی بات ہی نرالی تھی۔ جو اہل جہان کی تمام قومی یادگاروں کے خلاف نظر آتی ہے۔ دنیا کی تمام قومیں فتح و اقبال سے اپنی تاریخ شروع کرتی ہیں۔ مگر انہوں نے اپنی انتہائی بیچارگی و ماندگی سے شروع کی۔ دنیا کی قوموں کا فیصلہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اپنے ظہور کی سب سے بڑی فتح یاد رکھیں۔ مگر انہوں نے اپنے ظہور کی سب سے بڑی بے سروسامانی یاد رکھی۔ دنیا والوں نے اپنی تاریخ کی ابتدا اس وقت سے کی جب ان میں کوئی بڑا انسان پیدا ہوا۔ مگر انہوں نے اس وقت سے کی جب بڑے انسان کی نہیں بلکہ بڑے عمل کی پیدائش ہوئی۔ دنیا معنی سے زیادہ لفظ کی اور روح سے زیادہ جسم کی پرستار ہوتی ہے۔ مگر یہاں تخم کی جستجو تھی پھل کی نہ تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام نے پیدائش و بعثت کے واقعاتِ عظیمہ ترک کر کے واقعہ ہجرت کا انتخاب کیا گو انکی نظر میں بھی پیدائش اور ظہور جشن و کامرانی۔ اور فتح و اقبال کی بلندیاں تھیں اور وہ ناکامی و نامرادی کے دلدادہ نہ تھے۔ مگر وہ فتح و اقبال کی صورت اور برگ و بار کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ حقیقت و اساس پر نظر رکھتے تھے ان پر یہ حقیقت کھل چکی تھی کہ اسلام کی پیدائش و ظہور اور فتح و اقبال کی اصلی بنیاد ان واقعات میں نہیں ہے۔ جو بظاہر نظر آتے ہیں بلکہ ہجرت مدینہ اور اسکے اعمال و حقائق میں ہے۔ اسلئے جو اہمیت دنیا کی نگاہیں پیدائش بعثت بدر اور فتح مکہ کو دیتی تھیں۔ وہ انکی نظروں میں ہجرت مدینہ کو حاصل تھی۔ یہی وجہ ہوئی

کہ سنہ اسلامی کی ابتدا کرنے میں انہوں نے منارۂ محراب کی بلندیوں کو مدنظر نہیں رکھا۔ بلکہ زمین کی بنیادوں کو دل ودماغ میں جگہ دی۔ اور سنہ اسلامی کی ابتداء واقعہ ہجرت سے کی گئی۔ کیونکہ ہجرت ہی تکمیل کار کا اعلان تھی۔

پس جونہی یہ سوال سامنے آیا۔ کہ اسلامی سنہ کی ابتدا کس واقعہ سے کی جائے۔ تو انہیں ایک ایسے واقعہ کی جستجو ہوئی۔ جو امت کے قیام اقبال کا اصلی سرچشمہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا واقعہ یقیناً سب سے بڑا واقعہ تھا۔ لیکن اس کے تذکار میں شخصیت سامنے آتی تھی۔ اور شخصیت کا عمل نہیں سامنے آتا تھا۔ بعثت کا واقعہ بھی سب سے بڑا واقعہ تھا۔ لیکن وہ معاملہ کی ابتدا تھی انتہا و تکمیل نہ تھی۔ بدر کی جنگ اور مکہ کی فتح عظیم کے واقعات تھے لیکن وہ اسلام کی فتح و اقبال کی بنیاد نہ تھے بلکہ کسی دوسری بنیاد کے نتائج وثمرات تھے۔ یہ تمام واقعات صحابہ کرام کے سامنے آئے لیکن ان میں سے کسی پر بھی طبیعتیں مطمئن نہ ہو سکیں۔ بالآخر جب ہجرت کا واقعہ سامنے آیا تو سب کے دلوں نے قبول کر لیا۔ کیونکہ انہیں یاد آ گیا کہ اسلام کے ظہور و خروج کا مبدء حقیقی اسی واقعہ میں پوشیدہ ہے۔ اور یہی واقعہ اسلامی تاریخ کا مبدء بننا چاہئے ۔

تحویلِ قبلہ

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ (پ ۲۔س بقرہ)

ترجمہ:۔ تحقیق ہمنے تیرے روئے انور کو آسمانوں میں پھرا دیکھا پس البتہ ہم تجھکو اسی قبلہ کی جانب پھیر دیں گے جس کی طرف تو راضی ہے۔ پس اب مسجد حرام کی جانب اپنا منہ پھیر لے۔ پس پھیرا کرو موہنوں کو اسی کی طرف جہاں کہیں تم ہوا کرو۔ اور وہ لوگ جن کو کتاب ملی ہے البتہ جانتے ہیں۔ ان کے رب کی طرف سے وہی ٹھیک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے عملوں سے جو وہ کرتے ہیں بے خبر نہیں ہیں:

قبلہ مکرمہ کی فطری ضرورت

کسی نہ کسی ما فوق الانسان ہستی کو اپنا مالک و خالق جاننا اور قادر مطلق ماننا انسانی فطرت میں داخل ہے۔ ایک جاہل سے جاہل اور وحشی سے وحشی کے ہاتھ بھی (جس نے کبھی خدا کا نام تک نہ سنا ہو) تکلیف و مصیبت میں بالکل غیر اختیاری طور پر استمداد کے لئے کسی ایسی ہستی کی طرف ضرور اٹھ جاتے ہیں۔ جسے وہ ہر شئے پر قادر یا اپنی مصیبتوں کا مداوا اور نجات دہندہ

سمجھتا ہے۔ پھر دعا مانگنے کے بعد روح میں کسی قدر تسکین اور قلب میں کسی قدر طمانیت کا پیدا ہو جانا ایک یقینی امر ہے۔ اور یہ سکون و اطمینان بالکل اسی قسم کا ہوتا ہے۔ جیساکہ بچے اس وقت محسوس کرتے ہیں جب انہیں کوئی ستائے اور وہ اپنا دکھ درد آکر اپنے ماں باپ سے بیان کر دیں۔ جن کے متعلق ان کو یقین ہوتا ہے۔ کہ وہ انکی مدد پر قادر ہیں۔ طبعًا دکھے ہوئے دل میں اس قسم کے اطمینان کا پیدا ہونا بھی اسی کا ثبوت ہے۔ کہ اپنے سے بالاتر کسی ہستی کو تسلیم کرنا اور اسے قادر مطلق جاننا انسانی فطرت کا لابدی تقاضا ہے۔ اور اعتقادی و معنوی طور پر یہی مفہوم عبادت ہے۔

عبادت خواہ محسوس ہستی کی کی جائے یا نادیدہ اور غیر محسوس ہستی کی لیکن یہ امر سب میں مشترک ہے۔ کہ اس محسوس یا غیر محسوس ہستی کو جہان کا خالق مالک۔ رازق۔ محی۔ ممیت وغیرہم اوصاف کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت میں یہ خواہش لے کر پیدا ہوا ہے۔ کہ وہ کسی نہ کسی ہستی کو اپنا خالق و مالک بنائے اور ایسی تمام طاقتوں کو اس کے ساتھ منسوب کرے جو انسان میں نہ پائی جاتی ہوں۔ اور اسی خواہش و شوق نے بعض اوقات لوگوں کو اس بات پر بھی مجبور کر دیا ہے کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے آگے سجدے کیا کریں۔ جو اپنی بعض خوبیوں اور خصوصیتوں میں عام انسانوں سے انہیں بالاتر نظر آئیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض افراد نے ان دیکھے خدا پر ایمان لانے کو مشکل خیال کر کے اس کے تصور کو تو چھوڑ دیا اور ایک دیکھے ہوئے انسان کو خدا سمجھکر پوجنے لگے مہاتما بدھ۔ کرشن مہاراج۔ حضرت عیسٰے۔ حضرت عزیر کی پرستش اسی مغالطہ کی کڑیاں ہیں۔ جو انسان ہونے کے باوجود بہت سے انسانوں کے نزدیک قابل پرستش و معبود سمجھے گئے۔ اور غلط بین انسانوں نے بہت سی صفات الٰہیہ ان کے ساتھ منسوب کر دیں

ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ خدا کی ہستی پر ایمان لانا اور اس کی بارگاہ میں سر نیاز جھکا کر اپنی حاجات کا اس سے طلب کرنا انسانی شریعت میں داخل ہے۔ اور جو معدودے چند حیوان ناطق بہرے سے خدا ہی کے قائل نہیں وہ صحیح الفطرت انسان نہیں ہیں جنہوں نے سلیم فطرت کی بجائے اپنی محدود و نارسا عقل کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا ہے۔ جسکے لئے ہر لحظہ گمراہی کا امکان مسلّم ہے۔

پھر خدا کی ہستی کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کی محبت و تعظیم اور اس کا خوف و رعب بھی انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اور دنیا کی کسی طاقت سے نہ ڈرنے والا اور صاحب قوت وجود بھی اس دیدہ یا نادیدہ ہستی کے خوف سے کانپ اٹھتا ہے اور اسکی محبت اس کو ایسے کام کرنے پر مائل کر دیتی ہے جو اس کو پسند ہیں اور اسکا خوف اسکو ایسے افعال سے باز رکھتا ہے جنکے متعلق اس کو خیال ہے۔ کہ یہ افعال میرے معبود کی مرضی کے خلاف ہیں۔ اور یہ عبادت کی دوسری ظاہری صورت ہے بالکل ابتدائی زمانے کے حالات کا تو علم نہیں اور نہ یہ بتایا جا سکتا ہے۔ کہ حضرت سیدنا آدم علیہ السلام اور حضرت سیدہ حوا علیہا السلام کس طریق پر عبادت الہی کیا کرتے تھے۔ مگر تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر تشریف لائے تو وحشت و تنہائی کو محسوس فرما کر بارگاہ ایزدی میں عرض گذار ہوئے۔ کہ یہاں کوئی مسقف مکان نہیں اور نہ کوئی عبادت کا سامان۔ لہذا میرے لئے عبادت گاہ کا انتظام فرمایا جائے حکم ہوا کہ تو عبادت کیلئے ایک گھر بنا کہ یہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہو گا۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ جگہ معلوم ہونی چاہیئے چنانچہ جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ اور انہوں نے کعبۃ اللہ کی جگہ بتائی اور آدم علیہ السلام نے زمین سے اوپر پتھروں سے بنیاد اٹھائی۔ اور ایک غیر مسقف چوکور چار دیواری کھڑی کر لی۔ جس پر بحکم الہی ایک خیمہ نورانی جو ملاء اعلیٰ میں ملائکہ کی طواف گاہ اور بیت المعمور کے نام سے مشہور تھا لگا دیا گیا۔ اور آدم علیہ السلام وہاں پر طواف فرماتے۔ اور اسی جہت کو عبادت کے رکوع

وقیام اور سجود و سلام کرتے۔ (جسکی مفصل بحث فقیر نے اپنی کتاب مصباح الامکان میں لکھدی ہے) اور یہ ہے عبادت کا پہلا طریق اذجو زمین پر شروع ہوا۔

عبادت کے بیشمار طریقے دنیا میں رائج ہیں۔ جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے مثلاً کسی جوگی کا اپنے ایک ہاتھ یا ایک ٹانگ کو زمین سے اونچا رکھ رکھ کر خشک کر دینا اور مدت العمر کے لئے اپنے آپ کو اپاہج بنالینا۔ یا نیند سے نجات حاصل کرنے کے لئے لوہے کی کیلوں پر بیٹھنا جو ہر وقت جسم میں چبھتی رہیں۔ یا تیس تیس چالیس یوم کا ایک ہی برت (روزہ) رکھنا یا ہمیشہ کے لئے شادی نہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ عبادت کے وہ اذیت رساں طریق کار ہیں۔ جن کو فطرت کے قانون نے ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ کیونکہ اگر اسی عبادت کی متمنی ذات باریتعالےٰ ہوتی تو یقیناً اس جہان کی ملذذات پیدا نہ کی جاتیں۔ اور اس معمورہ کے سامان خورد و نوش وعیش و راحت سے نفع اٹھانا ایک انتہائی نافرمانی کے مرادف قرار دے دیا جاتا۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود فطرت کی اس اقتضا کے مذہب عیسوی کی تاریخ اور ہندو مت کی پوتھیاں۔ تارک الدنیا راہبوں اور بادیہ نشیں سادھوؤں کی غلط کاریوں سے بھری پڑی ہیں اور یہ دیکھکر کہ اس قسم کی عبادت کے اس قدر خراب نتیجے نکلتے ہیں خیال ہوتا ہے۔ کہ یہ عبادت کے طریقے خدا کے مقرر کردہ نہیں ہیں۔ بلکہ لوگوں نے اپنی اپنی اقوام میں شہرت حاصل کرنے کے لئے خود ایجاد کر لئے ہیں۔ اور ان میں عالمگیر طریقہ عبادت بننے کی ذرا سی بھی صلاحیت نہیں۔

ہزاروں برس کی تاریخی معلومات کا مطالعہ اور انسانی نفسیات کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے۔ کہ خداوند عالم جل وعلا شانہ کی عبادت کا کوئی ایسا

طریقہ مقبول عام نہیں ہو سکتا۔ جس میں بہت سی دشواریاں اور خلاف فطرت جانکاہیاں پیش آئیں۔ اور تمام قوم کو ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق حاصل نہ ہو۔

عبادت کا نظریہ درحقیقت یہ ہے۔ کہ انسانی عبادت انسان ہی کے فائدے کے پیش نظر نہایت مستحسن اور سہل طور پر ادا ہو کر اس پر بوجھ نہ بنے اور انسان رضا الٰہی کے ماتحت پورے ذوق و شوق سے ہمیشہ اس پر مستعد رہ سکے اور اس قسم کی عبادت پیش کرنے کا فخر صرف اسلام کی تعلیم کے اس حصہ کو ہے جو سرکار کائنات مختار شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا دیگر انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے دنیا کو پہنچا ہے۔ اس لئے انسان بجا طور پر یہ توقع کر سکتا ہے۔ کہ اگر یہ تمام مذاہب والے عبادت کے طریق خداء ندعالم جل و علاشانہ ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ تو ان میں کوئی نہ کوئی بات تو ایسی ہونی چاہیئے۔ جس کی طفیل مقررہ وقت عبادت کے لئے عابد اپنے جسم اور روح کو معبود کا نام جپنے اور اس کی یاد کرنے میں پوری تسکین اور طمانیت سے مستفید کر سکے کیونکہ وہ طریق عبادت خالق و مخلوق کے تعلقات کی استواری اور عابد و معبود کی رازداری میں قطعاً قابل منسوخی سمجھا جائیگا۔ جس میں معبود کے لئے ایک سیکنڈ کو بھی یکسوئی کا موقعہ نہ مل سکے۔ اور عابد اپنی جسمانی کوفت اور روحانی بیقراری سے ایسا بیچین ہو کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے جذبہ عبودیت کو تسکین کا اہل نہ بنا سکے۔

عبد و معبود کے تعلقات اور بندہ و خدا کے باہمی راز و نیاز چونکہ الفاظ و اشارات کے محتاج نہیں اور ان کا تمام تر تعلق ہماری قلبی کیفیتوں سے ہے۔ مثلاً ادھر سر جھکانے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو اُدھر عالم الغیب اس ارادہ سے مطلع ہو جاتا ہے۔ ادھر عابد نے اسکی

تسبیح و تقدیس کی نیت کی اُدھر اسکی رحمت کو جوش آگیا۔ اور عبادت مقبول بارگاہ الٰہی ہو گئی۔ زبان ہلے یا نہ ہلے۔ ہاتھ اٹھے یا نہ اٹھے۔ پاؤں حرکت کریں یا نہ کریں۔ عجز و نیاز ظاہر کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ عابد کا دل یکسوئی سے اُس کے حضور میں عبادت کو تیار ہو جائے۔ ہم اپنا منہ پورب کو کریں یا پچھم کو مشرق کو کریں یا مغرب کو وہ معبود برحق ہر جگہ موجود ہے۔ گویا تعیین جہت و تخصیص سمت بھی کوئی لابدی چیز نہیں۔ لیکن مقصد چونکہ یکسوئی ہے۔ اس لئے ان چیزوں کے غیر ضروری ہونے کے باوجود بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مذہب نے عبادت الٰہی کے لئے کچھ تھوڑے تھوڑے الفاظ مخصوص کر دیئے ہیں جو زبان سے ادا کئے جاتے ہیں۔ اور ہاتھ پاؤں کی کچھ حرکتیں ہیں۔ جن کے بغیر عبادت مکمل اور درست نہیں ہوتی مثلاً دست بستہ کھڑے ہونا۔ پاؤں کو اعتدال پر عریض رکھنا۔ دو زانو بیٹھنا ہاتھ جوڑنا سجدہ کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ جن کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ عابد کی مکمل بیداری باہوش طریق پر اسکو معبود کے حضور میں یکسو رکھ سکے۔ اور اس کا ہر عضو اس کی عبادت میں شریک ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہو گا۔ کہ جب ہر طرف معبود کی ذات موجود ہے اور ہر سمت کو یکسوئی کے امکانات ہو سکتے ہیں تو پھر ایک ہی سمت کو منہ کرنا اور ایک ہی سمت میں متوجہ ہو کر معبود سے رشتہ جوڑنے کی سعی کرنا کیوں ضروری ہو گا۔ بات یہ ہے کہ نظریہ یہی صحیح ہے۔

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ

یعنی جہاں بھی منہ کر دگے خدا کو پاؤ گے

مگر اس معبود کے مرتب کردہ کچھ قوانین و اصول ہیں اور عموماً نتائج انہی کی بنا پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ فاینما تولوا کا نظریہ معبود برحق کے فرمان

میں تھا۔ مگر سیدنا موسےٰ علیہ السلام نے جب درخواست دیدار بالفاظ
رب ارنی انظر الیک بارگاہ معبود میں گذرانی تو لن ترانی کے
جواب کے بعد ارشاد ہوا درخواست دیدار بیجا یا نہ بلاواسطہ کی ہے۔ جس کی
اہلیت آپ میں نہیں۔ لہذا آپ میرے اور اپنے درمیان ایک وسیلہ
ایک تجلّی گاہ اور ایک سمت۔ ایک مقام معین فرمائیں۔ تاکہ متردد طبع
اور متزلزل تخیل یکجا و یکسو ہو کر میرے انوار کا انتظار کر سکے۔ جب تک یہ
سب کچھ یکسو نہ ہوگا دیدار باریتعالیٰ کے لئے ایک غیر مطمئن صورت
حال پیدا ہو جائیگی۔ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے آدمی کو جس طرح قوت
عقلیہ کا بیش بہا خزانہ عطا فرمایا ہے۔ اسی طرح قوت خیالیہ کے بھاری
خلعت سے بھی نوازا ہے۔ اور اصولی بات ہے کہ جب قوت خیالیہ
قوت عقلیہ کی معاون بنجاتی ہے۔ تو اس کا فعل وا ثر یعنے مجردات کا
ادراک قوی اور مستحکم ہو جاتا ہے۔ دیکھئے مہندس احکام مقادیر کا اعداد
کرتے وقت جب تک صورتوں اور شکلوں کو مصوّر و متشکل نہیں کر لیتا۔ اور اپنی
قوت خیالیہ کو قوت عقلیہ کا پورا مددگار نہیں بنا لیتا مقادیر کے احکام بخوبی
ذہن نشین نہیں کر سکتا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قوت خیالیہ کو عالم اجسام
میں پورا پورا دخل ہے اور جب تک قوت عقلیہ و خیالیہ متحد نہ ہونگی کسی غرض
کے پورا کرنے میں یکسوئی نہ ہوگی۔ اور تضاد رہیگا۔ جس کا نتیجہ بالکلیہ مقصد
سے ناکامی ہوگی۔ اس لئے ضروری تھا کہ ارشاد باری کے ماتحت سیدنا
موسےٰ علیہ السلام ایک مخصوص تجلی گاہ پر فوراً متوجہ ہو جاتے تاکہ درخواست
کے جواب میں جو نتائج وانوار قدسی رونما ہونے والے تھے۔ ان میں
تعویق و تاخیر نہ ہوتی۔ چنانچہ فانظر الی الجبل کا حکم خداوندی سنتے
ہی پہاڑ کی جانب مراقب ہو گئے اور نتیجہ سامنے آگیا۔ تجربہ شاہد
ہے۔ کہ کوئی شخص کسی جلیل القدر حاکم یا بادشاہ کو سلام کے لئے جائے

اور اسکی مدح و ثنا کرنا چاہئے۔ تو نقیب و ملازم شاہی اس کا ہاتھ پکڑ کر حاکم یا بادشاہ کے سامنے مؤدب طور پر کھڑا کر دیتا ہے۔ اور یہ اس کی جانب مکمل طور پر دھیان کر کے اور اس کے سامنے منہ دیکر اپنا مطلب عرض کرنے لگتا ہے۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ شاہی دربار میں گفتگو کے لئے تو بادشاہ سے مخاطب ہو اور خیال دائیں بائیں رکھے۔ تو مقصد براری اس وقت تک ممکن ہی نہیں بلکہ محال امر ہے۔ جب تک سکون محض و یکسوئی اختیار نہ کر لے۔ اور یہ دونوں امور اسی وقت میسر آسکتے ہیں کہ عابد عبادت کے اوقات میں ایک معین جہت کا التزام کرے۔ اور اس جانب سے دوسری جانب پر التفات نہ رکھے۔ یہاں سے یہ بھی ثابت ہو گیا۔ کہ عبادت الہیہ کے لئے تعین قبلہ نہایت ضروری و لابدی چیز ہے۔ اور جس جہت یا مکان کو قبلہ معین کیا جائے۔ اُسے کسی محسوس و معقول کمال اور تعلقات مخلوق سے پاک و منزہ اور خالی ہونا چاہئے۔ کیونکہ جو قبلہ محسوس و معقول کمالات سے جیسے آفتاب و ماہتاب۔ سیارہ و ستارہ۔ آتش و دریا۔ آراستہ ہو گا۔ یا مخلوق کے تعلقات سے (جیسے انبیاء و صلحاء علیہم السلام کے اماکن و مزارات مقدسہ) صاف نہ ہو گا۔ عوام کے نزدیک وہ قبلہ بننے کا مستحق نہ ہو گا کیونکہ وہ حرمت و عبادت اس مقدس مخلوقات اور محسوس و معقول کمالات کی جانب منسوب ہو گا۔ جن کا علاقہ اس قبلہ سے ہے۔ نہ خداوند عالم جل و علا شانہٗ کے لئے۔ لہذا اس مکان و جہت کا تعین و تقرر بھی اسی معبود لایزال اور حی باکمال کیطرف سے ہونا چاہئے۔ اور جس جہت کو وہ تعین فرمادے اس کو امر غیبی سماوی کے ساتھ وابستہ جاننا اور اپنے ناقص عقول و افکار کو اس کی تعیین و تشخیص میں متزلزل کرنا اور اس میں بیجا و ناجائز بحث و تمحیص کو عمل میں لانا در حقیقت رب العزت اور اس کے مطیع و

فرمانبردار بندوں کے طریق حقہ سے انحراف اور دوری ڈھونڈھنا ہے۔
نیز یہ کہ بندگی اور عبادت محض معبود حق کا ہی حق ہے۔ اور کسی حقدار کا حق بدوں اسکی یقینی اجازت کے کسی دوسرے محل و موقع میں صرف کرنا در حقیقت صاحب حق کے حق میں تجاوز عن الحد اور ظلم ہے۔ بدیں وجہ اللہ تعالےٰ نے سیدنا ابو البشر آدم علیہ السلام اور ابو الملت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں اکمل جہات اور افضل امکنہ (کعبہ مکرمہ) کو قبلہ قرار دیا۔ کیونکہ یہی ایک مبارک مکان انسان مبدء ترابی محسوس و مشاہد ہو سکتا ہے! اسلئے کہ انسان کا اصل عنصر ہی (زمین) اسی نقطہ کے نیچے سے پھیلایا گیا ہے۔ اور عبادت کے وقت چونکہ عابد کا ظاہری جسم اپنے ظاہری مبدء کی طرف توجہ کرتا ہے۔ تو اس کے باطن کو بھی اپنے باطنی مبدء کی جانب مصروف ہونا ضروری ہے بدیں وجہ بھی جہت کعبہ ہی کو قبلہ ٹھیرانا ضروری ہوگا کیونکہ یہ مکان برکات و کرامات کا مجمعہ کعبہ معظمہ ایک ایسی خاص بات سے مخصوص ہے۔ جو کسی دوسرے مکان میں نہیں پائی جاتی اور وہ یہ ہے کہ قیامت کے دن عرش الٰہی کی تجلی اسی جگہ ہوگی اور اہل قیامت قبروں سے نکل نکلکر اسی کے اردگرد کھڑے ہونگے۔ گو اس مبارک مکان کی جانب منہ کرکے عبادت الٰہی کرنا گویا ہر وقت قیامت کے المناک واقعات اور اپنی کرتوتوں کی بازپرس کا نقشہ بچشم عبرت سامنے رکھنا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے صخرا بیت المقدس بڑا عالیشان اور خوشنما قبہ بناکر اس کے اردگرد مسجد کا نقشہ کھینچا تھا تو مسجد میں جنت دوزخ کی تصویریں بھی کھینچ دی تھیں۔ تاکہ جو شخص عبادت کے وقت انکی جانب منہ کرے وہ قیامت کے جانگسل مصائب کو یاد کرکے اپنے عملوں میں خاطر خواہ خلوص و اصلاح بھی پیدا کرلے۔

تعمیر قبلہ و کعبہ جب یہ امر متحقق ہو چکا۔ کہ فطری طور پر انسان کو اپنے معبود کے سامنے جھکنے کیلئے کسی جہت و قبلہ کی ضرورت ہے۔ اور اس کے بغیر یکسوئی و سکون قلب ممکن ہی نہیں

تو اسی نظریہ کے ماتحت ہمارے مولا و آقا سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے وقت سے ہجرت کے زمانہ تک کعبہ مکرمہ کی جانب رخ کر کے عبادت فرماتے رہے اگرچہ اس میں کسی قدر اختلاف بھی ہے کہ ہجرت سے پیشتر آپ کس سمت کو متوجہ ہو کر عبادت فرمایا کرتے تھے بعض نے لکھا ہے کہ جبتک آپ مکہ شریف میں جلوہ آرا رہے۔ بیت المقدس ہی کی جانب عبادت میں متوجہ ہوتے رہے اور بعض کا قول ہے۔ کہ قبلہ ابراہیمی یعنے خانہ کعبہ کی جانب عبادت فرمایا کئے۔ مگر جب تمام روایات پر گہری نظر ڈالی جائے تو یہ اختلاف بالکل اٹھ جاتا ہے۔ یعنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ میں صخرۂ بیت المقدس کی جانب متوجہ ہو کر عبادت کرنے کا حکم ہوا تھا۔ تو آپ دونوں رکنوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر تعمیل ارشاد کیا کرتے جہاں آنکھوں کے سامنے تو کعبۂ ابراہیمی ہی ہوتا مگر رُخ انور بیت المقدس کی جانب ہی رہا کرتا۔ بایں وجہ کسی نے سمت خانہ کعبہ اور کسی نے جہت بیت المقدس کو قبلہ بتایا ہے۔ پھر جب حضور مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ تو خواہ باجتہاد خود اور خواہ بالہام الٰہی تقریباً سوا برس تک بیت المقدس ہی کی جانب منہ پھیر کے نماز ادا فرماتے رہے۔

اس اثنا میں یہودی لوگ متعجب تھے۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے مذہب کے مخالف ہونے کے باوجود قبلہ کے مسئلہ میں ہماری موافقت کرتے ہیں۔ شاید یہ فیصلہ کے لئے متردد ہیں یا مدینہ میں ہماری نماز دیکھ کر ان کو صحت قبلہ کا پتہ چلا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی باتوں سے کبیدہ خاطر تو نہ ہوئے۔ مگر آپکی عالی ہمتی تحویل قبلہ کا تقاضہ کرتی رہی۔ اور آپ ہر نماز میں حکم الٰہی کے منتظر رہے حتیٰ کہ بجسب اقتضا آپ بنی سلمہ کی مسجد میں نماز عصر یا ظہر ادا فرما رہے

تھے۔ کہ یہ حکم نازل ہوا قد نریٰ تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃً ترضٰھا فول وجھک شطر المسجد الحرام۔ اس وقت آپ دوسری رکعت کے رکوع میں تھے۔ حکم الٰہی پاکر بڑی مستعدی کے ساتھ تکمیل فرمائی۔ اور اسی حالت میں کعبۂ ابراہیمی کی جانب پھر گئے۔ آپکا پھرنا مقتدیوں پر بھی فرض کر گیا کہ وہ بھی کعبۂ ابراہیمی کی جانب منہ کریں۔ اور حضور کی اقتدا سے قدم باہر نہ رکھیں۔ چنانچہ وہ بھی اسی وقت جانب کعبہ پھر گئے۔ اور عشرہ مبشرہ کا ارشاد باری سنا۔ اس عمل نبوت سے تغیر قبلہ نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اور منشائے اسی ضرورت کے پیش نظر سب سے پہلے آدم علیہ السلام بھی عبادت گاہ کے لئے عرض گذار ہوئے تھے۔ جس کی ان کو اجازت ہوئی۔ اور بیت اللہ یا بیت ایل۔ یا کعبہ۔ یا مسجد حرام۔ یا بیت الحرام۔ یا مبتنہ۔ یا ام رحم دیا امباسہ یا الحاطم وغیرہ اسماء کا ایک غیر مسقف مکان بنا کر جس پر ایک نورانی خیمہ تھا۔ عبادت معبود کیجانب رجوع ہوئے۔ جس کی نسبت اہل اسلام کا بالکل صحیح دعویٰ ہے۔ کہ یہی سب سے پہلا گھر تھا۔ جو خدا کی عبادت کے لئے بنایا گیا۔ اور اسکی توحید کا اعتراف کرنے اور اس وحدہٗ لاشریک لہٗ کی معرفت حاصل کرنے کو جسکی بنیاد رکھی گئی۔ نیز ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام کے بعد حضرت شیث علیہ السلام نے اس جگہ پتھروں اور گارے سے ایک مربع صورت کی بغیر چھت کے چار دیواری بنائی۔ جسکو طوفان نوح تک قرار رہا۔ اس کے بعد طوفان نوح ہی کیوجہ سے وہ مختصر سی عمارت منہدم ہو گئی اور اس کی یادگار کے طور پر ایک سرخ سا ٹیلہ رہگیا۔ جس کو لوگ ایسا ہی مقدس سمجھتے رہے۔ جیسے کعبۃ اللہ کو سمجھتے تھے۔ اور اسی کے پاس حاضر ہو کر خدا سے حصول مقاصد کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے۔

اسی تعمیر کے متعلق غالباً قرآن کریم میں بالفاظ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اشارہ ہے۔ ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی ذرع عند بیتک المحرم۔ یعنے جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ریگستان عرب میں چھوڑ کر رخصت ہونے لگے۔ تو دعا فرمائی اے پروردگار میں نے اپنی ذریت کو بے آب و گیاہ جنگل میں تیرے بزرگ اور حرمت والے گھر کے پاس چھوڑا ہے) گویا ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا ثابت کرتی ہے۔ کہ تمام عرب اور خود ابراہیم علیہ السلام کے نزدیک بھی اس جگہ کی عظمت اور کعبتہ اللہ کی بزرگی مسلمہ تھی۔ اور اسی کی تائید قرآن کریم کے یہ الفاظ واذ بوانا لابراھیم مکان البیت (یعنے جب ہم نے ابراہیم کو کعبہ کی جگہ بتائی) فرماتے ہیں۔ اور ان اشارات سے چلتا ہے۔ کہ تعمیر ابراہیمی سے پہلے بھی یہ مقام مقدس و متبرک تھا۔ اور توراۃ شریف کی کتاب پیدائش میں لکھا ہے۔ کہ اس نے (حضرت ابراہیم نے) بیت ایل کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا۔ بیت ایل اس کے پچھم اور عئی اس کے پورب تھا۔ وہاں اس نے خدا کیلئے ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا۔

ایک اور روایت سے پتہ چلتا ہے۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے بعد پہلے صرف ایک دفعہ حضرت شیث علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی عمارت کو تعمیر کیا تھا۔ لیکن طوفان نوح کے بعد باوجود نشان کی موجودگی کے کسی کو بھی اس کی تعمیر کی ہمت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اتنی مدت کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہی اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل کی مدد سے اس کی تعمیر کی۔

ان مقدس معماران بیت اللہ (حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہم

السلام) نے جو عمارت کعبہ تعمیر کی وہ بالکل سادہ اور چار دیواروں کی ایک چوکھنڈ ہی تھی جس کی ایک دیوار طول میں ۳۲ گز اور دوسری ۳۱ گز تھی. عرض ایک طرف سے ۲۲ گز اور دوسری طرف سے ۲۰ گز چھت بالکل نہ تھی مگر بے چوکھٹ اور بغیر کواڑوں کے جس سے اس کی اندرونی حفاظت ہو سکتی ایک نامکمل سا دروازہ تھا. پھر جب کبھی کسی حادثہ سے یہ عمارت بیت اللہ شریف خراب ہوتی یا گر پڑتی رہی تو اس زمانہ کے متولی اُسی وقت تعمیر کر دیتے رہے۔

کتب تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ کعبۃ اللہ کی عمارت کے گرنے کے صرف دو ہی سبب ہوتے رہے ہیں ۔ ایک یہ کہ کبھی پہاڑی نالوں سے برسات کے وقت آمنا سیلاب آگیا۔ کہ اس کو نقصان پہنچگیا۔ دوسرے آتشزدگی یعنے کبھی کسی مجاور وخادم کے ہاتھوں خوشبو وغیرہ جلانے سے آگ کا لگ جانا۔ اور انہی دو سببوں سے اکثر مرتبہ اس کو گزند پہنچا ہے جنکے باعث کبھی کبھی تعمیر میں تبدیلی ہوتی رہی ہے ۔ چونکہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے بیت اللہ شریف ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اس لئے جب کبھی مکہ شریف کے پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے ۔ تو پانی سیلاب کی صورت میں حرم شریف کے اندر چلا جاتا ہے جس سے بیت اللہ کی عمارت کو اکثر بار نقصان پہنچا ہے. چنانچہ اس قسم کا سب سے اہم واقعہ اس زمانہ میں پیش آیا جبکہ اس کی تولیت کا فخر قبیلہ جرہم کو تھا (یہ قبیلہ بنو جرہم وہی قبیلہ ہے جس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام نے شادی کی تھی) ان بنو جرہم کے زمانہ مدت میں ایک بار بہت زور کی بارش ہوئی ۔ اور پہاڑیوں کے پانی نے ایک تیز رو ندی کی شکل اختیار کر لی۔ جو بیت اللہ شریف کی دیواروں سے ٹکرایا ۔ اور عمارت بیت اللہ سے ملیشتر حصہ کو بہا لیگیا ۔ کچھ دنوں بعد جب پانی اتر گیا ۔ اور زمین خشک ہو گئی

تو بنی جرہم نے پھر انہی بنیادوں پر اسی شکل میں دوسری عمارت بنا دی۔

تعمیر بنی خزاعہ دوسرا سیلاب جس کا نام سیل القارعہ ہے۔ اس زمانہ میں آیا۔ جبکہ کعبتہ اللہ کی تولیت بنو خزاعہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس دفعہ بنی خزاعہ نے تعمیر کعبہ کے علاوہ خانہ کعبہ کے گرد اس خیال سے ایک چار دیواری مزید بنا دی۔ کہ بعد میں آنے والے سیلابوں کی روک تھام ہو سکے۔ اس سیلاب میں بنی خزاعہ کی ایک مشہور ترین عورت قارعہ نامی غرق ہو گئی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس سیلاب کا نام سیل القارعہ رکھدیا۔

تعمیر قصی یہ قصی بن کلاب سرور کائنات مختار شش جہات محمد رسول اللہ علیہ وسلم سے چھ پشتیں پہلے تھا جس کی تعمیر کردہ عمارت کعبہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ تک تقریباً دوسو برس ہوتے ہیں۔ علامہ طبری نے لکھا ہے کہ جب بنو خزاعہ کی بنائی ہوئی عمارت کعبہ اس قصی بن کلاب کے زمانہ میں گر پڑی تو قصی نے ازسر نو اسکی دیواریں بنائیں اور دیواروں کے ساتھ کعبتہ اللہ پر کھجور کی لکڑی کی چھت بھی ڈال دی۔ اور پھر اُس پر سیاہ رنگ کے کپڑے کا غلاف بھی چڑھا دیا۔ یہی عمارت سرکار انبیاء علیہم السلام کے زمانہ خوردسالی تک موجود تھی۔ اور اسی عمارت کے ساتھ واقعہ اصحاب فیل پیش آیا تھا جس کا مختصر حال یوں ہے۔ کہ رب العزت جلشانہٗ کے مقدس بند حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جس خلوص اور پاکدلی سے خانہ خدا کی بامر خدا تعمیر کی اور جس محبت و خلوص اور عجز و انکساری سے اسکی مرجعیت کے لئے دعائیں مانگیں۔ خداوند جل و علا مجدہٗ نے ان کو سنا اور عرب کے تمام اطراف و اکناف سے لوگوں کو وہاں جمع ہونے اور حج کرنے کی توفیق بخشی۔ تمام حصص کے لوگ بیت اللہ کے حج کو آتے

اور خوشی خوشی رحمت الٰہی سے دامن مراد بھر بھر کر واپس گھروں کو جاتے اور اُن دنوں میں بھی جبکہ عرب اور بالخصوص مکہ مکرمہ میں ایک ایک گھر اور ایک ایک برادری کا جدا گانہ بت تھا۔ اس (بیت اللہ) کی مرجعیت میں کچھ فرق نہ آیا۔ باوجودیکہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری (پیدائش) سے چند سال پیشتر یمن پر حبشی عیسائیو نے یورش کرکے یہاں کے اصل حکمرانوں کو شکست دے دی تھی۔ اور ملک پر قابض ہو کر اسیطرح عیش و عشرت میں انہماک پیدا کر کے خداوند عالم کو بھول چکے تھے۔ جیسے مشرکین عرب لیکن یہ کعبہ مکرمہ پھر بھی سجدہ گاہ عوام تھا چنانچہ انہی ایام میں جبکہ یہ حبشی عیسائی یمن میں بدکاریوں سے کھیل رہے تھے۔ حج کا وقت آگیا۔ اور یمن سے لوگوں کے گروہ در گروہ حج و زیارت خانہ کعبہ کے لئے روانہ ہونے شروع ہو گئے ابرہہ (عیسائی بادشاہ) کو حیرت ہوئی۔ کہ یہ اتنی تعداد میں اکٹھے ہو کر لوگ کہاں جارہے ہیں۔ وجہ دریافت کرنے پر مکہ معظمہ کو حج بیت اللہ کیلئے انکی روانگی کا حال معلوم ہوا۔ تو اس نے پوچھا بیت اللہ کیا شئے ہے چنانچہ اس کو بتایا گیا۔ کہ وہ ایک پتھر کا بنا ہوا مکان ہے جسکی تعظیم و تکریم زمانہ قدیم سے چلی آتی ہے۔ اور اہل عرب کو کوئی طاقت اس کے حج سے نہیں روک سکتی۔ ابرہہ نے جب یہ سنا تو آتش حسد بھڑکی اور خانہ کعبہ کی حرمت کو مٹانے کا تہیہ کرکے صنعا شہر میں اس نے ایک بہترین گرجا بنانے کا حکم دیا۔ دیگر شاہان حبش سے مدد مانگی۔ اور قصر بلقیس کو کھود کھود کر سفید پتھر کی سلیں نکلوائیں اور گرجا کی تعمیر شروع ہو گئی۔ آبنوس اور ہاتھی دانت کے منبر بنا بنا کر صحن گرجا میں نصب کئے گئے۔ سونے چاندی کی مرصع سلیبیں کھڑی کی گئیں۔ تعمیر گرجا میں اس قسم کی تعجیل کا حکم تھا کہ جو کاریگر یا مزدور طلوع سورج سے پہلے کام پر حاضر نہ ہوتا۔ اس کے

ہاتھ کٹوا دیئے جاتے غرضیکہ تعمیر کا کام نہایت معظم الشان پیمانہ پر ختم ہوا۔ اور تمام عرب میں اسکی دھوم مچ گئی۔ اس گرجا کا نام قلیس رکھا اور اسکی خوبصورتی کو دیکھ کر فخریہ لہجہ میں کہنے لگا۔ جبتک کعبہ ابراہیمی سے لوگوں کا رخ بہ نیت حج اس گرجا (قلیس) کی جانب نہ پھیر لوں گا مجھے چین نہیں آئے گا

اور یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب کبھی خداوند عالم جل و علا شانہٗ کسی اپنے مقبول پر رحمتیں نازل کر کے اپنے کام کی تکمیل کرا لیتا ہے تو اس کی کامیابی کو دیکھ کر اکثر جھوٹے مدعی بھی اُٹھ کھڑے ہوا کرتے ہیں۔ اور چند روز فتنہ و فساد کھڑا کر کے اور چند گمراہوں کو اپنا معتقد بنا کے ایسے تباہ ہوتے ہیں کہ تاریخی اوراق کے سوا ان کا اور ان کے پیروؤں کا کہیں نشان تک بھی نہیں ملا کرتا۔ اور دنیا کے ہر میدان اعمال صالحہ و کاروبار سیئہ میں اس کی مثال موجود ہے کہ جب کسی صادق نے کامیابی کا میدان مارا تو ہزاروں کاذب بھی اس میدان میں رینگنے کو نکل آئے۔ چنانچہ یہی حال خانہ کعبہ کے حاسدوں اور حریفوں کا ہوا۔ جو بڑے بڑے طمطراق سے اٹھے مگر آناً فاناً فنا ہو گئے۔ ان میں سے کعبہ مکرمہ کا سب سے بڑا حریف یہی قلیس تھے جو ابراہہ نجاشی نے بنوایا اور جس کی جانب خلق خدا کو اطاعت کرنے کیلئے متوجہ کرتے ہوئے اپنی اور اپنے دیگر ساٹھ ہزار ساتھیوں کی جانیں اسکی بھینٹ چڑھا دیں۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اور قلیس کی اس شاندار بناوٹ اور سج دھج کے باوجود یہ حالت ہوئی۔ کہ وہ چند ہی دنوں میں ویران ہو گیا۔ اس میں زہریلے جانوروں کے بل اور موذی درندوں کے مسکن بن گئے۔ اور کوئی راہرو مسافر اسکی مہیب بربادی اور مخدوش دیرانگی سے اس کے پاس سے گذرنے

کی بھی جرأت نہ کرتا۔ آخر خلیفۂ اول سفاح عباسی نے اپنے عامل بھیجکر اس کو منہدم کرایا۔ اور اسکی قیمتی اشیاء فروخت کرکے انکی قیمت داخل خزانہ شاہی کردی۔

اور یہی حال قبیلۂ غطفان کے ایک معبد لیس کا ہوا۔ جو انہوں نے بڑی تگ ودو سے خانہ کعبہ شریف کے مقابلہ میں بنایا تھا۔ اور اسکو حرم کی حرمت دیتے اور بڑے راسخ اعتقاد سے اس کی جانب حج اور طواف کو نکلتے۔ مگر زہیر ابن خباب کلبی اور قبیلۂ غطفان والوں کا آپس میں جھگڑا ہوا اور قبیلۂ غطفان کو شکست ہوئی تو زہیر نے انکے ساتھ ان کے اس معبد کو بھی مٹا دیا۔

ایسے ہی عبد المسیح بن دارس بن عدی کا قبہ دار ایک معبد تھا۔ جو تین سو کھالوں سے بنایا گیا تھا۔ تمام عرب اس کو کعبۂ نجران کہتے تھے اور وہ بھی کعبۃ اللہ کیطرح زیارت گاہ عوام سمجھا جاتا تھا۔ مگر باوجود عیسائی سلطنت کی محافظت کے وہ بھی قائم نہ رہ سکا۔ اس کے علاوہ اور کئی معبد اسی غرض وغایت کے ماتحت معرض وجود میں آئے۔ کہ بیت اللہ کی توقیر و منزلت کا اعتقاد لوگوں کے دلوں سے نکال کر کسی دوسری جانب راغب کردیں۔ چنانچہ ذوالخلصہ ذوالکعبات سعیدہ وغیرہ بھی اسی شاخسانے کی چند بوسیدہ کڑیاں تھیں۔ جو آخر اپنے بنانیوالوں سمیت مٹ مٹا کے فنا ہو گئے۔

تعمیر قریش اس تعمیر کا باعث ایک عورت کے کعبۃ اللہ میں خوشبو جلاتے ہوئے غلاف کعبہ اور عمارت کعبہ کا جل جانا تھا۔ دیواریں پھٹ گئیں۔ اور ان میں آہنی دراڑیں پڑ گئیں۔ کہ کعبۃ اللہ کی نئی تعمیر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس تعمیر میں کچھ یہ خیال بھی کام کرنے لگا کہ ہمیشہ پہاڑی نالوں کے سیلاب کعبۃ اللہ کو نقصان

پہنچاتے رہتے ہیں. لہٰذا اس کی بنیادیں مضبوط کر کے اس کی سطح (کرسی) کچھ بلند کر دی جائے. چنانچہ اس مرتبہ قریش نے چار گز اور ایک بالشت کعبہ شریفہ کی اندرونی سطح کو اونچا کر دیا. اور چھت کی بلندی پہلے سے دگنی کر دی اور اندر تین تین پائے دو قطاروں میں کھڑے کر کے چھت کو مضبوط کر دیا. دیواریں طول میں چھ گز ایک بالشت کم کر دیں. اور عرض میں بھی ایک نئی بنیاد کچھ کم کر کے کھود دی. اور دیواریں سختگی سے اٹھائی گئیں. چھت کا پانی اتارنے کے لئے پر نالہ اس مقام پہ ڈالا جو جگہ دیواروں کے طول میں چھوڑ دی گئی تھی. کعبہ شریفہ کے اندر ایک لکڑی کی سیڑھی چھت تک بنائی اور چھت میں ایک روشندان بھی رکھا تاکہ اندر روشنی پڑتی رہے اور جب کبھی ضرورت ہو تو اسی کے راستے چھت پر بھی چڑھ سکیں. پھر اس کے ایک کونے میں حجر اسود بھی گاڑ دیا گیا. اور یوں کعبۃ اللہ کی تعمیر قریش پوری ہوئی. یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے. کہ حجر اسود کا کچھ تذکرہ کر دیا جائے. جس سے عوام کے معلومات میں اضافہ ہو.

حجر اسود کیا ہے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب کعبۃ اللہ کی دیواریں اٹھائیں. تو آپ کو کسی اچھے سے پتھر کی طلب ہوئی جو بطور یادگار کعبۃ اللہ شریف کے کونے پر نصب کریں. چنانچہ مذہبی روایات سے معلوم ہوتا ہے. کہ اس موقعہ پر کوہ ابو قبیس نے زبان حال سے پکار کر کہا کہ یہ امانت ازل سے میرے سپرد ہے. اور اسی پہاڑ کا ایک صاف و چوکور پتھر لیکر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے وہاں نصب کر دیا. لیکن یہ روایت قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی. کیونکہ جب کعبہ مکرمہ کی ساری عمارت پتھر کی ہے. تو پھر اس میں کسی مزید پتھر سے اضافہ اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ کعبۃ اللہ کی بانی تعمیر میں اس کو امتیازی شان حاصل ہو کیا معنے رکھتا ہے. بلکہ اس کی اہمیت و خصوصیت اس

امر کی مقتضی ہے۔ کہ اس پتھر (حجر اسود) کی کوئی نمایاں حیثیت ہے جو اس کو خانہ کعبہ کے تمام عمارتی پتھروں سے ممتاز کر رہی ہے۔ اگر یہ بھی ایک عام پتھر ہوتا تو اس کے یہاں پر گاڑنے کی کوئی خاص ضرورت نہ ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پتھر (حجر اسود) سے کوئی خاص بات وابستہ ہے۔ جس کے باعث اس کا یہاں پر نصب کیا جانا ضروری سمجھا گیا۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے۔ کہ یہ پتھر سابقہ خانہ کعبہ کے پتھروں سے بطور یادگار دنیا میں رہ گیا تھا۔ جو طوفان نوح میں اس مقام سے بہکر کوہ بو قبیس پر چلا گیا تھا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں سے اٹھوا منگایا اور یہاں پر کعبہ کے کونہ میں گاڑ دیا۔

بعض بنی اسرائیلی روایات میں یوں بھی بتایا گیا ہے۔ کہ حجر اسود ایک سیاہ رنگ کا پتھر ہے۔ جو حضرت سیدنا ابوالبشر آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے اترا تھا۔ اور برف سے زیادہ سفید تھا۔ بعض روایتوں میں ہے۔ کہ یہ ایک فرشتہ تھا جس کے روبرو اللہ تعالےٰ نے عہد الست لیا۔ اور یہ قیامت کو گواہی دیگا۔ عہد الست کے بعد اسکی صورت فرشتے سے پتھر کی کر دیگئی۔ اور کعبہ میں نصب کر دیا۔ لیکن اس روایت کی حقیقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے کھل جاتی ہے کہ اے حجر اسود تو ایک معمولی پتھر ہے۔ نہ کسی کو نفع دے سکتا ہے نہ ضرر۔ اگر تجھکو سرور کائنات علیہ السلام نے بوسہ نہ دیا ہوتا۔ تو میں تجھکو کبھی بوسہ نہ دیتا۔

ایک روایت میں یوں بھی آیا ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کعبہ سے پہلے بطور سترہ اس پتھر کو سامنے رکھکر نماز ادا کیا کرتے تھے۔ تعمیر کعبہ کے وقت اس کو بھی تیمناً کعبہ مکرمہ کے کونہ میں نصب کر دیا۔

طبرانی میں ایک روایت ہے۔ کہ حجر اسود جنت کا پتھر ہے۔ اور زمین پر جنت کی کوئی چیز سوائے اس کے نہیں۔ یہ بلور سفید کی طرح روشن

تھا بنجاست جاہلیت اگر اس کو نہ لگتی۔ تو جو دکھ والا اس کو چھوتا وہ اچھا ہو جاتا۔ ابن خزیمہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یوں بھی ہے۔ کہ یہ جنت کے یواقیت سے ایک یاقوت ہے۔ جس کو مشرکین کی خطاؤں نے سیاہ کر ڈالا ہے۔ حدیث ابن عباس میں مرفوعاً اس طرح بھی آتا ہے۔ کہ حجر اسود جنت سے اترا ہے۔ دودھ سے زیادہ سفید تھا۔ مگر بنی آدم کی خطاؤں نے اس کو سیاہ کر دیا۔ نیز ابن عباس مرفوعاً راوی ہیں۔ کہ خداوند عالم حجر اسود کو قیامت کے دن ایسی صورت میں اٹھائیگا۔ کہ اس کی دو آنکھیں ہونگی جن سے دیکھے گا۔ اور ایک زبان ہوگی جس سے بولیگا۔ اور جس کسی نے حق سمجھ کر چوما ہے۔ اس کی گواہی دیگا۔ ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ ابن خزیمہ و ابن حبان نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ اور طبرانی کے الفاظ کبیر میں یوں ہیں۔ یبعث اللہ الحجر الاسود والرکن الیمانی یوم القیامۃ ولھما عینان ولسانان وشفتان یشھدان لمن استلمھما بالوفا۔ یعنے حجر اسود و رکن یمانی قیامت ۔۔۔۔ کو دونوں کے لئے آنکھیں۔ زبان اور لب ہوں گے اور یہ دونوں اپنے مستلم کے لئے (چھونے والے) پر ایمان کی گواہی دیں گے۔

حجر اسود کی سیاہی اور شکستگی کی نسبت اخبار مکہ کا مصنف لکھتا ہے کہ وہ دو دفعہ آگ میں جل جانے کی وجہ سے سیاہ ہو گیا ہے۔ ایکدفعہ زمانہ جاہلیت میں ایک عورت کے ہاتھ سے کعبہ شریفہ کے پردے میں خوشبو جلاتے وقت آگ لگ گئی تھی۔ جس کے سبب سے بیت اللہ و حجر اسود دونوں جل گئے تھے۔ دوسری دفعہ زمانہ اسلام میں بعہد حکومت ابن زبیر آگ لگی تو حجر اسود جلکر تین ٹکڑے ہو گیا۔ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کے گرد مضبوطی اور تینوں ٹکڑوں کو قابو رکھنے کے لئے چاندی کا حلقہ چڑھا دیا۔

اور اس سے قبل کا ایک واقعہ بھی ہے۔ کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ

علیہ وسلم ابھی صغیر سن ہی تھے۔ کہ خانہ کعبہ میں آگ لگی تھی۔ اور ساری عمارت جل گئی جس کو قریش نے نئے سرے سے تعمیر کیا۔ مگر حجر اسود کو اس کے مقام پر نصب کرنیکے لئے تمام قبائل قریش میں فساد رو نما ہو گیا۔ ہر قبیلہ یہی چاہتا تھا کہ حجر اسود کے نصب کرنے کا فخر اسی کو حاصل ہو۔ اور قریب تھا۔ کہ تلواریں۔ بے نیام ہو جائیں۔ اور کشت و خون تک نوبت پہنچتی لیکن حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود نصب فرما کر اس جھگڑے کا خاتمہ کر دیا۔

حجر اسود کے متعلق ایک بڑی مشہور روایت یہ بھی ہے۔ کہ قبیلہ بنو جرہم جس کا پیچھے ذکر ہوا ہے۔ جب اپنی خامیوں کی وجہ سے حکومت چھوڑ کر مکہ معظمہ سے نکلا۔ تو انہوں نے یہ ایک شرارت کی۔ کہ حجر اسود کو زمزم کے کنوئیں میں ڈالکر اوپر سے چاہ زمزم کا منہ بند کر دیا۔ اور خود بھاگ گئے مدتیں گذر گئیں اور کسی کو حجر اسود اور زمزم کا خیال تک نہ آیا۔ کہ زمزم نکالیں اور نہ یہ یاد ہی رہا کہ وہ کہاں تھا۔ ہاں ضرورت کے لئے مختلف مقامات پر کنوئیں کھودلئے گئے تھے۔ اور لوگ انہیں کا پانی پیتے تھے۔ یہاں تک کہ حضور علیہ السلام کے دادا حضرت عبدالمطلب نے بحکم الٰہی خواب میں اس موقعہ کو دیکھکر زمزم کو نکالا۔ اور اسی سے حجر اسود بھی برآمد کیا۔

سیدنا مولا مشکلکشا حضرت علی کرم اللہ وجہٗ اس خواب حضرت عبدالمطلب کے متعلق یوں ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ حضرت عبدالمطلب نے کہا۔ کہ میں سورہا تھا۔ کہ مجھے خواب میں ایک شخص نے کہا۔ کہ طیبہ کو کھود دو میں نے پوچھا طیبہ کیا چیز ہے۔ تو وہ شخص بغیر جواب دیئے کے چلا گیا اور میں بیدار ہو گیا۔ دوسری رات پھر وہی شخص آیا اور حکم دیا۔ کہ مضنونہ کو کھود دو۔ تو میں نے پھر گذارش کیا کہ مضنونہ کیا شئے ہے۔ قبل اس کے کہ میں جواب سنوں میں بیدار ہو گیا۔ اور وہ صاحب تشریف لے گئے تیسری

شب پھر وہی بزرگ سامنے آئے اور فرمانے لگے زمزم کھودو۔ میں نے عرض کیا زمزم کیا ہے تو فرمانے لگے بہت پانی نکلیگا اور تم کو زیادہ مشقت بھی نہ کرنی پڑیگی۔ وہ اس جگہ ہے۔ جہاں لوگ قربانیاں کرتے ہیں اور جہاں چیونٹیوں کا بل ہے۔ تم صبح وہاں جاؤگے .... تو وہاں ایک کوا چونچ سے زمین کریدتا ہوا پاؤگے۔ پس وہی جگہ آب زمزم کی ہے۔ چنانچہ جب حضرت عبدالمطلب نے کھودا تو پانی بڑے زور سے نکلا۔ صفائی کرائی گئی۔ تو اس کے اندر سے دو سونے کے بنے ہوئے ہرن اور بہت تلواریں اور حجراسود بھی نکلا۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے۔ کہ یہ ہرن ایرانی زائروں نے کعبہ پر چڑھائے تھے۔

حجراسود کے متعلق مورخین نے ایک اور بھی عجیب سا واقعہ لکھا ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ فرقہ قرامطہ میں (جو نہایت گمراہ فرقہ تھا) ایک شخص ابوطاہر تھا۔ جو بڑا ظالم اور سنگدل تھا۔ حاجیوں کو لوٹنا۔ مسلمانوں کو قتل کرنا اس کا ایک نہایت خوش کن مشغلہ تھا۔ سنہ ۳۱۷ ہجری میں اس نے عین حج کے موقعہ پر مکہ معظمہ پر حملہ کیا۔ حاجیوں کو مارا۔ کعبہ کی بیحرمتی کی اور حجراسود اکھاڑ کر اپنے وطن لیگیا۔ اور اس کو اپنے ایک مکان میں گاڑ کر اس کا نام دارالہجرۃ رکھا۔ اس سے اس کی غرض کعبہ شریفہ سے لوگوں کی روگردانی کرانا تھی۔ مگر یہ پوری نہ ہوسکی۔ اور کعبہ کو چھوڑ کر کسی نے اسکے دارالہجرۃ پر توجہ بھی نہ دی۔ آخر اس کے مسلم امام عبیداللہ مہدی نے اس کو لکھا۔ کہ حجراسود کو خانہ کعبہ میں واپس کردو۔ مگر اس نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ پھر عبیداللہ مہدی کے بعد جب منصور ابن القائم بن المہدی امامت اسمٰعیلیہ کا وارث ہوا۔ تو اس نے ابو طاہر کے بھائی ابوالقاسم کو لکھا۔ کہ اگر تم حجراسود کو مکہ مکرمہ میں واپس کردو۔ تو میں تمہیں پچاس ہزار دینار دونگا۔ لیکن اس نے قطعاً توجہ نہ کی۔ آخر ابوطاہر جب مرض چیچک

سے ۳۳۲ھ ہجری میں مرگیا۔ تو قرامطہ کی طاقت روبزوال ہونے لگی۔ تو اس وقت ابوطاہر کی موت کے سات سال بعد ۳۳۹ھ ہجری میں خاص عیدالضحٰی کے دن نعبر بن حسین قرمطی حجراسود کو لیکر مکہ معظمہ میں آیا اور جہاں اس کا مقام تھا اس کو نصب کردیا۔ غرضیکہ حجراسود بتیس سال تک خانہ کعبہ سے علیحدہ شہر ہجر میں رہا۔ اور اس کے بعد اصلی جگہ پہ پہنچا۔ پھر کسی ملحد کو کبھی بھی اس کی بے حرمتی کی جرأت نہیں ہوئی۔

تعمیر ابن زبیر

امیر شام حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب یزید جیسے ناہنجار انسان نے تخت سنبھالا تو حضرت عبداللہ بن زبیر نے اس کی بعض خامیوں کے پیش نظر اسکی بیعت سے انکار کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید نے اپنی قوت منوانے اور بیعت کا پابند بنانے کے لئے حصین بن نمیرہ کو فوج دیکر مکہ معظمہ پر حملہ کو بھیجدیا۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر کئی معرکوں کے بعد شہر میں محصور ہو گئے۔ حضرت عبداللہ کے حفاظتی دستے بیت اللہ شریف کے گرد خیموں میں پڑے تھے اور یزیدی فوج حصین بن نمیرہ کی کمان میں کوہ ابوقیس پر سے سنگباری میں مشغول تھی۔ جس کی وجہ سے غلاف کعبہ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ اسی دوران میں ایک خیمے کو کسی وجہ سے آگ لگ گئی۔ ہوا تیز تھی آگ کے شعلوں نے بیت اللہ شریف کو لپیٹ میں لے لیا۔ اور تمام عمارت کعبہ مکرمہ جل گئی۔ یہ حادثہ ۳ ربیع الاول ۶۲ھ ہجری کو ہوا۔ اور ۱۴ ربیع الاول ۶۲ھ ہجری کو یزید مرگیا۔ جسکی خبر سنکر ۵ ربیع الثانی کو حصین بن نمیرہ بغیر جنگ کو طول دیئے کے واپس شام چلا گیا۔

اس طرح عبداللہ بن زبیر نے جنگ سے نجات پاکر شرفاء مکہ کو بلایا اور کعبۃ اللہ کی نئی تعمیر کا ارادہ ظاہر کیا۔ سابقہ سوختہ عمارت ہموار کردی گئی اور زمین سے جب نئی بنیادیں استوار کی جانے لگیں۔ تو اتفاق سے سیدنا

ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ کی رکھی ہوئی سابقہ بنیاد نکل آئی جس پر حضرت ابن زبیر نے عمارت اٹھائی۔ اور دروازے ایک کی بجائے دو رکھ دیئے۔ تاکہ حاجی لوگ مشرقی دروازہ سے داخل ہوں۔ اور مغربی سے باہر نکل جایا کریں سطح کی بلندی چھانٹ دی۔ چوکھٹ کو زمین پر کھڑا کر دیا۔ اور اندرونی بلندی قریش کی بلندی سے ۹ گز اور زیادہ کر دی۔ قریش نے کعبہ میں چھ ستون بنا رکھے تھے انکی بجائے حضرت عبداللہ نے صرف تین رہنے دیئے۔

تعمیر حجاج بن یوسف جب عبداللہ بن زبیر کا دور حکومت ختم ہو گیا اور وہ عبدالملک بن مروان کے ایما پر شہید ہو گئے۔ اور حجاج بن یوسف مکہ میں داخل ہوا۔ تو اس نے عبدالملک کو لکھا کہ ابن زبیر نے کعبے میں بعض وہ چیزیں زیادہ کر دی ہوئی ہیں جو پہلے نہ تھیں۔ اور ایک دروازہ بھی بڑھا دیا ہوا ہے۔ تو اس کے جواب میں عبدالملک نے لکھا کہ اس دروازہ کو بند کر دو۔ اور جو کوئی اور زیادتی بھی ابن زبیر نے کی ہے وہ سب مٹا دو۔ چنانچہ حجاج نے چھ گز اور ایک بالشت کعبہ کو کم کر دیا۔ قریش کی بنیادوں پر دیواریں اٹھائیں۔ نیا دروازہ قطعی بند کر دیا۔ اور اندرونی سطح چار گز ایک بالشت رکھ کر بھرتی ڈلوا دی۔ چھت کے اوپر جانے کے لئے اندر کی جانب ایک زینہ (سیڑھی) بنائی اور روشنی کے لئے دو روشندان نکلوا دیئے۔

تعمیر ترکی جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا ہے۔ کہ کعبۃ اللہ کی عمارت کو اکثر حوادثات جو پیش آئے۔ اور اس کو نقصان پہنچتا رہا۔ اس کے دو ہی سبب ہوتے رہے ہے۔ ۱۔ سیلاب کا پانی۔ ۲۔ اتفاقیہ آگ لگنا۔ کعبۃ اللہ کی وہ عمارت جو حضرت عبداللہ بن زبیر نے بنوائی تھی۔ ان عمارتوں میں سب سے آخری اور پختہ عمارت تھی۔ جو وقتاً فوقتاً بنائی جاتی رہیں۔ اور اسی عمارت کو سب سے زیادہ سیلابوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑا۔

اور یہی وہ عمارت تھی جس کے کہنہ اور بوسیدہ ہونے سے سلطنت ٹرکی کو از سر نو کعبۃ اللہ تعمیر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قبل اس کے کہ تعمیر ترکی کا ذکر کیا جائے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان سیلابوں پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ جو یکے بعد دیگرے اسکی شکستگی کا باعث بنتے رہے۔

اس امر میں ہمیں سب سے عمدہ وضاحت کتاب تاریخ بیت اللہ شریف میں ملتی ہے۔ جس میں لکھا ہے۔ کہ ایک سیلاب ۹۷ھ ہجری میں بزمانہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز آیا۔ دوسرا ۱۲۰ھ ہجری میں جسکو سیل ابوشاکر کہا جاتا ہے تیسرا ۱۸۴ھ ہجری میں جو سیل مخبل کہلاتا ہے۔ چوتھا سیل حنظلہ جو ۲۰۲ھ میں آیا۔ جس سے بہت زیادہ نقصان ہوا۔ پانچواں ۲۰۸ھ میں آیا جس سے تمام حرم مٹی۔ کنکر اور پتھروں سے بھر گیا۔ چھٹا ۲۵۳ھ میں آیا اور پانی حجر اسود تک چڑھ گیا۔ ساتواں ۲۶۶ھ میں اور آٹھواں ۴۲۳ھ میں آیا۔ جو کسی شدید نقصان کا باعث نہ بنا۔ نواں ۱۴ ذیقعد ۶۸۲ھ ہجری میں آیا۔ جس سے حرم شریف میں پونے آٹھ فٹ پانی چڑھ گیا۔ اور پانی کے زور سے مسجد الحرام کے کئی ستون اکھڑ کر گر گئے۔ دسواں ۸۳۸ھ میں آیا۔ جس کا پانی ساڑھے چار گز کی بلندی پر بیت اللہ شریف کے اندر بھر گیا۔ گیارہواں ۱۰ جمادی الاول بروز پنجشنبہ ۸۰۲ھ میں آیا جو نہایت بے پناہ تھا۔ بارہواں ۲۲ ذالحجہ ۸۱۰ھ کو بوقت عصر آیا جس نے چھوٹی موٹی پہاڑیوں پر بھی زلزلہ پیدا کر دیا۔ تیرھواں ۸۸۰ھ میں آیا جس کے پانی میں تمام شہر ڈوب گیا۔ اور جب کچھ وقت کے بعد پانی اترا تو صرف حرم شریف میں ہی ایکسو اسی ۱۸۰ لاشیں آدمیوں کی تھیں۔ چودھواں ۱۴ ذیقعد ۸۸۸ھ میں آیا۔ جس کا پانی خانہ کعبہ میں قد آدم تھا۔ اور شہر کے سینکڑوں مکانات تباہ ہو گئے۔ اور حرم شریف سے ستر لاشیں آدمیوں کی نکلیں۔ پندرھواں ۱۰۳۹ھ ہجری میں آیا۔ جس سے ڈھور ڈنگروں اور

دو کانات کا کافی نقصان ہوا۔

یہ تھے وہ سیلاب جن کے متواتر حملوں سے بیت اللہ شریف کی دیواریں بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ اور اہالیان مکہ و شریف ادریس مکہ نے سلطان ترکی احمد خان بن سلطان محمد خان رابع کو لکھا تھا۔ کہ خانۂ خدا کی دیواریں نہایت بوسیدگی کی حالت میں ہیں۔ انکی اگر جلدی خبر گیری اور حفاظت نہ کی گئی تو عمارت کے انہدام کا خطرہ ہے۔ اس پر سلطان احمد خان و اراکین سلطنت نے فیصلہ کیا۔ کہ بیت اللہ شریف کو بار بار بنانے اور گرانے کا مشغلہ نہیں بنانا چاہیئے۔ بہتر ہے کہ پوری عمارت کو دو دو آہنی نالوں اور پٹیوں سے مضبوط کس دیا جائے۔ جس سے عمارت گرنے سے محفوظ رہ سکے۔ اور خوبصورتی کے لئے ان پٹیوں پر چاندی اور سونے کا پترا چڑھا دیا جائے اور میزاب رحمت (پرنالہ) کو بھی جو سلطان سلیمان کے زمانہ سے چاندی کا چلا آتا تھا۔ سونے کا لگا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور یہ تمام اشیاء ۱۵ رجب المرجب ۱۰۳۰ھ ہجری المقدس کو قسطنطنیہ ہی میں تیار ہو کر حسن پاشا معتمد سلطنت کے ساتھ براستہ مصر مکہ مکرمہ کو روانہ کر دی گئیں۔ اور ان کے متعلق ایک حکمنامہ محمد علی پاشا خدیو مصر کو بھی لکھ دیا گیا تاکہ مکہ مکرمہ تک محفوظ پہنچانے میں مدد کر سکے۔ یہ تمام اشیاء مکہ معظمہ میں پہنچیں اور حسب ضرورت مرمت کر دی گئی۔ مگر اس مرمت کو ابھی صرف ۱۹ سال ہی گذرے تھے۔ کہ ۱۹ شعبان المعظم ۱۰۳۹ھ ہجری بروز چہارشنبہ کو سخت سیلاب آیا۔ اور حرم شریف میں تین دن تک پانی کھڑا رہا۔ ۲۱ شعبان کی عصر کو رکن شامی اور رکن عراقی کی دیواریں اس زور سے گریں کہ کئی آدمی انکی دہشت سے لقمۂ اجل ہو گئے۔ اس حادثہ کو محسوس کرتے ہوئے شریف مکہ امیر مسعود نے اکابرین شہر کو جمع کیا اور اس حادثہ کی اطلاع بذریعہ والئے مصر آستانہ کو روانہ کر دی۔ چنانچہ

والئے مصر نے قبل اس کے کہ جواب شاہی آئے۔ اپنے ملازم خاص رضوان آغا کو حکم دیا۔ کہ ایام حج قریب ہیں۔ تم جلدی پہنچو اور حرم شریف کو صاف کرا کے مرمت کا کام شروع کردو۔ رضوان آغا مکہ مکرمہ میں پہنچا اور بہ ہزار دشواری علماء کرام کے فتووں کے بعد عملی تعمیر کی ابتدا کر دی سبیل آفندی نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے۔ کہ حرم شریف میں سے صفائی کرتے ہوئے ہر روز چالیس ہزار من بوجھ اونٹوں کے مٹی اور کنکر کے نکالے جاتے تھے۔ الغرض ۵ رشوال سنہ ۱۰۴۰ ہجری کو یہ صرف تعمیر مکمل ہو کر پہلی داخلی ہوئی۔ اور یہی موجودہ عمارت ہے جو سلطان عماد بن سلطان احمد خان والئے قسطنطنیہ نے تعمیر کی۔ اور آج تک بفضلہ تعالیٰ قائم ہے۔

تاسیسِ شریعت

یَاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ
وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ

ترجمہ:- اے جادر اوڑھنے والے اُٹھ۔ اور لوگوں کو
ڈرا۔ اپنے رب کی بڑائی کر۔ اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ
اور بتوں کو چھوڑ دے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اعلان نبوت فرمایا۔ اور خفیہ تبلیغ کا آغاز کیا تو سب سے پہلے بسم اللہ گھر سے شروع کی۔ اور حضرت خدیجہ۔ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ کہ مجھے تبلیغ کا حکم مل گیا ہے۔ اور میں تمام دنیا کی اصلاح و ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا گیا ہوں۔

حضرت خدیجہ چونکہ فطری طور پر سعید فطرت اور آپکی غمگسار و انتہائی فرمانبردار تھیں۔ فی الفور ایمان لے آئیں۔ ان کے بعد آپ کے پروردہ آغوش حضرت علی المرتضٰے مشرف باسلام ہوئے۔ پھر ان کے بعد حضور علیہ السلام نے نہایت ہوشمندی و معاملہ فہمی سے ان حضرات میں تبلیغ شروع کی۔ جن کو آپکے اخلاق۔ شرافت۔ دیانت اور صحبت کا پورا تجربہ تھا۔ اور جو مدت سے آپکو راستباز۔ پاکیزہ خو اور امین سمجھنے میں خلوص اور یقین کے تمام مدارج طے کر چکے تھے۔ مثلاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالٰے عنہ۔ جن سے تمام معززین مکہ۔ اکثر ذاتی امور میں مشورے لیتے۔ اور عزت کرتے تھے۔ کیونکہ یہ نہایت فیاض۔ دانشمند۔ متمول۔

معاملہ فہم۔ ذی عقل شریف النفس ماہر انساب تھے۔ آپکی دعوت پر اسلام قبول کر گئے۔ پھر انہی کی ترغیب سے حضرت سعد بن وقاص۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف۔ حضرت زبیر بن العوام۔ حضرت طلحہ۔ حضرت عثمان بن عفان رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ نور ایمان کے حصول میں آگے بڑھے۔ اور مشرف باسلام ہوتے چلے گئے۔ یہ سب بزرگ اپنی اپنی جگہ ذی اقتدار اور باثر تھے۔ اور اسلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ ایمان لائے انکی لیاقت۔ شرافت۔ وجاہت۔ اور ہوشمندی مسلّم تھی۔ اور زر و دولت میں بھی امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ تھے۔ جن پر مال و متاع اور رزق روٹی کا لالچ دے کر آج عیسائیت اور دیگر مذاہب ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔

اس سے آپکے ساتھ ایسے ذی اثر اور باہوش بزرگوں کی ایک مختصر سی جماعت تیار ہو گئی۔ جو بجائے خود اسلام کا ایک ایک مبلغ تھا۔ اور مخفی طور پر سرگرمی کے ساتھ تبلیغ اسلام میں مصروفیت رکھتا تھا۔ یہ رب العزت کا احسان اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا اثر تھا۔ کہ جس کے کانوں میں یہ حق کی آواز پہنچی۔ اس کے دل میں اتر جاتی اور وہ فورًا اسلام لے آتا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ اندر ہی اندر پھیلتا اور بڑھتا چلا گیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر حضرت عثمان بن مظعون۔ ابو عبیدہ۔ بلال۔ سعید بن زید۔ عمر بن عنبسہ۔ عبداللہ بن مسعود۔ خباب بن الارت۔ زید بن ارقم۔ عبداللہ الاسد بن بلال۔ عامر بن فہیرہ۔ سائب بن عثمان ابو حذیفہ بن عتبہ۔ اور خالد بھی ذیلوائے اسلام آگئے۔

گو یہ سب حضرات اپنے اپنے قبیلہ میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ مگر ابھی تک اسلام کی تبلیغ پوری طرح خفیہ اور احتیاط کے ساتھ کی جا رہی تھی۔ اور محرمان اسرار اور واقفان راز کے سوا کسی کو بھی

علم نہ ہونے پاتا تھا۔ نماز کا وقت آتا تو وہ فریضہ بھی پوشیدہ طور پر کسی پہاڑ کی گھاٹی میں یا کسی سکونتی مکان کے کونے میں ادا کیا جاتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت علی المرتضٰے کرم اللہ وجہہ کسی پہاڑ کے درے میں نماز پڑھ رہے تھے۔ کہ آپ کے والد بزرگوار ادھر آنکلے۔ اور دیر تک کھڑے غور سے دیکھتے رہے۔ آپ جب فراغت پا چکے تو سوال کیا۔ کہ یہ کونسا دین ہے آپ نے جواب دیا کہ ہمارے دادا ابراہیمؑ کا یہی دین تھا۔ ابوطالب بولے میں اس دین کو اختیار تو نہیں کر سکتا۔ لیکن تمہیں بھی نہیں روکتا۔ تم کو میری طرف سے اجازت ہے۔ اور کوئی بھی تمہاری مزاحمت نہ کر سکے گا۔

تین برس تک خفیہ تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا۔ اور اس تمام مدت میں قریباً سو سوا سو افراد نے ایمان قبول کیا۔ پھر جب رحمت کاملہ نے دیکھ لیا۔ کہ جتنے شریف النفس اور نیک نہاد لوگ تھے۔ وہ تقریباً سب کے سب اسلام لے آئے ہیں۔ تو علانیہ تبلیغ کا حکم صادر ہوا۔ فاصدع بما تومر وانذر عشیرتک الاقربین۔ یعنی تجھے جو حکم دیا گیا ہے اب علانیہ اسکی تعمیل کر اور اپنے رشتہ داروں کو خداوند عالم سے ڈرا۔ چنانچہ آپ نے لوگوں کو جمع کیا۔ اور کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر فرمایا:۔

"اے معشر قریش! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر جرار بڑھتا چلا آتا ہے۔ اور وہ تم پر شبخون مارنے گا تو تم مجھکو سچا سمجھو گے یا جھوٹا۔ تو سب نے بیک آواز کہا کہ ہم آپکو سچا سمجھینگے۔ اس لئے کہ ہم نے تجھے کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا۔ پھر آپنے فرمایا۔ کہ میں تمہیں ایک آنیوالے خطرے سے آگاہ کرتا ہوں۔ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے۔ تو تم پر عذاب شدید نازل ہوگا۔"

یہ سنکر وہ سب لوگ برہم ہوئے۔ اور جو جی میں آیا بڑبڑاتے ہوئے

چلے گئے۔ اس کے چند روز بعد ہی آپ نے حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہٗ کو حکم دیا کہ ایک دعوت کا انتظام کرو۔ جس میں تمام خاندان عبد المطلب کو مدعو کیا جائے۔ چنانچہ وہ انتظام ہو گیا۔ اور دعوت کے بعد آپ نے فرمایا کہ دیکھو میں ایک ایسا دین لے کر آیا ہوں جو دنیا اور عقبےٰ دونوں کی فلاح کا حامل ہے۔ تم بتاؤ کہ اسکی تبلیغ میں کون کون میرا ساتھ دے گا۔ اس آواز کے جواب میں سوائے حضرت علیؓ کی آواز کے اور کوئی آواز نہ آئی۔ آخر آپ نے حرم کعبہ میں پہنچکر اعلانِ توحید فرمایا۔ جس پر چاروں طرف سے تلواریں بے نیام ہو گئیں۔ اور بے پناہ حملہ ہو گیا۔ جس میں آپکے ربیب حارث جو بچانے آئے تھے۔ اسی وقت شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا۔ جس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ آئندہ کیا کچھ ہو گا۔ اور کیا کچھ ہونے والا تھا۔

یہ واقعہ اپنی نوعیت میں نہایت ولدوز اور خوفناک تھا۔ اور کفار نے اس ہنگامۂ قتل میں یہ واضح کر دیا۔ کہ وہ سب کچھ سن سکتے اور گوارہ کر سکتے ہیں مگر صدائے

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

ان کے لئے ایک ناقابل برداشت آواز ہے۔ اور جب بھی کبھی ایسی کوئی آواز پیدا ہو گی۔ وہ اس کے دبانے کے لئے بزور شمشیر ہر ممکن کوشش کریں گے ادھر یہ قتل کا واقعہ اور ان کا متعصبانہ جذبہ معمولی تنبیہ نہ تھا۔ جس سے کسی آئندہ وقت میں وہ بارہ ایسا اقدام اور صدائے توحید کا بلند کرنا اپنے آپ کے لئے موت کے مترادف نہ ہو۔

ادھر نور نبوت کا استقلال اور بندۂ الٰہی پر قیام ایک وہ چیز تھی جنے اس واقعہ اور جلادان مکّہ کی قساوت شقاوت کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی اور یہ کیا۔ کے برابر پرواہ تک نہیں کی۔ اس اعلان توحید کے بعد جو حرم شریف میں ہوا۔ ہر جگہ اعلانیہ تبلیغ شروع کر دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کجا ہر شخص آ۔ مکی

شرافت اور دیانت کا معترف ہوا کرتا تھا۔ کجا اعلان توحید کے بعد یہ حالت کہ مکہ کے زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے۔ بچہ بچہ مخالفت پر آمادہ نظر آنے لگا۔ عزیز و اقارب آنکھیں پھیر گئے۔ اور جدھر کو نکلتے مذاق اڑایا جاتا۔ جہاں جاتے مخالفت ہوتی۔ تکلیفیں پہنچائی جاتیں۔ اور بے روک ٹوک المناک مصائب میں مبتلا کیا جاتا۔

ایک بڑا مشہور واقعہ ہے۔ کہ ابوجہل نے ایک دن آپکو بہت ایذا دی جس سے آپ بد حال ہو کر دیوار مسجد حرام کے ساتھ تکیہ کئے کھڑے ہو گئے اتفاق سے حضرت حمزہ کی لونڈی پریشان کن منظر اپنی آنکھوں دیکھ رہی تھی۔ اس نے جا کر وہ تمام کیفیت حضرت حمزہ سے عرض کی۔ کہ آپ کے یتیم بھتیجے کے ساتھ ابوجہل نے یہ سلوک کیا ہے۔ حمزہ ہزار اختلاف ہونے کے باوجود بھی آخر چچا تھے۔ طبیعت میں جوش آگیا۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور غصہ میں بھرے ہوئے ابوجہل کے پاس گئے۔ اور کہا۔ کہ تو نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کمزور سمجھ کر اس سے وحشیانہ سلوک کیا۔ میں تجھے تیری اس ناجائز اکڑ فوں کا مزہ چکھا دوں گا۔ اب کچھ بول کر دیکھ۔ تجھے پتہ چل جائیگا۔ کہ تیری اس بیہودگی کی سزا کیا ہے۔ میں آج اسلام قبول کر کے آیا ہوں۔ ابوجہل جانتا تھا۔ کہ حمزہ ہمت و شجاعت میں جواب نہیں رکھتے بولوں گا تو خیر نہیں۔ خاموش ہو رہا۔ حضرت حمزہ نے ایک کمان اس کے سر پر ماری اور واپس لوٹ آئے اور گھر میں آ کر اسلام قبول کرنے کا بہ صحیح اعلان کر دیا۔ اس اعلان کو سنکر کفار کے حوصلے پست ہو گئے۔ اور وہ سمجھے کہ اب اسلام دبائے سے بھی نہیں دبیگا۔ مگر انکو یہ پتہ نہ تھا۔ کہ اسکے بعد سرکار دو عالم کی ایک اور دعا بھی قبول ہو چکی ہے جس کا نتیجہ عمر بن الخطاب کے ایمان لانے کی صورت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ سرکار دو عالم علیہ السلام نے کفار کی سفاکانہ روش کے مقابلے میں ایکدن ہاتھ اٹھائے

اور دعا مانگی کہ الٰہی عمر بن ہشام (ابو جہل) یا عمر بن الخطاب دونوں عمروں میں سے ایک کو ایمان عطا فرما۔ چنانچہ دعا نے یہ سرفرازی عمر بن الخطاب کے مقدر میں کر دی۔ اور ایک دن عمر بن الخطاب کے ایمان کا سامان ہو گیا عمر بن الخطاب جہاں غصہ ور اور بہادر تھے وہاں جابر طبیعت ہونے کے علاوہ معاملہ فہم بھی تھے۔ مجلسِ کفار میں کہیں بات ہوئی، طبیعت جوش میں آگئی، مشتعل ہو کر شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے چراغ مصطفوی علیہ السلام کو بجھانے پر آمادگی کی اور چل دیئے۔ راستہ میں بہن بہنوئی کا گھر پڑا۔ وہاں جا گھسے۔ دیکھا تو بہن بہنوئی دونوں شمع اسلام کے پروانے نظر آئے۔ یہ دیکھ کر بہت جھنجھلائے۔ ہمشیرہ کو سخت سست کہا۔ بہت سختی کی مگر ایک نہ بنی۔ آخر وہاں سے ہی قرآن کریم کی چند آیات سنکر ایسے متاثر ہوئے کہ غلامانہ طور پر دربار نبوت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ پھر کیا تھا۔ آپ کے اسلام لانے کے بعد اسلامیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے حرم پاک میں جا کر علانیہ نماز پڑھی۔ پھر ایک شدید ہنگامہ ہوا۔ جس میں ممکن تھا۔ کہ کفار کی متحدہ یورش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی نقصان پہنچاتی مگر عاص بن وائل ایک متمول اور رئیس مکہ نے حضرت عمرؓ کو اپنی پناہ میں لے لیا جس سے لوگ ہٹ گئے۔ اور یہ قضیہ فرو ہو گیا۔ اس کے بعد اس چھبیس ۲۶ سالہ نوجوان حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے اسلام کو اتنی تقویت حاصل ہو گئی۔ کہ اس روز سے فرائض الاسلام حرم پاک میں اعلانیہ ادا ہونے لگے۔

یہاں یہ لکھنا بے جا نہ ہو گا۔ کہ کرہ ارض پر جس قدر اور جتنے بھی پیشوایانِ مذاہب اور علمبردارانِ اصلاح و عمل وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہے ہیں وہ ضرور شکارِ مصائب اور آماجگاہِ حوادث و ذمائم ہوتے رہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت

پر جس شقاوت و قساوت سے کفار نے کام لیا۔ اس کی نظیر پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ کس راہنما کو ایک نمرود۔ ایک فرعون اور ایک اسرائیل سے واسطہ پڑا ہوگا۔ لیکن یہاں مکہ و طائف کا ہر امیر و رئیس بجائے خود فرعون و نمرود تھا۔ پہلے راہنماؤں میں ایک یہ بات تھی کہ مد مقابل جتنی قوم ہے۔ ان میں سے کسی ایک کی ہاں اور ایک ہی کی نہ۔ پوری قوم کی ہاں یا نہ مقصود ہوتی تھی۔ مگر مکہ میں اس 'ہاں' یا 'نہ' کا سوال ہی نہ تھا۔ کوئی اسلام قبول کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ اتنے پر پیچ اور اُلجھے ہوئے حالات تھے کہ ان میں تبلیغ جیسے فریضہ سے عہدہ برا ہونا قریباً ناممکن تھا۔ سیاست۔ سیادت۔ رقابت وہ رکاوٹیں تھیں کہ خدا کی پناہ۔ ایک پتھر ہٹایا۔ تو دوسرا اسکی جگہ گرا۔

ابتدائے اسلام سے مسلمانوں کے ستائے جانے اور ایذارسانی کا سلسلہ شدت کے ساتھ جاری ہوگیا۔ دم لینے کی مہلت نہ تھی۔ سیلاب عقوبت واذیت امنڈے ہوئے چلے آتے تھے۔ اس لئے اس وقت عقائد اور اعمال کی صورت بھی نہایت مختصر سی تھی۔ اور اسلام کے لئے توحید و رسالت کا اقرار اور وہ بھی چھپ چھپا کر تاریکیوں میں دو چار رکعت نماز پڑھ لینا کافی سمجھا گیا تھا۔ پہلی وحی الٰہی اقرأ باسم ربك الذی خلق میں روحانی نسبت کے سوا کسی بھی مخصوص عقیدے کی تعلیم نہ تھی۔

اس کے بعد دوسری وحی یاایھا المدثر الاخر۔ میں (یعنی اے چادر اوڑھنے والے اٹھ لوگوں کو ڈرا۔ اپنے رب کی بڑائی بیان کر اپنے کپڑوں کو پاک رکھ بتوں کو چھوڑ دے) صرف اتنا بتایا گیا کہ اللہ تعالےٰ بہت بڑا ہے۔ اس کی عبادت کرنی چاہیئے۔ اللہ کے خوف سے لوگوں کو ڈرانا چاہیئے۔ اور اس کی عبادت کے لئے کپڑے بھی پاک ہونے چاہئیں۔ اسکے بعد پھر تمام آیات میں مولا کریم کی عظمت و کبریائی۔ جنت و جہنم و رسالت کی

خصوصیات اور اس کے وجوہ و دلائل کہ اس کی کیوں ضرورت ہے یوم محشر کا نقشہ اور بت پرستی و مورتی پوجا کی مذمت کا بیان تھا۔ کیونکہ نبوت کا سیزدہ سالہ عرصہ جو مکہ میں گذارا وہ اسی ضرورت کا حامل تھا۔ کہ عوام کے دلوں میں خدا جوئی۔ رقت اور دماغوں میں خدائے قدوس کے جلال و ہیبت کا تصور قائم کیا جائے۔ اور یہ سب کچھ محض عقائد سے متعلق تھا۔ پھر عذاب و ثواب کی آیات نازل ہو چکنے کے بعد اوامر احکام کا نزول ہوا۔ چونکہ مکہ معظمہ کے قیام تک۔۔ روزہ فرض ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ اگر ہمارے پاس غذائے لطیف نہیں۔ آب خوشگوار نہیں۔ اور زوجہ جمیلہ نہیں تو ایسی حالت میں ان تمام اشیاء سے منہ موڑ لینا کوئی حقیقی تقوے نہیں سمجھا جاتا۔ قوتِ ایمان اور ضبطِ نفس کا صحیح مقام یہی ہے۔ کہ جذبات نفسانیہ کو مشتعل کرنے والے سامان موجود ہوں۔ پھر احتراز کر کے زہد و تقویٰ اور صبر و توکل کا امتحان دیا جائے۔ اسی طرح زکوٰۃ اسلام کا ایک اساسی فرض ہے لیکن رات دن جنگوں میں مسلمانوں کی مالی حالت ترقی پذیر نہ ہو سکتی تھی اس لئے اس کی فرضیت بھی سات آٹھ سال بعد ہوئی۔ ایسے ہی فریضۂ حج کا بھی حکم نہ آیا۔ کیونکہ ۸ھ ہجری المقدس سے پیشتر تک تو مسلمانوں کو مکہ میں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ نماز گو اسلام کے وجود کے ساتھ ہی فرض ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی تکمیل بھی ہجرت کے چھ سال بعد ہوئی۔ گویا فتح مکہ کے بعد جب مشرکین اور یہود و نصاریٰ کا تمام زور ٹوٹ گیا۔ اور اسلام اپنے آب و تاب کے ساتھ نصف النہار پر چمکنے لگا۔ تو نظام شریعت کی تکمیل کا موقع ہاتھ آیا۔ بلکہ اس وقت بھی بعض احکام کا نزول نہیں ہوا تھا۔

اسلام میں عقائد کے بعد سب سے اہم فرض نماز ہے۔ وضو پر عمل تو پہلے ہی سے تھا۔ لیکن اس کی فرضیت ہجرت کے چار پانچ سال بعد کو ہوئی پہلے

لوگ وضو میں خاص احتیاط نہ برتتے اور جلد جلد کر لیا کرتے۔ مگر نماز پڑھنے کے لئے اس آیت شریفہ کے نزول نے یاایھا الذین آمنوا اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین (یعنے مسلمانوں نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو تم منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لیا کرو۔ اور سروں پر مسح کرو۔ اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔) جو ۵ھ ہجری میں نازل ہوئی۔ وضو ٹوٹے یا نہ ٹوٹے ہر نماز کے لئے وضو کرنا لازمی کر دیا اور آخر میں پھر ہر وقت وضو کرنا بھی لازم نہ رہا۔ اور پہلے وضو ہونے کی شرط پر معافی ہو گئی۔ تاکہ یہ پابندی بھی لوگوں پر گراں نہ گذرے۔ اور فتح مکہ کے وقت اس کا عام اعلان بھی کر دیا گیا۔

نماز جو حضور علیہ السلام کے اظہار نبوت فرماتے ہی فرض ہوتی تھی اس کی بھی یہ صورت ابتدا میں نہ تھی جواب ہے۔ کفار کی دن بھر کی شرارتوں سے مامون رہنے کے لئے رات کا زیادہ وقت قیام نماز میں خرچ کر دینے کا حکم تھا جس کا ذکر سورہ مزمل شریف کی ابتدائی آیات میں ملتا ہے نماز کی تدریجی کیفیت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابتدا میں صبح و شام کی دو دو رکعتیں فرض ہوئیں۔ واذکر اسم ربک بکرۃ واصیلا ومن اللیل فاسجد لہ وسبحہ لیلا طویلا (یعنے صبح و شام خدا کا نام لیا کرو۔ اور رات کے وقت دیر تک سجدہ کیا کرو۔ اور اس کی تسبیح بیان کرو) دیر تک رات کو نماز پڑھنے کا یہ حکم ایک سال تک رہا۔ اس کے بعد اس کی فرضیت منسوخ ہو گئی۔ اور دوسرا حکم آ گیا جو سورہ مزمل شریف کی آخری آیات میں ”ان ربک“ سے شروع ہو کر آخر تک بیان ہوا ہے۔ یعنے تیرا پروردگار جانتا ہے۔ کہ تو دو تہائی رات سے کم آدھی رات اور تہائی رات تک نماز پڑھا کرتا ہے۔ اور تیرے

ساتھ کچھ اور لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ وہ خود ہی شب و روز کا اندازہ کرتا ہے۔ اس نے جان لیا کہ تم اسے گن نہیں سکتے۔ اس نے تم پر مہربانی فرمائی۔ اب جتنا تم سے ہو سکے اتنا ہی قرآن نمازمیں پڑھو۔ اس نے جان لیا ہے۔ تم میں بیمار بھی ہوں گے۔ مسافر بھی ہوں گے۔ جو اپنی معاش کے لئے مصروف سفر ہونگے۔ اور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے سفر کریں گے۔ اس لئے اب تم سے جتنا ہو سکے اتنا ہی پڑھو۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے تمہاری مجبوریاں دیکھ کر تم پر فضل روا رکھا۔

یہ رات کی نفل نماز تہجد ہے۔ اس کے بعد مغرب و عشا کی نمازیں فرض ہوئیں۔ اور جوں جوں حالات رو بہ اصلاح ہوتے گئے۔ احکام میں ترمیم ہوتی گئی۔ اور پانچویں سال تک شبِ معراج میں پانچوں وقت کی نمازیں فرض ہو گئیں۔ مگر رکعتیں نماز کی دو ہی تھیں۔ مدینہ منورہ پہنچکر صورت حالات میں طمانیت پیدا ہوئی۔ تو اس فرض نے بھی کچھ وسعت اختیار کر لی۔ اور دو کی بجائے چار رکعتوں کی فرضیت آ گئی۔ مگر ابھی تک سکون نہ تھا۔ نماز میں بعض اوقات ایسی حرکات کر لی جاتیں کہ اگر آج کا مسلمان دیکھ پائے تو تعجب کرے۔ مثلاً نماز میں منہ آسمان کو کر کے دیکھنا۔ نماز پڑھتے پڑھتے سلام کا جواب دے دینا۔ پاس پاس کھڑے نمازیوں کا آپس میں کوئی ضروری بات کر لینا۔ کسی ضروری کام کے یاد آ جانے پر دوسرے سے کہہ دینا۔ سب کچھ روا تھا۔ سنہ ۶ ہجری المقدس میں مہاجرین واپس آئے۔ اور نماز کی حالت میں دیکھ کر مسلمانوں کو سلام کیا۔ جواب نہ ملا تو حیران ہوئے۔ حضور علیہ السلام نے نماز سے فارغ ہو نے کے بعد فرمایا۔ کہ خداوند عالم نے نماز میں بات چیت کی ممانعت فرما دی ہے۔ اس وقت سے نماز پورے سکوت سے ادا ہونے لگی۔ تشہد کا بھی یہ طریق نہ تھا۔ مختلف اشخاص کے نام لیکر التحیات کے خاص الفاظ

سکھائے گئے۔ جو آج تک جاری ہیں۔ جب تکمیل فرائض ہوگئی تو نماز تمام تر خشوع وخضوع اور محویت کا پیکر بن گئی۔ اور اٹھارہواں سپارہ کی شروع کی آیات نے نازل ہوکر نماز کو پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا فرض کر دیا۔ اور یہ حالت ہوگئی۔ کہ ایک شخص نے نماز جلدی جلدی پڑھی تو حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ نماز پھر پڑھو تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک نے تین مرتبہ نماز لوٹا کر پڑھی اور تین ہی بار حضور نے فرمایا کہ پھر پڑھو نماز نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سمجھایا کہ قیام۔ رکوع۔ قعود اور قومہ۔ سجدہ سکون و اطمینان کے ساتھ ادا کیا کرو۔ اور نماز میں پوری احتیاط برتو۔ خشوع وخضوع کا حکم آتے ہی محویت و استغراق کا یہ عالم ہوگیا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ عین نماز کی حالت میں مجروح ہوکر گرتے ہیں۔ اور تڑپنے لگتے ہیں مگر اس دلدوز حادثہ پہ کوئی شخص مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ اور نماز کی محویت کسی کو ادھر متوجہ ہی نہیں ہونے دیتی۔ کیسا عجیب حال ہے کہ ایک انصاری کے عین نماز کے وقت تین تیر لگتے ہیں۔ مگر نماز کی نیت نہیں توڑتے۔ حضرت علی المرتضٰے کرم اللہ وجہٗ کی محویت کا بھی یہی حال ہوتا تھا۔ عین حالت نماز میں آپکے پہلو میں اترا ہوا تیر کھینچ لیا جاتا ہے۔ اور خبر ہی نہیں ہوتی۔

روزہ کی تدریجی فرضیت

اس وقت تک کہ روزہ کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا مسلمانوں کو حضور علیہ السلام نے یوم عاشورہ کا ایک روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ جس میں کھانا پینا اور عورتوں سے ہم بستری حرام تھی۔ چونکہ عرب لوگ روزہ کے کم خوگر تھے اور ان پر یہ عبادت بڑی شاق تھی۔ اس لئے اسلامی روزہ کی پابندیاں بتدریج نازل ہوئیں۔ ہجرت کے بعد آپنے مسلمانوں کو صرف تین روزے

رکھنے کا حکم دیا۔ اور اس کے ساتھ روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار
بھی حاصل تھا۔ کہ اگر چاہو رکھو نہ چاہو نہ رکھو۔ مگر نہ رکھنے کی صورت
میں ایک مسکین کو بطور فدیہ کھانا ضرور کھلا دینا چاہئے۔ پھر فرضیت
روزہ کا حکم آگیا جس میں روزہ بلا عذر شرعی نہ رکھنے کا اختیار جاتا
رہا۔ اور یہ حکم نازل ہو گیا کہ جب رمضان شریف آجائے تو ضرور روزہ
رکھو اور فدیہ کی اجازت صرف بیماروں اور مسافروں کو دیگئی اور عمداً روزہ نہ رکھنے والے
کے لئے سخت وعید اور سزا کا حکم آگیا۔ اور جہاں آپ نے مسلسل روزہ
رکھنے کو منع فرمایا۔ وہاں راتوں کو صبح صادق تک کھانے پینے اور تمام
اشغال جاری رکھنے کی بھی اجازت فرمادی۔ اور روزہ کا مقصد اتنی
آسانیاں بہم پہنچا دینے کے بعد تعذیب جسمانی نہیں بلکہ ترک معصیت
رہ گیا۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے فرما دیا کہ جو شخص روزہ رکھکر
جھوٹ اور معصیت کو ترک نہیں کرتا اس کے صرف منہ باندھنے اور
فاقہ کشی کرنے کی ضرورت نہیں۔

زکوٰۃ کے احکام

روزہ تو ۲ ہجری المقدس میں فرض ہو گیا مگر زکوٰۃ جیسا اہم فریضہ جس کا حکم قریباً نماز
کے ہر حکم کے ساتھ ہے۔ ادائیگی کے لئے ۸ ہجری میں جا کر فرض
ہوا۔ اور وہ بھی بتدریج اس منزل فرض تک پہنچا جس پر اب ہے۔
البتہ خیرات و صدقات کی تاکید شروع ہی سے جاری ہو گئی تھی اور
وقت کی اقتضا کے مطابق یہ حکم آچکا تھا۔ کہ جس کے پاس ضروریات
زندگی کے بعد کچھ بچے اس کو خیرات کر دینا چاہئے۔ کیونکہ مسلمانوں پر شدید
افلاس طاری تھا۔ اور مسلسل کئی کئی اوقات کے فاقے ہوتے تھے۔
پیٹ پر پتھر باندھنے تک کی نوبت آجاتی۔ اندریں حالات زکوٰۃ فرض
بھی نہ ہو سکتی تھی۔ پہلا حکم والذین یکنزون الذھب والفضۃ

ولا ینفقونها فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم ہ
(یعنی جو لوگ سونا چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں
خرچ نہیں کرتے۔ ان کے لئے آخرت میں سخت عذاب کی اطلاع ہے)
اس کے بعد پھر وحی نازل ہوئی۔ کہ یسئلونك ماذا ینفقون قل
العفو" (یعنی لوگ آپ سے پوچھتے کہ کیا خیرات کرنا چاہئے۔ انکو فرما
دیجئے کہ مصارف وحوائج ضروریہ سے جو بچ رہے۔ وہ سب خیرات
کردو۔ پھر حکم ہوا مسلمانوں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز سے جو ہم نے
تمہارے لئے زمین میں پیدا فرمائی ہے۔ اچھا حصہ خیرات کرد اس حکم
سے مسلمانوں پر یہ واضح کرنا مقصود تھا۔ کہ اچھا اچھا مال۔ پھل اور میوے
محفوظ رکھنا اور بیکار وخراب اشیا خیرات کرنا کوئی ثواب کا کام نہیں
پھر اس حکم کی تائید میں مزید تاکید ہوئی۔ کہ تمہیں اس وقت تک کچھ ثواب
نہ ملیگا۔ جب تک تم اپنی محبوب چیزیں خیرات نہ کرو۔ اس حکم سے ہر امیر
وغریب مسلمان میں یہ رغبت پیدا ہوئی کہ وہ جو کمائے اپنے مصارف
سے بعد بقیہ خیرات کردے۔ کیونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرما دیا تھا۔ کہ خیرات کرو خواہ وہ نصف چھوہارہ ہی کیوں نہ ہو کہ
وہ بھی تمہاری قبر کو روشن کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ اس سے اللہ تعا
کی راہ میں کم وبیش خیرات کرنے کا سوال ہی نہ رہا۔ جو جس کو توفیق ہوتی
وہ خرچ کرتا۔ اور اللہ تعالےٰ کی راہ میں دیتا۔ ایسے ہی صدقہ فطر
سنہ ۲ ہجری میں واجب ہو چکا تھا۔ اور فتح مکہ کے بعد مسلمانوں پر زکوٰۃ
بھی فرض ہو گئی۔ اور زکوٰۃ کے مصارف میں فقراء۔ مساکین تحصلین
زکوٰۃ۔ مولفۃ القلوب۔ غلام۔ مقروض۔ مسافر اور عامہ ان کے علاوہ
اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بیان فرما دیا گیا۔
چونکہ ہجرت کے بعد حالات میں بڑا فرق ہو گیا ہوا تھا۔ اور دو برس

تک مسلمانوںکو کوئی اطمینان کا سانس لینا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ۱سنہ ہجری اور ۲سنہ ہجری میں صرف صدقہ فطر۔ نماز عید۔ قربانی روزہ اور تحویل قبلہ وغیرہ کے احکام ہی نازل ہوتے رہے۔ پھر تعزیرات مذمت شراب۔ احکام وقف وصیت۔ وراثت۔ نکاح۔ طلاق۔ کھانے پینے میں حلال و حرام کے احکام ان کے بعد واضح ہوئے۔ اور قتل وخونریزی کی پاداش میں جزا و سزا۔ تحفظ مال اور چوری اور راہزنی کا سدباب۔ زنا کا انسداد۔ اور انکی حدود کے مسائل۔ شرابخوری و قماربازی کا استیصال۔ تہمت عفاف اور سزاء عفو حفظ جان و مال اور عزت و آبرو کے حقوق۔ نگہداشت۔ معاملات و مراتب دوسرے مذاہب اور غیر اقوام کا نظام آئین۔ وحقوق نزال بعد بتدریج نازل ہوئے۔

نظامِ احیاءِ ملت

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ:-

بس تو اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر۔

قرآن کریم نے اعلانیہ بتایا ہے۔ کہ حضرت خلیل اللہ کے مجاہدانہ کارنامے، مجاہدانہ تخیلات، مجاہدانہ تصورات اور مجاہدانہ اعمال و اوصاف ہی ان کی خلّت و عظمت کا باعث بنے، انہوں نے اللہ کی اطاعت کی۔ اس کی محبت میں ہر محبوب شئے سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔ اور اسی کے ہو رہے۔ اس لئے اللہ کریم نے ان کو نوازا اور ان کی نسل کو بھی ساری دنیا میں برگزیدہ فرما دیا سنت ابراہیمی کا یہی وہ سبق ہے جس کو سرور کائنات علیہ السلام و تحیات نے دنیا والوں کے سامنے دہرایا۔ اور اسی کی یاد دہانی کو کائنات انسانی و بشری کی ہدایت دائمی کے لئے مختص فرما دیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اپنی ارشادات داشارات کے ماتحت پیغام توحید باری تعالیٰ دنیا کے کونے کونے میں پہنچایا اور وحدت کے نور مبین کی ضیا پاشیوں سے ظلمت و ضلالت کے پردے چاک کر کے صنم پرستوں اور اجرام سماوی کی پرستار اقوام کو آسمان و زمین کے خالق سے روشناس کرا دیا۔

ابتلاد آزمائش ابراہیمی کے جتنے ابواب ہیں ان میں سب سے بڑا اور واضح ترباب قربانی ہے جو انہوں نے رب کعبہ جلشانہٗ کے اشار پر بلا حیل و حجت وادیٔ غیر زرع میں کھولا۔ اور جس پر آج مادہ پرستی

کے دور میں عام جاہلوں نے وہ معاشی اعتراضات کئے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل و دماغ پر معاشی مفاد کی اہمیت کچھ ایسی بری طرح مسلط ہو گئی ہے۔ کہ معاشی قدر کے سوا کوئی دوسری قدر ان کی نگاہوں میں باقی ہی نہیں ہے۔ اور وہ بنیوں اور کنجڑوں کی طرح حساب لگا کر دیکھتے ہیں کہ ہر سال کتنے لاکھ یا کتنے کروڑ مسلمان قربانی کرتے ہیں۔ اور اس پر اوسطاً فی آدمی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ پھر اس پر جب قربانی کا مجموعی خرچ کی ایک کثیر رقم ان کے سامنے آجاتی ہے تو حرص کا مڑوڑ پڑتا ہے۔ اور چیخ اٹھتے ہیں کہ اتنا روپیہ جو قربانی کے ذریعے ضائع ہو رہا ہے۔ اگر اس کو معاشی منصوبوں پر خرچ کیا جائے تو کتنے فوائد حاصل ہوں۔ مگر انہیں معلوم نہیں کہ نظامِ احیائے ملت میں کتنے اعمال عشق و محبت میں جو تیری معیشت کی میزان پر تول تول کر بے وزن نہیں سمجھے جا سکتے۔ اور نہ ان گہرے دریاؤں کا پانی فلسفیانہ خبط کے دو انچے گز سے ناپا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اسی طرح حج کے معاشی نقصانات کا ایک مہیب تخمینہ پیش کر دے یا تمام نمازیوں کے صرف اوقات کا کئی لاکھ گھنٹے جمع کر کے تضیع اوقات سے بچنے کا نقشہ بنا دے۔ یا یہی لغو منطق روزے کی بھوک پیاس کے خلاف استعمال کرے تو دین کے احکام کو جانچنے میں یہ معیار کہاں تک قابل قبول سمجھا جائے گا۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

کاش کہ یہ چودھویں صدی کے ناواقف ریاضی دان اسلامی احکام اور انکی اقتصادی مصلحتوں کو قرآن و حدیث کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے اور یوں اپنی بے علمی کو آشکارا ہونے سے بچا لیتے۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا۔ کہ مسئلہ قربانی کے شروع ہونے کا

سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لیکر آج تک مسلمانوں کی ہر نسل کے بعد دوسری نسل اس پر عمل کرتی چلی آئی ہے۔ دو چار یا پانچ دس آدمیوں نے نہیں۔ بلکہ ہر پشت کے لاکھوں کروڑوں بلکہ انگنت مسلمانوں نے اپنی سے پہلی پشت کے بےشمار مسلمانوں سے اس عمل کو آخذ کیا ہے۔ اور اپنے سے بعد والی پشت کے اربوں مسلمانوں کو پہنچایا ہے۔ اگر تاریخ اسلام کے کسی مرحلے پر کسی آدمی نے اس کو ایجاد کر کے دین میں شامل کرنے کی کوشش کی ہوتی۔ جیسا کہ اس کو مابعد کے ملانوں کی ایجاد کہا جاتا ہے۔ تو کس طرح ممکن تھا۔ کہ تمام مسلمان ہر زمانہ میں بالاتفاق اس کو قبول کر لیتے اور کہیں کوئی بھی اس کے خلاف لب کشائی نہ کرتا۔ اور کس طرح یہ بات تاریخ میں چھپی رہ سکتی تھی۔ کہ اس طریقہ کو کب، کس نے اور کہاں ایجاد کیا ہے؟ آخر یہ امت ساری کی ساری نعوذ باللہ منافقوں پر ہی تو مشتمل نہیں رہی جو حدیثوں پر حدیثیں قربانی کی مشروعیت پر گھڑتی چلی جاتی۔ اور ایک نیا اور نقصان دہ طریقہ ایجاد ہو کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے منسوب ہوتا رہتا۔ اور پوری کی پوری امت آنکھیں بند کر کے بلا چون وچرا اسکو اپنے عمل میں جگہ دیتی رہتی اور اگر نعوذ باللہ یہ مان لیا جائے کہ تمہارے متقدمین اسی قسم کے تھے تو ایک قربانی کیا ہے۔ رسالت قرآن۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، سب کچھ ہی مشکوک ہو کر رہ جائے گا۔ اور ایسا کونسا پہلو ہو گا جس کو اس شک سے بالاتر ٹھہرایا جا سکیگا۔

انسوس ہے کہ بعض لوگ خوف خدا اور شرم خلق سے دور ہٹ کر علم اور سمجھ بوجھ کے بغیر جس دینی مسئلہ پر چاہتے ہیں کلہاڑی رکھ دیتے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ ہماری اس غلطی کی زد کس کس پہلو کو مجروح کر گئی

اور سادہ لوح مسلمانوں کا عام طبقہ علم دین سے ناواقف ہونے ہوئے اس فتنہ سے کس قدر متاثر ہو گا؟

ان شریعت کے راندے ہوئے بے علم علماء سوء کو اگر خود توفیق نہیں تھی تو کسی سے ہی مسئلہ پوچھ لیتے کہ قربانی کا شرعی حکم کیا ہے؟ اور یہ کہاں سے ثابت ہے؟ قرآن و حدیث کے جاننے والوں کے پیر پکڑتے تو سب کچھ ملتا اور کھلی حقیقتوں کے ساتھ ملتا اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ عمل قربانی صرف حج اور متعلقات حج ہی سے وابستہ نہیں۔ بلکہ دوسرے حالات میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔ اور یہ آیت ہی قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین ط پڑھ لیتے (اے محبوب فرما دیجئے میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ پروردگار جہانوں کے لئے ہے) جو کہ معظمہ میں اس وقت نازل ہوئی جبکہ نہ حج کی فرضیت نازل ہوئی تھی۔ اور نہ اس کے مراسم ومناسک مقرر ہوئے تھے۔ تو شاید ان کے سیاہ خانہ علم کا علاج ہو جاتا۔ کیونکہ اس آیت میں کوئی اشارہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ اس حکم سے مراد حج میں قربانی کرنا ہے۔ اور لفظ نسک جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے۔ اس کو خود قرآن کریم نے دوسری جگہ قربانی ہی کے معنوں میں استعمال فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ فمن کان منکم مریضا او بہ اذی من راسہ ففدیۃ من صیام او صدقۃ او نسک۔ یعنی جو شخص سفر حج میں بیمار ہو جائے۔ یا اس کے سر میں تکلیف ہو اور وہ سر منڈا لے تو فدیہ میں روزے رکھے۔ یا صدقہ دے۔ یا قربانی کرے۔ اور آیت فصل لربک وانحر۔ بھی مکی ہے۔ جس کا ترجمہ ہے۔ کہ اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر۔ اس میں بھی کوئی قرینہ یا ایسا اشارہ نہیں

جسکی بنا پر کہا جا سکے کہ قربانی کا یہ حکم حج کے لئے خاص ہے۔ بلکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم جل مجدہٗ کے حضور میں قربانی پیش کرنے کا رواج حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے چلا آیا ہے۔ اذ قربا قربانا فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الآخر۔ اسی پر مشاہد ہے۔ یعنی جبکہ آدم کے دو بیٹوں نے قربانی پیش کی تو ایک کی قربانی قبول کر لی گئی۔ اور دوسرے کی نامقبول ہوئی۔ اس بارے میں قرآن کریم میں کوئی اشارہ نہیں۔ کہ یہ قربانی کس چیز کی تھی مگر توریت شریف میں اسکی تفصیل موجود ہے۔ کہ ہابیل نے اپنی دو بھیڑوں میں سے موٹی بھیڑ پیش کی خداوند عالم ہابیل سے خوش ہو گیا اور اس کی قربانی قبول فرمائی۔ اس عبارت سے پتہ چلتا ہے۔ کہ تمام مشہور مذاہب میں قربانی کا حکم تھا۔ جو کسی زمانہ میں بھی حج سے مخصوص نہیں ہوا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بعض صحابہ کرام کے اس سوال کے جواب میں کہ یا رسول اللہ ہمارے ماں باپ قربان ہوں، قربانی کیا ہے؟ تو حضور نے فرمایا۔ کہ سنتہ ابیکم ابراہیم (کہ یہ قربانی تمہارے باپ حضرت ابراہیم کی سنت ہے) سے ظاہر ہے کہ عمل قربانی صرف حج ہی سے مختص نہیں۔ اور ۲ھ ہجری میں مدینہ طیبہ میں اس سنت ابراہیمی کو اہتمام و پابندی کے ساتھ زندہ کرنے کی بنیاد پڑی۔ اور بیسیوں روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مدینہ طیبہ میں برابر قربانیاں کرتے رہے اور یہ ایک ایسا عمل ہے۔ کہ اس سے انکار سوائے جاہل کے دوسرا نہیں کر سکتا۔ ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے ایک مشہور روایت ہے۔ کہ ایک مرتبہ ہمیں عید الضحیٰ سفر میں پیش آ گئی۔ تو ہم قربانی کے لئے گائے میں سات آدمی اور اونٹ میں دس آدمی

شریک ہوئے۔ گویا عہد نبوی علیہ السلام میں قربانی کا اتنا اہتمام کیا جاتا تھا کہ بیرون مکہ میں مسافر بھی سفر کی حالت میں اس کو نہ چھوڑ سکتے تھے اور حدیث عن ابن عمر قال اقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمدینۃ عشر سنین یضحی۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں دس سال قیام فرما رہے اور قربانی فرماتے رہے اس سے صاف واضح ہو گیا۔ کہ قربانی بیرون مکہ کا عمل تمام متقدمین اور خود سرکار دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے اور وہ حدیث شریف من وجد سعۃ ولم یضح فلا یقربن مصلانا۔ کہ جو شخص باوجود استطاعت کے قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہوں میں نہ آیا کرے صاف ظاہر فرماتی ہے کہ یہ عیدگاہوں میں آنیکا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہی لوگوں کو فرما رہے ہیں جو ایسی جگہوں میں قیام پذیر ہوں۔ جہاں عید کی نماز ہوتی ہو۔ اور یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ مکہ معظمہ میں عید کی نماز کا وقت ہی نہیں ملتا۔ اس لئے لامحالہ یہ حکم بیرون مکہ رہنے والوں کو ہو گا۔ اور جو آیت فصل لربک وانحر کا یہ ترجمہ کرتے ہیں۔ کہ یہ قربانی مکہ مکرمہ ہی کے رہنے والوں پر ایام حج میں لازم ہے۔ کیا وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس آیت میں اگر قربانی کا حکم اہل مکہ کے لئے ہے تو نماز بیرون مکہ پر کیوں واجب قرار دی گئی ہے؟ ایک ہی جملا اور ایک ہی حکم ہے۔ پھر اسے مکہ سے باہر رہنے والوں کے لئے کیوں فرض کر دیا گیا ہے چاہیئے تو یہ کہ مکہ والے ہی قربانی کریں۔ اور وہی نماز بھی پڑھیں حالانکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی آیت کے ماتحت مروی ہے۔ کہ یہ حکم عام ہے نماز (عید) پڑھ اور قربانی کر، اس میں مکہ یا بیرون مکہ کی کوئی تخصیص نہیں۔ ایسے ہی قرآن کریم کی دوسری آیت وفدیناہ بذبح عظیم سے صاحب عین الھدایہ نے قربانی کے وجوب پر بلا تخصیص استدلال فرمایا ہے، اور شرائع اول کو برقرار

کہا گیا ہے۔

احادیث اور آثار امام محمد رحمۃ اللہ علیہ میں ہے، اخبرنا ابو حنیفہ عن ابراهیم قال الاضحیۃ واجبۃ علی اهل الامصار ما خلا الحاج قال محمد وبه ناخذ وهو قول ابی حنیفہ رحمهما الله یعنی قربانی واجب ہے شہروں والوں پر سوائے حاجیوں کے کہ ان پر قربانی واجب نہیں، نیز حدیث شریف میں ہے۔ کہ سید الکونین مالک حرمین الشریفین صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات شریف میں خطبہ دیا۔ اور قربانی کے متعلق ارشاد فرمایا۔ علی کلِّ اهل بیتٍ فی کل عامٍ اضحاۃ۔ یعنی ہر گھر والے پر ہر سال قربانی کرنی واجب ہے۔ بشرطیکہ صاحب وسعت ہو۔ یہ حدیث عین الہدایہ میں ہے۔ اور اس کو احمد ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ وغیرہم سب نے روایت کیا ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے۔ اور یہ حدیث طبرانی نے بھی روایت کی ہے۔ کہ جس گھر میں قربانی ہو وہ گھر اپنے میں رہنے والوں کے لئے دعا کرتا ہے۔ اور باوجود طاقت کے اگر قربانی نہ کی جائے تو وہ گھر رہنے والوں کے لئے بربادی کی دعا کرتا ہے۔ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قربانی کا مسئلہ ہر ایمان اور اسلام والے گھر والوں سے تعلق رکھتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ گھر کس شہر، کس علاقہ اور کس ملک میں ہو۔ صاحب ہدایہ ایک اور حدیث بھی پیش فرماتے ہیں۔ کہ علی کل مسلم فی عامٍ اضحاۃ، یعنی ہر مسلمان پہ ہر سال میں قربانی واجب ہے۔ پھر اصحاب صحاح ستہ نے سوائے بخاری کے ایک حدیث روایت فرمائی ہے۔ کہ من اراد ان یضحی منکم فلا یاخذ من شعرہ واظفارہ شیئاً۔ یعنی جو شخص قربانی کا ارادہ کرے اور ذوالحجہ کا چاند دیکھے۔ تو وہ اپنے بال نہ لے اور ناخن نہ ترشوائے یعنی

حجامت نہ بنوائے)

اس حدیث سے یہ لطیف اشارہ پایا جاتا ہے کہ حج کے ایام میں حج کرنے والے لوگ جب عرفات سے فارغ ہو کر اور حج کر کے منیٰ میں پہنچتے ہیں۔ تو پہلے حجامت کراتے ہیں۔ پھر احرام کھول کر قربانی کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ حجامت نہ کرانے کا حکم انہی لوگوں کے لئے ہے۔ جو بیرون مکہ معظمہ قربانی کرنے والے ہوں۔ اور جب تک قربانی نہ کریں وہ حجامت نہیں کرا سکتے، اور اگر یہ حکم قربانی حاجیوں کے لئے خاص ہوتا۔ تو یہ ان کے منافی تھا۔ اس لئے کہ احرام باندھنے والا شخص کسی جانور کو نہ خود ذبح کر سکتا ہے۔ نہ کسی ذبح کئے جانے والے بھاگے ہوئے جانور کی شکاری کو دلالت کر سکتا ہے۔ تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ یہ حکم ان عوام بیرونی علاقوں کے رہنے والوں کے لئے ہو گا۔ جو مکہ معظمہ کے علاوہ دوسرے مقامات پر رہ رہے ہوں۔ خواہ وہ کہیں ہوں۔ کیونکہ حاجی پہلے حجامت کراتا ہے۔ پھر قربانی کرتا ہے۔

ابن ماجہ میں ایک روایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں قربانی کی اور مسلمانوں نے آپ کے بعد قربانیاں کیں۔ اور اس پر سنت جاری ہوئی۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا۔ کہ جب قربانی کا ارادہ کرو۔ تو اپنے اہل و عیال کو جمع کر لو۔ کہ وہ اس کے گواہ بن جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ حاضرین و قائمین کو بخشدیگا۔

حضرت خلف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک درہم کی قیمت کی بھیڑ قربان کرنا میرے نزدیک دس ہزار درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے کیونکہ قربانی میں، امتثال امر باریتعالیٰ اور سنت انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باعث فرحت اہل زمین و آسمان ہے۔

صلوٰۃ مسعودی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دو مینڈھے املح قربانی فرمایا کرتے تھے۔ ایک اپنی طرف سے اور ایک ان امتیوں کی طرف سے جن کو بوجہ ناداری یا فراموشی قربانی کی توفیق حاصل نہیں ہوئی اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قربانی کے تین دنوں میں یعنی (۱۰ - ۱۱ - ۱۲ تاریخوں) ذوالحج میں اداقۃ الدما مر قربانی کے جانوروں کا خون بہانے سے کوئی عمل خدا وند عالم کو پیارا نہیں۔ بخاری شریف میں آیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ پہلی وہ عبادت جس سے ہم اس روز ابتداء کریں یہ ہے کہ عید کی نماز پڑھیں۔ پھر واپس ہوں اور قربانی کریں۔ تو جو شخص یہ کرے پس وہ ہماری سنت کو پہنچا اور جس نے نماز سے پہلے ہی قربانی کے جانور کو ذبح کر دیا تو وہ گوشت ہے۔ جس کو اس نے اپنے گھر والوں کے لئے پہلے ہی فراہم کرلیا ہے وہ عبادت نہیں۔ بخاری ہی میں ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ عید الضحیٰ کے موقع پر مجھے مدینہ طیبہ میں خلیفۃ المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ نماز عید پڑھنے کا اتفاق ہوا تو آپ نے نماز کے بعد تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں عید الفطر اور عید الضحیٰ میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ ایک دن ان میں سے افطار کا دن اور دوسرا اپنی قربانیوں کے گوشت کھانے کا دن ہے۔ ان تمام احادیث کا تعلق عید کے موقع پر قربانی کرنے سے ہے۔ حج کے ساتھ نہیں اور ان سب کا اطلاق ان لوگوں پر ہے جو حج کے علاوہ دوسرے مقامات پر قربانی کرتے ہیں۔ بعض لوگ سال حدیبیہ کے عمل سے دلیل پکڑتے ہیں۔ کہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے جانور مکہ معظمہ میں بھیجے تھے۔ لہذا قربانی مکہ معظمہ میں ہی ہو سکتی ہے۔ سو یہ ان کا مغالطہ ہے وہ نہیں جانتے۔ کہ یہ دلیل نا قابل قبول ہے۔ کیونکہ وہ نہ عید اور نہ حج بلکہ عمرہ کی قربانی کے جانور تھے۔ اور ان کا مکہ معظمہ ہی میں قربانی کیا جانا ضروری تھا۔ حضرت حسین بن محمد سعید عبد الغنی مکی حنفی اپنی کتاب ارشاد الساری الی مناسک ملا علی قاری مدفون جنت المعلیٰ مکہ مکرمہ میں فرماتے ہیں لا تجب الاضحیۃ علی المسافر والحاج لان فیہ الحاق

المشقۃ بالمشقۃ وتجب علیٰ اہل مکۃ بعدم المشقۃ فیھم ولعلہ اراد باھل مکۃ من لم یحج منھم - اور اسی طرح جوہرۂ نیرۂ شرح قدوری میں ہے۔ یعنی قربانی مسافر اور حاجی پر واجب نہیں کیونکہ ان میں اس کے لئے مشقت پر مشقت ہے - اور مکہ مکرمہ والوں پر واجب ہے - کیونکہ ان کے لئے مشقت اور تکلیف نہیں - اس لئے کہ وہ مقیم ہیں - مسافر نہیں ہیں اور نجندی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ والوں پر بھی قربانی واجب نہیں - جبکہ وہ حج کا احرام باندھے ہوئے ہوں - اس کی علت یہ ہے کہ حاجیوں پر دم (قربانی) قران اور تمتع واجب ہے - اور ان کے لئے دم (قربانی) افراد (اکیلے حج) کی قربانی مستحب ہے - اس لئے ان پر یہ قربانی تخفیفاً واجب نہیں کی گئی - جیسا کہ باتفاق ائمہ کرام رحمہم اللہ ان پر سے عید کی نماز اور جمعہ ساقط ہو جاتے ہیں - اس تشریح سے شاید منکرین قربانی سمجھ سکیں کہ قربانی مکہ مکرمہ میں بوجہ مشقت حاجیوں پر سے ساقط کر دی گئی ہے - اور دوسرے امصار و ممالک یعنی تمام شہروں، ملکوں اور گاؤں پر واجب ہے - جس تحقیق سے وہ حاجیوں اور مکہ والوں پر قربانی کا بوجھ ڈالنا چاہتے ہیں - اسی تحقیق سے وہ اس مسئلہ میں . . متکلف ثابت نہیں ہوتے - بلکہ قربانی کے جانوروں کی کھالوں کے مصرف اور گوشت کی تقسیم وغیرہ کے بارے میں جو متعدد احادیث صحیحہ وارد ہیں - ان سے پتہ چلتا ہے - کہ وہ سب کی سب دوسرے مقامات پر قربانی کرنے والوں کے متعلق ہیں - اور ایسی کوئی حدیث نہیں ملتی جس سے حضور علیہ السلام کا وہ ارشاد ثابت ہو جو دوسرے مقامات پر قربانی کی ممانعت میں ہو۔

منکرین قربانی جب مسلمانوں کو قربانی کے مسئلے کی تحقیق میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر قربانی کرنے سے باز نہیں رکھ سکے تو پھر ایک اور سبھا

اعتراض کرکے دل اندوہ گیں کو تسلّی دلایا کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ آجکل کی قربانی رسمی ہوتی ہے۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں، گویا ان کو سارا مغالطہ لفظ رسمی سے لگ رہا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ رسمی تو کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں۔ نہ رسمی اسلام اسلام ہوگا نہ رسمی ایمان ایمان ہمیشہ حقیقی اسلام اور حقیقی ایمان درکار ہے مگر بغیر عمل کئے کے کیونکر بنہ جاہیگا۔ کہ حقیقی عمل کیا ہے۔ اگر قربانی کا کرنا ترک کردیا جائے تو کیا اس بے راہ روی سے حقیقی قربانی کا سوراغ مل سکیگا۔ اور قربانی .... کرنے والے قربانی نہ کرنے سے حقیقی قربانی کا ثواب اور رضاء مدبانی کا حصول کرسکیں گے۔

ملت بیضا کے پرستاروں کو اچھی طرح واقف ہوجانا چاہیئے کہ یہ رسم محض رسم ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا و تسلیم کے جویا اسی کے ذریعہ سے اپنے قلوب میں اسکی اطاعت کے پاکیزہ اور بہترین جذبات پیدا کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس رسم کو نہ صرف ظاہری حیثیت سے عمل میں لایا جائے۔ اور نہ رسم جان کر ترک ہی کیا جائے، بلکہ اس کی غایت کو پیش نظر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کو جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے۔ قربانی کے جانوروں کے گوشت پوست اور خون کی ضرورت نہیں۔ بلکہ وہ اس ہمیمیت قلب کا خریدار ہے۔ جس کے ساتھ جان نہ مال کی یہ قربانی کی جاتی ہے۔ اور اسی کا نام تقویٰ ہے۔

دوسرے معنوں میں یوں سمجھئے کہ جانوروں کا صرف خون بہانا ہی قربانی کی غرض و غایت نہیں۔ بلکہ اپنی تمام خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر قربان کردینا حقیقی قربانی ہے۔ اور اسی میں جانوروں کی قربانی بھی شامل ہے۔ قربانی کے دن سیدنا حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی اس راہ کو قائم کرتے وقت اپنی جان اور اپنے مال

کو راہ خدا میں قربان کرنے کا عزم بالجزم بھی کرنا لازمی ہے۔ اس لئے کہ مسلک ابراہیمی کا یہی مقصد وحید ہے۔ کہ انسان اپنی ہستی کو رب العزت جل و علیٰ شانہٗ کی ہستی کے سامنے کوئی شے نہ سمجھے۔ اس لئے کہ وہی موجودات عالم کا خالق و مالک ہے۔ اور اسی کے ہاتھ میں سب کی فنا و بقا ہے جب تک وہ اپنی تمام محبوبات کو اس ایک محبوب کی راہ میں قربان کر کے اس کا تقرب حاصل نہیں کرتا وہ یقیناً اپنے مفہوم زندگی سے بہت دور ہے۔ انسان کو اس امر پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ کہ مسلک ابراہیمی میں مسلمان کا کونسا مقام ہے۔ اور اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے اسکو کونسی شاہراہ سے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا اس دنیا میں کوئی شئے ایسی تو نہیں جو اس کو اپنے خالق و معبود عزوجل سے زیادہ محبوب و مرغوب نظر آتی ہو۔ اور جسے خدا کی راہ میں قربانی کرتے وقت اس کے دل میں تامّل اور اس کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوتا ہو۔ ہمیں آج پاکستان کی خاک کا ذرہ ذرہ پکار کر کہہ رہا ہے۔ کہ جب تک تمہاری رگ و پے اور تمہارے قلوب و ارواح میں مسلک ابراہیمی اور سنت محمدی علیہما الصلوٰۃ والسلام اختیار کرنے کیلئے صحیح جوش و خروش پیدا نہ ہوگا اس وقت تک وہ مقام رفیع جس کے حصول کے لئے تم تڑپ رہے ہو۔ حاصل نہ ہو سکیگا۔

اقوام کو زندہ رکھنے کے لئے قربانی ایک لازمی امر اور لابدی عمل ہے۔ جو قوم قربانی سے گھبراتی ہے۔ اور اپنی ہر عزیز سے عزیز متاع کو اپنے محبوب حقیقی کے نام پر قربان کرنا نہیں جانتی وہ قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور نہ ہی اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اسلام قربانی اور ایثار کا مذہب ہے۔ وہ ہر اپنے ماننے والے کلمہ گو مسلمان سے مطالبہ کرتا ہے۔ کہ اسلام کی صف میں شامل ہونے سے پہلے سوچ لے کہ وہ کتنی قربانی دے سکتا ہے۔ اور کس قدر ایثار کر سکتا ہے۔ کیونکہ ایک

سچے مسلمان کی زندگی اور موت محض خدا کے لئے ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی ہر آرزو اور اپنی ہر خواہش کو اس کی خوشنودی کے لئے ہی وقف کرتا اور اسی سے مسرور ہوتا ہے۔ قربانی شیوۂ تسلیم و رضا کی جانب قدم بڑھانے کا پہلا زینہ ہے۔ عید الضحیٰ کا دن اسی شعار ملّی کی یاد منانے کا دن ہے کس قدر خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس دن خدا کی راہ میں جانوروں کو قربان کرتے ہوئے اس امر کا عہد کرتے ہیں کہ اگر کوئی وقت ایسا آگیا جس میں ہماری گردنوں کے خون سے اسلام کے پودے کی آبیاری کی ضرورت ہو تو وہ اپنی جان اپنا مال و اولاد بلکہ اپنی ہر چیز اللہ جل جلالہٗ کی راہ میں قربان کر کے اپنا نام ان مسلمانوں کی صف میں لکھوائیں گے۔ جن کا جینا اور مرنا صرف خوشنودئ محبوب حقیقی کے لئے ہوتا ہے۔

عید الضحیٰ کی تقریب پر مسلمان اپنی حیثیت، اور اپنی بساط کے مطابق اپنے عمل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہر دلنواز ادا کا اعادہ کرتا ہے کیونکہ ملت اسلامیہ کا یہ موسس اول جس نے دنیا میں سب سے پہلے اللہ کی عبادت کے لئے وہ گھر بنایا جو اس وقت سے لیکر آج تک مرجع خلائق اور مسلمانان عالم کا قبلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس قدر عزیز اور پیارا تھا۔ کہ قرآن پاک میں اسکی دوستی کا اقرار فرماتا ہے۔ اور وا تخذ اللہ ابراہیم خلیلا کے مقدس ارشاد سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست بنایا۔ اور اسی موسس صادق کی ہر عظمت و عصمت و سیرت کے نقش و نگاروں سے قصر اسلام کو مزین فرماتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملت ابراہیمی کی پیروی ہر کہ و مہ پر لازم ہو گئی ہے۔

آج یادگار ابراہیمی قائم کرنے والے سوچیں کہ کیا ان کا قدم اسی جادۂ مستقیم پر ہے۔ جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کیا تھا۔ اور اگر نہیں تو انہیں جلد اپنا رخ اس کعبۂ عمل اور صراط مستقیم کی جانب پھیر

لینا چاہئے۔ جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا معین کردہ ہے۔ اور تعمیر ملت کے لئے یہی ایک صحیح راستہ ہے۔ روپے پیسے کے اندازے لگانا اور بوالہوسوں کی طرح کوڑی کوڑی کا حساب سوچنا عشاق کا شیوہ نہیں۔ حضرت حافظ شیرازی نے کیا مزے کی بات کہی ہے۔

در عشق زلفِ لیلیٰ بندو کارِ عشق مجنوں کن!

کہ طالب را زیاں دارد مقالات خردمندی

یعنی لیلیٰ کی زلفوں کا عشق ہو تو دیوانوں کے سے کام کر کیونکہ مطلب کے طالب کو عشق کے کوچے میں عقل کی باتیں نقصان دیتی ہیں۔ جو نفع و ضرر کا حساب لگا کر میدان عشق میں قدم رکھے۔ وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ باپ کا خواب سنکر سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے بغیر سوچے سمجھے اور نتیجہ کا اندازہ لگائے جو یہ جواب عرض کر دیا۔ یا ابت افعل ما تومر ستجدنی انشاء اللہ من الصٰبرین یعنی اے میرے باپ اس امر کی تعمیل کر گزریں جو آپ کو ہوا ہے میں انشاء اللہ آپ کی چھری کے نیچے صبر کروں گا ثابت کرتا ہے کہ باپ کا یہ عزم راسخ اور بیٹے کی تسلیم و رضا کا یہ عالم عقل کی پرواز سے بہت دُور ہے ؎

مسئلہ جہادِ اسلام

اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا۔ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ

(سورۃ الحج رکوع ۶)

ترجمہ :- تحقیق اللہ تعالیٰ مومنوں سے دفاع کرتا ہے۔ اللہ کو خیانت کرنے والے اور ناشکر گزار لوگ پسند نہیں ہیں۔ ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے۔ جن سے لڑائی کی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ بہت مظلوم ہیں اور اللہ ان کی مدد کرنے پر بڑی قدرت رکھتا ہے۔ وہ لوگ ناحق اپنے گھروں سے صرف اس لئے نکالے گئے کہ انہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ تعالیٰ اس طرح بعض کا بعض سے دفاع نہ کرتا ہے تو یہ راہبوں کے تکیے گرجے اور یہودیوں معبد خانے اور مساجد مسمار کر دیئے جائیں۔ حالانکہ ان مکانوں میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور اللہ اس کی ضرور مدد کریگا جو اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ بڑی قدرت والا اور بڑی عزت والا ہے ؎

اس آیت کریمہ کی تشریح اور مسئلہ جہاد پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ دنیا بھر کے عقلا وحکما۔ مدبرین ومفکرین مبصرین ومصلحین۔ اس بات پر متفق ہیں کہ جنگ دنیا بھر کے افعال قبیحہ سے بدترین فعل ہے۔ جس کا کوئی شریف وعقلمند آدمی حامی نہیں ہوسکتا کون بھلا آدمی ہے۔ جو بچوں کے یتیم ہوجانے۔ عورتوں کے سہاگ لٹ جانے جوانوں کے بازو کٹ کٹ کر بچھ جانے۔ سروں کا نیزوں کی انی پر چڑھنے یا خاک میں گرنے۔ خون کی ندیاں بہ جانے بستیوں کے ویران اور کھیتوں کے اجڑنے کو مستحسن فعل سمجھتا ہو۔ یا مجروحین کے سینوں سے جو درد انگیز ... نالے اٹھتے ہیں۔ خون کے فوارے چھوٹتے ہیں۔ انکو دیکھ کر اپنے قلب وروح میں مسرت حاصل کرتا ہو۔ ہاں کوئی شقی القلب انسان ہی ایسے انسانوں کی مصائب پر خوش ہوسکتا ہے۔ اور جارحانہ جنگ کو اپنی تفریح کا سامان تعبیر کرسکتا ہے۔ جس پر انسانیت نے ہمیشہ ماتم کیا ہے اور کرتی رہیگی۔

پھر کیا عوام اگر اس ظلم وستم اور قتل ونہب کو اخلاقاً جائز اور مستحسن نہیں سمجھ سکتے۔ تو وہ رحمۃ للعلمین بنی۔ وہ پیکر نور انسان وہ محبیب ونجیب پیغمبر۔ وہ اشرف ترین رسول۔ وہ مجسمۂ شرافت جوان۔ وہ شفیق باپ۔ وہ بلند قدر وخوش مزاج شوہر۔ وہ مہربان آقا۔ وہ حامل قرآن سید۔ وہ حوصلہ مند تاجر۔ وہ مجاہد اعظم قریشی۔ وہ جامع اوصاف حجازی۔ وہ مرد میدان محسن۔ وہ ممتاز سپہ سالار۔ وہ کامیاب درحمدل فاتح۔ وہ کریم النفس حکمران۔ وہ فقید المثال مبلغ۔ وہ مایۂ ناز منتظم۔ وہ بے مثیل معلم۔ وہ سادگی پسند رہبر۔ وہ عاقل مقنن۔ وہ عدیم النظیر ہادی۔ وہ لاثانی تاجدار وہ بے شکوہ فرمانروا۔ وہ عظیم الشان مصلح۔ وہ جمہوریت نواز قائد۔ وہ مجسمۂ رحم وکرم۔ وہ انسان کامل۔ وہ اولوالعزم بے مثیل نوری مجسمہ صلی اللہ

تعالے علیہ وسلم بایں ہمہ او صاف کب جائز فرماتے کہ یہ خونریزی ہو۔ اور اس ہیبت و بربریت سے انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جائے۔ لیکن جب خدائے قدوس کو معبود ماننا اور پرامن طریق پر ماننا بھی ممنوع قرار دیا جائے جب بے گناہ مردوں پر تشدد کی بجلیاں گرائی جائیں اور جب باحیا وباعصمت عورتوں پر ظلم وستم توڑے جائیں اور جب ایسی تمام خطا کاریاں جائز رکھی جائیں۔ جو انسانیت کے لئے دھبہ ہوں۔ اور جب شہر چھوڑ کر پیچھے ہٹ کر سکوت اختیار کرکے بھی جان نہ چھوٹے تو اس وقت مدافعت فتنہ کے لئے جنگ ہر سمجھدار اور غیور انسان کے نزدیک ایک مقدس فرض نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور اسی مقدس فریضہ کا نام جہاد ہے۔ اور ایسے جہاد کو خونریزی و سفاکی سے تعبیر کرنا پرلے درجے کی ناعاقبت اندیشی اور حماقت ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایسے مقدس جہاد سے گریز بزدلی اور قوم کے ساتھ غداری ہو گی۔

چونکہ اسی فرض مقدس کی ادائیگی عظیم اسلام کی حفاظت کا سبب بھی تھی۔ اس لئے عیسائی مشنوں اور یہودی سوسائٹیوں وہندو سماجوں نے یہ شور مچانا شروع کر دیا۔ کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ اور ان کا یہ لغو اعتراض اس لئے نہیں کہ وہ اسلام کے آئینے میں انسان کی خونریزی دیکھ کر ترس کھاتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک گال پر دھپڑ کھا کر جب دوسرا گال آگے ہونا عیسائیت میں بھی نظر نہیں آتا۔ اور موجودہ تہذیب عیسائیت اسے پوری طرح گواہ ہے۔ کہ یورپ کے میدانوں میں کس کس مسیح کے امتی نے اپنی عملی حیثیت کا ثبوت دیا ہے۔ اور کس کس نے مدمقابل کے سامنے دونوں گال رکھ دیئے ہیں۔ تو اپنے عیوب پر پردہ پوشی کا ایک نیا ذریعہ یہ اختیار کر لیا جاتا ہے۔ کہ دوسرے مذاہب کی عیب جوئی شروع کر دی تاکہ اسی پردے میں موجودہ عیسائیت چھپی رہے اور اسی طرح اس کی صداقت قائم کر لی جائے۔

عیسائی مذہب کے واعظ چونکہ الفاظ کا ذخیرہ عیسائیت کے پھیلاؤ

کے لئے بہت کم رکھتے ہیں۔ اور لے دے کے ان کے پاس باپ بیٹیا۔ روح القدس ہی کی تین سرخیاں ہیں۔ اور یسوع خدا تھا۔ جو صلیب پر مر گیا تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے کفارہ ہو۔ جو اس پر ایمان لائیں بس یہ ان تینوں سرخیوں کی تشریح ہے۔ اس لئے اُن کے وعظ کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ وہ اپنا کیچڑ دوسروں پر پھینک کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حقیقت میں ہماری صاف گوئی اور عیب جوئی ہیں اسلام پر عیب نظر آتا ہے ہم وہ ہیں کہ بغیر تلوار کے مذہب بھی پھیلاتے ہیں۔ اور اسلام کی تلوار سے اپنے آپ کو بھی بچاتے ہیں۔ اور یہی حال ہندوؤں آریہ سماجیوں جینیوں اور بدھ مذہب والوں کا ہے جس کا مختصر سا خاکہ ہم آگے چلکر پیش کریں گے اور اس حقیقت پر کچھ کہنے کے لئے ہم ہی بحیثیت مسلمان ہونے کے مجبور نہیں ہیں۔ بلکہ یورپین مصنفین کی بیشمار تصنیفات بھی اسپر شاہد ہیں، کہ بانئے اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا پر تحفظ انسانیت کے لئے کیا کچھ کیا۔ اسلام دنیا میں کس امن پسند اور غیر متعصبانہ رنگ میں پھیلا۔ چنانچہ تھنک اینڈ گرو رچ (THinK & GROW RicH) کے مصنف نپولین ہل نے اپنی کتاب کے انڈین ایڈیشن ۲۴۸ میں (بحوالہ ریویو بر تصنیف اسد بے انتقامس سگرو شائع شدہ اخبار ہیرلڈ ٹریبون) لکھا ہے۔ کہ

> جب مکہ معظمہ کے سرمایہ دار اور تاجروں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ تو وہ وہاں سے ہجرت کر گئے۔ اور یہاں سے اسلامی ترقی کا دور شروع ہوا۔ اور صحرا سے وہ شعلہ پیدا ہوا۔ جو بجھ نہ سکا (ایک جمہوری فوج جو ایک وجود ہو کر لڑنے اور بغیر تامل کے موت کا خیر مقدم کرتے) (محمد) حضور علیہ السلام نے یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت

دی تھی۔ کیونکہ وہ کسی نئے مذہب کی بنیاد نہیں رکھ رہے تھے کیونکہ توحید کے مسئلے اور عقیدے میں وہ بھی اسی طرح تھے جیسے پہلے تاکہ سب ایک مرکز پر جمع ہو جائیں۔ اگر یہودی اور عیسائی اس دعوت کو قبول کر لیتے۔ تو اسلام تمام دنیا پر چھا جاتا لیکن انہوں نے قبول نہ کیا۔ اور نہ ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدا کردہ شریفانہ جنگ کی جدت کو اپنایا تاکہ (بچا ہوا دیرینہ غیر مسیحانہ افراد کی خونریزی نہ ہو) چنانچہ حضور علیہ السلام کی امت کی فوجیں یروشلم میں داخل ہوئیں تو کسی ایک فرد کو بھی اس کے مذہبی عقیدہ کی بنا پر قتل نہیں کیا گیا۔ برخلاف اس کے جب کئی صدیوں کے بعد صلیبی افواج نے دوبارہ اسی شہر کو فتح کیا تو کسی ایک مسلمان مرد عورت اور بچے کو باقی نہیں چھوڑا گیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی خوبی نے ان تمام مذاہب کی اول کوشش رد کر دیا ہے۔ اور وہ دیکھتے ہیں۔ کہ جس تیزی کے ساتھ اپنے سابقہ عقائد کو ترک کر کے اہل دنیا نے اسلام کو قبول کیا ہے۔ اور کوئی مذہب اس حالت میں قابل قبول نہیں سمجھا گیا۔ تو وہ اسلامی تعلیمات کی روحانی خوبیوں کو جوانوں کی جسمانی طاقت سے تبدیل کر کے یہ ڈھونڈ رہے بیٹھے ہیں کہ اسلام اور اس کی تعلیم بجائے خود قبول کر لینے کی چیز نہ تھے بلکہ سلطنت کی ظاہری طاقت نے یہ اسلام لوگوں کو قبول کروایا۔ اور اسکو اپنانے پر مجبور کیا۔

اس سے قبل کہ اس الزام کا جواب اسلام اور قرآن کی روشنی میں دیا جائے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اسلام سے قبل جو مذاہب دنیا میں موجود تھے۔ کیا انہوں نے تلوار اٹھائی یا اسلام نے؟ اور اگر اسلام نے اٹھائی تو ان کی ستم رانیوں کے دفعیہ کے لئے یا اپنی اشاعت کے لئے۔ اور

اگر انہوں نے اٹھائی۔ تو اسلام سے دیکھ کر یا انکی پہلے ہی جبلی عادت و فطرت تھی۔ ع

شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور۔

آؤ۔ اگر سابق مذاہب کے متبعین اور مذاہب اس بدنمائی سے بے عیب نظر آئیں۔ تو ہم سمجھیں گے کہ اسلام کو اپنی مظلومیت کا علاج بھی کرنا ان کے مقابلہ میں اپنی حق گوئی و حق پسندی پر ایک دھبہ تھا۔ کاش کہ اسلام کی طرف سے حاسد آنکھیں ذرا انوار صداقت کو دیکھتیں اور اسلام کی امن پسندانہ اور بے عیب تعلیم پر صاد کرتیں

اسلام اور مسلمان کا دعوٰے ہے۔ کہ ارض عالم پر بڑے بڑے جلیل القدر فاتح رونما ہوئے اور دنیا کی تقریبًا ہر قوم نے اپنی عمر کے کسی نہ کسی دور میں کچھ نہ کچھ فتوحات ضرور حاصل کیں۔ لیکن کسی نے بھی مفتوحوں کے ساتھ رواداری نہ برتی۔ بلکہ انکے نزدیک مغلوب قوم پر جبر و تعدی اس کے مذہب کو مٹانا اس کے معابد کو گرانا اس کے بال بچوں کو غلام بنانا۔ اس کے سرداروں اور تاجداروں کو ذلیل کرنا۔ لڑنے والوں کو زندہ آگ میں جلانا۔ اور طرح طرح کے عذابوں سے ہلاک کرنا ان کا وطیرۂ عمل رہا ہے۔ صرف اسلام اور حلقہ بگوشان اسلام ہی کا وہ مذہب اور قوم ہے جنہوں نے مفتوحوں کو انسان سمجھا۔ اور ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک روا رکھا۔ دیکھو۔ بنی اسرائیلی پیاسی نیل گوں آسمان کے نیچے اور اسی وسیع و عریض سرزمین پر بڑے بڑے خوفناک و ہولناک مظالم تسلسل و تواتر کے ساتھ ہوتے رہے۔ لیکن اپنے عہد اقتدار میں انہوں نے بھی جب کبھی قابو پایا کمی نہ کی۔ انکی فتحمندی بھی مفتولوں کی بے حرمتی و عصمت دری اور بچوں کی اسیری۔ مال و متاع کی لوٹ۔ اراضیات کی بربادی۔ کھیتوں کی تباہی اور تمام شہروں و قلعوں کی آتشزدگی کا باعث بنتی رہی۔ پھر اس پر بھی کہا

جاتا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اس قوم بنی اسرائیل پر ناراض ہوئے کہ تم نے عورتوں کو جیتا کیوں چھوڑ دیا کیونکہ تورات شریف اعداد ۳۱ میں ہدایت موجود تھی۔ کہ مفتوحوں کے لڑکوں اور بیاہی عورتوں کو قتل کر دو۔ اور صرف کنواری لڑکیوں کو اپنے لئے رکھ لو (عہد قدیم) کریڈل اوف اسلام میں صاف موجود ہے۔ کہ جو عیسائی ترک مذہب کر کے عیسائی ہونے سے انکار کر دیتے تھے۔ انکو یہودی بلا تکلف تلوار کے گھاٹ اتار دیتے تھے یمن کے فرمانروا ذونواس نے یہودی مشرب کیا اختیار کیا۔ عیسائیوں پر قیامتیں ٹوٹنے لگیں۔ انکو جبراً یہودی بنانا شروع کر دیا اور اگر نجران کے عیسائیوں نے یہودی ہونے سے انکار کیا تو ان کو زندہ آگ میں جھونک دیا گیا (تاریخ عرب)

غیر مسلم فاتحین کی سنگدلی

سلاطین باب ۱۵ میں ملاحظہ فرمائیے۔ کہ تو انہیں سرحد تک، مارا اور پیٹ والیوں کے پیٹ پھاڑ ڈال۔ چنانچہ عیسائیوں نے اس ہدایت کی پوری وفاداری کے ساتھ تعمیل کی۔ ہسپانیہ۔ سسلی۔ اور شام کے مسلمانوں کے ساتھ آتشزدگی۔ قتل و غارت۔ اخراج و بربادی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ روسیوں۔ یونانیوں اور صلیبی مجاہدوں نے دیر تک ڈاور نفلپ بن کر جو قیامتیں اٹھائیں۔ وہ تاریخ کا ایک المناک وخونی باب ہیں۔ کوہستان الپکرا میں کاؤنٹ آف سیرین نے عورتوں اور بچوں سے بھری.... ہوئی ایک مسجد کو بارود سے اڑا دیا بلڈ کا رنامہ مورم اہل پرتگال نے اسی ہندوستان کے جنوب مغربی گوشے میں مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا۔ اور مسجد کو آگ لگا کر انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کیا (تاریخ ہند) ہرقل نے نینوا کی تاریخی اور فیصلہ کن جنگ کے بعد شاہنشاہ امن کا اوتار کہلانے کے باوجود ایرانیوں کے ساتھ کونسی

کسریٰ کٹھا رکھی۔ آذربائیجان کو تباہ کر دیا۔ اور پرانی عداوتوں و ذلتوں کا بدلہ دیکر دل کھولکر انتقام لیا۔ اس کے حکم سے آتش پرستوں کی آتش بہرام بجھا دی گئی۔ مجوسیوں کے آتشکدے برباد کرائے گئے۔ اور زرتشت کے مولد یعنے جائے پیدائش قریہ ارمیا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔

قسیس میکائیل اس ہرقل اعظم کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ اس نے یعقوبی عیسائیوں کے گرجے اور خانقاہیں بیدریغ لوٹیں۔ اور انکو بلا وجہ ستایا۔ مورخ رینی ڈاٹ لکھتا ہے۔ کہ مصر کے قبطیوں پر رومیوں نے مظالم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے۔ بعض شکنجوں میں کسے جاتے تھے۔ اور بعض سمندر میں گرائے جاتے تھے۔ اور بعض اپنے پیشواؤں سمیت جلاوطن کر دیئے جاتے تھے۔ شاہ جسٹن ین نے صرف ایک شہر اسکندریہ میں دو لاکھ قبطیوں کو ایک ہی یلغار میں قتل کیا۔ پھر مورخ میکاڈ صلیبی عیسائیوں کے ظلم و جور کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ ان عیسائیوں نے وہ ظلم و ستم کئے۔ جن کے ذکر سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ شہر نالس تک وہ شہروں کو تباہ کرتے اور لوگوں کو تلوار کے گھاٹ اتارتے چلے گئے۔ محض جوان عورتوں کو اپنی خرمستیوں کے لئے رکھ لیتے تھے۔ سلطان صلاح الدین مرحوم نے ان کو درست کیا۔ پانچویں صلیبی جنگ نہایت وحشتناک ہے گاڈفرے شاہ بولان کے ماتحت تمام یورپ کی سات لاکھ فوج روانہ ہوئی۔ اور انطاکیہ میں دو ہزار مسلمانوں کے سر کاٹ کر مشلہ کیا اور محصورین کو دکھا دکھا کر مزے سے کھا گئے اور دوسرے موقع پر مسلم نعشیں قبروں سے اکھاڑ کر اور انکی کھوپڑیاں نیزوں پر رکھکر مظاہرہ کیا گیا۔ اور انطاکیہ و مرۃ النعمان کو فتح کر کے ہر گھر میں قصاب خانہ بنا دیا۔ بیت المقدس میں عالیشان عمارتوں۔ مدرسوں اور خانقاہوں سب کو تباہ کر دیا۔ بچوں۔ بوڑھوں عورتوں کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ اور مکانوں میں بند کر کے آگ لگا دی

ساتویں صلیبی جنگ میں رچرڈ شاہ انگلستان اور فلپ شاہ فرانس۔ و فریڈرک شاہ جرمنی شریک تھے۔ شہر عقر کا دو برس محاصرہ رہا آخر امان کے وعدہ پر باہر نکلے۔ لیکن رچرڈ نے عہد شکنی کی اور سبکو قتل کر دیا نویں صلیبی جنگ میں متوحد عیسائیوں ہی کے تمام معابد اور گرجوں میں قسطنطنیہ کے اندرونی عیسائی سورماؤں نے آگ لگا دی۔ اور سینٹ صوفیہ کا عظیم الشان گرجا صرف بیش بہا پتھروں کی خاطر گرا دیا گیا۔

غرض یہ ہے۔ کہ گو یہ جنگیں خالص مذہبی جنگیں تھیں مگر ان عیسائیوں نے جدھر سے گذرے قتل و نہب کے طوفان برپا کر دیئے۔ مسلمان اور یہودی تو در کنار اپنے ہم مذہب عیسائیوں تک بھی ان کے ہاتھوں سے محفوظ نہ رہے آگ لگانا۔ معابد جلانا۔ اور امان کا معاہدہ کر کے بھی سبکو قتل کر دینا اور بدعہدی کرنا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ اسی طرز عمل کے ماتحت انہوں نے شام کو بھی تباہ کر کے رکھدیا۔ اور لاکھوں انسانوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ تو تھا یہودی اور عیسائی فاتحوں کی انسانیت سوز اور خون آشامی کی داستانوں کا اجمالی خاکہ۔ اب ایرانیوں کی فاتحانہ تاختوں کا حال سنئے۔ تاکہ اسلام پر طعن کرنے والوں کی بگلا بھگتی کا پتہ چل جائے۔

ایرانی فاتحوں کی خون آشامی

یہ وہ لوگ ہیں جو مجوسی کہلاتے اور مجوسی مذہب رکھتے تھے۔ شیر بابکان کا بیٹا شاپور بڑا پرشکوہ اور اقبال مند حکمران تھا۔ وہ حریفوں کے شانے اکھڑوا دیا کرتا تھا۔ اس نے رومیوں پر بڑے بڑے خوفناک حملے کئے۔ اور ایک معرکہ میں اس نے قیصر ولیریٹین کو گرفتار کر لیا۔ اور اسکی یہ توہین و تذلیل کی کہ جب شاہ پور گھوڑے پر سوار ہوتے لگتا تو اسکی گردن پر جوتے سمیت پاؤں رکھکر چڑھتا مرنے پر بھی اس کا

دکھتی آگ میں ان کا بدن جھلسانا عام باتیں تھیں پھر چوتھی صدی میں ایک نیا انقلاب
ہوا جو سلطنت کا مذہب عیسائی قرار دیا گیا۔ اور مشتری کی پوجا ترک کر کے حضرت
مسیح کے اتباع کے حق میں فیصلہ ہوا۔ اور ساتھ ہی ساتھ قلمرو میں بت پرستی کے استیصال
کے احکام صادر کر دیئے گئے بت پرستوں کی بتوں پر قربانیاں اور چڑھاوے جرم قرار دیے
گئے۔ اور فرمان جاری ہو گیا کہ بت پرستی کے تمام آلات و اسباب اور پجاریوں کی
تمام جائدادیں بحق حکومت ضبط کر لی جائیں اور مندروں کو مقفل کر دیا جائے۔
غرضیکہ رومی سلطنت نے بت پرستی اور بت پرستوں کے متعلق وہ جابرانہ رویہ اختیار
کیا کہ ۴۰۸ سال میں بت پرستی جڑ سے نکل گئی۔ اور تثلیث کا سکہ بیٹھ گیا۔ یہ تو ہے
ان لوگوں کی داستان انصاف و رواداری اور انکی مہذب سلطنتوں کے انصاف
کا مرقع جنہوں نے اسلام کو ہمیشہ تلوار اٹھانے کا الزام دیا ہے اور کس قدر تعجب
انگیز منظر ہے کہ پہاڑ کی جلتی نظر آتی ہے۔ گھر کی جلتی نظر نہیں آتی۔ اس خونچکاں ہی
داستان کی کتب تاریخ گھر میں رکھکر پھر اسلام کو تلوار کا الزام دینا کہاں تک دانشمندی
اور معقولیت پر مبنی ہے۔

اب انکی سنئے جو آزاد اور زندہ اقوام کے دیکھا دیکھی صرف اس لئے اسلام پر
طعن کرتے ہیں۔ کہ اس نے ان کو آزادی کی زندگی اور عہدہ داری کی ملازمت اور پیشے
داری کی نعمت سے ایسا نوازا کہ اپنی بربادی میں بھی شاہان اسلام نے ان گری گذری اقوام
کی آبادی برقرار رکھی۔ یہاں تک کہ انکی رعایتوں کے پیش نظر بعض اسلامی شعائر ترک
کر دیئے تاکہ ان کے حق میں رواداری قائم رہے۔ اور انکی حفاظت کیلئے یہاں انہوں نے
اپنی ہڈیاں بھی سرزمین ہند کے سپرد کر دیں۔ اپنے آپکو جوکھوں میں ڈالا۔ مگر انکی آبرو ریزی
سے آڑے آتے رہے۔ پھر بھی ان کا یہ گلہ ہے کہ اسلام اور مسلمان تلوار سے غیر اقوام پر
غالب آئے۔ علامہ شبلی نے کیا خوب لکھا ہے کہ ؎

ہمیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

مگر مسلمانوں اور اسلام کی حکومت کا ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کر کے پھر بیان کیا جا

کہ ہندوستان کا ہندو اسلام پر تیغ کا الزام دینے میں کہاں تک حق بجانب سمجھا جاسکتا ہے۔ مومن خاں لاہور کا گورنر تھا۔ ایکدن سیر کو نکلا۔ راستہ میں ایک نوجوان ہندو لڑکی پاس کے گھوڑے کی باگ تھام کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ تو گورنر نے پوچھا کیا چاہتی ہے (گورنر چونکہ نہایت حسین جوان تھا) لڑکی نے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ پرماتما مجھے تجھ جیسا ایک خوبصورت بچہ عطا کرے۔ اس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ سے تیرا منشا مجھ سے شادی کرنیکا ہے۔ جبھی یہ تمنا پوری ہوسکتی ہے۔ لڑکی نے اس کا جواب ہاں میں دیا۔ تو گورنر نے کہا کہ شادی کے بعد بھی لڑکے کا ملنا خدا کے بس میں ہے۔ پتہ نہیں ملے یا نہ ملے۔ اور تمہیں چونکہ مجھ جیسے ایک خوبصورت بچے کی تمنا ہے۔ لہذا تو مجھے ہی اپنا بیٹا سمجھ اور میں تجھ کو اپنی ماں سمجھتا ہوں۔ اور جبتک زندہ رہا۔ اسکو ماں ہی سمجھ کر خدمت کرتا رہا۔

کیا ظالم۔ بدکردار ستمگر اور ہندو کش اسی خوبی کے ہوا کرتے ہیں۔ یا وہ جن کی مختصر سی مثال نیچے درج کی جاتی ہے۔ تعصب تو ایک لاعلاج مرض ہے۔ اگر یہ پٹی کھولکر دیکھا جائے تو یجروید کے منتر ۲۲۸ اور ۱۳/۱۳ اور ۲/۴ کے کیا معنے ہیں جس میں دشمنوں اور مخالفوں کو بلا وجہ ہی ہلاک کرنے۔ جلانے مارنے تباہ کرنے کے احکام موجود ہیں۔ لالہ لاجپت رائے نے اپنی تاریخ ہند کے حصہ اول میں اعتراف کیا ہے۔ کہ ہندوؤں نے بدھوں اور جینیوں پر اور جینیوں اور بدھوں نے ہندوؤں پر ظلم کئے۔ پانڈیہ خاندان کے راجہ کو جب جینیوں نے بہت ستایا۔ حالانکہ یہ خود جینی تھا۔ مگر اپنی رانی کی ترغیب سے اس نے شیومت اختیار کرکے آٹھ ہزار جینیوں کا چمڑا اتروا دیا۔ اور نہایت عذاب سے مارا۔ گورو گوبند بھی مسلمانوں کے قتل کرنے کو ثواب عظیم اور اپنی نجات کا موجب سمجھتے تھے۔ (تاریخ پنجاب کنیالعل) جنم ساکھی میں لکھا ہے۔ کہ خالصہ جی کے لئے مسلمانوں کا مٹانا فرض و واجب ہے برہمنوں کی لیلا ایک کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ کہ جینیوں نے دید اور ہندوؤں کی جتنی اور کتابیں ہاتھ لگیں سب کو تلف کر دیا۔ آریوں پر حکومت کی اور خوب

ستایا۔ ٹاڈ راجستان میں ہے۔ کہ ۱۰۵۸ء میں جینیوں کو بڑا اقتدار حاصل ہوا۔ تو انہوں نے مفتوحوں پر جزیہ قائم کیا۔ ہندو کو بہت ایذائیں دیں۔ یعنے ان کے شدید ترین دشمن تھے۔ آخر شنکر اچارج نے ان کو غارت کیا۔

سداشیو مرہٹہ دہلی پر حملہ آور ہوا۔ تو دیوان خاص و دیوان عام کی نقرئی چھتیں توڑیں اور سلاطین و اولیائے کرام دہلی کے مزارات سے جس قدر بھی آلات نقرہ دستیاب ہو سکے لوٹ اور سب کے روپے ڈھال کر لے گیا (گلستان ہند، راجہ درگا پرشاد) بدن سنگھ مہاراجہ بھرت پور نے بھی دہلی کو لوٹ کر بے شمار دولت حاصل کی (وقائع راجپوتانہ جولا رسہائے) میلہ کوٹ میں سری وشنو برہمن رہا کرتے تھے۔ یہ مندر زر و جواہر سے لبریز تھا۔ مرہٹوں نے اسے لوٹ لیا۔ اور تمام مندروں اور متبرک مقامات میں آگ لگا دی (سوانح عمری حیدر علی) ناتھ کی خانقاہ۔ بدھوں کا معبد برہمنوں کے ہاتھ سے تین بار لٹا اور منہدم ہوا (تاریخ ہند) چند بری۔ رنتھور۔ اور سارنگ پور کی مسجدوں و خانقاہوں کو رائے سین نے رانا اور میدنی رائے کے حکم سے گوبر سے لیپ کر ناپاک کیا۔ اور ان میں مویشی (ڈنگر ڈھور) باندھے (تاریخ فرشتہ) راجہ دیو رائے نے فیروز شاہ کی سلطنت کا کچھ حصہ فتح کر کے مساجد مسمار کیں۔ اور بہت سے مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا (فرشتہ) راجپوتوں نے قاضیوں کو پکڑ کر انکی ڈاڑھیاں منڈائیں اور قرآن کریم کے نسخوں کو کنوئیں میں پھینکدیا (ٹاڈ راجستان جلد اول) بندہ بیراگی کے متعلق تو کچھ کہنا فضول ہے۔ جہاں پہنچا مسجدیں گرائیں۔ مسلمانوں پر قتل عام کیا۔ سرہند میں قاضیوں اور مولویوں کی ڈاڑھیاں نچوائیں اور امان کے وعدہ پر تمام مسلمان بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دی اور پھر بدعہدی کر کے سب کو قتل کروا کر آگ لگوا دی۔ ماؤں (حاملہ عورتوں کے پیٹ چروا کر بچے نکلوا دیئے بڑے بڑے پیروں بزرگوں مثلاً پیر بہاؤالحق۔ پیر قطب الدین رحمہما اللہ کی قبریں کھدوا کر انکی ہڈیاں نکلوا کر جلا دیں (شمشیر خالصہ حصہ دوم مصنفہ گیان سنگھ) ہنٹر صاحب

کی تحقیق کے مطابق راجپوت اکثر مساجد کو مسمار کرتے رہتے تھے۔

الغرض فرمانروا ہر ملک و ہر قوم میں لڑتے بھڑتے رہے ہیں۔ اور انکی لڑائیاں اکثر ذاتی مفاد کیلئے ہوتی تھیں بعض ہمقوم بادشاہ بلکہ حقیقی بھائی بھائی بھی لڑے۔ لیکن ہمیں دکھانا یہ ہے کہ غیر اقوام (جو امن و آشتی کا دعوے کرتی اور اسلام پہ تیغ زنی کا الزام دیتی تھیں) ۹۹ ننانوے فیصدی مذہب معابد پہ حملے کئے۔ اور مسلمانوں نے ۹۹ ننانوے فیصد اپنی ہی مذاہب و معابد کا احترام کیا۔ کیونکہ دوسرے مذاہب والوں سے اسلامی حکم کے ماتحت ایک مسلمان حکمران کو سختی و تشدد مذہباً حرام ہے اور دیگر مذاہب میں یہی کار ثواب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دیگر مذاہب کے پیشواؤں اور فرمانرواؤں نے بالعموم دوسرے مذاہب کے معابد کو تباہ کرنے اور انکو ہر قسم کی گزند پہنچانے میں کوئی باک نہیں کیا۔ مگر مسلمانوں کے برگزیدہ رسول اور رحمدل راہنما صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے غلاموں نے کبھی غیر مذاہب والوں کو محض مذہبی مخالفت کی بنا پہ نہ ستایا اور نہ حملہ کیا۔ نہ انکے منادر و معابد کو گرایا اور نہ ہاتھ لگایا۔ قبل اس کے کہ ہم اسلامی پیشوا اور مسلم فاتحوں کی رواداری پہ تاریخی حوالہ جات پیش کریں۔ یہ ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمان فاتحین کو جن پاکیزہ اصولوں نے ایسے ناروا مظالم کرنے سے باز رکھا۔ وہ کیا تھے۔ چونکہ مسلمان کی زندگی۔ موت۔ کھانا پینا۔ ماتحتی اور حکمرانی حب وطن اور غریب الوطنی سب کچھ خدا کے لئے ہوتا ہے اپنی ذات کے لئے نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ ہر حال میں حکم الٰہی کو مقدم رکھتا رہا ہے۔ اور اسی کے حکم کے ماتحت اس نے حکومت بھی کی ہے۔ فاتحین کے قصے ذکر کرنے سے ممکن ہے ہمارے معترضین حضرات جانبداری پہ محمول کریں۔ بہتر یہ ہے کہ اس مذہب کے جنگی قوانین ہی کا مطالعہ فرمالیں جسکی وجہ سے اور جس پہ وہ تلوار کے ذریعے ترقی کا الزام دیتے ہیں۔ پھر اگر ضرورت ہوئی تو فاتحین کے قصے بھی برائے درس پیش کر دیئے جائیں گے۔ قرآن کریم کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ اپنے آپ پر وارد شدہ اعتراضات کا جواب خود دیتا ہے۔ اس کو اعانت۔ جانبداری۔ اور پردہ پوشی کی ضرورت نہیں۔

اسلام کے جنگی قوانین

تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو ایک حق بیں اور غیر جانبدار نگاہ خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ کہ دنیا جس قدر جہالت سے دور بھاگتی ہے۔ اسی قدر اسلام کے قریب آتی جاتی ہے کیونکہ اسلام دین فطرت ہے۔ اور اس کا یہ خاصہ ہے۔ کہ جب لوگ ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں اور باطل پرستی کے فریب سے نکل کر حقیقت کی تلاش میں ادھر ادھر مارے پھرتے ہیں تو وہ ان کے لئے رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اس کے نورانی چہرے کی جھلک انکی راہنمائی کرتی ہے کفر کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ تعصب کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ راستے کی مشکلات سامنے سے ہٹ جاتی ہیں۔ اور انکو اسلام کے دامن میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اس دعویٰ کی دلیل پہلی آیت جہاد ہے جو اوپر ابتدائے مضمون میں درج کیگئی ہے۔ جسکے معنے یہ ہیں کہ اگر نہ ہوتا دفع کرنا اللہ کا آدمیوں کو ایک کا دوسرے سے تو ضرور گرائی جاتیں عیسائی درویشوں کی خانقاہیں اور گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے۔ اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی جہاد کا منشاء تیغ زنی جفا کاری۔ غارتگری یا ہوس ملک گیری کے ماتحت قتل و نہب نہ تھا۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسجدوں گرجوں یہودیوں کے معبدوں زاہدوں اور عابدوں کی خانقاہوں اور کمزور انسانوں کو حفاظت میں لیکر ایک ایسا امن قائم کیا جائے جسکی وجہ سے جملہ مذاہب کامل آزادی سے دنیا میں رہ سکیں۔ وہ کفار کو جبراً مسلمان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ اپنے غلاموں اور پیروؤں کو جو بغیر کسی جرم و قصور کے ناحق ستائے جاتے تھے۔ اغیار کے دشنہ سے بے تلوار کے سائے میں محفوظ رکھنے کا متمنی تھا اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اہل اسلام نے تلوار اٹھانے میں ابتدا نہیں کی بلکہ اینٹ کا جواب پتھر اس وقت دیا۔ اور تلوار انکو متحرک کیا جب ان کے خلاف پہلے ہتھیار اٹھائے گئے۔ چونکہ مسلمانوں کی تعداد اتنی کافی نہ تھی۔ کہ وہ دشمن کی منظم اور متفقہ افواج کا مقابلہ کر سکتی۔ اسلئے اللہ کریم

نے خود بھی ادا دینے کا وعدہ فرمایا۔ یہ آیت اس بات کی بھی پوری تردید کرتی ہے
کہ اسلام نے اس لئے مسلمانوں کو تلوار نہیں اٹھوائی کہ اس کے ذریعے سے اسلام کی اشاعت
کیجائے اور لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے بلکہ سب سے پہلی آیت جو جہاد کے حکم میں
آئی جس میں مسلمانوں کو لڑنے کی پہلے پہل اجازت دی گئی۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ ہر
مذہب کے متبعین کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ کھلے بندوں اپنے خدا کی عبادت کریں جس
طرح چاہیں اور انکی عبادت گاہوں کی عزت کیجائے پھر اس حکم کے ہوتے ہوئے اور مسلمانوں
کے اس پر عمل پیرا رہتے ہوئے یہ خیال کرنا کہ دوسرے مذاہب والوں کو جبراً مسلمان کرنے کا
ارشاد تھا۔ کہاں تک صداقت پر مبنی اور معقولیت کی دلیل ہو سکتا ہے۔

دشمن چونکہ اسلام کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتے تھے اس لئے اس کے دفعیہ کی سعی لازمی
امر تھا۔ اور اگر انکو اس ارادے سے روکنے کی کوشش نہ کیجاتی تو مسلمانوں کی یہ چھوٹی
سی جماعت دنیا سے بالکل نابود ہو جاتی چنانچہ قرآن کریم اس کی شہادت دیتا ہے
ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا (سورہ بقر رکوع ۲۷)
ترجمہ۔ اور تم سے ہمیشہ وہ لڑتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ تمکو کافر بنائیں اگر وہ طاقت پا سکیں
اس آیت سے معاندین و حاسدین کے پروگرام اور برے ارادوں کی قلعی کھل گئی اور
ساتھ ہی معلوم ہو گیا ہے کہ اسلام کو تلوار ہاتھ میں لینے کی ضرورت کیوں پڑی نیز مسلمان
پر طعن آخر اسی کتاب کی بنا پر یا بانئے اسلام (فداہ امی و ابی) کے عمل کی وجہ سے
ہی ہو سکتا ہے۔ کتاب کے الفاظ تو سامنے ہیں اور دستور العمل بانئے اسلام علیہ السلام
یہ ہے کہ آپ یتیم ہیں بے یار و مددگار اور بیکس ہیں کوئی پارٹی نبرد آزما۔ کوئی جماعت
جنگجو۔ کوئی گروہ کوہ شکن ساتھ نہیں رکھتے جن پر بھروسہ ہو سکتا تھا۔ قومی۔ ملکی۔ عزیز و
اقارب برادری۔ اپنے پرائے سب دشمن ہیں۔ اور الگ تھلگ۔ ایسی حالت میں اسلام کا
ظہور اس یتیمی کی گود میں ہوتا ہے اور اسکو قبول کرنیوالی ایک مختصر سی جماعت بعد کو
پیدا ہوتی ہے جو تلوار اٹھانا تو درکنار خود ان مظالم کا تختہ مشق نظر آتی ہے جن سے
انسانیت کو بھی عار ہے۔ پھر یہ جماعت معاندین سے اگر کبھی اپنے مظالم سے

دفعیہ کیلئے ہاتھ اٹھاتی ہے تو گردن زدنی ٹھیرتی ہے اور جو قوم لا الہ الا اللہ کی پرامن اور پرسکوت سچی آواز پر تلواریں سونت لیتی ہے وہ معترض کی نگاہ میں نہایت پاکیزہ شرافت کا مجسمہ، مظلوم، حق بجانب اور معصوم ہے۔ سبحان اللہ ان انصاف پسند دل اور حق پرستوں کی کیا شان ہے۔ شعر

رنگی کو نارنگی کہیں اور بنے دودھ کو کھویا ۔ چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا

عقل کے دشمن اتنا نہیں سمجھ سکتے۔ کہ اگر اسلام کو تلوار کے ذریعے تبلیغ کرنا مقصود ہوتا۔ تو وہ ایک یتیم کی ڈیوڑھی نہ تلاش کرتا۔ بلکہ کسی سلطنت کی گود میں پرورش پاتا جہاں اس کو مصائب اٹھانے سے قبل ہی تلوار کی فضا سازگار ملتی اور اس طرح اپنی تمنا پوری کرتا۔ کہ چودہ سو سال تک نے معنے منہ کھولتے۔ اے معترضین کا تخم بھی نہ چھوڑتا کیا یہ اسکی رافت و رحمت کا ہی نتیجہ نہیں۔ کہ وہ انکو اپنے سائے میں نہایت آشتی و امن کی زندگی گذارنے کو ملا تاہے۔ اور بداندیش اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے۔ کہ ہر انسان اپنی فطرت پر متحرک ہوتا ہے کسی دریا کے کنارے کوئی مرد خدا اللہ اللہ کر رہا تھا۔ کہ اس نے ایک بچھو کو پانی میں بہتے ہوئے دیکھا۔ دل میں رحم آیا اور اس کو پانی سے بچا کر باہر نکال دیا۔ جونہی کہ اُس نے بچھو کو زمین پر رکھا۔ اسنے زہر آلود ڈنک مار دیا۔ اور پھر دریا کے پانی میں چلا گیا۔ اور اپنے آپکو ہلاکت میں ڈالدیا۔ مرد خدا کو پھر ترس آیا۔ اور سوچا کہ بےعقل ہے مر جائیگا۔ اس نے پھر اس کو نکالا جونہی کہ ہاتھ سے رکھنے لگا اس نے پھر ڈس دیا۔ اس مرد خدا نے اس سے کہا کہ میں نے تیری جان بچانے کی کوشش کی اور تو نے مجھے ڈسنے سے دریغ نہیں کیا یہ کیا بات ہے۔ بچھو نے جواب دیا کہ اے رحمدل انسان یہ کوئی بڑی غور طلب بات نہیں تو نے جو کچھ کیا وہ تیری فطرت ہے اور میں نے جو کچھ کیا یہ میری فطرت ہے۔ لہذا مجھے چھوڑ دے۔ بعینہ یہی حال اسلام کی ہمدردی و دادرسی کا اور ان معترضین کا ہے جنکو وہ ہلاکت سے بچانا چاہتا ہے۔ اور وہ ڈنگ مارتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے کہنے سے اگر اسلام کی صداقت، رحمت، رافت اور نوع انسان کیلئے مابہ الامتیاز حفاظت پر ایمان لانا اپنے

مذہب کو سلامتی کے مترادف ہے۔ تو آؤ غیر مسلم انصاف پسند محققین کی آواز کو سنو وہ کیا کہتے ہیں۔
اسلام کی فراخدلی اور رواداری کے متعلق پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں۔ کہ اگر خلفائے اسلام دل میں ٹھان لیتے تو اپنی قلمرو سے مسیحی دنیا کو اسطرح ملیامیٹ کر دیتے، جیسے بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازبلہ نے اسلام کو ہسپانیہ سے نکالا تھا یا لوئی چہاردہم بادشاہ فرانس نے پروٹسٹنٹ مذہب کو اپنے ملک میں جرم قرار دے دیا تھا۔ یا جس طرح سلطنت انگلستان نے پینتیس ۳۵ برس تک یہودیوں کو اپنے ملک میں داخل نہ ہونے دیا تھا۔ مشرقی کلیسا جتنے بھی ایشیاء میں تھے ان کا تعلق باقی مسیحی دنیا سے بالکل منقطع ہو گیا تھا۔ اور ان میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو انکی طرف انگلی بھی اٹھا سکتا کیونکہ مشرقی کلیساؤں کو اصل دین سے منحرف سمجھا جاتا تھا۔ پس ان کا آجتک مشرقی ممالک میں زندہ رہنا اسلامی حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بین ثبوت ہے، اور کسی کو زبردستی مسلمان کرنا کسی قسم کے ظلم وستم روا رکھنا عربی فتوحات میں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ اسلامی ممالک میں بجز ایسے جرائم کے جو شریعت اسلامیہ کے خلاف سرزد ہوں عیسائیوں کے کل مقدمات ان ہی کے ججوں کے سامنے اور ان ہی کے قانون کے مطابق فیصلہ پاتے تھے۔ مذہبی پیروی میں عیسائیوں کا کوئی مزاحم نہ تھا۔ وہ دینی رسوم آزادی کے ساتھ ادا کرتے تھے، باجوں میں مسیحی گیت گایا جاتا تھا۔ اور مسیحی واعظ لوگوں کو وعظ سناتے تھے۔ اور گرجاؤں کے سب تہوار حسب معمول منائے جاتے تھے۔ (آرنلڈ صفحہ ۱۳۵) پھر مسٹر راجنس لکھتے ہیں کہ اہل اسلام کی مظفر و منصور فوجوں نے جدھر کا بھی رخ کیا قرآنی تعلیمات انکے ساتھ ساتھ گئیں۔ انہوں نے کہیں بھی جور و ظلم نہیں کیا، اور نہ کسی کو اس بنا پر قتل کیا کہ وہ اسلام کے قبول کرنے سے منکر تھے۔ مسٹر جان ڈیون پورٹ مسٹر ایچ، ڈی سینٹ بلیئر، موسیو لیبان پروفیسر آرنلڈ، لالہ لاجپت رائے۔ اور مسٹر ٹی۔ ایل وسوانی سب اسکو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اسلام کی اشاعت ہرگز بزور شمشیر نہیں ہوئی۔ اور سلطان محمود غزنوی، اورنگ زیب اور سلطان ٹیپو رحمہم اللہ کے خلاف جس قدر مناور شکنی اور ہندو آزاری کے الزامات لگائے جاتے ہیں بے بنیاد ہیں (واقعات ہند تلسی رام) مسٹر میل کہتے ہیں کہ وہ لوگ نہایت دھوکہ کھاتے ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے، حالانکہ اسلام تو ان لوگوں نے بھی قبول کیا ہے۔ جن پر مسلمانوں نے کبھی بھی فوج کشی نہیں کی۔

ابھی کل کی بات ہے کہ چوہدری چھوٹو رام وزیر پنجاب نے اپنی تقریر کے دوران میں بیان کیا تھا کہ جو لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ اسلام ہندوستان میں تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ غلط ہے۔ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت مسلمان

صوفیوں اور درویشوں کی مرہون منت ہے۔

آمدم برسر مطلب۔ یہ امر کہ اسلام نے تلوار صرف ظلم کرنے والوں کے مقابلے میں اٹھائی تھی۔ کتاب اللہ کی مندرجہ ذیل دوسری آیات سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ معترضین فراخدلی سے ان کا مطالعہ کر سکیں۔

۱۔ الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانھم وھموا باخراج الرسول وھم بدءوکم اول مرۃ اتخشونھم (سورۃ توبہ رکوع ۲) ترجمہ: کیا تم ایسی قوم سے نہیں لڑتے۔ جنہوں نے اپنے عہد و پیمان کا کچھ پاس نہیں کیا۔ اور اس کو توڑ دیا۔ اور انہوں نے رسول (علیہ السلام) کے نکالنے کا ارادہ کیا۔ اور انہوں نے ہی اس فتنے میں ابتداء کی کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ اس آیت سے بھی تین امور پر اطلاع ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ کسی قوم کا لڑائی کے لئے ابتداء کرنا موجب لڑائی ہے۔ دوم کسی قوم کا معاہدہ کر کے توڑنا اور عہد کے بعد جنگ کی شرارتوں کو خفیہ طور پر جاری رکھنا بھی کسی معہود الیہ قوم کو جنگ پر آمادہ کرتا ہے۔ سوئم پُر امن دعوت و تبلیغ کے مقابلہ میں اللہ کے رسول علیہ السلام کو گھر اور وطن سے نکالنے کے لئے ارادہ کرنا اور فساد و قتل پر آمادہ ہونا امن پسند قوم کو دعوت مجادلہ ہے۔ کیا قرآن کریم بلا وجہ لڑائی کے لئے اجازت دے رہا ہے یا مفسدہ پرداز اقوام کے افعال و اعمال کے بدلے میں اہل اسلام کو ذلت سے بچنے کا علاج جنگ بتا رہا ہے۔

۲۔ ومالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنک ولیا واجعل لنا من لدنک نصیرا (سورۃ نساء رکوع ۱۰)

ترجمہ: اور تمہیں کیا ہے۔ کہ تم اللہ کی راہ میں نہیں لڑتے ہو۔ اور ضعیف مرد اور عورتیں اور بچے جو ہر وقت یہ دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ کہ اے رب ہمارے ہم کو اس گاؤں سے نکال دے جن کے رہنے والے ظالم ہیں۔ اور ہمارے لئے تو اپنی بارگاہ سے ہمارا مددگار بھیج۔ اس آیت سے بھی یہ ثابت ہوا۔ کہ مسلمان اپنے جانی دشمن سے بھی جنگ کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اور نہ چاہتے تھے کہ خونی دشمنوں سے لڑا جائے۔ کیونکہ خونریزی و بدامنی

کے علاوہ وہ تعداد و قوت میں بھی مسلمانوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور اگر خدا کا حکم اور متواتر مدد کا وعدہ نہ ہوتا، تو مسلمان اپنے ایسے قوی دشمنوں سے لڑنے کا ارادہ اور مخاصمت کی جرأت نہ کرتے، اس مقابلہ پر نکلنا ضعیفوں اور مظلوموں کی مدد کے لئے اور خداوند عالم کی مدد کے وعدے پر تھا۔ شوق ملک گیری یا ذوق قتل و جدل کے لئے نہ تھا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے، کہ ان دشمنوں سے جنگ کی اجازت دی گئی تھی۔ جو ان سے جنگ کریں نہ ہر کافر کے ساتھ جنگ کی اجازت تھی۔ اور نہ محض کفر کی وجہ سے ہر کافر ان کا مدِ مقابل فرمایا گیا تھا۔ ایسے کفّار جو جنگ کی چھیڑ چھاڑ سے اپنے آپ کو الگ رکھتے، ان سے صرف لڑنا ہی منع نہ تھا۔ بلکہ اُن سے دوستانہ تعلقات بھی رکھنے کی اجازت تھی۔ اور ان سے اچھے برتاؤ و عمدہ سلوک کا حکم تھا۔ اور جو کافر مسلمانوں سے برسرپیکار بھی تھے ان سے بھی حد سے زیادہ گزرنا اور آگے بڑھنا جائز نہیں رکھا گیا تھا، اور اگر وہ لڑائی سے باز آجائیں تو پھر اُن سے بھی لڑنے کی اجازت رہتی، لڑائی صرف اسی وقت جاری رکھنے کا حکم تھا جب تک دوسری جماعت ان سے لڑتی رہے، اور اگر دوسرا فریق لڑائی سے دست کش ہو جاتا تو اسلامیوں کو بھی فوراً لڑائی بند کر دینے کا ارشاد تھا۔ بلکہ اثنائے جنگ میں بھی مسلمانوں کو انصاف ہاتھ سے چھوڑنے کی اجازت نہیں دی گئی، مثلاً حکم ہوتا ہے:۔

۴۔ قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا۔ ان اللہ لایحب المعتدین۔ ترجمہ: لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں۔ اور حد سے آگے مت گذرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو حد سے تجاوز کرنے والے پسند نہیں ہیں۔ یہ آیت اُن لوگوں سے لڑائی کی اجازت فرماتی ہے جو لڑائی میں مسلمانوں سے پہل کرتے ہیں۔ اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ تم ان کی بیہودگی و بے راہروی سے تنگ آکر زیادتی نہ کر بیٹھنا، یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، اس لئے کہ وہ تو خود پسند، حیلہ جو اور حاسد ہیں، ایک خدا کی مرضی کے متبع اور اسی کے حکم پر چلنے والی اور انصاف پسند قوم کو ان کے عادات نہیں لینے چاہئیں، ایک خود سر اور مصلح قوم میں یہ امتیاز رہنا چاہئے

دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے۔

۴۔ فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین۔ ترجمہ:۔ پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی ان پر زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی ہے، اور اللہ سے ڈرو۔ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ جس قوم کو میدان جنگ میں بھی انصاف پر قائم رہنے کا حکم ہو، جو مشتعل جذبات کے ماتحت انصاف قائم کرسکنے کا مقام نہیں اور ساتھ ہی انصاف کو چھوڑنے پر رب العزت کے خوف کو مدنظر رکھنے کا حکم بھی ہو اس قوم پر یہ الزام کہ وہ ذاتی اغراض لیکر اور ہوسِ سلطنت کو مذہب کی آڑ دے کر تلوار سونتے ہوئے میدان میں آئی۔ تاکہ اپنے مذہب کو دنیا پر پھیلا دے اور غلبہ حاصل کرے، کس قدر بعید از عقل و ہوش بات ہے، کون سی قوم ہے، جس نے دشمنوں پر ناپ تول کر اتنا ہی ہاتھ اٹھایا ہو جتنا دشمن اٹھائے، اور زیادتی پر خدا کے ہاں پکڑے جانے کا خوف بھی رکھتی ہو، کاش کہ معترض اسلام کی تعلیم کو پاکیزہ نگاہ سے مطالعہ کرے، اور اپنے آپ کو خداوند عالم جل مجدہٗ کی منشاء پر زندگی گذارنے کا اہل بنا لے۔

۵۔ فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم، فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا۔ ترجمہ:۔ اگر وہ تم سے کنارہ کشی کریں اور تم سے لڑائی نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کا پیغام بھیج دیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر کوئی راہ نہیں رکھی یعنے اس کے بعد تمہارے لئے یہ جائز نہیں، کہ تم ان سے لڑو۔ غور کا مقام ہے۔ کہ زیادتی نہ کرو، زیادتی کے برابر زیادتی کرو، اور اگر دشمن لڑائی سے کنارہ کر جائے اور صلح پر آمادگی ظاہر کرے، تو تم بھی کنارہ کشی کرو، اور فوراً صلح پر آمادہ ہو جاؤ۔ اس کے علاوہ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے تم کو اجازت نہیں دی جاتی۔ اللہ اکبر کس قدر صلح جو، محافظ انسانیت، قاطع جنگ، امن پسند، احکام ہیں، جن سے خواہ مخواہ کی لڑائی اور حرص و آز کی جنگ کا کوئی پہلو ہی مترشح نہیں ہوتا۔ فافہم۔

۶۔ فان لم یعتزلوکم ویلقوا الیکم السلم۔ ویکفوا ایدیھم

فخذوھم واقتلوھم حیث ثقفتموھم واولئك جعلنا لكم علیھم سلطانًا مبینًا۔ ترجمہ:۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں اور تمہیں صلح کا پیغام نہ دیں، اور تم سے اپنے ہاتھوں کو بند نہ کریں، تو ان کو پکڑو، اور ان سے لڑائی کرو جہاں تم ان کو پاؤ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ لڑنے کا تم کو حق پہنچتا ہے۔ اس آیت میں بھی صلح کا جواب صلح اور لڑائی کا جواب لڑائی فرمایا گیا ہے۔ جو بالکل غیر موزون نہیں ہے۔

۷۔ قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف۔ ترجمہ اے میرے محبوب کافروں کو اعلان کر دیجئے کہ اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز آ جائیں تو ان کے گذشتہ ظلموں اور زیادتیوں کو معاف کر دیا جائے گا۔ یہ آیت کس قدر لڑائی کے مٹانے اور امن قائم کرنے پر دلالت فرماتی ہے۔ ورنہ قابو پانے پر اسلام کو اور مغلوب ہونے پر ان کو حق پہنچتا تھا۔ کہ بجائے معاف کئے جانے کے ان کو قرار واقعی سزائیں دی جائیں، مگر اسلام کی فراخدلی اور رحیمانہ فطرت نے یہ بھی جائز نہیں رکھا کہ غلطی والے کو ضرور ہی سزا دی جائے، بلکہ معاف فرما دینے کی حیثیت بھی سمجھا دی ہے۔ جو نہایت وسیع ظرفی اور عالی حوصلگی کی دلیل ہے۔

-۸۔ وان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ انہ ھو السمیع العلیم وان یریدوا ان یخدعوك فان حسبك اللہ۔ ترجمہ:۔ اور اگر صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی صلح کے لئے جھک جا۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تجھ کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تجھ کو کافی ہوگا۔ اس آیت میں یہ حکم دیا کہ کافروں سے صلح کرلیں، جب کبھی وہ صلح کی درخواست کریں، رہا یہ خیال کہ دشمن شاید دھوکہ سے صلح کر رہا ہو اور جب کبھی موقعہ پائے گا۔ پھر مخالفت پر آمادہ ہو جائے گا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صلح کرنے سے مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ صلح کے لئے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی اس قدر مستعدی صاف بتا رہی ہے، کہ آپ کیسے امن پسند اور صلح جو پیامبر تھے۔ آپ کی طرف سے

ہر دشمن کے ساتھ جو تلطف وکرم نوازی اور فیاضی ظہور پذیر ہوتی رہی وہ دشمنوں کی جانب سے کبھی ظاہر نہیں ہوئی، اور پوری پوری تاریخ اسلام میں اس کی ایک مثال بھی نہیں ملتی اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے آخری حصہ میں دشمنوں کی دھوکہ دہی اور دغا بازی کا اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے، کہ ان کی طرف سے جو دھوکہ دہی کا خیال ہے۔ اس کا نمٹنا اور بدلہ خدا پر چھوڑ دیجئے۔ دشمنوں کی ہر ایسی فریب دہی کا وہ بہتر منتقم و حکیم ہے۔

الغرض اس قسم کی اور بھی آیات ہیں، جن میں سے اسلام کا جنگی پہلو اور کافروں کی حاسدانہ چالیں واضح ہو جاتی ہیں لیکن پھر بھی اسلام کی تعلیم یہی ثابت ہوتی ہے کہ کسی قوم کی دشمنی سے مسلمانو یہ رغبت نہ کرو، کہ انصاف کو چھوڑ کر اس کو سزا دینے یا قتل پر تل جاؤ۔ وہ جو کریں کریں، تم ہر حال میں نرمی۔ انصاف اور عفو کو مدنظر رکھو۔ اور عمدہ تدابیر واحسن طریقوں سے برائی کو دور کر دو یہاں تک کہ وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان عداوت ہے لگا اور گہرا دوست بن جائے، اور یہی وجہ تھی۔ کہ حضور علیہ السلام ہمیشہ اپنے مخالفوں کی گذشتہ بیرحمیوں اور ظلموں کو معاف کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ معلوم ہو گیا۔ کہ مسلمانوں کی لڑائیاں دشمنوں کی تلوار کو روکنے کے لئے تھیں، نہ جبراً مسلمان بنانے کے لئے اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، کہ اگر اسلام اس کی بھی اجازت نہ دیتا تو وہ مخالفین اسلام اور مسلمانوں کے تمام تک کو صفحۂ دنیا سے مٹا دیتے۔

یہاں یہ امر بھی یاد داشت کے قابل ہے کہ مسلمانوں کو جو فتوحات نصیب ہوئیں وہ مسلمانوں کی طاقت کی وجہ سے نہ تھیں، بلکہ وہ بتائید ایزدی تھیں، جن کا ابتداد ہی میں ان سے وعدہ ہو چکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جہاں وہ فاتحانہ صورت میں داخل ہوئے ان کی حرکات وسکنات اللہ کی مشیت کے ماتحت ہوا کرتی تھیں۔ ان کے جلو میں وہ شوخی، وہ غارت گری، وہ قتل ونہب، وہ خود پسندی، وہ طمطراق، وہ دبدبہ، وہ جلال نہ ہوتا تھا، جو ایک دنیا کے دلدادہ بادشاہ اور ملک گیری کے شیدائی ایک حکمران کا ہو سکتا ہے۔

فاتح اور پیغمبر کا امتیاز

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک فاتح بادشاہ، اور ایک فاتح نبی کا کچھ فرق بیان کر دیا جائے، جو معترض کی آنکھ کو حقیقت کا نور پانے میں مدد دے سکے۔ کیونکہ جہاد اسلامی کی حقیقت جن مقاصد پر مشتمل ہے اُن کے لحاظ سے وہ دُنیوی لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے، اور یہ اختلاف اس قدر بدیہی ہے۔ کہ ہم کو اس کی ظاہری شکل کے ایک ایک خط و خال کے اندر نمایاں طور پر نظر آسکتا ہے۔

ایک فاتح جب ملک گیری کے ارادے سے میدان جنگ کا رُخ کرتا ہے تو طبل و دھل کے غلغلے اور قرنا، و برق کے ترانے اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں، سر پر چتر شاہی ہوتا ہے۔ جو سورج کی بھی گرم شعاع کو اس کے قریب آنے کی جراُت نہیں کرنے دیتا اور سامنے پرچم لہراتا ہے، جس کے پاس یہ جاہ و جلال کا مجسمہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور تمام فوج اس مرجع بُت کے گرد طواف کرنے لگتی ہے، عظمت و ہیبت کا یہ منظر دنیا کو دفعتاً مرعوب کر دیتا ہے۔ اور اس رُعب داب کے احساس سے اس دنیادار فاتح کا سَر پُر غرور بادۂ نخوت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اور یہاں تک کہ اس کا یہ نشہ خاک و خون میں مِل کر بھی نہیں اترتا۔

۱۔ لیکن ایک اللہ کے نبی برحق کی حالت اس سے بالکل جداگانہ اور مختلف ہوتی ہے۔ وہ گھر سے جب نکلتا ہے تو باوجود مخلصین کی ایک قربان ہونے والی جماعت ہمراہ ہونے کے وہ اپنا رفیق سفر صرف خدائے واحد ہی کو بناتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بغرض جہاد روانہ ہوتے تھے۔ تو یہ دعا فرماتے۔ اللھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل الاٰخر۔ یعنے اے خدا تو ہی ہمارا رفیق سفر ہے اور تو ہی ہمارے بال بچوں میں ہمارے پیچھے محافظ و قائمقام ہے۔

۲۔ وہ سواری کی پشت پر قدم رکھتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے، کہ وہ خدا بزرگ و برتر ہے، جس نے اس سواری کو ہمارا فرمانبردار بنا دیا ہے۔ ورنہ ہم

اس کی قدرت وطاقت نہ رکھتے تھے ۔

(۳) وہ سفر سے پلٹتا ہے تو خدا کی حمد کا ترانہ سناتا ہے، اور اس کی بندگی کا اظہار فرماتا ہے، کوئی بلندی ایسی نہیں جہاں وہ چڑھتا ہوا خدا وند عالم کی بڑائی نہیں پکارتا، اور کوئی ڈھلان ایسی نہیں جہاں وہ اس کی ترنم ریز تسبیح وتہلیل کے نعرے نہیں مارتا ۔

(۴) وہ فوج کو میدان جنگ میں بھیجتا ہے تو اس کو طاقت کا غرور نہیں سکھاتا اور نہ اس کے جوش قوم کو دوآتشہ کرتا ہے۔ بلکہ اس کے سفر اور تمام نتائج اعمال کو خدا کی سپرد کر کے رخصت کر دیتا ہے ۔

(۵) وہ منزل پر اترتا ہے، تو نہ تو سلاطین کی طرح اس کے لئے خیمے نصب کئے جاتے ہیں، اور نہ فرش شاہانہ سے زمین آراستہ ہوتی ہے۔ وہ خدا کا نام لیکر زمین پر ہی لیٹ جاتا ہے۔ اور اپنی حفاظت کی خدمت ان الفاظ میں زمین ہی کی سپرد فرما دیتا ہے۔ یا ارض ربی و ربک اللہ اعوذ باللہ من شرک و شر ما فیک و من شر ما یدب علیک ۔ یعنی اے زمین میرا اور تیرا خدا ایک ہی ہے، میں تیرے شر سے تیری سطح باطنی کے شر سے اور تجھ پر چلنے والوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں ۔

(۶) وہ سفر جہاد سے پلٹ کر گھر پہنچتا ہے۔ تو سب سے پہلے اس کو خدا کا گھر یاد آتا ہے، اور مسجد میں جاکر دو رکعت نماز نفل ادا کرتا ہے ۔

(۷) جب وہ فتح کی خبر پاتا ہے تو نہ خوشی میں شادیانے بجتے ہیں اور نہ جشن شاہانہ منایا جاتا ہے، بلکہ صرف اپنے خدا کے حضور میں فوراً سجدہ ریز ہوتا ہے اور شکر بجا لاتا ہے ۔

(۸) اگر وہ مشیت ایزدی کے ماتحت کبھی شکست کا منہ دیکھتا ہے، تو وہ فوج کے افراد کو جوش وغیرت نہیں دلاتا، بلکہ اپنے مولا کریم ہی کی غیرت کی ان الفاظ میں سلسلہ جنبانی کرتا ہے۔ اللھم انک ان تشاء لا تعبد فی الارض ۔ یعنی اے

خدا۔ کیا تو چاہتا ہے کہ اب زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو

(۹) وہ اپنی فوج کی قلت اور دشمن کے لشکر کی کثرت کو دیکھتا ہے۔ تو صرف رحمت الٰہی ولنصرت آسمانی ہی سے مدد طلب فرماتا ہے۔ کسی دنیوی طاقت کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا۔

(۱۰) جنگ میں اس کو زخم لگ جائے تو بجائے انتقام لینے کے وہ یہ فرماکر خاموش ہو جاتا ہے۔ ربِّ اغفر لقومی فانهم لا یعلمون ۔ یعنے اے خدا میری قوم کو معاف فرما کیونکہ یہ لوگ مجھ کو نہیں جانتے۔

(۱۱) اگر وہ بحیثیت فاتح مفتوحین پر اپنے آپ کو قابض دیکھتا ہے۔ تو جانی دشمنوں اور غیر مسلموں سے بھی انتقام نہیں لیتا۔ ان کو قتل کا حکم نہیں دیتا بلکہ انہیں آرام کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ پیٹ بھر کر کھلاتا ہے، اور جو ننگے ہوں ان کو کپڑا بھی پہناتا ہے، خاندانوں کی۔ شریفوں کی۔ شریف زادوں کی، عزت داروں کی عزت کو ملحوظ رکھتا ہے، اور بد لگاموں کو معاف فرماکر اور رہائی دے کر یہ ارشاد کرتا ہے۔ کہ جاؤ امن کی زندگی گذارو، اور رحم کرنا مجھ سے سیکھو۔ میں بدلہ نہیں لیا کرتا۔ کیا دنیا کی کوئی حکومت اپنے جانی دشمنوں اور غداروں سے وہ سلوک کر سکتی ہے جو اللہ کے بھیجے ہوئے رحمدل اور کریم النفس نبی علیہ السلام کی ذات نے فرمایا اور اگر اس پر بھی معاندین مطمئن نہیں۔ تو ہم یہاں مختصراً مثالی طور پر وہ چند واقعات تاریخ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں، جن سے پتہ چل جائے، کہ بقول معترض تیغ زن نبی اور تلوار کے دھنی رسول علیہ السلام کی فتوحات کا رنگ کیا تھا، کیونکہ بہترین معیار رواداری اور پرکھ کی کسوٹی آپ ہی کی فتوحات قرار پا سکتی ہیں۔

فاتح رسولؐ کی فتوحات

حضورؐ کی فتوحات عرب اور حدود شام سے لیکر یمن۔ بحرین۔ حضرموت اور عمان تک پھیل گئیں تھیں، اور آپ کی تمام لڑائیاں غیر مسلموں ہی سے نہیں، بلکہ اپنے قومی تشنۂ خون اور جانی دشمنوں سے بھی ہوئیں، اور اس حالت میں ہوئیں جبکہ

مسلمانوں کے جذبات انتقام کی آگ سے بھڑکے ہوئے تھے۔ اور جوان کے مسلّمہ معاند و دشمن تھے۔ مثلاً کفر و اسلام کی پہلی جنگ جنگ بدر ہے۔ جس میں اسلام کو تباہ و برباد کرنے کے لئے قریش پورے زور اور بڑے حوصلے سے اٹھے تھے۔ مگر ان کی تمام اکڑفوں غارت ہو گئی، اور خدا کے برگزیدہ رسول علیہ السلام نے فتح پائی، پھر کیا تھا، دشمنان اسلام بند و سلاسل میں جکڑے ہوئے میدان جنگ سے حضور کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، آپ نے نہ تو ان کے قتل کا حکم دیا اور نہ اُن سے اسلام قبول کروایا، بلکہ فرمایا تو یہ کہ ان کو آرام سے رکھا جائے، پیٹ بھر کر غذا دی جائے۔ اور جو ننگے ہیں ان کو لباس بھی ملے، درانحالیکہ اسلام کا حقیقی دشمن سمجھے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب کے قتل کی رائے بھی دی، مگر آپ نے منظور نہ فرمائی، مکہ میں گھر گھر ماتم بپا تھا، کہ سردار تو جنگ میں مارے گئے، اب جو گرفتار ہیں۔ انکو بھی قتل کر دیا جائے گا، مگر ایسا نہ ہوا بلکہ رحمت للعالمین نبی (علیہ السلام) نے معزور و گردن فراز دشمنوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اب تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو، یہ لوگ سنگدل اور شقی القلب ہونے کے ساتھ ادا شناس رسالت بھی ضرور تھے۔ فوراً مجمع کا مجمع بول اٹھا تو کریم ابن کریم ہے، آج ہمیں آپ سے وہی توقع ہو سکتی ہے، تو حضرت یوسف سے ان کے بھائیوں کو تھی۔ تو حضور فرماتے ہیں۔ لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء یعنے آج کے دن تم پر کوئی سختی اور تنگی نہیں ہے، جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔

یہ وہ جبّار ان قریش تھے، جو مسلمانوں کو جھلستی ہوئی دھوپ میں تپتی ریت پر لٹا کر سینوں پر بھاری پتھر رکھ دیا کرتے تھے، اور جن کی زبانیں حضور علیہ السّلام کے حق میں کبھی گالی اور بکواس کے سوا نہ کھلیں، جن کی کوششیں اسلام کی بیخ کنی کے سوا اور کچھ نہ تھیں، جن کی رعونت کی پیاس خدا کے نبی کے خون کے سوا نہ بجھنے والی تھی۔ جن کی دل لگی اوقات تبلیغ میں حضور کو پتھروں سے

زخمی کرنا تھا۔ جنہوں نے حضور کو زندگی سے مٹانے کے لیے تین برس تک شعب ابو طالب میں بھوکا پیاسا محصور رکھا۔ جنہوں نے بارہا قتل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے پر کاشانۂ نبوت کا محاصرہ کیا۔ جنہوں نے راستے میں کانٹے بچھائے اور گڑھے کھودے۔ جنہوں نے سیلاب بن بن کر مدینہ طیبہ پر حملے کئے۔ جنہوں نے آپ کے چچا حمزہ علیہ السلام کا جگر چبایا اور خون پیا۔ جنہوں نے آپکی معصوم صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا کو نیزہ مار کر ہلاک کر دیا۔ اور جنہوں نے پورے اکیس سال تک حضور پر اور تمام مسلمانوں پر سکھ کی نیند حرام کر دی تھی۔ مگر واہ رے رحمت عالم کی عالی ظرفی و بلند حوصلگی اپنے رحمت ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا اور فرمایا۔ میں تم سب کو بری کرتا ہوں اور بخشتا ہوں۔

(۵) ابو سفیان جس کی زندگی کا ہر لمحہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی اذیت میں گذرتا تھا۔ اور جو دشمنان اسلام کا سرغنہ ہونے کی حیثیت سے ہر برائی میں پیش پیش رہا کرتا تھا۔ ایک وقت آگیا۔ کہ جاسوسی کرنے گیا اور گرفتار ہوا۔ مجرمانہ حیثیت میں دربار نبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ آئین جنگ اس امر کا تقاضہ کرتے ہیں۔ کہ ایسے شریر انسان کا سر قلم کر دیا جائے۔ اور وہ خود بھی سمجھتا ہے۔ کہ آج خیر نہیں، کیونکہ خدا کے نبی کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جس پر آج مخلصی کی توقع کر سکوں۔ مستقبل نہایت تاریک نظر آ رہا ہے۔ چہرہ زرد۔ جسم میں لرزہ۔ رنگ فق۔ بید کی طرح تھر تھر کانپ رہا ہے۔ قدم رکھتا کہیں اور پڑتا کہیں۔ حضور نے اس کی اس دہشت زدگی اور بے بسی کو دیکھ کر فرمایا ابو سفیان گھبراؤ نہیں آگے آؤ۔ نہایت رافت و رحمت کا سلوک فرمایا اور پاس بٹھا لیا۔ اور ارشاد کیا۔ کیا اب بھی یقین ہوا کہ نہیں۔ کہ اللہ ایک ہے۔ اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ سنکر ابو سفیان نے سر جھکا لیا۔ اور نیچی آواز سے عرض کی۔ کہ اگر اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا۔ تو وہ آج میری مدد ضرور کرتا۔ پھر حضور نے فرمایا۔ کیا میری رسالت میں کوئی شک ہے۔ تو کہنے لگا نہیں۔ آپ اللہ کے سچے رسول

ہیں۔ اس وقت حضور نے لشکر اسلام کی شان و عظمت دکھانے کے لئے اس کو ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کر دیا۔ اور اپنے مسلح جانبازوں کا وہ ایک متلاطم سمندر دکھایا جس کی صولت و ہیبت اور جلال و احتشام دیکھ کر ابو سفیان کے ہوش اڑ گئے۔ اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور اسی وقت ابو سفیان کا اپنی قلبی قوت اور رئیسانہ سطوت کے تحت ایمان لاکر لشکر اسلام کے ساتھ ہو جانا اس شان کا حامل ہو گیا۔ کہ فتح مکہ کے وقت اُن دشمنان دین کی پناہ گاہ اسی ابو سفیان کا گھر بنتا ہے، جو فتح مکہ کے دن مرعوب ہو کر قتل سے پناہ لینا چاہتے ہیں۔ یعنے مکہ مکرمہ میں فاتحانہ طور پر داخل ہوتے ہی حضور علیہ السلام نے یہ اعلان عام فرما دیا تھا، کہ جو ہتھیار ڈال دے گا یا دروازہ بند کر لے گا۔ یا ابو سفیان کے گھر میں پناہ گزین ہو جائے گا۔ اس کو امان دی جائے گی۔

سبحان اللہ، ظہور عالم سے لیکر رہتی دنیا تک اس کرم و عفو کی ایک مثال بھی زمانہ نہ پیش کر سکا ہے اور نہ کر سکے گا۔ کہ ایسے اشقیاء اور جان کے لاگوؤں کے ساتھ اس قسم کی مکرمت و عفو اور اس نوع کی فتحمندانہ نوازش کی گئی ہو یا کی جا سکے۔ یہ تھا فاتح اعظم کی فتح کا مظاہرہ جس کو ایک حاسد آنکھ آج تک اسلام کی تلوار کی چمک سے چندھیا کر لے رہی۔ قتل و نہب اور غارتگری کے الزام سے ملوث کرنا چاہتی ہے۔ موسیو لیبان نے کیا سچی اور مزے کی خدا لگتی بات کہی ہے، کہ دنیا کو مسلمانوں جیسے رحمدل فاتح کبھی نصیب ہی نہیں ہوئے۔ شعر

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معترض کی آنکھ کا دوسرا کانٹا بھی نکالنے کیلئے ان لوگوں کے بھی چند نمونے پیش کر دیئے جائیں۔ جو بقول اس کے اسلام کی تلوار سے مرعوب ہو کر اور آبائی دین ترک کر کے اسلام کی آغوش میں آئے تھے، اور ان کو اسلام سے کیا محبت و عشق اور دلپذیری و دلچسپی تھی، جس سے معترض کے بے معنی قول کے مطابق متنفر اور کینہ رکھنے کے باوجود بھی اس سے منہ نہ موڑ سکے۔ اور وطن کی دوری، احباب و اقارب کی مہجوری، تنگدستی و لاچاری، قوم و ملک کی عداوت بھی ان کے اسلامی

استقلال و ثبات کے قدموں کو جنبش نہ دے سکی ۔

اسلام کی مفتوح جمعیت

یہ عنوان قائم کرنے کی ضرورت اس لئے پیدا ہوئی ہے۔ کہ بزورِ شمشیر اسلام کی اشاعت کے طعن کا ہم وہ نتیجہ پیش کر سکیں ۔ جو معترض کی اندرونی جلن اور بیرونی سوزش کو ٹھنڈا کر دے ۔ اور جس سے یہ واضح ہو جائے ۔ کہ وہ سب لوگ جن سے بزورِ شمشیر کلمہ پڑھوایا گیا، ان کا انجام کار کیا ہونا چاہیئے تھا، اور وہ کب تک مسلمان رہ سکتے تھے، ایک بہت کم فہم، بے علم و بے سمجھ انسان بھی اس سوال کا جواب دے سکتا ہے ۔ اور اس حقیقت پر زبان کھول سکتا ہے ۔ کہ جبر و تشدّد سے ہمیشہ نفرت بڑھتی ہے اور نفرت سے عداوت کی آگ بھڑکتی ہے ۔ لہذا جو لوگ جبر و اکراہ سے ایمان لائے حقیقتاً ان کو اسلام کیلئے مارِ آستین بننا اور موقعہ ملنے پر اسلام جیسی ٹھونسی گئی چیز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیئے تھا، مگر یہ نہیں ہوا ۔ اور جس شخص نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے ۔ اس پر بخوبی روشن ہے کہ وہ لوگ اسلام کے لئے مارِ آستین نہیں بنے بلکہ وہ اسلام کی مار میں لذّت حاصل کر کے یہی لکارنے والے عاشق زار ثابت ہوئے ۔ شعر

ادیم طائفی نعلین پا کُن ۔۔۔ شراک رشتہ محانہائے ما کن

(ا) ۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایک برگزیدہ و با اثر رئیس اور نامور تاجر تھے ۔ ہزاروں لوگوں سے لین دین رکھنے اور سینکڑوں ان کے مقروض تھے ۔ باوجود اس عزت و توقیر کے اسلام لا کر ان دشواریوں میں مبتلا ہوئے۔ کہ زود کوب ہوتا ہے لوگ نیم مردہ کر کے چلے جاتے ہیں ۔ وطن عزیز سے ہجرت کرنا پڑتی ہے ۔ بال بچوں کو نہایت المناک حالات میں چھوڑتے ہیں ۔ مگر یہ نہیں ہو سکا ۔ کہ اسلام چھوڑ دیں ۔

(ب) حضرت عمار ۔ اُن کے والد یاسر اور اُن کی والدہ سمیّہ ۔ رضوان اللہ علیہم تینوں اسلام لاتے ہیں، ابوجہل مردود نے بی بی سمیّہ کو رانوں میں نیزہ مار کر ہلاک کر دیا حضرت یاسر کو سنگ باری اور نیزے کی نوکیں مار مار کر شہید کیا گیا ۔ حضرت عمار اپنے والدین کے ساتھ ہر رنج و الم میں شریک رہے ۔ مگر سب صعوبتیں برداشت کر کے دکھا دیا

کہ اسلام کی جدائی گوارا نہیں ۔

(ج) حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی گردن میں رسی باندھ کر شریر لونڈوں کی سپرد کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر اسلام کو خیر باد کہہ دیں، لڑکے ان کو ہیں گلی کوچوں میں گھسیٹتے ہیں، تو کہیں تپتی ریت پر لٹا دیتے ہیں، مگر یہ عاشق رسول انام ہے۔ کہ اپنی انتہائی ذلت منظور ہے۔ مگر دین حقہ کی اتنی بھی منظور نہیں کہ بلال انکار کر کے اس پر کذب کی توہین کا موجب بنے ۔

(د) حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو جنگ میں ۵۷ زخم لگتے ہیں اور بیہوش ہو کر گر جاتے ہیں، سیدنا ابو بکر ان کے منہ میں پانی ڈالتے ہیں تو ہوش آ جاتا ہے، ہوش آنے پر سب سے پہلا سوال جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کرتے ہیں۔ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں۔ صدیق اکبر فرماتے ہیں، کہ حضور ہی نے مجھ کو آپکی خبر کو بھیجا ہے، حضور بعافیت ہیں، طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ اگر حضور بخیریت ہیں تو مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں ۔

(ہ) سعد بن ربیع مخلصان بارگاہ سے تھے، ایک جنگ میں زخموں سے چور پائے گئے، ایک صحابی نے پوچھا کیا حال ہے ۔ فرماتے ہیں، میری وصیت سن لو۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میرا اسلام پیش کر کے یہ عرض کرنا۔ کہ مولا کریم آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، آپ کی مہربانیوں اور عطاؤں سے ہم کو کیا کیا درجات رفیعہ و مدارج شفیعہ حاصل ہوئے ہیں، گویا جان توڑ رہے ہیں مگر حضور کے شکر گزار ہیں ۔

(و) حضرت عمر بن معاذ رضی اللہ عنہ جنگ اُحد میں شہادت پا جاتے ہیں۔ جنگ سے واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی والدہ ماجدہ سے چند کلمات تعزیت فرمائے۔ تو وہ سننے کے بعد بڑے اطمینان سے عرض کرتی ہیں، کہ اگر اللہ کے رسول (آپ) نے بسلامت مراجعت فرمائی ہے ۔ تو میں سب کچھ حضور پہ قربان کر سکتی ہوں ۔

(ز) اسی جنگ میں ایک اور انصاری عورت کے باپ، بھائی، بیٹا اور شوہر شہید ہو گئے۔ چار کوس پر شہر تھا اس کو بھی خبر جا پہنچی، اسلامی فوج کی واپسی پر شام کو سرِراہ آکھڑی ہوئی۔ پوچھا کیا اللہ تعالیٰ کے نبی تو بخیریت واپس تشریف لائے ہیں؟ لوگوں نے کہا ہاں، تو کہنے لگی۔ اگر حضور زندہ ہیں، تو مجھے کسی عزیز کی موت کا غم نہیں۔

(ح) حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جن کو غسیل الملائکہ فرمایا گیا ہے۔ ایک رات کی بیاہی دُلہن کو چھوڑ کر جذبۂ دین کے ماتحت میدان جنگ میں پہنچتے ہیں، اور شادی کے جوڑے کو بجائے عیش و طرب کے رنگ کے اپنے ہی خون سے رنگین بناتے ہیں

(ط) حضرت حبیب بن عدی (بلیغ الارض) رضی اللہ عنہ کو قریش نے زندہ گرفتار کرلیا، اور کچھ مدت قید رکھا، پھر پھانسی دینے کے ارادے پر باہر لے جا کر پھانسی کے نیچے کھڑا کر کے کہا، کہ اب بھی اسلام چھوڑ دے تو تجھے آزاد کر دیا جائیگا حضرت عدی فرماتے ہیں، اگر روئے زمین کی حکومت بھی میرے سامنے پیش کرو تو اسلام نہیں چھوڑا جا سکتا، پھر کفار قریش نے کہا، کیا تو یہ پسند کرتا ہے۔ کہ تیری جگہ یہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم محصور ہوتے، اور تو گھر میں آرام سے بیٹھا ہوتا، آپ نے فرمایا۔ حضور علیہ السلام کے پاؤں مبارک میں ایک معمولی کانٹا لگ کر بھی میری جان بچتی ہو، تو مجھے یہ بھی گوارا نہیں، اور نہایت خندہ پیشانی سے پھانسی کو بوسہ دیا اور اوپر چڑھ گئے۔

(ی) حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ صحابہ سے ہیں۔ باوجود رئیس زادہ ہونے کے ۱۶ سال کی عمر میں اسلام لاتے ہیں۔ اور اپنے والدین کی مصائب کا شکار بنتے ہیں، کھجور کی چٹائی میں لپیٹکر آپ کو نیچے سے دھوواں دیا جاتا ہے۔ تاکہ اسلام سے نفرت و ترک کا اظہار کردیں، مگر اسلام کا نشہ وہ نہ تھا۔ جسے حرب و ضرب کی ترشی اُتار سکتی۔

یہ ہیں مشتے نمونہ از خروارے عاشقانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضوان اللہ

علیہم کے خلوص وجان نثاری کے واقعات اور ان کے فدائیانہ جوش کے زندہ تذکار جنکو تاریخ اسلام رہتی دنیا تک نورانی حروف میں آنے والی نسلوں کے سامنے پیش کرتی رہے گی۔ بھلا، معترض سے کوئی پوچھے، کہ جن لوگوں کو مجبور کر کے نئے دین میں داخل کیا گیا ہو۔ اور تلوار کے زور سے ان کا پیارا آبائی مذہب چھڑایا گیا ہو۔ اُن میں یہ محبت وخلوص اور یہ عقیدت واستقامت ہو سکتی ہے، اور کیا وہ لوگ اسی نمونہ کے ہوا کرتے ہیں؟

بہ بین تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

کیا دلوں میں نفرت رکھتے ہوئے عمر بھر ہر روز پانچ نمازیں ادا کرتے رہنا۔ ہر سال اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ غربا ومستحقین کی نذر کرتے رہنا۔ گرم سے گرم موسم میں جملہ مقتضیات طبع کو مجبور کر کر خوشنودئ باری تعالیٰ کے لئے متواتر ایک ماہ تک بھوک اور پیاس کو برداشت کرنا۔ اور ہزاروں کوس سے بحر وبر کو چیر کر اور آفات ارضی وسماوی کو جھیلتے ہوئے پا پیادہ عرفات ومنا میں پہنچنا۔ اسلام کی محبت وصداقت کی دلیل ہے۔ یا معترض کی یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی کی +

(ھٰذا البصائر للناس والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ)

برکاتِ غزواتِ اسلامیہ

اور

میدانِ قتال میں بادشاہ فاتح اور پیغمبر فاتح کا امتیاز

قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝

تم بھی اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ اور حد سے نہ گزرو تحقیق اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

حرب یا قتال کیا ہے

عربی زبان کی وسعت اس قسم کے سینکڑوں الفاظ پیش کر سکتی ہے۔ جن سے مقاصد جنگ کا مفہوم واضح ہو جائے لیکن سب سے زیادہ متداول لفظ حرب تھا۔ جو لغوی معنوں کے لحاظ سے اس مفہوم کی ایک جامع تفسیر ہے۔ دنیا میں صرف لوٹ مار یا بغض و انتقام کیلئے شعلہ ہائے جنگ بھڑکائے جاتے تھے۔ جن کو عادتاً اہل عرب نہایت معمولی چیز سمجھتے تھے۔ اور اس قسم کی لڑائی ان کی نگاہ میں کوئی گناہ نہ تھی، مگر دوسری قسم کی لڑائیوں کی عبرت انگیز داستانوں کو تاریخ نے محفوظ رکھا۔

لفظ حرب ان دونوں قسموں کی لڑائیوں کے اسباب و مقاصد پر محیط ہے۔ جیسا کہ تصریحات لغت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حرب کے معنے غصے ہونے کے ہیں۔ اور تحریب کے معنے بھڑکانے، غصہ ہونے، غصہ کرنے۔ غصہ دلانے اور نیزہ تیز کرنے کے ہیں۔ حرِبتہ اس مال کو کہتے ہیں۔ جس پر آدمی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور حرب کا اطلاق کسی کے مال لے لینے اور قلاش رہ جانے پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ لٹے ہوئے شخص کو

محروب اور حریب بھی کہتے ہیں۔

یہی قوم، یہی لٹریچر اور یہی زبان تھی جس میں قرآن کریم کا نزول ہوا، اور اب ہم کو معلوم کرنا چاہیئے کہ اس نے عرب کے عقائد، عرب کے اعمال اور عرب کی تہذیب و تمدّن میں جو اصلاحیں کیں، ان کا اثر عرب کی تاریخ جنگ اور دُنیا بھر کی تہذیب جنگ پر بھی پڑا ہے یا نہیں؟

حرب اور قرآن

قرآن حکیم نے عقائد، اعمال، اخلاق اور تہذیب تمدّن کے متعلق جو اصلاحیں کیں وہ صرف ان کی سطح باطنی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ان کی سطح ظاہری پر بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ الفاظ و اصطلاح اگرچہ کوئی حقیقی چیز نہیں بلکہ معانی کا غلاف ہیں۔ جو ان کے اوپر چڑھا دیا جاتا ہے۔ تاہم اسلام کی اصلاحیں مغز و پوست دونوں کو شامل ہیں۔ اور اس نے تمام چیزوں کے ساتھ عربی زبان اور عربی لٹریچر کی بھی اصلاح کی ہے۔ اسلام کی اصلاحیں ان خیالات کے طریق اظہار کے متعلق نہیں تھیں۔ جن کی حقیقت کو اسلام نے نہیں بدلا تھا، لیکن اسلام نے جنگ کی حقیقت۔ جنگ کے اسباب اور اس کے مقاصد میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے جنگ کے متعلق عرب کا لٹریچر اس کی اصلاح کا سب سے زیادہ مستحق تھا۔

عرب میں جنگ کے لئے سینکڑوں الفاظ، سینکڑوں محاورے۔ ہزاروں ترکیبیں اور ہزاروں ہی استعارے پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن وہ سب کے سب صرف ایک وحشیانہ جنگ کے لئے موزون تھے۔ ایک متمدّن قوم، ایک ترقی یافتہ نظام۔ ایک صلح جُو مذہب اور ایک امن پسند پیام رساں جماعت۔ ان کی قطعاً متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

جہاد

اس لیے حقیقت جنگ کے انقلاب کے ساتھ اسلام نے ان تمام الفاظ و محاورات کو بھی یک قلم متروک کر دیا۔ جو اس کی شان امنیت کے خلاف تھے۔ اور غزوات اسلامیہ کے لئے صرف ایک سادہ لفظ "جہاد" وضع کر لیا اور اسی کو قابل استعمال سمجھا جس سے لفظ حرب کی طرح نہ تو غیظ و غضب کے

جذبات ظاہر ہوتے تھے۔ نہ لوٹ مار، سلب ونہب اور خونخواری و وحشت کی بُو آتی تھی۔ بلکہ وہ عرف اس انتہائی کوشش پر دلالت کرتا ہے۔ جو ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے کی جا سکتی ہے، وہ خواہ بذریعہ قوی ہو۔ خواہ بذریعہ زبان۔ خواہ بذریعہ افعال جوارح بالواسطۂ قبضۂ شمشیر و سنان، کیونکہ انسان کو صرف اپنی کوشش ہی کا صلہ مل سکتا ہے۔

قرآن حکیم نے جنگ کے ہر موقعہ پر اسی لفظ کا استعمال کیا ہے، اور اس کی اصطلاح میں اس کا اطلاق صرف جنگ کی خونریزی ہی تک محدود نہیں بلکہ عموماً اس کے ذریعہ سے علم، ایثار، ضبط، خاموشی۔ تزکیۂ نفس، اور اخلاق کا اظہار کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہو رہا ہے۔ لکن الرسول والذین امنوا معہ جاھدو باموالھم و انفسھم و اولئک ھم الخیرات و اولئک ھم المفلحون۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین ہ ترجمہ: لیکن رسول اور وہ لوگ جو رسول (علیہ السلام) کے ساتھ ایمان لائے یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے اپنی جان و مال دونوں سے جہاد کیا تمام بھلائیاں صرف ان ہی کے لئے ہیں اور وہی کامیاب و فائز المرام ہیں، اور جن لوگوں نے ہمارے لئے جہاد (ریاضت و سعی) کی۔ تو ہم ان کو اپنے پانے کے راستے بتائیں گے، اور خدائے معبود صرف ارباب احسان ہی کے ساتھ ہے۔ ان آیتوں میں جس جہاد نفس و روح کا ذکر کیا گیا ہے، اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام الاحادیث یعنے حدیث جبرائیل علیہ السلام میں بہ تشریح ذیل "احسان" واضح ترکر دیا ہے۔ ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک ہ یعنے خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اور اگر اس طرح نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس قدر استغراق تو ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ ثم ان ربک للذین ھاجروا من بعد ما فتنوا ثم جاھدوا وصبروا ان ربک من بعدھا لغفور رحیم ہ

یعنے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے سخت آزمائش کے بعد ہجرت کی پھر جہاد اور صبر کیا۔ اللہ کا فضل تیار ہے۔ خدائے قادر ایسی صداقتوں کے بعد بڑا معاف کرنیوالا اور رحم کرنے والا ہے۔

قتال اسلامی

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد اسلامی کی حقیقت صرف صبر و استقلال اور ضبط و ایثار سے متقوم ہوتی ہے مال غنیمت، اظہار غیظ و غضب، اور قتل و نہب، وغیرہ نہ تو اس کی حقیقت میں داخل ہیں اور نہ اس کا کوئی خاصہ لازمی، وہ محض عارضی چیزیں ہیں جن سے جہاد کے مقصد اعلیٰ و اشرف کا دور کا واسطہ بھی نہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں طلب مال غنیمت پر عتاب الہیٰ نازل ہوا تھا، جبکہ واقعۂ بدر پیش آیا تو صحابہ مال غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہوگئے۔ حالانکہ وہ اس وقت تک حلال نہیں ہوا تھا۔ اس پر رب العزت کی جانب سے یہ حکم نازل ہوا کہ اگر خدا کی مشیت نے اس کا فیصلہ نہ کر دیا ہوتا تو جو مال بطور غنیمت تم نے لوٹا ہے اس پر بہت بڑا عذاب نازل ہوتا اس سے ثابت ہوا کہ اسلام کے رب سے پہلے اور سب سے بڑے معرکۂ جہاد میں غنیمت حرام تھی، حالانکہ اگر اسلامی جہاد کا مقصد لوٹ مار ہوتا تو قریش کا کاروان تجارت اسلام کے دامن مقصود کو اچھی طرح بھر سکتا تھا، اور وہی اس کا بہترین موقع بھی تھا۔

ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ جنگ کے یہی وحشیانہ افعال یعنی ہتیانا، ظلم و ستم، غیظ و غضب، قتل و غارت وغیرہ، تھے جن پر لفظ حرب کا مفہوم لغوی مشتمل تھا۔ اور اسلام سے پہلے اہل عرب نے عملی طور پر حرب کا یہی نمونہ پیش کیا تھا جیسا کہ دنیا کی اور تمام اقوام نے کیا، لیکن اسلام نے جنگ کے ان تمام آثار و علائم کو مٹا کر ایک خاص مدنی نظام قائم کیا، جس کی بنا پر لغت و حقیقت کی کسی حیثیت سے بھی جہاد اسلامی پر "حرب" کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاد پر ایک جگہ بھی اس لفظ کا استعمال نہیں کیا گیا، البتہ جہاد کی ایک خاص صورت کی تعبیر قتال سے کی گئی ہے جو ظاہری مفہوم کے لحاظ سے کوتہ بینوں کے نزدیک

نہایت خطرناک لفظ ہے۔ حالانکہ جہاد اور قتال کے الفاظ معانی اور مفہوم و مقصود میں ایک طرح کے عموم و خصوص اور زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم یعنے مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ اور واقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم۔ یعنے کفار کو جہاں پاؤ قتل کرو، اور جہاں سے انہوں نے تم کو نکال دیا ہے وہاں سے تم بھی انہیں نکال دو۔ لیکن دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشاکلۃ اللفظ باللفظ ہے۔ جو کلام میں زور پیدا کرنے کا ایک طریقہ یا متکلم بہ کو کامل متوجہ کرنے کا ایک قاعدہ ہے۔ اس کی وہ کیفیت تعصب اور سینہ زوری یا شورا شوری قطعاً مراد نہیں جو تنگ نظروں نے لی ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین حالانکہ رب العزت مکار نہیں۔ بلکہ یہ عقیدہ ہی اس کی ذات کے لئے ممتنع بالشان ہے۔ تو مقصود اس ارشاد کا یہ ہے کہ پرزور طریقہ سے کفار کے اعمال شنیعہ کا جواب دیا جائے۔ ایسے ہی ہم اپنی زبان میں کہہ دیتے ہیں۔ کہ برائی کا بدلہ برائی ہے۔ حالانکہ برائی خود برائی ہے۔ لیکن اس کا بدلہ برائی نہیں ہے۔ بلکہ وہ قانون عمل کا ایک احسن نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زید اگر بکر کو قتل کرتا ہے تو وہ ظالم دبے راہرو ٹھیرتا ہے اور عدالت وہی سلوک بکر کے قتل کے عوض میں زید سے کرتی ہے۔ یعنے زید کو مار ڈالتی ہے۔ تو وہ عادل و منصف سمجھی جاتی ہے۔ جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا یعنے برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے کا محاورہ اسی طریقہ پر استعمال کیا جاتا ہے ورنہ اس قول سے اس کی حقیقت سیئہ مقصود نہیں۔ جس طرح خدا کے مکر سے حقیقی مکر مراد نہیں لیا جا سکتا۔ اور اس کا مفہوم مکر کا بدلہ ہے۔ اسی طرح یہاں قتال سے بھی دنیا کا عام قتال مراد نہیں، کیونکہ اس کی مصدری سی تشریح اس آیت میں موجود ہے۔ فان قاتلوکم فاقتلوھم اور فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین۔ یعنے اگر وہ تم سے مقابلہ کریں تو تم بھی ان سے مقابلہ کرو۔ اور جو شخص تم پر زیادتی کرے۔ تم بھی اسکی

مثل زیادتی کر سکتے ہو۔ لیکن اس سے زیادہ تجاویز کرنے میں خدا سے ڈرو۔ اور
یقین کرو۔ کہ خدا پرہیزگاروں ہی کے ساتھ ہے۔ اور اگر اس شرح پر بھی معترض
کی تسلی نہ ہو اور تسلیم نہ کرے تب بھی یہ قتال خود کفر ہی کی شامت اعمال کا نتیجہ
ہے۔ جہاد کا اصل مقصد نہیں ہے اور نہ ہی تمام قرآن پاک میں کہیں جہاد پر حرب
کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ قوم جو صرف اعلاء کلمۃ اللہ کا جھنڈا بلند کرنے آئی
تھی اور جس کی زندگی کا مقصد وحید محض معبود حقیقی کی بڑائی کا سبق دوہرانا تھا
اور جو ایک دین قیمّ کی صداقت کو دنیا کے تمام ظلم و فساد پر غالب کرنا چاہتی تھی۔ وہ
صرف تمدن و تہذیب کی گلکاریوں پر فریفتہ نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ اس کا مقصد ظہور
اس بلندی سے جس کے بعد چشم مادی کچھ نہیں دیکھ سکتی اور اس وسعت سے جس کے
بعد ہماری بڑی سے بڑی رصدگاہیں بھی جواب دے دیتی ہیں۔ بہت بلند تھا جس
پر کتاب اللہ کا یہ اشارہ گواہ ہے۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون
بالمعروف وتنہون عن المنکر۔ یعنے تم کو خداوند عالم نے دنیا کی بہترین قوم
بنا کر نمایاں کیا ہے۔ تم سچائی کا حکم دیتے ہو اور دنیا کی برائیوں اور منکرات سے
روکتے ہو۔

پس جس قوم کے ظہور کا مقصد قیام صلوٰت۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو
ضرور تھا کہ وہ جو کچھ کرتی اسی مقصد کے لئے کرتی۔ اور اپنے سفر سعی کے ہر قدم پر
اسی کی تلاش میں منہمک رہتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ دنیا پر تمام اقوام کی جنگی
یادگاریں بربادی و ہلاکت اور عدوان و طغیان کی صورت میں صفحۂ زمین پر باقی ہیں
مگر اسلام کے غزوات و جہاد کی یادگاریں ایک اور ہی رنگ اور ایک دوسری ہی
حالت میں نظر آتی ہیں۔ جو سرتاپا علم و تمدن اور ہر پہلو سے ایک روشنی کا روحانی
مینار ہیں۔

جنگ کے اسباب

جنگ اپنی ظاہری و باطنی کیفیتوں کے لحاظ سے دو قسم پر منقسم سمجھی جاتی ہے۔ اور دو ہی قسم کے

اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے ایک تو یہ کہ حرص و طمع کی ایک بے پناہ فوج جو ہمیشہ اپنی کمین گاہ بادشاہوں کے دلوں کو بناتی ہے، اور دنیا کی ضعیف قوموں کے دبانے کی فکر میں گھات لگائے رکھتی ہے، اور ہمسایہ سلطنتوں پر دھاوا بول دیتی ہے۔ جس کے جواز کے لئے سیاست کی زبان میں ظاہری اسباب کی بنا پر اہل جہان کے علماء سیاست سے فتوے حاصل کر لینا اس کے لئے کوئی دشوار چیز نہیں ہوتی۔ اور جب تک حملہ کا کوئی نام نہاد ظاہری سبب پیدا نہیں ہوتا، جنگ کے حقیقی اسباب کو بدنیتی کے تاریک پردوں میں چھپائے رکھتی ہے، پھر جب خوش قسمتی سے اس قسم کا موقعہ ہاتھ آجاتا ہے تو علانیہ میدان جنگ میں اتر آتی ہے اور اپنے مظالم و وحشت پر ظاہری اسباب کا پردہ ڈال کر دنیا کو خدع و فریب میں مبتلا کر کے خوب قتل و نہب کرتی ہے۔ مگر کہتی یہ ہے کہ امن و تہذیب کے قیام کی ایک مقدس خدمت انجام دی جارہی ہے۔ دوسرے یہ کہ کبھی کبھی عاشقانہ، رقابت یا چند ناگوار الفاظ بھی جنگ کا سبب بن جاتے ہیں، جن سے بغض و انتقام کی آگ دفعۃً دنیا میں بھڑک اٹھتی ہے۔ اور سلاطین جب تک انتقام لینے کی قدرت رکھتے ہیں شخصی سلطنتوں میں ان کو اظہار سبب اور توجیہہ و تعلیل کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تمام فوج اور تمام ملک ان کے اشارۂ چشم و ابرو کے ساتھ فی الفور حرکت میں آجاتا ہے، لیکن جب وہ کمزور اور ضعیف ہو جاتے ہیں، اور ان کا قدم میدان جنگ کی جانب نہیں بڑھ سکتا، تو اس وقت حیلہ آفرینی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور بعض اختراعی اسباب کی بنا پر ملک کے جذبات کو مشتعل کر کے آمادۂ جنگ کیا جاتا ہے۔ اس حالت میں تمام قوم دھوکے سے یقین کرتی ہے کہ وہ اپنی عزت اپنے وطن اور اپنے مصالح پر اپنی جان قربان کر رہی ہے۔ حالانکہ درحقیقت میدان جنگ سلاطین کی اغراض شخصیہ کی شکار گاہ ہوتا ہے۔ جس کو ہمیشہ مصنوعی مصلحتیں برقع پوش رکھتی ہیں ÷

نتائج ہمارے سامنے ہیں، جن میں قتل و نہب، غارتگری، دہشت زدگی، بربادی علم، ہلاکت تمدن، تباہی عمران اور خرابی امن و امان کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر اہل اسلام کی جنگوں کا مقصد ظہور ان نتائج کا حامل نہیں، بلکہ وہ قیام صلوٰۃ الٰہی، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان باللہ کا حامل ہے، اس قوم کو اس کے دشمنوں نے اول روز ہی سے مسلح ہونے پہ مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ وہ ان علائم و آثار کی مدعی نہ تھی اور نہ ہی اس نے خون اور مٹی کے کیچڑ پر سے گذرتے وقت اپنا کوئی ایسا نقش چھوڑا جس سے اس بربریت و درندگی کی بو آتی ہو۔ جو باقی اقوام نے میدان قتال اور مقصد جدال سے آتی ہے۔ کیونکہ اسلامیوں کے جہاد کی غرض غائی پر غور کیا جائے تو اس کی یادگاریں کچھ اور ہی حقیقت کو لئے ہوئے سامنے آئینگی۔ مثلاً

۱۔ اس کی پہلی روحانی یادگار نماز ہے، جو روحانیت کا سرچشمہ، ہدایت قلبی کا منبع، نیکی کا مرکز، برکات الٰہیہ کا مہبط، اور انسان کو تمام بہیمی قوتوں اور نفسانی جوشوں سے بچانے والی ہے، جس کے لئے قرآن کریم کا دعوٰی ہے کہ وہ انسان کو تمام برائیوں اور بے حیائیوں سے روک دیتی ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ہمیشہ خدا کے تعلق کا تصور قائم رہتا ہے۔ پس وہ ایک قلعہ ہے جو برائیوں کے لشکر کو اپنے اندر گھسنے نہیں دیتا۔ لیکن اس قلعہ کے ستونوں کو اسلامیوں کے سفر جہاد و غزوات ہی نے قائم کیا تھا۔ ابوداؤد جلد ا صفحہ ۳۱۹ کتاب الجہاد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مجاہدین کی افواج جب بلندیوں پر چڑھتی تھیں تو غلغلۂ تکبیر بلند ہوتا تھا، اور جب پستیوں کے نشیب کو طے کرتی تھیں تو سبحان اللہ کا نعرہ مارتی تھیں، پس نماز میں قیام و قعود، رکوع و سجود، اور تسبیح و تکبیر کو اسی قالب میں ڈھالا گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز کے ارکان صرف لڑائی ہی کی بدولت وجود میں آئے لہذا نماز مسلمانوں کی جنگوں کی پہلی یادگار ہے، اور صلوٰۃ الخوف تو بالخصوص جہاد ہی کے لئے مخصوص ہے، جس کے احکام اور نمازوں سے بالکل مختلف ہیں

اور جس کے متعلق قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب تم مجاہدین کی صف میں نماز پڑھنا چاہو تو پہلے ایک گروہ تمہارے ساتھ اپنے ہتھیار لیکر شریک نماز ہو جائے۔ پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو پیچھے ہو جائیں۔ تاکہ حفاظت کرتے رہیں، اور دوسرا گروہ آئے جس نے نماز ابھی نہیں پڑھی ہے، اور چاہیئے کہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ مسلح ہو کر تمہارے ساتھ نماز ادا کریں۔ کیونکہ کفار موقعہ ڈھونڈھ رہے ہیں۔ کہ تم اپنے ہتھیاروں اور مال و متاع سے غافل ہو جاؤ تو وہ دفعتہً تم پر ٹوٹ پڑیں۔

القصہ مسلمانوں نے اپنی اس یادگار کے ذریعہ دُنیا کو دکھا دیا ہے کہ خدا کی صداقت کی محافظ قوم دشمن کے مقابلہ میں اپنی روحانی یادگاروں کو کیونکر قائم رکھ سکتی ہے۔ جبکہ میدان جنگ میں دُنیا کی تمام قومیں فرصت کے اوقات کو ستانے اور کھانے پینے میں صرف کرتی ہیں۔ مسلمان تلواروں کے سائے کے نیچے بھی اپنی مہلت کی گھڑیاں صرف اللہ ہی کی عبادت میں گذارتا ہے۔

۲۔ طہارت۔ عبادات اسلامیہ کی آسانیوں میں تیمم بھی خدا کی عطا کردہ ایک یادگار آسانی ہے۔ جس کی برکات کا ظہور زیادہ تر سفر ہی میں ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا سفر اکثر جہاد ہی کے لئے ہوا کرتا تھا، اس لئے سفر ہی میں مسلمانوں کو یہ عطیہ الٰہی بھی دیا گیا۔ چنانچہ ایک سفر میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کے ساتھ تھیں اور سوءِ اتفاق سے راستہ میں ان کا ہار گر ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام صحابہ کے ساتھ اسکے ڈھونڈھنے کے لئے ٹھیر گئے۔ لیکن منزل پر دُور تک پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ صحابہ کرام نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی شکایت کی، تو انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر ناراضگی ظاہر فرمائی، کہ تمہاری ہی غفلت نے تمام قوم کو اس مشقت و مصیبت میں ڈالدیا ہے۔ چنانچہ عین اسی موقعہ پر آیت تیمم نازل ہوئی، اور تمام صحابہ مسرت کے لہجہ میں پکار اُٹھے۔ ماھی باوّل برکتکم یاآل ابی بکر یعنے اے آل ابی بکر یہ کچھ تمہاری پہلی ہی برکت نہیں فلہذا تیمم بھی اس بنا پر جہاد و غزوات

اسلامیہ ہی کی یادگار ہے۔

۳۔ **صلوٰۃ وصیام** ، حالت سفر میں قصر صلوٰۃ اور رمضان شریف میں افطار صوم کی اجازت بھی جہاد ہی کی راہ میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے دی گئی۔ قرآن کریم کی آیات قصر میں نمایاں طور پر جہاد کے مواقع کا ذکر ہی بالوضاحت فرمایا گیا ہے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حکم قصر نماز درحقیقت جہاد ہی کے لئے ہوا تھا۔

۴۔ **حج البیت** : عبادات اسلامیہ میں حج ایک بزرگترین یادگار اور بہت سی مختلف یادگاروں کا مجموعہ ہے۔ وہ جس گھر سے اپنی ادائیگی کے لئے متعلق ہے وہ بھی خدا کے ایک برگزیدہ بندے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ کی قائم کی ہوئی یادگار ہے۔ بلکہ دنیا بھر کی مذہبی یادگاروں سے سب سے قدیم یادگار رہی ہے۔

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا حضرت سیدہ ہاجرہ علیہا السلام کی اس سراسیمگی کا منظر تازہ کرتی ہے جب وہ پانی کی جستجو اور بچے کی محبت میں پریشان حال تھیں، چاہ زمزم قدرت الٰہی کی اس کرشمہ سازی کو یاد دلاتا ہے جس نے وادی غیر ذی زرع میں خدائی رحمت کے دبے ہوئے چشمے کا منہ کھول دیا تھا۔ اور قربانی حقیقت اسلامیہ کی اس جاں فروشی اور فدویت کے تبرد حانی کو محسوس و نمایش کر دکھاتی ہے جس نے حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام اور ذبیح اللہ اسمٰعیل علیہ السلام کے اندر سے ظہور کیا تھا۔ رمی جمار ان ابلیسی قوتوں سے دنیا کو روکتا ہے جو ان پاک ہستیوں کی تعمیل میں سنگ راہ ہو رہی تھیں۔

سیاست لیکن غزوات اسلامیہ نے ان یادگاروں میں ایک یادگار کا اور بھی اضافہ کر دیا۔ یعنی فتح مکہ سے ایک سال پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ سے صلح کر لی تھی۔ جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے اس صلح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لئے تشریف لائے تو صحابہ کو مدینہ طیبہ کی آب و ہوا نے چور چور کر دیا تھا۔ اور بخار کے عام ابتلا نے تک

طاقت رفتار سلب کر دی تھی، اس ضعف کا اثر طواف کعبہ شریف کی حالت میں بھی صاف نمایاں ہوتا تھا، اور مکہ والے دیکھتے تھے، اس پر کفار نے جو اسلام کی فوجی طاقت کا ہر موقعہ پر امتحان لیتے رہتے تھے، طنز آمیز لہجہ میں کہنا شروع کر دیا، کہ مدینہ کے بخار نے تو ان کو چور چور کر دیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک عملاً ان کو یہ یقین نہیں دلایا جا سکتا تھا کہ یہی ناتوان ہستیاں، یہی کمزور و نخیف بندے، یہی ضعیف احسام، ایک دن ان کی قوت کے سر پر غرور کو کچل دیں گے، تاہم علامات و آثار دکھلائے جا سکتے تھے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تندرستوں اور طاقتوروں کی طرح اکڑ کر چلنے کا حکم دیا۔ تاکہ روح کی ایمانی قوت کو جسم ضعیف کے پردے میں بھی نمایاں کریں۔ چنانچہ پہلوانوں کی طرح کندھے ہلا ہلا کر چلنے کی یہ یادگار آجتک قائم ہے، جس کو فقہا نے رمل کے نام سے تعبیر کیا ہے، اس یادگار کو ایک وقت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خیال فرما کر کہ یہ ایک وقتی حکم سے متعلق تھی موقوف کر دینا چاہا۔ مگر پھر یہ سمجھ کر رک گئے، کہ یہ یادگار مسلمانوں کے لئے ہمیشہ درس شجاعت و تحریک عزائم کا وسیلہ ہے، اور ہر سال یہ یاد دلاتی ہے کہ ان کے اسلاف کرام نے ضعف جسمانی کی حالت میں بھی کس طرح اپنی صولت اسلامی کو قائم رکھا تھا۔

واقعۂ افک ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ افک بھی ایک سفر جہاد ہی میں پیش آیا تھا، جو اسی سلسلہ کی ایک روحانی یادگار ہے۔ یہ یادگار اگرچہ ابتداء میں نہایت درد انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں خدا کی رحمت کا بہت بڑا خزانہ اس کے اندر مستور تھا۔ قرآن مجید میں عورتوں کے تمدنی حقوق کی حفاظت کے لئے ایک خاص سورت سورۂ نساء نازل ہوئی، جس کو عورتوں کی مخصوص یادگار کہا جا سکتا ہے، لیکن ان کی وضع معاش طرز معاشرت اور حقوق منزلی وغیرہ کی عام اصلاح کے متعلق اب تک کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی، مگر اس واقعہ کے بعد ہی سورۂ نور نازل ہوئی جو زیادہ تر ان ہی احکام سے مملو ہے۔

چھٹی صدی عیسوی میں یہ انسان کا شریف تر نصف حصّہ انتہا درجہ کی بیکسی و ذلّت میں ڈالدیا گیا تھا۔ تمدّن اور مذہب دونوں نے اس کے ساتھ بے رحمی کی تھی، صرف اسلام ہی ایک وہ قانون الٰہی ہے، جس نے سب سے پہلی مرتبہ عورتوں کے حقوق کا اعلان کیا، اور ان کے معاشرتی درجہ کو خاندان میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی۔ اور اس انقلاب کا بڑا حصہ سورۂ نور کے نزول سے ہی وجود میں آیا ہے اور سورۂ نور ایک سفر جنگ کو یاد دلاتی ہے، پس عورتوں کے حقوق کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی اصلاح بھی غزوات اسلامیہ ہی کی یادگار ہے۔

حدِ قذف و حدِ زنا

حد قذف اور حد زنا کے متعلق بھی اب تک کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس واقعہ کے بعد ہی ان حدود کی تعیین کیلئے بھی آیات الٰہی نازل ہوئیں، جن میں اس معصیت کا سدِّ باب کر دیا گیا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت اگرچہ عام طور پر مسلّم تھی، لیکن قرآن مجید کی برأت نے اس کو اور بھی روشن اور قطعی کر دیا پس یہ واقعہ ان احکام کی روحانی یادگاروں کا ایک مجموعہ ہے، جن کو حدود اللہ کے جامع و مختصر لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ امہات المؤمنین رضوان اللہ علیہن اجمعین کے فضائل مخصوصہ کا ایک باب اور حضور کی ازواج مطہرہ کی پاکیزگی کا ایک مقدس تذکرہ ہے۔ جس کو کفار نے کسی اور رنگ میں پیش کرنا چاہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کو مسلمانوں کے لئے خیر و برکت فرمایا ہے۔ اور کفار کی تمام خباثت کی تردید فرما دی ہے +

فاتح اور پیغمبر کا امتیاز

یہ امر متحقق ہو چکا ہے کہ جہاد اسلامی کی حقیقت جن مقاصد پر مشتمل ہے، اس کے لحاظ سے وہ دیگر اقوام کی دنیوی لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے، اور یہ اختلاف اس قدر بدیہی ہے، کہ ہم کو اس کی ظاہری شکل کے ایک ایک خط و خال کے اندر نمایاں طور پر نظر

آسکتا ہے۔ اس بدیہی اختلاف کی علاوہ پہلے تذکار کے ایک واضح حیثیت یہ بھی ہے کہ ایک بادشاہ فاتح جس نے حرص و آز کے ماتحت میدان جنگ وجدال میں قدم رکھا اور ایک پیغمبر خدا جس نے دُنیا کی بھلائی کے لئے جہاد کیا برابر نہیں ہو سکتے۔ ایک غرض پرست حملہ آور اور نفس پرست فاتح جب ملک گیری کے ارادہ سے میدان جنگ کا رخ کرتا ہے تو طبل و دہل کے غلغلے اور قرنا و برق کے ترانے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ سر پر پرچم نخوت لہراتا ہے اور چتر شاہی آفتاب کی شعاعوں کو بھی اس کی طرف نگاہِ کرم سے دیکھنے نہیں دیتا۔ جاہ جلال کا یہ دیوتا میدان جنگ میں ایک مجسمے کی طرح کھڑا ہوتا ہے، اور تمام فوج اس مرصع بُت کے گرد طواف کرنے لگ جاتی ہے۔ عظمتٗ و جبروت کا یہ منظر دفعتہً دُنیا کو مرعوب کر دیتا ہے اور اس رعب و داب کے احساس سے اس دنیوی فاتح کا سر غزور بادۂ کبر و نخوت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خاک و خون میں مل کر بھی اس کا یہ نشہ نہیں اترتا اگر کوئی اہل فہم اس سر متکبر کو ٹھکرا بھی دیتا ہے۔ تو اس سے مغرورانہ صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔

لیکن ایک پیغمبر خدا کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ گھر سے جب نکلتا ہے تو گو مخلصین و مُومنین کی ایک مختصر سی جماعت اس کے ساتھ ہوتی ہے، مگر وہ اپنا رفیق سفر صرف خدائے واحد ہی کو بناتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لبغرض جہاد اپنے مقام سے روانگی فرمایا کرتے تو یہ دعا پڑھا کرتے۔ اللھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل۔ اللھم انی اعوذبك من وعثاء السفر وکاٰبۃ المنقلب وسوء المنظر فی الاھل والمال۔ اللھم اطوت الارض وھون علینا السفر۔ یعنے حضور علیہ الصلوٰت والسّلام جب لبغرض جہاد روانہ ہوتے تھے تو یہ دعا زبان پر لاتے۔ خدایا۔ تو ہی ہمارا رفیق سفر ہے، تو ہی ہمارے بال بچوں میں ہمارے قائمقام ہے۔ خدایا سفر کی شدائد اور پلٹ کر اہل وعیال کو بُرے حال میں دیکھنے

کی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں۔ خداوندا مسافت سفر کو کم کر دے۔ اور ہمارے لئے آسان بنا دے۔

وہ سواری کی پشت پر قدم رکھتا ہے تو باین الفاظ خدا کا شکر ادا کرتا ہے سبحان الذی سخر لنا ھٰذا وما کنا لہٗ مقرنین (یعنے پاک و برتر ہے وہ ذات جس نے اس جانور کو ہمارا فرمانبردار بنا دیا ہے۔ ورنہ ہم اس کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔

وہ سفر سے پلٹتا ہے۔ تو راستہ میں خداوند قدوس کی حمد کا ترانہ گاتا ہوا چلتا ہے کہ ہم توبہ کرکے لوٹتے ہیں۔ ہم خدا کے عبادت گذار بندے ہیں۔ اور اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ وہ پہاڑ کی بلندیوں پر چڑھتا ہے۔ تو غلغلۂ تکبیر بلند کرتا ہے۔ اور اگر میدانی نشیب میں اترتا ہے تو ترنم ریز تسبیح و تہلیل ادا کرتا ہوا۔ وہ فوج کو میدان جنگ میں روانہ کرتا ہے تو اس کو مغرورانہ طاقت کی یاد نہیں دلاتا۔ اور نہ اس کے جوش کو دو آتشہ کرتا ہے۔ نہ قدیم کا زمانہ ہائے شجاعت کا تذکرہ کرکے اس کے دل کو گرماتا ہے۔ بلکہ اس کے دین کو۔ اس کی امانت کو۔ اور اس کے تمام نتائج اعمال کو خدا کی سپرد کرکے رخصت کر دیتا ہے۔

وہ منزل پر اترتا ہے تو نہ تو سلاطین زمانہ کی طرح اس کے لئے خیمے نصب کئے جاتے ہیں۔ نہ فرش و بساط شاہانہ سے اس کے لئے زمین آراستہ ہوتی ہے اور نہ میدان کا نشیب و فراز ہموار کیا جاتا ہے۔ وہ خدا کا نام لیکر فرش خاک پر لیٹ جاتا ہے اور اسی نام کی عظمت کے سہارے پر زمین ہی کو اپنی حفاظت کی خدمت سونپ دیتا ہے۔ یا ارض ربی و ربك اللّٰہ اعوذ باللّٰہ من شرك و شرما فیك و من شر ما یدب علیك۔ یعنے اے زمین میرا اور تیرا خدا دونوں کا ایک ہی ہے۔ میں تیرے شر سے تیری سطح باطنی کے شر سے۔ اور تجھ پر چلنے والوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

وہ سفر جہاد سے پلٹ کر گھر پہنچتا ہے تو سب سے پہلے اس کو خدا کا گھر یاد

آتا ہے۔ اور مسجد میں جاکر دو رکعت نماز نفل ادا فرماتا ہے۔ پھر جب اس کو فتح وظفر کی خبر ملتی ہے۔ تو نہ تو اس کے سامنے شادیانے بجائے جاتے ہیں۔ نہ جشن شاہانہ کی تیاریاں کر کے عیش وطرب کے ترانے گائے جاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے خداوند جل وعلاشانہٗ کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے۔ اور سجدۂ شکر بجالاتا ہے۔ اور اگر اسکو کبھی مشیت ایزدی سے شکست ہوتی ہے۔ تو وہ نہ تو فوج کو جوش وغیرت دلاتا ہے اور نہ اس کو مطعون کرتا ہے۔ بلکہ اپنے خداہی کی غیرت کی سلسلہ جنبانی کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی فوج کو اپنی نہیں بلکہ خداہی کی فوج یقین کرتا ہے۔ کان یقول یوم اُحد اللّٰھُمَّ انک ان نشاء لا تعبد فی الارض۔ یعنے آپ نے معرکۂ اُحد کے دن فرمایا۔ اے خدا کیا تو چاہتا ہے کہ اب زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو۔

وہ اپنی فوج کی قلت اور دشمن کے لشکر کی کثرت کو دیکھتا ہے۔ تو صرف رحمت آسمانی ہی سے مدد طلب کرتا ہے۔ اور کسی دنیوی طاقت کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا۔ چنانچہ بدر کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مشرکین کی جانب دیکھا اور معلوم ہوا کہ ان کی جمعیت ایک ہزار یا زیادہ کی ہے۔ اور مسلمان صرف تین سو انیس ہیں۔ تو آپ قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر خدائے قدوس کو پکارنا شروع کیا۔ کہ اے خدا، تو نے جو مجھ سے فتح وظفر کا وعدہ فرمایا ہے اس کو پورا فرما۔ اے میرے مولا اگر مسلمانوں کا یہ مختصر سا گروہ فنا ہو گیا تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ اسی طرح ہاتھ پھیلا کر متواتر پکارتے رہے۔ یہاں تک کہ جوش استغراق میں آپ کی دوش مبارک سے چادر گر گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کے اس تضرع والحاق کو دیکھا تو خدمت میں حاضر ہوئے اور چادر اٹھا کر آپ کے کندھے پر ڈال دی۔ پھر پیچھے سے آکر آپ سے لپٹ گئے۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیک وسلم آپ اپنی مناجات ختم فرمایئے۔ مولا کریم نے جو آپ سے وعدہ کیا ہے اس کو بہت جلد پورا فرمائے گا۔

وہ میدان جنگ میں اگر شدید زخم کھاتا ہے تو اس حالت میں صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے ۔ ربّ اغفر لقومی فانھم لا یعلمون ۔ یعنے اے خدا میری قوم کو معاف فرما ۔ کیونکہ وہ لوگ حق کو نہیں جانتے ۔

الغرض ۔ ایک ہوس ملک گیری رکھنے والا بادشاہ فاتح میدان جنگ میں سر پُر غرور اور ایک پیغمبر خدا مجسم جبین نیاز ہوتا ہے ۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں زبان خودستا ۔ مگر ایک داعی حق زبان شکر سنج ہوتا ہے ۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں غیظ وغضب کا آتشکدہ لیکن ایک منادِ توحید رحم وکرم کا سرچشمہ ہوتا ہے ۔ پھر ان دونوں متضاد حالتوں کا انجام بھی نہایت مختلف اور عبرت خیز ہے ۔ بادشاہوں کے سر پُر غرور بارہا ٹھکرا دیئے گئے ۔ لیکن کسی موید من اللہ کی جبین نیاز مذلّت سے آلودہ نہیں ہوئی ۔ بادشاہوں کی زبان خودستا بارہا ذلّت کے ساتھ خاموش کر دی گئی ۔ لیکن کسی داعیٔ رب کا نغمہ حمد وشکر کبھی بھی ساکت نہیں ہوا ۔ بادشاہوں کے غیظ وغضب کے شعلے بارہا بجھا دیئے گئے مگر کسی پیغمبر کے دریائے کرم کو دنیا کے خس وخاشاک نہیں روک سکے ۔

وَلقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین ۔ انھم لھم المنصورون وان جندنا لھم الغالبون ط

حضور علیہ السّلام کا سانحۂ ارتحال اور نمازِ جنازہ

کتاب "جمالِ رسول" کی طباعت کے بعد بعض احباب نے لکھا کہ اس میں سرکارِ دو عالم نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت اور نمازِ جنازہ کا ذکر نہیں کیا گیا کہ حضور کی نمازِ جنازہ کس طرح ہوئی۔ لہٰذا کتاب میں اس باب کا بھی اضافہ فرما دیجئے۔ فقیر کے نزدیک گو یہ مسئلہ جس کا حل تمام دنیائے اسلام کے علم میں ہے کوئی قابلِ بحث چیز نہیں، چونکہ بعض کوتاہ اندیشوں اور خام عقیدوں کی تحریر و تحقیق نے اسکو مشتبہ کر کے قابلِ بحث بنا ہی دیا ہے۔ اس لئے جواب میں فقیر اس کے ان تین پہلوؤں پر بحث کرتا ہے جو سائلین نے لکھے ہیں:

۱۔ عشاقِ رسول علیہ السلام کے عقیدہ میں چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیات النبی ہیں لہٰذا آپ پر نمازِ جنازہ کیسی؟ بلکہ ان کے نزدیک لفظِ جنازہ کا اطلاق ہی غلط ہے۔

۲۔ اگر صحیح معنوں میں جنازہ کی صورت قائم تھی تو کس نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور اس میں کون کونسی دعائیں اور آیتیں پڑھیں؟

۳۔ تمام جماعت کا اپنا اپنا سوچ بعض دینی حقیقی تعصب کا کیچڑ اچھالنے کیلئے یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ تین دن پڑا رہا اور لوگ تجہیز و تکفین نہ کر سکے کہاں تک صحیح ہے؟

پہلے سوال میں چونکہ عشق و محبت کا تعلق ہے اسلئے اس کا جواب بھی اسی روشنی میں معلوم کیجئے:۔

حضور علیہ السلام کا ہر قول و فعل اپنی نجات و مناجات پر منتج نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ تمام تر عمل تعلیمِ امت کے لئے تھا۔ لہٰذا جو کچھ حضور علیہ السلام سے امت کو پہنچا اس پر چلنا امت کیلئے لازم و واجب تھا۔ وقت اس کی ضرورت کو ظاہر کرے یا نہ کرے، مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک جگہ سے اپنے ہمراہیوں سمیت گزر رہے تھے تو ایک مقام پر سے سیدھا اور صاف راستہ چھوڑ کر کچھ فاصلہ کا چکر کاٹا اور پھر آگے جا کر راستہ پر آ گئے۔ ہمراہیوں نے پوچھا کہ راستہ صاف تھا آپ نے اس کو چھوڑ کر ٹیڑھی راہ کیوں اختیار فرمائی تو آپ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور یہاں راستہ میں پانی تھا تو حضور علیہ السلام نے اس راہ کو چھوڑ کر اسی طرح عبور فرمایا جیسے میں نے کیا ہے اور میرا دل نہیں چاہا کہ اگرچہ اب راہ صاف ہے میں حضور علیہ السلام کے نقشِ قدم کو چھوڑ کر سیدھا گزر جاؤں۔ صحابہؓ کی یہی وہ محبت تھی جس کی وجہ سے عقیدتمندوں کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ حضور علیہ السلام دنیا سے تشریف لے گئے ہیں حضرت فاروقِ اعظم عمر رضی اللہ عنہ نے تلوار کھینچ لی کہ جو یہ کہے گا کہ حضور وفات پا گئے ہیں اس کا سر تن سے جدا کر دوں گا۔ مگر یہ حقیقت کسی حد تک وضاحت طلب ہے کہ حیات النبی علیہ السلام سے وہ حیاتِ طیبہ مراد ہے جو ظاہریت سے تعلق رکھتی ہے یا حیاتِ برزخی۔ اس پر اکثر حضرات علمائے کرام نے لکھا ہے کہ اس حیات انبیاء علیہم السلام والصلوٰت سے مراد حیاتِ برزخی ہے جو کہ وردِ موت سے بعد حاصل ہوتی ہے اور اس کا ظہور کامل طور پر کفن و دفن کے بعد ہوتا ہے جس کی تفصیل یوں ہے کہ روح اور بدن کا اتصال و دفاق چونکہ ایک عادی و عارضی امر ہے لہٰذا یہ زائل ہو سکتا ہے اسی وجہ اتصال کو شریعت میں موت کہتے ہیں اور اسی کو فنا سے بھی اطلاق کرتے ہیں۔ یعنی روح اور بدن کے اتصال کو حیات اور ان دونوں کے افتراق کو موت کہتے ہیں اور یہ افتراق برزخی روح و تعفّن کا

وارد ہوتا ہے۔ گو ایک آن کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ اور کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ اور اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ اور حدیث شریف میں ہے فانی رجل مقبوض اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ اور عقلی طور پر یہ ازالۂ اتصال ممکن ہے کیونکہ ہر عارضی کا زوال ایک بدیہی حقیقت ہے۔ بہرصورت موت کا معنی روح وجسم کی باہمی آمیزش اور رقابت کو فنا کر دینے کا نام ہے جس سے ہر متنفس متاثر ہوگا۔ نہ یہ کہ ازالۂ اتصال کے ساتھ بدن اور روح بھی فنا اور منعدم ہو جائیں بلکہ حق یہ ہے کہ بدن اور روح مطلقاً باقی رہتے ہیں۔ ہاں بعض ابدان بجز اجزاء اصلیہ کے بعض عوارض کی وجہ سے نابود ہو جاتے ہیں مگر نیک حضرات کے ابدان باقی رہتے ہیں مثلاً اولیائے اکرام، شہدائے عظام اور صالحین وغیرہم اور بالخصوص انبیائے کرام علیٰ نبینا وعلیہم السلام کے اجسام مطہرہ و ابدان طیبہ دائمی طور پر صحیح وسالم رہتے ہیں اور ان کی ارواح طیبہ کو انکے پاکیزہ اجسام میں لوٹا دیا جاتا ہے۔ اور وہ ابدان مثالیہ کے علاوہ اصلی اور حقیقی بدنوں کے ساتھ ہی عالم کائنات میں تصرف کرتے ہیں عبادات الٰہیہ میں بطریق تلذذ مستغرق رہتے ہیں اور متوسلین کی فریاد رسی کے ساتھ خاص شغف رکھتے ہیں۔

رہا یہ امر کہ جب موت کا ورود انبیاء کرام علیٰ نبینا وعلیہم السلام پر بھی حتمی طور پر ثابت ہے تو پھر انبیائے کرام علیہم السلام کو زندہ بالخصوص حضرت مآب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو حیات النبی کے تصور سے یاد رکھنے کا کیا مطلب ہوگا؟ سو اس کے چند وجوہات ہیں :۔

۱۔ یہ کہ انبیائے کرام علیہم السلام گو موت سے متاثر ہوتے ہیں۔ مگر یہ تاثر محض آنی لمحی ہوتا ہے نہ کہ دائمی و استمراری۔ پھر ان کی ارواح مقدسہ کو واپس دوبارہ ان کے حقیقی ابدان میں لوٹا دیا جاتا ہے جس کا ظہور عموماً کفن و دفن کے بعد ہوتا ہے لہٰذا ان کو زندہ کیا جاتا ہے اور اسی کو حیات برزخی حیاتِ جسمانی کہتے ہیں۔ امام بیہقی کتاب الاعتقاد، مواہب لدنیہ، عون الودود شرح ابی داؤد، کتاب الشفاء، مدارج النبوۃ وغیرہا میں موجود ہے کہ الانبیاء بعد ما قبضوا رُدّت الیھم ارواحھم۔ یعنی بعد قبض انبیاء علیہم السلام کی ارواح طیبہ ان کے اجسام میں لوٹا دی جاتی ہیں۔

۲۔ یہ کہ بالخصوص حضور علیہ السلام کی پیدائش اس امکان سے ہوئی ہے جو صفات الٰہیہ اضافیہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے نہ کہ اس امکان سے جو تمام ممکنات عالم میں ثابت ہے۔ (مکتوب ۱۰۰ از مکتوبات امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ) اور آپ کو اس انداز پر پیدا فرمایا گیا ہے کہ نہ آپ کی مثل پہلے کوئی ہوا اور نہ ہی بعد میں ہوگا۔ تو ثابت ہوا کہ جب آپ کی پیدائش عالم امکان سے جداگانہ ہے اور آپ کی مثال مفقود و معدوم ہے تو آپ کی موت بھی اوروں سے الگ نوعیت کی ہوگی اور وہ بھی کہ آپ کی موت صرف آنی تھی۔ بعدہٗ وہی حیات حقیقی جسمانی دوبارہ لوٹا دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ میں آپ کی موت کو علیحدہ ذکر فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا آپ کی حیات برزخی حیات حقیقی ہے اور آپ کو اسی وجہ سے حیات النبی علیہ السلام کہا جاتا ہے۔

۳۔ سرورِ کائنات مختارِ شش جہات سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ جیسے اوروں کی حیات مستعار سے الگ شان رکھتی ہے ایسے ہی آپ کی موت بھی دوسروں کی موت سے جداگانہ کیفیت کی حامل ہے اور وہ یہ کہ سرکار دو عالم

صلی اللہ علیہ وسلم کی موت ساتر حیات ہے نہ کہ مزیل حیات یعنی آپ کی موت نے آثار حیات طیبہ (مثلاً حس و حرکت اور دیگر تصرفات و مشاغل وغیرہا) کو چھپا دیا ہے، نہ یہ کہ ان کو فنا کر دیا ہے۔ جیسا کہ شرعی طور پر مسح ساتر حدث تسلیم کیا گیا ہے نہ کہ مزیل حدث۔ اور وہ بھی کفن و دفن تک بعدہٗ پھر وہی اصلی حقیقی جسمانی حیات حاصل ہو گئی، بخلاف عوام کے کہ ان کی موت کلاً یا بعضاً سالب و مزیل حیات ہوا کرتی ہے۔ جس سے حیات حقیقی اور جسمانی ختم ہو جاتی ہے۔ بنا بریں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو حیات النبی کہا جاتا ہے۔

بہر نہج ان وجوہ مذکورہ کی وجہ سے جناب کو حیات برزخی میں بلحاظ اوروں کے ایک خصوصی امتیاز حیات حاصل ہے اور آپ کے مشاغل و مصارف برزخیہ اپنی نظیر میں بے نظیر ہیں اور ورودِ موت کے تاثرات آنی و لمحی ہونے کے اعتبار سے بہ نسبت دائمی و استمراری تصرفات برزخیہ کے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے گویا کہ موت حضور پر واقع ہی نہیں ہوئی جس سے حضور کو حیات النبی کہتے ہیں اور بلحاظ تاثر آپ پر موت کا اطلاق نہیں کرتے نہ یہ کہ آپ پر آثارِ موت مرتب ہی نہیں ہوئے۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ چونکہ آپ کی موت سالب حیات نہیں بلکہ ساتر آثار حیات ہے اور کلیۃً و حقیقتاً حیات دنیوی ختم نہیں ہوئی اس لئے آپ کی متروکات کو وراثت نہیں تصور کیا جائے گا اور کسی قسم کی ان میں تقسیم جاری نہیں ہوگی کیونکہ تقسیم ترکہ اور اجزاء توریث انتقال ملک پر متفرع ہے اور وہ انتقال موت استمراری اور دائمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جو کہ یہاں منشاء نزاع میں غیر متصور ہے۔ نیز یہ امر بھی واضح و لائح ہو گیا کہ آپ کی حیات دنیوی چونکہ کلیۃً منعدم نہیں ہوئی بلکہ من وجہ حقیقی حیات جسمانی موجود رہتی ہے۔ بنا بریں آپ کے جنازہ کی کیفیت ادائیگی عام نماز جنازہ سے الگ ہونی چاہئے سو اسی وجہ سے کہ آپ کی نماز جنازہ عام طریق مسنون پر ادا نہیں کی گئی بلکہ ایک خاص الگ طرز پر ادا کی گئی ہے۔ جیسا کہ مشہور مسائل میں کتب معتبرہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کی نماز جنازہ میں کوئی امام نہ تھا اور نہ ہی اس میں وہ دعائیں پڑھی گئیں جو عام جنازوں میں پڑھی جاتی ہیں جس کو بعد آگے ذکر کرے گا۔

لہٰذا ان حقائق کی بناء پر یہ بھی وضاحت ہو گئی کہ چونکہ آپ کی حیات طیبہ بالکل منعدم نہیں ہوئی اس لئے آپ کی ازواج مطہرات سے کسی اور کا نکاح ناجائز اور قطعی حرام قرار دیا گیا اور وہ امہات المومنین کے خصوصی اور ممتاز لقب سے نوازی گئی ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں وازواجہٗ اُمّہاتہم کے ارشاد سے ظاہر ہے۔

(۵) نماز جنازہ کا مسئلہ: موجب یہ معلوم ہو گیا کہ حضور علیہ السلام پر لمحی طور سے کیفیت موت طاری ہوئی تو سنت نماز جنازہ کی ادائیگی بھی لازم تھی مگر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے وہ تمام جنازوں کی طرح نہ تھی لہٰذا اس کی صورت یوں الگ پیدا کی گئی جیسا کہ ابن اسحق نے سیرت میں لکھا ہے کہ حضور کی وفات پیر (سوموار) کے دن دوپہر کو ہوئی اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق پیر کے دن آخری وقت میں وصال ہوا اور حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں تطبیق دے کر وصال کا وقت یہ لکھا ہے کہ جب دوپہر ڈھل چکی تھی تو گویا ان کی تحقیق میں بعد زوال وصال قریب عصر ہوا اور اس کے بعد اتنا وقت نہیں تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے تکفین و تدفین سے فراغت ہو سکے اس لئے دوسرے دن منگل کو پورا پورا انتظام ہوا اور اسی دن حضور علیہ السلام

کے جسم اطہر کو قبر مقدس ہی رکھ دیا گیا۔ جس حجرہ میں آپ نے وفات پائی تھی وہیں لوگ علی الترتیب تھوڑے تھوڑے ہو کر اندر جاتے تھے اور نماز جنازہ ادا کرتے تھے اور سہ شنبہ یعنی منگل کا دن گزار کر شام کو فارغ ہوئے۔ ابن سعد کی بعض روایات میں یوں بھی ہے کہ بدھ یعنی چہارشنبہ کو تدفین ہوئی۔ لیکن یہ تمام روایتیں موضوع ہیں۔ خود ابن سعد سے جو صحیح روایات ہیں ان میں یہ ہے کہ منگل کے دن تدفین ہوئی اور بدھ کی شام شروع ہوگئی تھی (یہ یاد رہے کہ اسلامی تاریخ بعد از غروب آفتاب شروع ہوتی ہے) اور ابن ماجہ کتاب الجنائز میں بھی یہی ہے فلما فرغوا من جنازہ یوم الثلثا اور جب فارغ ہوئے حضور کی تجہیز سے منگل کا دن تھا۔ گویا وصال پیر (سوموار) کے روز ہوا اور تدفین منگل کو ہوئی اور سارا دن منگل کا صرف ہو کر شام کو فراغت پائی گئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے غسل دیا تھا اور فضل بن عباس اور اسامہ بن زید رض پردہ کرنے والے تھے۔ اوس بن خولی انصاری رض پانی لاتے تھے اور حضرت عباس کے دونوں صاحبزادے قثم اور فضل "مدد دیتے تھے۔ بعد ازاں تین سوتی سفید کپڑے کفن میں استعمال ہوئے۔ پھر غسل وکفن کے بعد سوال پیدا ہوا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی جس جگہ وفات پاتے ہیں وہاں ہی دفن ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی جگہ جہاں وصال ہوا قبر کھودی گئی، قبر کھودنے والے ابوطلحہ رض تھے جنہوں نے لحد والی قبر کھودی۔

جنازہ تیار ہوگیا تو لوگ نماز کی سعادت حاصل کرنے کے لئے بڑھے۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ دس دس آدمی باری باری آئیں اور نماز پڑھیں۔ چنانچہ پہلے مردوں نے پھر بچوں نے یعنی تمام مہاجرین وانصار نے نماز پڑھی۔ امام کوئی نہ تھا اور نہ وہ دعائیں پڑھی گئیں جو عام جنازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ بلکہ نماز جنازہ کی صورت یہ تھی کہ لوگ نہایت ادب واحترام کے ساتھ حاضر ہوتے اور صلوٰۃ وسلام عرض کر کے واپس ہو جاتے۔ سب سے بعد ازواج مطہرات نے نماز جنازہ ادا کی مگر عوام کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نماز میں کیا پڑھیں، تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رض سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھو۔ چنانچہ آپ سے پوچھنے پر ارشاد ہوا کہ یہ دعا پڑھو۔ ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ لبیک اللھم ربنا وسعدیک صلوات اللہ البر الرحیم والملئکۃ المقربین والنبیین والصدیقین والشھداء والصلحین وما سبح لک من شیئ یارب العلمین علی محمد بن عبد اللہ خاتم النبیین وسید المرسلین وامام المتقین ورسول رب العلمین شاھد البشیر الداعی الیک باذنک السراج المنیر وعلیہ السلام۔ ذکرہ الشیخ زین الدین بن الحسین المراغی فی کتابہ تحقیق النصرۃ۔ اس حدیث کو شیخ زین الدین بن حسین مراغی نے اپنی کتاب تحقیق النصرۃ میں ذکر کیا ہے۔

اس بحث کا تیسرا پہلو ہے ایک مقدس گروہ پر یہ کہہ کر طعن کرنا کہ انہوں نے جنازہ نہ پڑھایا یا زیادہ وقت پڑا رہا۔ حقیقتاً ایک ایسے رنج والم کے موقع کو افسانہ بنانا مقصود ہے جس سے کہنے والوں نے بہا کا نہ طور پر کہنے سے دریغ نہیں کیا۔

اس پر بحث کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ ان الفاظ کے قائل کون تھے۔ گمان کرنا پڑتا ہے کہ وہ اہل اسلام کے خیرخواہ نہ تھے۔ جنہوں نے انتقال کے فوراً ہی بعد معاندت کا ثبوت دے کر یہ ثابت کر دیا کہ عوام اہل اسلام میں تخریب اسلام کا جال پھیلانا ان کا مقصود ہے۔ ورنہ ایک چھوٹی عقل کا آدمی بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ جس کمرہ میں صرف دس آدمی نماز جنازہ کے لئے کھڑے ہو سکتے ہوں، وہاں لاکھوں یا ہزاروں کی تعداد میں باری باری حاضر ہو کر نماز ادا کرنا کتنا وقت لے سکتا ہے اور کثرت ہجوم کے باعث چھوٹی جگہ میں اس تاخیر کا امکان کس حقیقت کا حامل ہو گا۔ اندا اگر ایک عامیانہ نگاہ سے بھی اس تاخیر کے اشارہ کو دیکھا جائے تو اس قاعدہ کی رعایت بھی ملحوظ ہو گی کہ کسی بادشاہ کی وفات کے بعد حکومتیں اس وقت تک اس کے جسم کی حفاظت کرتی ہیں اور قبر میں داخل بلکہ موت کا بھی اعلان نہیں کرتیں جب تک اس کے قائم مقام کا انتخاب نہ ہو جائے اور بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ خلافت کا مسئلہ نہایت اہم ہو یہ تاخیر کس حد تک وقت کی نزاکت کی مؤید ہو گی۔ اور شاید زمانہ کی سلطنتوں کا یہ الفاظ بیک وقت استعمال کرنا، بادشاہ مرگیا، بادشاہ زندہ باد اسی کا ترجمان ہو حقیقت میں یہ تاخیر تھی ہی نہیں کیونکہ تاخیر یا پڑا رہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی نے توجہ ہی نہ کی ہو، ایسے موقعہ کے لئے تاخیر کا لفظ استعمال کرنا حق و صداقت کا خون کرنا ہے۔ ~~~

بریں عقل و دانش بباید گریست

متروکاتِ نبوی

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

ترجمہ:۔ آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی، اور تمہارے لئے مذہب اسلام پر راضی ہو گیا۔

یہ آخری وحی الٰہی جو حضور پر نازل ہوئی، محبوب خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے دُنیا سے تشریف لے جانے کا ایک اشارہ اور پیش خیمہ بھی جس کے نزول کے تین ماہ بعد حضور علیہ السّلام دُنیا سے تشریف لے گئے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، تو بعض دور اندیش صحابہ بھانپ گئے کہ حضور علیہ السلام کے وصال کا زمانہ قریب آگیا ہے، کیونکہ جس فرض کی ادائیگی کے لئے حضور تشریف لائے تھے وہ پورا ہو چکا ہے۔ بعض روایتوں میں یوں بھی آیا ہے کہ اس آیت کریمہ کے نزول پر اکثر صحابہ تکمیل دین سے نہایت مسرور ہوئے، مگر ادا شناس قدرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جن کی حیات طیبہ حیات نبوت کا صحیح عکس تھی رونے لگے، احباب و اصحاب نے پوچھا کہ تکمیل دین کا پیغام ایک مسرت و شادمانی کا مقام ہے، جو کسی اُمت سابقہ کو حاصل نہیں ہوا، آپ رو کیوں رہے ہیں؟ فرمایا یہ صحیح ہے کہ تکمیل دین کا پیغام نہایت مسرور کُن پیغام ہے، مگر اس آیت کے نزول سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ اب حضور علیہ السّلام ہم کو داغ مفارقت دے جائیں گے اور ہم میں نہیں رہیں گے۔ اور ہم اس بے مثل دولت عظمےٰ سے ہمیشہ کے لئے ظاہری طور پر محروم ہو جائیں گے، پھر کون ہے۔ جو اس صدمۂ جانکاہ

پر اشکباری نہ کرے گا۔

چنانچہ ہجرت کے گیارہویں سال ربیع الاوّل کی دسویں تاریخ شنبہ کے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت کا آغاز ہوا۔ درد سر اور بخار کی شکایت بڑھتی گئی، دو روز تک طبیعت ناساز رہی، وصال کے دن دو شنبہ کے روز بوقت نماز فجر مزاج مبارک میں کسی قدر سکون ہوگیا اور صحت محسوس کی جانے لگی مسجد نبوی میں نماز باجماعت پڑھی جا رہی تھی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سر مبارک کو کپڑے سے باندھے حجرہ شریف کے دروازہ تک تشریف لائے۔ اور پردہ کو اٹھا کر نمازیوں کا مشاہدہ فرمایا اور متبسم ہوئے۔

مسلمانوں نے جب حضور کے چہرۂ انور کو دیکھا تو نہایت خوش ہوئے اور قریب تھا کہ قدمبوسی کے لئے دوڑ پڑتے، مگر حضور علیہ السلام نے ان کو اشارے سے منع فرمایا اور وہ دعاؤں میں مشغول ہو گئے۔ پھر اُن کے دعا کے فارغ ہو جانے کے بعد حضور نے باواز بلند ارشاد فرمایا۔

مسلمانوں میں نے تم کو اللہ کا کلام پہنچا دیا اور اس کے احکام بتا دیئے۔ اب تمہارا فرض ہے کہ عمل کرو اور سعادت دارین سے حصّہ پاؤ۔ اس کے بعد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ گرا دیا۔ اور بستر استراحت پر واپس ہوکر لیٹ گئے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں کہ ذرا دیر کے بعد طبیعت اقدس پھر ناساز ہوئی۔ اور زبان مبارک پر یہ کلمات جاری ہوگئے اللّٰھُمَّ فی الرفیق الاعلٰی اور یہ کل کائنات کا آفتاب ہدایت غروب ہوگیا۔ وصلی اللہ علی حبیبہ محمد وآل وسلم۔ سرکار انبیاء علیہ التحیۃ والثناء گو حیات النبی اور ایک ابدی زندگی کے مالک تھے۔ مگر قانون قدرت کے ماتحت اس جہان فانی سے بمصداق کُلُّ نفسٍ ذائقۃُ الموت آپ کا بھی تشریف لے جانا اُمت کے لئے ایک سبق ہی تھا، تاکہ یہ آخری منزل بھی عملاً طے کر کے دکھا دی جائے اور بتا دیا جائے کہ ایک مومن اس جہان سے کوچ کر جانے کے بعد بھی ایک لازوال حیات

ابدی کا حامل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ مسئلہ حیات بعد الممات کا یوں حل کر کے دکھانا منظور ہوتا تو حضور یقیناً مرضیٔ مولا کے ماتحت ہمیشہ اس جہان میں قیام فرما سکتے کیونکہ یہاں سے رحلت کے لئے بھی تو مولا کریم نے مرضیٔ مبارک معلوم فرمائی تھی اور فرشتہ کے ذریعہ پوچھا تھا۔ کہ اس جہان کو چھوڑنے کے متعلق کیا ارادہ ہے۔

حضور علیہ السلام کا واقعۂ رحلت ایک وہ عظیم الشان واقعہ ہے۔ جس پر مؤرخین و شعرائے نے ان الفاظ میں خامہ فرسائی کی ہے۔ شعر

نمے دانم حدیث نامہ چونست ہمے بینم کہ عنوانش بخون است

تقریباً تینتیس ۳۳ گھنٹے کے بعد حضور علیہ السّلام کی تکفین و تدفین ہوئی اور اس کے بعد مہاجرین و انصار جنابہ سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے۔ جنابہ سیدہ رضی اللہ عنہا نے حضرت انس سے پوچھا کہ سرکار دو عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کر آئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں۔ حضرت سیدہ نے پھر فرمایا کہ تمہارے دلوں نے کیونکر گوارا کیا کہ آپ پر خاک ڈالی جائے۔ اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔ سب نے پرنم آنکھوں سے ثابت کرتے ہوئے کہا کہ اے بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے کون ہے۔ جس کو آنحضرت محبوب خدا کی جدائی کا صدمہ نہ ہو۔ لیکن رب العزت جل شانہٗ کے حکم کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ اور صبر و شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس مضمون کے ماتحت وفات نامہ لکھنا مقصود نہیں ورنہ اس صدمۂ دلدوز پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے۔ کہ شہنشاہ کونین نے اس جہان سے رحلت فرماتے وقت دنیا میں اپنی دنیا پسندی کے عنوان پر کیا کچھ چھوڑا۔ اور دنیا میں کیونکر زندگی گزاری۔ چنانچہ صحیح روایات کے مطابق کتب صحاح ستہ سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ چھوڑا وہ برائے نام تھا اور وہ بھی ایسا کہ جس کا عالم حیات میں ہی فیصلہ فرما دیا تھا۔ یعنی نحن معشر الانبیاء لا نورث ولا نورث ما ترکنا صدقۃ۔ یعنی ہم گروہ انبیاء

علیہم السلام کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ ہم جو کچھ چھوڑیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے۔ اور صدقہ سے مراد عام مسلمانوں کا حق ہے۔ سرکار دو عالم کے مختار کے ترکہ کی جو فہرست کتب دین میں ملتی ہے۔ اس کا کچھ اجمالی خاکہ یہ ہے :

جانور اسی طرح صحیح بخاری کی دوسری حدیث بروایت عمرو بن الحارث برادر ام المؤمنین جویریہ رضی اللہ عنہا یہ ہے۔ ماترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند موتہ درھماً ولا دیناراً ولا عبداً ولا امۃ ولا شیئاً الا بغلتہ البیضاء وسلاحہ وارضاً جعلہ صدقۃ۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موت کے وقت کچھ نہیں چھوڑا نہ درہم نہ دینار نہ غلام نہ لونڈی نہ کچھ اور۔ صرف اپنا ایک سفید خچر اور اسلحہ زمین اور ان کو بھی صدقہ کر گئے۔ یہ وہ خچر ہے جس کو مقوقش شاہ مصر نے ہدیۃً پیش کیا تھا۔ اور اس کا نام تیہ تھا۔ جس کو دُلدل بھی کہا جاتا ہے۔ اور ارباب سیر کی روایات کے مطابق وفات سے پہلے مختلف اوقات میں سات گھوڑے بھی رہے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں سکبؔ، سبحہ۔ مرتجز۔ لزاز۔ ظرب۔ لحیف۔ وردؔ۔ ان گھوڑوں کے علاوہ ایک تیز رفتار اونٹنی بھی جو اپنی صفات کے لحاظ سے عضباء، قصوا یا جدعا مشہور تھی۔ اور ایک گدھا جس کا نام عفیر یا یعفور تھا۔ حضور علیہ السلام کے پاس تھے۔

اراضیات مدینہ طیبہ کی اراضیات سے بنو نضیر کے نخلستان (کھجوروں کے باغ مراد ہیں) جو ان کی جلاوطنی کے بعد حضور علیہ السلام کے قبضہ میں آگئے تھے۔ ان باغات کی آمدنی اتفاقیہ مصارف کے لئے مخصوص تھی اور بعد امانت محفوظ رکھی جاتی تھی۔ باقی کچھ خیبر کی اراضیات بھی تھیں۔ جو فتح کے بعد مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ اور ان میں سے کوئی ایک ٹکڑا بھی حضور علیہ السلام کے لئے مخصوص نہ تھا۔ البتہ لگان کی مجموعی آمدنی سے خمس (پانچواں حصہ) نبی کریم علیہ السلام والتسلیم کا ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی رقم سے ایک حصہ ازواج مطہرات

حضور علیہ السلام کے سالانہ مصارف میں دیا جاتا تھا۔ پھر اگر کچھ باقی رہ جاتا۔ تو غرباء مہاجرین پر بانٹ دیا جاتا۔ ان کے علاوہ دو حصّے عام مسلمانوں کے لئے وقف تھے۔ اور باغ فدک کی کل آمدنی مسافروں کے لئے مخصوص تھی۔ چنانچہ شروع سے اخیر تک یعنی تاریخ قبضہ سے لیکر حضور علیہ السّلام کی رحلت تک ان زمینوں کی آمدنی کا یہی مصرف رہا۔ اور اسی اصول پر حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی پابند عمل رہے۔ پھر سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحۂ ارتحال پر جب بنی ہاشم اور حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے فدک کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو حضرت خلیفۂ اول صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسی اصول کی بنیاد پر ان کے مطالبے کے دعوئے کو خارج کر دیا۔

کیونکہ نبیؐ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اراضی خیبر کے بطور ملکیّت ذاتی مالک نہ تھے۔ بلکہ بحیثیت وقف آپ اس کے متولی تھے۔ یہی وجہ فتوح البلدان بلاذری میں لکھی ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہ زہرا اس جواب اور فیصلہ پر ناراض ہوگئیں۔ اور ساری عمر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ہمکلام نہ ہوئیں۔ یہ غلط ہے، اس کا مطلب ناراضگی کا نہ تھا، بلکہ یہ کہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے جب حضور علیہ السّلام کی یہ حدیث سُنی تو تعمیل ارشاد کے طور پر آپ نے سکوت فرمایا اور اس امر کا پھر تمام عمر مطالبہ یا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا آپ سے زیادہ احترام کرنے والا اور کون ہو سکتا تھا؟

اسلحہ جات جہاد کی ضرورت کے پیش نظر سرکار کائنات مختار شش جہات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسلحہ بھی موجود رہتے تھے۔ اور ذاتی مصارف سے جس قدر رقم پس انداز ہوتی تھی وہ بھی اسلحہ کی خریداری میں صرف فرما دیا کرتے تھے۔ جو اکثر مجاہدین ہی کے کام آتے تھے۔ البتہ ذاتی طور پر جو گیارہ تلواریں تھیں وہ سرکار کے پاس ہی رہتی تھیں۔ اور اپنی صفات کے لحاظ سے الگ

الگ ناموں پر پکاری جاتی تھیں، مثلاً (۱) ماثور۔ ترکہ پدری کی یادگار تھی (۲) عضب۔ جو معرکۂ بدر کے موقع پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے نذر کی تھی (۳) ذو الفقار۔ اس میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح گرہیں تھیں۔ بدر کے مال غنیمت میں آئی تھی جو عاص بن منبہ سہمی کی ملکیت تھی۔ اس کا قبضہ چاندی کا تھا، اور حضور علیہ السلام نے حضرت مولا مشکل کشا علی علیہ السلام کو عطا کر دی تھی۔ جو بعد میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے بعد خلفائے عباسیہ کے قبضہ میں آئی (۴) قلعی (۵) تبّار۔ یہ دونوں تلواریں نہایت تیز اور دھاردار تھیں (۶) حتف۔ (موت) (۷) مخذم جو زید الخیر نے نذر کی تھی، بڑی شاندار اور جوہر والی تھی (۸) قضیب (شاخ درخت) نہایت خوبصورت اور نازک تھی (۹) رسوب (زخم میں پیوست ہو جانے والی) یہ ایک تاریخی یادگار تھی۔ ملکہ سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو سات تلواریں نذر گذاری تھیں ان میں سے ایک یہ تھی (۱۰) قبیعہ۔ یہ حضور علیہ السلام کو اتنی پسندیدہ تھی کہ ہر غزوہ میں زیب کمر رہی (۱۱) صمصام یہ عمرو بن معدیکرب کی مشہور تلوار تھی جو سرکار کے پاس رہی۔

ان تلواروں کے علاوہ دو ڈھالیں بھی تھیں، ایک کا نام ذلوق تھا اور دوسری کا عقاب تھا جس پر مینڈھے کے سر کی تصویر تھی۔ بدیں وجہ حضور علیہ السلام اس کو استعمال نہ فرماتے تھے۔ آجکل کے تصویروں کے دلدادہ اور فوٹوؤں کے عاشق ذرا غور کریں کہ وہ تصویریں بنوا کر کس حد تک ادائے سنت کا ثواب حاصل کر رہے ہیں۔

زرہیں حضور علیہ السلام کے اسلحہ جات جنگ کے ساتھ جو مذکور ہوئے ہیں سات عدد زرہیں بھی تھیں، اور سب آہنی تھیں۔ عرب میں چونکہ چمڑے کی زرہیں بھی استعمال ہوتی تھیں، اس لئے ان کو لوہے کی ہونے کا خاص درجہ حاصل تھا ان کے نام یہ تھے۔ ذات الفضول، ذات الوشاح۔ ذات الحواشی، سغدیہ۔ فضہ تبرا۔ فرنق۔ ان کے علاوہ آہنی مغفر دو تھے، ایک کا نام السبوغ اور دوسرے کا نام الموشح تھا۔ اکثر غزوات میں زرہ اور مغفر دونوں کا استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ غزوہ احد

اور حنین میں جسم اطہر پر دو زرہیں ذات الفضول و فضہ تھیں۔

نیزے سرکار نے اس غرض و غایت کے لئے پانچ نیزے بھی رکھے ہوئے تھے۔ جن میں ایک کا نام متوی (قاتل) اور دوسرے کا نام مثنی تھا۔ ایک برچھی تھی جس کا نام عنزہ تھا۔ جو شاہ حبش نجاشی نے نذر کی تھی۔

کمانیں زوراء۔ روحا۔ بیضاء۔ صفراء۔ سداد۔ شداد۔ کتوم۔ سات کمانیں تھیں۔ ان سے کتوم غزوہ اُحد میں ٹوٹ گئی تھی جو حضور علیہ السلام نے حضرت قتادہ کو دے دی تھی۔

ترکش ایک ترکش تھا۔ جس کا نام کافور تھا۔ ترکش کو عربی میں کنانہ کہتے ہیں۔

عَلم سفید۔ سیاہ اور سبز متعدد علم بھی تھے۔ مشہور سیاہ علم عقاب تھا۔ یہ غزوہ خیبر میں تھا۔ ایک سفید علم بھی تھا جس پر کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔ اکثر علم امہات المومنین کے دوپٹوں سے تیار کئے گئے تھے۔ ایک اور سفید علم بنام زینتہ تھا۔

عصا حضور نے اپنی ضرورت کے لحاظ سے متعدد دستی لاٹھیاں بھی رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک الیمین تھی۔ جو عیدین کے موقع پر اکثر دست مبارک میں ہوتی۔ دوسری عرجون جو بقدر نصف قد کھجور سے بنی ہوئی تھی۔ اور عصائے دراز بھی دو تھے۔ ایک کا نام ممشوق اور دوسرے کا محجن پکارا جاتا تھا۔ جن میں سے ایک سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عطا ہوا اور ایک خود سرکار دوعالم کے پاس رہتا تھا۔

خطاط یہ بالوں کا ایک خیمہ تھا جس کا نام الکن رکھا ہوا تھا۔ (محافظ گرما و سرما) غزوات میں یہ ساتھ رہتا تھا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ کی عادت مبارک تھی کہ ہر چیز کا نام اس کی صفت کے لحاظ سے رکھا کرتے تھے۔ اور وہی پکارا بھی جاتا تھا۔

لباس آپ کے لباس مبارک میں تین عدد جبّے تھے، جن کا جنگوں میں استعمال ہوتا تھا، ایک سیاہ رنگ کا عمامہ شریف تھا۔ جس کا نام سحاب تھا۔ فتح مکہ کے دن یہی سر اقدس پر زینت دہ رہا۔ اس کے علاوہ روایتوں میں آیا ہے کہ چار جوڑے چرمی موزوں کے بھی تھے، جو وقتاً فوقتاً استعمال ہوا کرتے تھے۔

انگوٹھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ضرورت زمانہ کے مطابق ایک چاندی کی انگوٹھی جس پر تین سطور میں محمد رسول اللہ کندہ تھا۔ آپ کے بعد استحقاق خلافت کی بنا پر یہ انگوٹھی خلفائے کرام کے قبضہ میں رہی اور عہد عثمانی میں جب فتنہ بپا ہوا تو ضائع ہو گئی۔

ظروف یعنی برتن وغیرہ ایک الصادرہ نامی کوزہ تھا اور ایک العقبہ نامی قعب یعنی رکابی تھی، ایک قلاح (پیالہ) جس کا نام الریان ومعیث تھا، اور دو پیالے لکڑی کے تھے، اور ایک پیالہ کانچ کا بھی تھا۔ ایک پتھر کا طشت تھا جس میں آپ وضو فرمایا کرتے تھے، اور ایک لوہے کا مخضب نام کھلا ٹب (کٹھیلا) تھا۔ اور ایک لکڑی کا بڑا اوزنی (قصعہ) یعنی کا ٹھڑا تھا، جس میں دعوت وغیرہ کے موقع پر تخمیناً دس بارہ آدمیوں کا کھانا پڑ جاتا تھا۔ اس کا نام الغرئی تھا۔

اشیاء متفرقات ایک تھیلی کپڑے کی جس میں آئینہ، ایک کنگھی جو کھجور کی پشت کی ہڈی کی تھی، سرمہ دانی، سوئی۔ دھاگہ۔ قینچی۔ سوسومۃ الجامع (تیل کی کپی) اور مسواک رہا کرتی تھیں۔ یہ تھیلی سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتی۔

تخت پوش چوبی ایک لکڑی کا تخت ہوتا تھا، جس کے پائے ساج کے تھے، یہ اسد بن زرارہ نے نذر کیا تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم پاک جنازہ کے وقت اسی پر تھا، اور آپ کے سیدنا ابوبکر صدیق خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ اور حضرت سیدنا عمر فاروق خلیفۂ دوئم رضی اللہ عنہ کے جنازے بھی اسی تخت پر اٹھائے گئے تھے۔

مسکن شریف

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ معظمہ والا موروثی مکان حضرت عقیل (برادر حضرت علی علیہ السّلام) کے قبضہ میں رہا۔ مدینہ طیبہ میں سکونت کے لئے ازواج مطہرات کی نسبت سے نو حجرے تعمیر کرائے گئے تھے جن میں سامان آرائش میں صرف ایک چادر اور ایک چارپائی تھی۔ بستر اور چمڑے کا ایک گدا (دلائی) اور ایک ایسا ہی تکیہ تھا۔

غلام اور کنیزیں

غلامان خاص میں سے سب سے پہلے غلام زید بن حارثہ تھے۔ دوسرے ابو عبداللہ حمیری۔ تیسرے ابوکبشہ شقران چوتھے ابو رافع اسلم، پانچویں ابو موتیہ مزینہ، چھٹے سفینہ، ساتویں بشار، آٹھویں ابو حمیرہ نادیں مدحم، دسویں البیبنہ۔ گیارہویں فضالہ رضوان اللہ اجمعین تھے۔ اور کنیزوں میں ام ایمن (برکہ نامی) حبشیہ جو ترکہ پدری میں آئی تھیں، اور حضور علیہم السلام کی دایہ اور خادمہ تھیں، اور باقی مختلف اوقات میں ۸ کنیزیں رہی تھیں، ان سب غلاموں اور کنیزوں کی تفصیلی حالات معلوم کرنے کے لئے الخمیس اور زرقانی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس مختصر کتاب میں اس کی گنجائش نہیں ۔

تقبیل ابہامین اور برکاتِ اسمِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اہل اللہ رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ محبوب کا ہر قول و فعل محبوب اور مطلوب کی مراد امطلوب ہوتی ہے۔ کیونکہ محبت ہی ایمان کی علامت ہے۔ جس میں محبت نہیں اس میں ایمان نہیں۔ بعض خشک زاہد اس رسمی اسلام پر عامل ہو کر۔ جوان کے اپنے نفسوں نے گھڑ لیا ہے۔ مدعی ہوتے ہیں۔ کہ صراط مستقیم ہمارے ہی حصے میں آیا ہے مگر جب اسلام لانے والے سے محبت کا اظہار کرنا پڑے تو فوراً شرک گونی کی مشین متحرک ہو جاتی ہے۔ اور بے معنی توحید پرستی کے گیت گائے جاتے ہیں۔ نہیں سمجھتے کہ اسلام اور خدائے قدوس اسی کا ہے۔ جس نے جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں خداوند عالم کا تصور سمجھایا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ وہ ایک ہے۔ واحدہٗ لاشریک ہے خالق الکل ہے۔ اور ساری کائنات کا خالق و رازق ہے۔ اُسی کے فرمانے سے ہم جانا کہ خدا ہے اور ایک ہے۔ وہی قابل پرستش ہے۔ اور وہی رازق مطلق ہے اگر بتلانے والے اور شناسائے خدا کرانے والے محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اور خدائے واحد کے درمیان سے الگ کر دیں تو ساری توحید پرستی کرکری ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہاں کی توحید اور کیسی توحید پرستی۔ انسانیت ہو تو یہ سمجھ آئے گی۔ کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے خدائے واحد سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ کیونکہ ایک منوانے والے کو اور خدا کے محبوب کو ہم نے درمیان سے نکال دیا ہے۔ اور توحید وہی قبول ہو سکتی ہے جو بواسطۂ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔ اُس ماننے والے کی اپنی کیا حیثیت ہے۔ جو کسی کے کہنے پر خدا کو ایک ماننے پھرا ہے اگر منوانے والا سات خدا بھی منوا دیتا تو اسے ماننا ہی پڑتا۔ کیونکہ اس کی اپنی تحقیق کی کوئی عینک نہیں

اور اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت و رسالت کے بغیر توحید کوئی قابل قبول عمل و عقیدہ ہوتا تو سکھ قوم یقیناً ایسے توحید پرستوں سے پہلے درجۂ موحدیت پر فائز ہوتی بے تحقیق محبت کا نبیائے بنی اسرائیل کے مدعی اور خلیفۃ اللہ فی الارض کہلانے والے اور اپنے آپ کو حضور علیہ السلام کی گدی کا مستحق خیال کرنے والے ذرا غور تو کریں کہ حضور علیہ السلام کے کلمۂ توحید پڑھانے کا بھی احسان ہے کہ خداوند عالم کا پیغام سُن پانے کے بعد پیغام لانے والے ہی سے بے ادبی کا ارتکاب کیا جائے، لاحول ولا قوۃ۔ اس خودستائی اور خودنمائی کی بھی کوئی حد ہے۔ جو بزعم خود اپنے وجود فانی کو خدائے واحد کا عرش قرار دئے بیٹھے ہیں، بڑے بڑے خطابوں سے اپنے آپ کو لکھوا لکھوا کر مشہور کراتے ہیں۔ مگر حق پسندی اس قدر بھی نہیں جتنی شہرت پسندی ہے۔ انہیں خدا کے پیارے کی نہ کوئی شرم و حرمت ہے اور نہ اس کی عزت و عصمت کا کچھ پاس، نہ اس کے نام و ناموس پر مٹنا جانتے ہیں، اپنے کسی فرقہ دار مولوی کی توہین ہو تو لاٹھیاں اٹھالیں، اور سرکار دو جہاں بانئے اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر لاکھوں راجپال چڑھ آئیں تو ان کے قلوب قاسیہ موحدیہ نام نہاد پر خطِ الم نہ آئے، لوگوں کو توحید توحید کے نعرے مار مار کر مسرور لگا دیتے ہیں۔ حدیث حدیث اور سنت سنت پکارتے تھکا دیتے ہیں، لیکن خود ترک شرک و بدعت نہیں کرتے آ جائے اس فرقہ کے پاس ادائے سنت کے لئے کئی لاکھ احادیث واجب العمل سے آمین بالجہر، رفع یدین اور فاتحہ خلف الامام کا جھگڑا رہ گیا ہے اور کچھ نہیں، حضور علیہ السلام کے معاملہ میں ہر بات پر شرک مجسمہ کا فتوے ہیں، اور لیوے بے ادب اللہ کریم ان کو توفیق عطا فرمائے۔ کہ یہ سرکار دو عالم کو پہچان سکیں۔ لطیفہ

چند مسلمان ریل میں سفر کر رہے تھے کہ گاڑی ایک سٹیشن پر رکی، نماز ظہر کا وقت تھا۔ کسی مقامی مسلمان نے سٹیشن کی مسجد میں اذان دینی شروع کر دی۔ اور جب وہ کلمۂ اشہد ان محمد رسول اللہ پر پہنچا تو بعض نے ادب رسول علیہ السلام سے قرۃ عینی بک یا رسول اللہ کہکر ہاتھوں کے انگوٹھے چومے۔ وہاں ایک امرتسری

موحد بھی موجود تھے۔ انہوں نے ٹوکا اور ترش روئی سے ٹوکا۔ پھر کیا تھا وہ بحث چھڑی
اگرچہ دوسرے ہمسفر مزاحمت نہ کرتے تو یہ مسئلہ جوتے گھونسے سے کچھ آگے جیل تک
کا ثواب بھی معترض کے نامۂ اعمال میں لکھوا دیتا۔

حیرانگی ہوتی ہے کہ یہ حسد و کاوش کیوں ہے۔ جبکہ مولا کریم نے اپنی اطاعت کو
اطاعت رسول علیہ السلام پر ہی موقوف رکھا ہے۔ اور مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ
اَطَاعَ اللّٰہَ سے ثابت فرما دیا ہے۔ کہ میرے محبوب کی محبت و اطاعت ہی میری
محبت و اطاعت ہے۔

قرآن کریم میں دو قسم کے احکام آئے ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں سے
دو ہی طرح پر تخاطب فرمایا ہے۔ ایک تو امنوا باللہ ورسولہ یعنے اللہ اور اسکے
رسول علیہ السلام پر ایمان لاؤ۔ اور دوسرے اطیعوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔ یعنے اللہ تعالیٰ
اور اس کے رسول علیہ السلام کی اطاعت کرو۔ پہلا مرحلہ آمنوا کا ہے۔ اور دوسرا
عملوا الصّٰلحٰت کا۔ گویا ایمان و عمل دونوں ہی لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ اگر ایمان باللہ
سے ایمان بالرسول کو الگ کر دیا جائے۔ اور اطاعت الٰہی کے ساتھ اطاعت رسول
الٰہی کو شرک سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔ تو اسلام کس شئے کا نام ہوگا۔ حالانکہ امنو
سے مراد ہے۔ انسانیت کے بلند ترین مقاصد کو بواسطہ رسول علیہ السلام سامنے رکھنا
اور کسب سعادت کی استعداد و قوت کا اظہار کرنا۔ اور اطیعو و عملوا الصّٰلحٰت
سے مقصود ایسے عملی ذرائع اختیار کرنا ہے۔ جن سے اشخاص اور اقوام اپنے مطلوبہ
مقاصد تک پہنچ سکیں۔ یعنے امنوا عالم روحانیات کی جانب پرواز اور کسب سعادت
کی سچی طلب اور تیاری ہے۔ اور اطیعو آلات پرواز اور حصول مطلب کا ذریعہ ہیں
گویا آمنوا روح ہے اور اطیعوا جسم ہے۔ جب تک دونوں کا اشتراک نہ ہو۔ صحیح
مذہبی زندگی نہیں بن سکتی۔

یہ مسئلہ جس کا لطیفہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ بھلا کون سا شرک و کفر کا اقدام ہے جس
میں دھینگا مشتی تک نوبت پہنچائی جائے۔ صحابہ کرام نے فضلات خارجہ تھوک پیپ

وغیرہ حضور علیہ السلام سے لیکر چہروں پر مل لیا، یا خون پیپ پی کر محبت ایمانی کا ثبوت دیا، اور حضور علیہ السّلام نے اُنہیں بد عمل کہنے کی بجائے یہ فرما دیا۔ کہ تم پر دوزخ حرام ہوگئی ہے، کیونکہ تمہارے اندر نبی علیہ السّلام کا خون چلا گیا ہے۔ تو یہ کس بات کا صلہ تھا، حالانکہ قرآن کریم خون پیپ اور مردار وغیرہ کو حرام فرماتا ہے۔ اس بیان سے دو باتیں ثابت ہوئیں، ایک اختیارات نبوی علیہ السلام کہ جنتی کو جہنمی اور جہنمی کو جنتی، حرام کو حلال اور دو گواہوں کی بجائے ایک گواہ کافی فرما دیں۔ دوسرے محبت کے میدان میں کبھی ایسے افعال بھی پسندیدہ ہو جاتے ہیں، جو اگرچہ مواخذہ کے قابل ہوتے ہیں، مگر مواخذہ تو درکنار وہ موجب نجات ہو جاتے ہیں۔

فقیر اپنی تالیف جمال رسول علیہ السلام کو مکمل کر چکا تو ایک دن نماز کے بعد کسی کہنے والے نے کہا کہ اس کتاب میں مسئلہ تقبیل ابہامین بھی لکھو۔ تاکہ اہل ایمان اس سے کماحقہ، نفع حاصل کر سکیں۔ چنانچہ اسی آواز کا نتیجہ یہ چند اوراق بھی قارئین کے پیش خدمت ہیں مطالعہ فرمائیں اور ایمانوں کو مجلّٰی کریں۔

تقبیل ابہامین یعنی دونوں انگوٹھوں کا بوقت تکلم مؤذن اشهد ان محمد رسول الله چومنا کتب احادیث قدسیہ میں ثابت ہے، چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے، کہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمانہ قیام جنت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا پس اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم پر وحی بھیجی، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے صلب سے ہیں، اور ان کا ظہور آخری زمانہ میں ہوگا، مگر جب حضرت آدم علیہ السلام کا اشتیاق زیادہ ہوا تو حق تعالیٰ جلّ وعلا شانہٗ نے حضور علیہ السلام کی صورت مبارک حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں انگوٹھوں کی صاف سطح میں ظاہر فرما دی، اور حضرت آدم علیہ السّلام نے فرط محبت سے دونوں انگوٹھوں کو چوم کر اپنی دونوں آنکھوں پر رکھ لیا، پس یہ انگوٹھوں کا بوسہ دے کر آنکھوں پر محبت سے لگانا آدم علیہ السلام کی اولاد کے لئے اپنے دادا کی سنت ہوئی، اس قصّہ کو جب جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، تو حضور نے ارشاد فرمایا

کہ جس شخص نے میرا نام اذان میں سُنا اور محبت سے انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر ملے تو وہ کبھی اندھا نہ ہوگا۔ ایسے ہی یہ واقعہ تفسیر ابوطالب مکی میں ہے، کہ جب آدم علیہ السلام کو جنت میں داخل کیا گیا تو آپ دیدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متمنی ہوئے۔ مولا کریم نے وحی فرمائی کہ وہ آپ کی پشت مبارک میں ہیں اور آخری زمانہ میں ظہور فرمائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے لئے آپ کے نور پاک کو آدم علیہ السلام کی انگشت شہادت میں ظاہر فرمایا، تو اس نور نے تسبیح پڑھنی شروع کر دی۔ ایک دوسری روایت میں یوں بھی آیا ہے، کہ مولا کریم نے اپنے محبوب کے نور کو انگوٹھوں کے ناخنوں میں آئینہ کی طرح چمکایا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام نے دیکھتے ہی انگوٹھوں کو چوم لیا اور آنکھوں پر مسح فرمایا۔

اور محیط میں ہے کہ ایک روز حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دے رہے تھے۔ اور انہوں نے جب کلمہ اشھد ان محمداً رسول اللہ پکارا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ حضور علیہ السلام نے یہ فعل دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ اے عمر تم نے یہ کیا کام کیا ہے۔ فقال سمعت اسماك يا رسول الله فى الاذان فقبلت ابهامى فوضعت على عينى فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم من فعل مثل ما فعل عمر فانا طالبه فى صفوف القيامة قائده الى الجنة۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم میں نے آپ کا اسم مبارک اذان میں سنا۔ اور بوجہ غایۂ محبت کے اپنے دونوں انگوٹھوں کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ تو حضور علیہ السلام نے جواب میں ارشاد فرمایا، کہ جو شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح کریگا تحقیق میں اس کو قیامت کی صفوں میں تلاش کروں گا۔ اور اس کو جنت میں لیجاؤں گا۔

ایسا ہی بروایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بستان المحدثین میں بھی مذکور ہے اور تفسیر ابوطالب میں ہے۔ کہ جب ابتداء میں اذان شروع ہوئی۔ اور اس کا اہتمام قبل از نماز پنجگانہ ہونے لگا، تو ایک دن ۲۰ محرم الحرام بروز جمعہ کو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم مسجد میں تشریف شریف لائے اور مسجد کے ستون سے تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ مسجد میں حاضر ہوئے، اور وضو فرما کر اذان دینے لگے۔ جب کلمہ اشہد ان محمد رسول اللہ پر پہنچے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کے دونوں انگوٹھوں کو بوسہ دیا اور آنکھوں پر رکھ کر فرمایا۔ قرۃ عینی بک یا رسول اللہ۔ جب اذان ختم ہو چکی تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکر جو کوئی شوق و محبت سے ایسا کرے اور کہے جو تو نے کیا اور کہا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ قدیم و جدید اور پوشیدہ و ظاہر کو بخش دے گا۔ اور میں اس کے گناہوں کا شفیع ہوں گا۔ یہ روایت ابن عیینہ کی ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ بھی اسی طرح عمل فرماتے اور رضیت باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا پڑھ کر ہاتھوں کے دونوں انگوٹھوں کو چومتے اور آنکھوں پر مسح فرماتے۔ اور رد المختار باب اذان اور کنز العباد میں ہے جب مؤذن کلمہ اشہد ان محمد رسول اللہ اذان میں کہے تو سننے والا درود شریف پڑھے اور مستحب ہے کہ انگوٹھوں کو بوسہ دے کر آنکھوں پر لگائے، اور منہ سے یہ الفاظ کہے۔ قرۃ عینی بک یا رسول اللہ اللھم متعنی بالسمع والبصر، اور فتوح الاوراد میں ملا فتح محمد محدث رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اذان میں سننے والا بوقت شہادت ثانیہ اپنی دونوں انگشت شہادت کو اپنی دونوں آنکھوں پر رکھے، کیونکہ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا ایسا ہی معمول تھا۔

اور صلوٰۃ مسعودی میں ایک روایت بایں الفاظ درج ہے۔ روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم من سمع اسمی فی الاذان و وضع ابہامیہ علی عینیہ فانا طالبہ فی صفوف القیامۃ قائدہ الی الجنۃ یعنی روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جس نے اذان میں میرا نام سنا، اور اپنے دونوں انگوٹھوں کو اپنی دونوں آنکھوں پر رکھا میں اس کو صفوف قیامت میں یقیناً تلاش کروں گا اور اس کو جنت کی طرف لے جاؤں گا۔ اور کتاب مقاصد حسنۃ میں ہے۔ من

قبل عند سماعه من المؤذن کلمة الشهادة ظفری ابهامیه ومسحهما علی عینه وقال عند المس اللهم احفظ حدقتی ونوره ا ببرکة حدقتی محمد ونورهما لم یعمر۔ یعنے جو شخص موذن سے کلمہ شہادت ثانیہ سُنے اور اپنے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو چومے اور اپنی دونوں آنکھوں پر ملے اور کہے۔ اللّٰھم احفظ الآخر۔ وہ کبھی اندھا نہ ہوگا۔ اور اسی سے ملتی جلتی عبارت قریباً مفتاح السعادت میں بھی ہے۔ جس کا مختصر ترجمہ یہ ہے۔ کہ جو شخص اس عمل پر مداومت کرے اسکی آنکھیں اس کی برکت عظیمہ سے اندھی ہونے سے محفوظ رہیں گی۔ اور شیخ زادہ نے وقایہ کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ نقل سنت ہے۔ اور خلفائے کرام رضوان اللہ علیہم کا طریقہ ہے۔ بوقت سُننے کلمۂ شہادت ثانیہ کے انگوٹھوں کو بوسہ دے کر یہ کہنا چاہیئے اللّٰھم احفظ عینی ونورھما۔ اور صاحب مضمرات نے بھی اسکو مسنون لکھا ہے۔ اور کنز العباد میں اس کے عمل کا طریق یوں لکھا ہے۔ کہ جب اشہد ان محمد رسول اللہ پہلی بار سنے تو کہے صلی اللہ علیك یا رسول اللہ۔ اور دوسری بار کہے قرة عینی بك یا رسول اللہ۔ اور انگوٹھوں کو بوسہ دے کر اپنی آنکھوں پر لگاتے۔

اور مقاصد حسنہ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت بیان فرمائی گئی ہے۔ کہ جو شخص کلمہ اشہد ان محمد رسول اللہ سن کر مرحبا بحبیبی وقرة عینی محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہے اور اپنے انگوٹھوں کو بوسہ دے کر اپنی آنکھوں پر ملے۔ لَمْ یَعْمَ وَلَمْ یَرْمَدْ وہ کبھی اندھا نہ ہوگا۔ اور نہ کبھی اس کی آنکھیں دُکھیں گی۔ اور مولانا جمال بن عبد اللہ بن عمر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے فتاوے میں لکھتے ہیں۔ کہ اذان میں حضور علیہ السلام کا اسم مبارک سُن کر انگوٹھے چومنا اور ان کو آنکھوں پر رکھنا جائز بلکہ مستحب ہے۔ اور اس کی ہمارے مشائخ نے تصریح فرمائی ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ انگوٹھے چُومنے اور آنکھوں پر لگانے کے متعلق

بعض لوگ غیر شرعی عمل ہونے کا فتویٰ دے دیتے ہیں۔ اور بعض روایات کو حدیث ضعیف و موضوع کہہ کر انکار کر دیتے ہیں۔ اس کا مفصل جواب تو بہت سے علمائے کرام احناف نے اپنی اپنی تصانیف میں دیدیا ہے۔ مگر فقیر کہتا ہے۔ کہ معترضین کے کتنے اعمال ہیں جو وہ صحیح احادیث کی روشنی میں عمل میں لاتے ہیں۔ تفصیل نہ پوچھئے ورنہ ابھی اسلامی حیثیت معلوم ہو جائے گی۔ سینما، پریس انجکشن، سواریاں، بنکوں کا سود، پراویڈنٹ فنڈ۔ ولایتی حجامت، فیشن وار لباس، بے پردۂ نسواں، رشوت ستانی نئی دنیا کے اعمال سیاہ، کس کس کو نہ حدیث صحیح سے ثابت کرنا پڑے گا۔ یہ فعل چونکہ نیکی کے میدان سے متعلق ہے، اس لئے ضعف و منع کا شور اٹھ رہا ہے۔ ایک کام کی نسبت ہو پسند بدگئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور دور افتادہ مسلم شور مچائے منکرانہ۔ ہائے افسوس۔ بات صرف اتنی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ جس کی طرف سے آنکھ میلی ہو اس کا ثواب بھی عیب دکھائی دیتا ہے۔ اور جس کی طرف سے آنکھ صاف ہو اس کا عیب بھی ثواب نظر آتا ہے۔ لطیفہ

ایک مرتبہ انجمن نعمانیہ لاہور کے سالانہ جلسہ پر علمائے کرام کا کثیر اجتماع ہوا، اور اتفاق سے کسی شخص نے یہی مسئلہ دریافت کیا۔ ایک مولوی صاحب نے جواب دیا کہ کلمۂ شہادت ثانیہ پر انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر ملنا مستحب ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ فائدہ بھی ہے کہ آدمی اندھا نہیں ہوتا، اور اس کی آنکھیں بیمار نہیں ہوتیں۔ پھر دوسرے مولوی صاحب نے تشریح کی۔ کہ میاں اگر تعظیم و توقیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ عمل کوئی نہ بھی کرے تو اپنی آنکھوں کے فائدے کے لئے ہی کرے۔ یہ سن کر مفتی محمد اعظم صاحب بہت برہم ہوئے اور فرمانے لگے، یہ کون سا ایمان ہے، کہ مسلمان ہو کر حضور علیہ السلام کی تعظیم و محبت پر اپنی آنکھوں کی بینائی یا صحت کو ترجیح دے۔ جب بھی کرے حضور علیہ السلام کی تعظیم کے لئے کرے۔ سبحان اللہ کس قدر پاکیزہ جذبۂ ایمانی ہے۔

حضرت شیخ علامہ نورالدین خراسانی سے منقول ہے، کہ بعض لوگ ان کو اذان کے وقت (اور جب انہوں نے) موذن کو کلمۂ شہادت ثانیہ کہتے ہوئے سنا۔ تو انہوں نے اپنے انگوٹھے چومے اور ناخنوں کو اپنی آنکھوں کے کونے سے لگایا اور کنپٹی کے کونے تک پہنچایا۔ پھر ہر شہادت کے وقت ایک ایک بار کیا۔ جب ان سے اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمانے لگے، میں پہلے انگوٹھے چوما کرتا تھا، پھر میں نے چھوڑ دیئے، پس میری آنکھیں بیمار ہوگئیں، اسی اثناء میں میں نے حضور علیہ السلام کو خواب میں دیکھا۔ تو حضور علیہ السلام نے مجھے فرمایا کہ تم نے اذان کے وقت انگوٹھے آنکھوں پر لگانے کیوں چھوڑ دیئے، اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری آنکھیں اچھی ہوجائیں تو پھر انگوٹھے آنکھوں سے لگانا شروع کردو، پس بیدار ہوا اور یہ مسح شروع کیا، جس سے مجھے فوراً صحت ہوگئی۔ اور اس سے لبعداب تک میری آنکھیں خراب نہیں ہوئیں۔

فقیر اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکالنا چاہتا ہے، کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک پر انگوٹھے چومنا اور آنکھوں پر لگانا مستحب اور آدم علیہ السّلام و حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت سیدنا عمر فاروق اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تعالیٰ سنت ہے اور اکثر فقہاء و محدثین اس عمل کے استحباب پر متفق ہیں، اور ہر ملک و زمانہ کے دیندار مسلمان مستحب جانتے اور کرتے چلے آئے ہیں، اور سب سے بڑا انعام اس فعل کے کرنے سے حضور کے ساتھ جنت میں داخل کرانے کا حضور علیہ السلام کا وعدہ ہے۔ پھر معلوم نہیں ہوتا کہ مسلمان اس پر انکار کے دلائل کیوں تلاش کرتا رہتا ہے اللہ کریم رحم فرمائے اور ہدایت بخشے۔

اربعین

رَحْمَۃٍ وَاسِعَۃ

اکثر بزرگان دین متقدمین ومتاخرین رحمہم اللہ نے ارشادات نبی الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھیلانے میں بیشمار اربعین یعنی چالیس احادیث مبارکہ کے مجموعے شائع کئے ہیں۔ جن کی غرض وغایت یوں ارشاد فرمائی ہے۔ کہ ہماری متقدس روایات اس امر کی حامل ہیں کہ حضور سرورکائنات مختار شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی چالیس احادیث جمع کرنا باعث فوز وفلاح عظیم ہے۔ لہٰذا اسی خیال کے پیش نظر فقیر بھی ایک مجموعہ اربعین مختصر طور پر عاشقان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ جس کی احادیث مبارکہ کے ساتھ بخوف طوالت کتاب ہٰذا میں) اسماء شریفہ راویان احادیث کو درج نہیں کرتا۔ اس اربعین منیفہ کی حقیقت صرف یہ ہے۔ کہ عوام کو ارشادات رسالت کے سمجھنے اور یاد کرنے میں سہولت کے علاوہ کتاب ہٰذا کو برکت حاصل ہو۔ کیونکہ یہ ساری کی ساری کتاب محبوب خدا محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے جمال بے پناہ میں لکھی گئی ہے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم شرف اجابت بخشیں۔ آمین ثم آمین۔

(۱) لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

(ترجمہ) تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی سے وہی الفت نہ رکھے جو اپنے نفس سے رکھتا ہے یا وہی اپنے بھائی کیلئے پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

(۲) مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ وَاَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ اِیْمَانَہٗ	(ترجمہ) جو شخص عطا کرنے اور منع کرنے اور محبت کرنے اور بغض رکھنے میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی رضا کا خواہشمند ہو وہی ایمان میں کامل ہوتا ہے۔ یعنے اس کی عطا و منع اور محبت و کینہ میں کسی غیر خدا کا دخل اور نفس کی خوشنودی مراد نہ ہو۔
(۳) اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ	(ترجمہ) مسلمان کی تعریف یہی ہے۔ کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں۔ یعنے مسلمانوں کو اس کے ہاتھوں اور زبان سے ایذا نہ پہنچے۔
(۴) خَصْلَتَانِ لَا یَجْتَمِعَانِ فِیْ مُؤْمِنٍ اَلْبُخْلُ وَسُوْءُ الْخُلُقِ	(ترجمہ) مومن کی سرشت میں بخل اور بداخلاقی دونوں خصلتیں جمع نہیں ہوتیں۔ یعنے ایماندار نہ بخیل ہوتا ہے نہ بداخلاق۔
(۵) یَشِیْبُ ابْنُ اٰدَمَ وَتَشُبُّ فِیْہِ خَصْلَتَانِ الْحِرْصُ وَطُوْلُ الْاَمَلِ	(ترجمہ) ابن آدم کی زندگی کا خضاب ہوا و حرص ہوتی ہیں جن سے بڑھاپے میں جوانی کا رنگ چڑھتا ہے۔ یعنے حرص و آز ہی کا پابند ہو کر انسان ضعیفی میں جوان بنتا ہے۔
(۶) مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ	(ترجمہ) جو شخص کسی انسان کے احسان کا منت پذیر نہیں ہو سکتا۔ وہ اللہ تعالیٰ جل و علا شانہٗ کا بھی شکر گذار نہیں بن سکتا۔ گویا بندے کے احسان کا شکریہ

ادا کرنا رب العزت کے شکر گذار بننے کی نشانی ہے ؛

(۷) مَنْ لَا يَرْحَمِ النَّاسَ لَا يَرْحَمْهُ اللّٰهُ

(ترجمہ) جو شخص بیکس لوگوں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ تعالیٰ بھی رحم و رحمت نہیں فرماتا۔ یعنے اللہ کریم کے رحم کو قریب لانے والی چیز اس کی نادار مخلوق پر رحم کرتا ہے ؛

(۸) اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ وَ مَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا اِلَّا ذِكْرَ اللّٰهِ تَعَالٰی۔

(ترجمہ) دنیا اور جو کچھ اس میں ہے لعنت کی گئی چیز ہے۔ مگر وہ جس کا تعلق اللہ کریم جلشانہٗ کے ذکر سے ہے۔ قابل رحمت ہے ؛

(۹) لُعِنَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَلُعِنَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ

(ترجمہ) درہم و دینار یعنے مال وزر میں گرفتار جس قدر انسان ہیں۔ جن کے دلوں پر درہم و دینار کی ہوس ہی قابض ہو چکی ہے۔ اُن کے لئے لعنت و پھٹکار الٰہی ہے ؛

(۱۰) لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ

(ترجمہ) جنگ کی صفوں میں شدید ہونا بہادری نہیں۔ بلکہ بہادر و شدید وہ شخص ہے۔ جو غصہ کی حالت میں اپنے دلی نفس پر قبضہ پالے۔ یعنے اپنے نفس امارہ پر غصہ کی حالت میں قابو رکھنا جنگ کی صفیں الٹنے سے زیادہ سخت ہے ؛

(۱۱) لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَۃِ الْعَرْضِ اِنَّمَا الْغِنٰی عَنِ النَّفْسِ

(ترجمہ) مال و زر رکھنے والا غنی نہیں ہوتا بلکہ غنی وہ شخص ہے۔ جو دِل کا غنی ہو یعنے تونگری دل سے ہوتی ہے۔ مال سے نہیں ہوتی ؛

(۱۲) اَلْغِنٰی اَلْیَاسُ مِمَّا فِیْ اَیْدِی النَّاسِ۔

(ترجمہ) غنی کی صحیح تعریف یہ ہے کہ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے اس پر جلب منفعت کیلئے نظر نہ رکھے۔ یعنے غیر کے مال سے بے نیاز ہونا حقیقت میں غنی ہونا ہے ؛

(۱۳) طُوْبٰی لِمَنْ شَغَلَہٗ عَیْبُہٗ عَنْ عُیُوْبِ النَّاسِ

(ترجمہ) وہ شخص مبارک ہے۔ جو اپنے عیبوں پر نگاہ رکھتا ہے۔ اور اس کی نظریں غیروں کے گناہوں میں نہیں الجھتیں یعنے اپنے گناہوں پر دھیان دینا دوسروں کی عیب جینی سے بہتر ہے ؛

(۱۴) دُمْ عَلَی الطَّھَارَۃِ یُوَسَّعُ عَلَیْکَ الرِّزْقُ

(ترجمہ) طہارت پر ہمیشگی کرنا روزی میں کشائش پیدا کرتا ہے۔ گویا جو شخص ہمیشہ پاک و صاف اور با وضو رہنا اپنی عادت بنالے اس کو رزق کی تنگی نہیں ہوتی ؛

(۱۵) لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَّرَّتَیْنِ

(ترجمہ) مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔ یعنے ایک مرتبہ دھوکا کھا کر پھر دوکھانا مومن کا شیوہ نہیں۔ ایکبار جس سوراخ سے کوئی موذی جانور کاٹ کھائے۔ دوبارہ اس پر انگلی رکھنا عقل کی

دلیل نہیں ہوتی ۔

(۱۶) اَلْوَعْدَۃُ دَیْنٌ

(ترجمہ) کسی سے وعدہ کر کے وفا کرنا لازم ہے، کیونکہ یہ ایک دین کا جز ہے۔ یعنے وعدہ جب کیا جائے۔ تو وہ ایک فرض ہو جاتا ہے۔ جس کی ادائیگی فرض ہے ۔

(۱۷) اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ

(ترجمہ) کسی محفل میں بیٹھنا اس کی پوشیدہ گفتگو کا رازدار ہونا ہے۔ اور راز ایک امانت ہوتا ہے، جس کے اہل مجلس حامل ہوئے ہیں، یعنے جو شخص مجلس کے بھید کو محفوظ نہیں رکھتا، وہ امانت دار نہیں رہتا ۔

(۱۸) نَوْمُ الصُّبْحَۃِ تَمْنَعُ الرِّزْقَ

(ترجمہ) چڑھے دن تک فجر کے بعد سوئے رہنا رزق کیلئے مانع ہوتا ہے یعنی ایسے شخص کو جو صبح کے بعد بستر پر خراٹے لیتا ہو، اس کے لئے روزی تنگ ہو جاتی ہے ۔

(۱۹) اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ

(ترجمہ) کسی مشورہ میں کسی کا مشورہ کار ہونا اس کا رازدار بننا ہوتا ہے۔ یعنے مشیر کو مشورہ لینے والے کے راز کا امانت دار ہونا چاہئے۔ یہ دین کے مسائل میں ایک مصلحت ہے ۔

(۲۰) اَلسَّمَاحُ رِبَاحٌ

(ترجمہ) یقینی نفع والی تجارت سخاوت ہے یعنی خدا کی راہ میں دینا اکارت نہیں جاتا اس میں نفع ہی نفع ہوتا ہے ۔

(۲۱) اَلدَّیْنُ شَیْنُ الدِّیْنِ

(ترجمہ) قرض دین کا پھندا اور مقراض محبت ہے۔ لہذا مسلمان اور مومن کو قرض کی پھانسی گلے میں نہیں ڈالنی چاہیئے۔

(۲۲) اَلْقَنَاعَةُ مَالٌ لَایَنْفَدُ

(ترجمہ) قناعت وہ مال ہے جو گھٹانے سے بھی نہیں گھٹتا۔ یعنے قناعت کو ہر لحظہ بڑھاؤ ہی بڑھاؤ متصور ہوتا ہے۔

(۲۳) اٰفَةُ السَّمَاحِ اَلْمَنُّ

(ترجمہ) سخاوت کیلئے سب سے بڑی نقصان دہ چیز سخاوت کرنے کے بعد احسان جتانا ہے گویا سخاوت پر احسان جتانا اس کو باطل کر دیتا ہے۔ داناؤں نے کہا ہے سخاوت کا سُو احسان جتانا ہے، جو حرام ہے۔

(۲۴) اَلسَّعِیْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَیْرِهٖ

(ترجمہ) سعادت کو وہ پاسکتا ہے جس کو دوسروں کے حال سے عبرت حاصل ہو۔ اور بدوں کی برائی سے نیکی کا سبق اخذ کرے یعنی غیروں کے حال سے نصیحت پکڑنا خدا کے نزدیک سعید بنتا ہے۔

(۲۵) کَفٰی بِالْمَرْءِ اِثْمًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ

(ترجمہ) زبان کا بہت بڑا گناہ یہ ہے کہ کان کی ہر سُنی ہوئی بات کو بیان کرے یعنے زبان کو کان کا پردہ دار ہونا چاہیئے اگر ایسا نہ ہو تو یہ انسان کی ایک بڑی لغزش ہے۔

(۲۶) کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا!

(ترجمہ) موت بہترین واعظ ہے اور واعظ اس سے بڑھ کر نکتہ آموزی کیا کریں گے۔ موت سے عبرت پکڑنی چاہیئے۔

(۲۷) خَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ

(ترجمہ) بہترین لوگوں کا وہ بندہ ہے جس کی ذات سے لوگوں کو بہترین نفع پہنچے یعنے جس انسان سے دوسرے انسانوں کو نفع پہنچے وہ نہایت بلند شخصیت ہے۔

(۲۸) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ السَّهْلَ الطَّلَقَ

(ترجمہ) تحقیق اللہ تعالیٰ خوشخو اور خندہ پیشانی شخص کو دوست رکھتا ہے۔ یعنے وہ انسان اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے جو شگفتہ فطرت اور کشادہ ابرو ہنس مکھ ہو۔

(۲۹) تَهَادُوْا تَحَابُّوْا

(ترجمہ) ہدیہ اور سوغات سے محبت بڑھاؤ یعنے تحائف و ہدیہ سے محبت بڑھتی ہے۔

(۳۰) اُطْلُبُوا الْخَيْرَ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوْهِ

(ترجمہ) اچھی صورت اور اچھے چہرے والوں سے سوال کرو اور حاجت مانگو۔ کیونکہ جس کا حال اچھا ہے اس کا قال بھی اچھا ہے۔ اس سے ترشروئی کی اُمید نہیں ہوتی۔

(۳۱) زُرْغِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا

(ترجمہ) کچھ کچھ دنوں کے فاصلے پر آپس میں ملاقات کرو۔ اور محبت سے ملتے رہو گویا متواتر ہر روز صبح و شام کا ملنا محبت والفت کو گھٹاتا ہے۔

(۳۲) مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ

(ترجمہ) اسلام کی خوبی کا راز اس سے عیاں ہوجاتا ہے۔ کہ بے ضرورت اور لایعنی حصص اعمال وخصائل کو چھوڑ دیا جائے یعنے مذہب بے ضرورت باتوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۳۳) اَلحَزمُ سُوءُ الظَّنِّ

(ترجمہ) محتاط ہونے کی نشانی یہی ہے ۔ کہ انسان اعمال کے لحاظ سے اپنے نفس پر ہمیشہ بدگمان رہے ۔ اور اس کی پاکبازی کا فریب نہ کھائے ؎

(۳۴) اَلعِلمُ لَا یَحِلُّ عَنہُ صَدٌّ

(ترجمہ) علم وہ چیز ہے کہ اس سے روکنا کسی حال میں بھی جائز نہیں ۔ اس سے انسان کو فائز ہونا چاہیئے ؎

(۳۵) اَلکَلِمَۃُ الطَّیِّبَۃُ لِلسَّائِلِ صَدَقَۃٌ

(ترجمہ) پاکیزہ بات اور نرمی کا جواب سائل کے لئے صدقہ ہی ہے ۔ اگر جیب خالی ہو تو میٹھی بات خیرات کا نعم البدل ہے ؎

(۳۶) کَثرَۃُ الضِّحکِ تُمِیتُ القَلبَ

(ترجمہ) بہت ہنسنا دل کو مُردہ کردیتا ہے ہر کام اعتدال پر ہونا چاہیئے ۔ یعنے اتنا ہنسو کہ طبیعت منغض اور مذاق افسردہ نہ ہو جائے ؎

(۳۷) اَلجَنَّۃُ تَحتَ اَقدَامِ الاُمَّھَاتِ

(ترجمہ) جنت ماؤں کے پاؤں کے نیچے ہے ۔ یعنے جو شخص جنت کا طلبگار ہو اس کو ماں کی خدمت کرنی چاہیئے ؎

(۳۸) اَلبَلَاءُ مُوَکَّلٌ بِالمَنطِقِ

(ترجمہ) زبان ایک وہ شئے ہے جس کے بے قابو ہونے سے انسان مصائب و آلام میں گھر جاتا ہے ۔ یعنے منہ سے بُری بات نکلی ہوئی آدمی کو وطن سے نکال دیتی ہے ؎

(۳۹) اَلنَّظْرَۃُ سَھْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِہَامِ اِبْلِیْسَ

(ترجمہ) غیر شرعی طور پر نامحرم کو دیکھنا شیطان کے زہرآلود تیروں سے ایک تیر ہے۔ گویا تیر نظر کو جائز طور پر استعمال کرو۔ ناجائز دیکھنا حرام ہے۔

(۴۰) لَا یَشْبَعُ الْمُؤْمِنُ دُوْنَ جَارِہٖ

(ترجمہ) مومن کے لئے اس میں اسلامی خو کا شائبہ بھی نہیں ہوگا۔ کہ وہ پیٹ بھر کر کھائے۔ اور اس کا ہمسایہ بھوکا ہو۔ گویا ہمسایہ کی خبرگیری مومن پر واجب و لازم ہے۔

الحمد للہ علی احسانہ ومنّہ وحسنِ توفیقہ و
صلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہٖ ونور عرشہٖ محمد وآلہٖ
واصحابہٖ واتباعہٖ اجمعین
برحمتک یا ارحم
الراحمین
آمین

فہرست تصانیفِ حضرت ابوالفیض سہروردی مدظلہ العالی

سیاح لامکان :- اس کتاب میں مسئلہ فلسفۂ معراج پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور معترضین کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا گیا ہے۔ قیمت صرف دو روپے (عہ)

موعظۃ لاستقین :- اس کتاب کے متعلق بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ کتاب لکھ کر حضرت مصنف نے علماء پر احسان کیا ہے۔ قیمت دو روپے (عہ)

صحیفہ غوثیہ :- یہ قصیدہ غوثیہ کی شرح ہے۔ اس کا مطالعہ سالکان راہ طریقت کے لئے مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔ قیمت چار روپے (للعہ)

دعوت الحنفیہ :- یہ وہ رسالہ ہے جس میں اصلاح عقائد شیعہ کیلئے وضاحت سے لکھا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

پردۂ نسواں :- اس کتاب میں قرآن وحدیث کی روشنی میں بے پردگی کے حامیوں کے لئے مسکت جواب ہے۔ قیمت ۴ر

حلیۃ النبیؐ :- یہ چھوٹی سی کتاب پنجابی اشعار میں بڑے مقبول طریقہ پر لکھی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

لباس التقویٰ :- یہ رسالہ داڑھی کی شرعی حقیقت پر بڑی وضاحت سے لکھا گیا ہے۔ قیمت ۴ر

رسالہ علم غیب :- یہ رسالہ حضور علیہ السلام کے علم غیب کے متعلق ایک فیصلہ کن تحریر ہے۔ قیمت ۱۰ر

الفقر فخری :- اس کتاب میں حقیقت تصوف پر تفصیلی بحث ہے۔ جو طبع ہو رہی ہے۔

قمیص یوسفی :- یہ ہیر وارث شاہ کے وزن پر پنجابی زبان میں ایک نہایت دردناک قصہ لکھا گیا ہے، جو زیر طبع ہے۔

تذکرہ سہروردیہ :- جس میں صوفیائے کرام کے دینی کارناموں پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قیمت

تعارف سہروردیہ :- اس میں دعائے مغنی، شجرہ عالیہ سہروردیہ۔ حضرت میاں صاحب سہروردی حیات گرامی کی مختصر سوانح حیات۔ دعائے مناجات وغیرہ تحریر ہے۔ قیمت ایک روپیہ

متفرق تصانیف

میلاد الرسولؐ۔ شعبان المعظم۔ کتاب الصوم۔ صوت ہادی۔ رمضان المبارک۔ اسلامی عورت۔ زکوٰۃ کا اسلامی نظام۔ یہ مختلف رسائل مختلف موضوعات پر جب امر مرکزی مجلس سہروردیہ نے محض للہ تقسیم کئے۔